ماہنامہ

سچی کہانیاں

دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں

January 2017

25 سچی کہانیاں اس شمارے میں موجود ہیں



☆ ...."مسئلہ یہ ہے" قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل





ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام

مدیر : کاشی چوہان / دانیال شمسی

MEMBER APNS CPNE

خط و کتابت کا پتا: II 88-C فرسٹ فلور خیابان جامی کمرشل ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

منیجر مارکیٹنگ
021-35893121

منیجر سرکولیشن
0333-2269932

انکم ٹیکس ایڈوائزر
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے
021-35893122
021-35893123

 قیمت فی شمارہ: 60 روپے  جلد: 34 — شمارہ: 01 جنوری 2017ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

فون: 021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین ... پریس OB-7 ... لیبور روڈ، کراچی

زر سالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا، آسٹریلیا 65 ڈالر امریکا، یورپ ... ڈالر ... قانونی مشیر جی ایم بھٹو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

پرل پبلی کیشنز

کی جانب

سے تمام

اہلِ وطن کو

نیا سال





2017





مبارک

ہو



''اِک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا''

کون ایسا ہوگا جو جنید جمشید سے واقف نہ ہوگا' کون ہوگا جو اُس زندہ دل شخصیت کا مداح نہ ہوگا۔ سحر انگیز شخصیت اور مقناطیسی کشش رکھنے والے اس ہر دلعزیز فنکار اور بہت بڑے انسان کو الوداع کہنا بہت مشکل کام تھا۔ مگر اللہ کی امانت اللہ کے حوالے کرنی ہی پڑتی ہے' سو ہم سب نے بھی اپنے پیارے جنید جمشید کو منوں مٹی تلے دفنا دیا۔ آخرت کی تیاری کی نصیحت کرنے والا آخرت کے سفر پر روانہ ہو گیا اور کس شان سے ہوا یہ لمحات شاید کوئی بھلا نہ سکے۔ اللہ اپنے پیاروں کو یونہی پیار' محبت اور احترام سے اپنے پاس بلاتا ہے۔ دل دل پاکستان جان جان پاکستان گانے والے جنید نے اپنی جان اس پاک سرزمین کے سپرد کر دی۔ وہ جو زندگی کے ہر معاملے میں کامیابی کے جھنڈے گاڑتا آیا تھا آخری سفر پر بھی اس شان سے روانہ ہوا کہ آنکھیں اب بھی آنسوؤں سے لبریز ہیں۔

یا اللہ! جنید جمشید کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دینا اور ہم سب کو اس پیارے انسان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمانا......آمین۔

منزہ سہام

پہلا سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ

انتظار کی گھڑیاں ختم!

مِنی پاکستان سے نکل کر......

پاکستان کے دل میں......

زندہ دلانِ لاہور کے درمیان

ماہِ جنوری کے آخری ہفتے میں

پہلے سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی تقریب

اپنی روایتی شان و شوکت کے ساتھ منعقد کی جا رہی ہے

کیا **لاہور**...... **کراچی** سے سبقت لے جائے گا؟

اس سوال کا جواب...... سچی کہانیاں کے چاہنے والوں کے ہاتھ میں ہے

اس تقریب کو کامیاب بنانے کے لیے......

آپ میرا ساتھ دے رہے ہیں ناں؟

آپ کے جواب کا منتظر......

آپ کا اپنا......

کاشی چوہان

تقریب کی تاریخ اور مقام کا اعلان آپ کو بذریعہ فون اور دعوت نامے کی صورت جلد موصول ہو جائے گا

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

بہت پیارے ساتھیو! اک اور برس بیتا، نیا برس آ پہنچا۔ اک دوسرے میں الجھے ہم ''معصوم'' کاغذ کے تیر قلم کے چابک سے دشتِ طلسم میں دوڑاتے رہے، جہانِ رنگ و بو کو دشتِ ظلمت بناتے رہے۔ آہ! اس برس نے اپنے پیراہن میں ملکِ عزیز کے رتنِ جہاں ساز، فاطمہ ثریا بجیا، عبدالستار ایدھی، جنید جمشید، امجد صابری، اے نیئر.................! سجا لیے ہائے!! ہم ہاتھ ملتے رہ گئے اور کوہِ نور مالکِ دو جہاں کے دربارِ عالی میں چمکنے لگے۔ اک دن تو ہم سب نے بھی کہانی ہو ہی جانا ہے۔ اس کہانی کو طلسم ہوشربا بنانے کے لیے محبت کا سب رس اس زندگی کے ہر Cell (خلیے) میں بھرنا ہوگا۔ کام مشکل نہیں اتنا کہ ہم ہار جائیں۔ اتنا سہل بھی نہیں کہ ہم اسے ہوا سمجھ کر اڑا دیں۔ ماضی کی خشک ٹہنیاں کاٹ دیں، موسم بہت سرد ہے، اسے ماضی بیتیوں کو جسم تاپنے کا ایندھن بنالیں۔ ہاتھ دیکھیں گے تو منظر بدلنے کا حوصلہ ہو جائے گا۔ اس نئے منظر میں پرانا آپ ہی آپ 'کل' بن جائے گا۔ آج بڑا روشن ہوتا ہے۔ آج بڑا زندگی سے بھرپور ہوتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے زندگی ناامیدی کے بعد امید کی چنگاری سے بھڑکنے لگتی ہے۔ آج 2017ء نئے سال کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ کوئی بڑا واقعہ نہیں۔ عظیم واقعہ یہ ہوگا کہ اس نئے برس نے ہمیں بالکل بدل ڈالا۔ طوفان کے خوف سے شاخ سے جڑے رہنا عقلمندی نہیں۔ عقلمندی یہ ہے کہ آپ تخلیق کار بن جائیں۔ اپنے آپ میں ایک نئی شخصیت کی تخلیق بھی کسی کارنامے سے کم نہیں۔ اس آدمی کو باہر لے آؤ دوستو! جو ہمارے اندر خدا کی پھونکی روح سے جڑی ہر صفت اپنے اندر پوشیدہ رکھے بیٹھا ہے۔ پھر کہہ رہا ہوں کام مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔ اپنے دم پر ہر حالات کا مقابلہ کرنا، سامنا کرنا اس برس ہم سیکھیں گے۔ یہ میری اپنے لیے اور سب پیاروں کے لیے دعا ہے۔ ماہِ جنوری ہمارے لیے برکتوں اور خوشیوں کا منبع بن جائے، (آمین)۔ اس دعا کے ساتھ احوال کے طلسم کدے کا آغاز کرتے ہیں، سب سے پہلے ہمارے ساتھ ہیں لاہور سے رضوانہ کوثر جی، لکھتی ہیں:

2016ء کے دوران جتنے بھی پرچے آئے، ہر پرچے کا سرورق ایک سے بڑھ کر ایک رہا۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں، اتنے مکمل اور حسین سرورق پورے ملک کے ڈائجسٹوں میں کوئی شائع نہیں کرتا۔ اس کے لیے آپ سب مبارک باد کے مستحق ہیں۔ منزہ سہام اداریے حسبِ حال لکھتی ہیں تو کاشی احوال میں ہر بار نیا ہی جادو جگاتے ہیں۔ ''لائف بوائے'' اسماء اعوان بارہ مہینے منفرد کہانیاں لے کر آتی رہیں۔ کیا بات ہے بھئی۔ جی خوش ہو جاتا ہے۔ محمود شام صاحب کا سفرنامہ پورے بارہ مہینے ہمیں بھارت میں لیے لیے گھومتا رہا۔ ممتاز احمد نے خوب شاندار کہانیاں تخلیق کیں اور اس کے ساتھ ہی ان کی ''پلیٹ فارم'' کے نام سے کتاب بھی ماہِ دسمبر میں منظرِ عام پر آ گئی۔ ممتاز بھائی کو میری طرف سے کتاب کے لیے خصوصی مبارک باد۔ جاوید راہی کی کہانیاں اس برس اچانک ہی طویل ہو گئیں مگر تمام تحریریں منفرد اور خاص ہوتی تھیں۔ احمد سجاد بابر تم بھی کمال ہو۔ ہر ماہ نئے نئے کمالات دکھاتے رہے۔ ارے بھائی تم واقعی رائٹر آف دا ایئر کے مستحق ہو۔ اس برس ارم ناز اپنی سلگتے ہوئے موضوعات پر لکھی کہانیوں کے ساتھ چھائی رہیں، عام دکھ کو قلم سے خاص کر دینے والی ارم ناز تم نے کمال کر دیا۔ فضلو کی جورو، لو 2016ء، جوگی، واہ واہ جیو۔ راحت بھائی کی طبیعت اچانک ہی خراب ہوگئی اور ہم شکل کے اختتام

کے بعد'' زرد لومڑی'' جس تیزی سے قلانچیں بھر رہی تھی، اب تشویش ہے اور دعا ہے کہ اللہ ایم اے راحت بھائی کو جلد صحت یاب کر دے۔ ایم اے راحت ہمارا اثاثہ ہیں۔ ہمارا فخر ہیں۔ کاشی چوہان کا'' زہر عشق'' ادب کی دنیا میں ایک بہت اعلیٰ اضافہ ثابت ہونے والا ہے۔ کاشی بیٹا اپنی نظر اتروا لینا۔ اس برس میری طبیعت بار بار خراب ہوتی رہی۔ منزہ تم بہت محبت کرنے والی ہو۔ سچ میں تم، تمہارے بچوں اور پرچوں کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ دسمبر کی کہانیوں پر مختصرا تبصرہ کہ اتنا طویل خط پتا نہیں لگ بھی پائے گا یا نہیں۔ رضیہ مہدی'' سہیلی'' جیسی منفرد تحریر لکھ کر آپ نے ثابت کر دیا کہ سینئرز کا ثانی کوئی نہیں۔ افتخار چوہدری، ایڈیسن، ارم ناز، حنا بشریٰ، ممتاز احمد، فرح انیس، مہتاب خان، صائمہ عروج، محمد بلال فیاض، جاوید راہی اور احمد سجاد بابر کی کہانیاں اعلیٰ پائے کی ثابت ہوئیں۔ اچھا اب اجازت، اس دعا کے ساتھ کہ نیا سال سب کو صحت، سلامتی اور خوش حالی دے، ملکِ خداداد کو امن اور ترقی دے، (آمین)۔

☆ پیاری آپی! آپ کی محبتوں کا بہتا دریا ہمیں Refresh رکھتا ہے۔ آپ کی صحت کی دعا کے ساتھ، آپ کے ساتھ کی دعا کے ساتھ نئے سال کا آغاز کریں گے۔ محبت کرنے والے اب اس دنیا میں خال خال ہیں جو ہیں ہمیں ان کی قدر کرنی چاہیے۔

☆ ہماری نئی ساتھی شاہدہ ذاکر، دبئی سے عرض کرتی ہیں۔'' آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے مجھے احوال میں جگہ دی اور اللہ کا شکر ہے کہ میری کہانی بھی آپ کے معیار پر پوری اتری۔ نومبر کا شمارہ حسب معمول شاندار ہے۔ سب احوالیوں کے خطوط اور تبصرے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ کہانیاں بھی عمدہ، سبق آموز اور دلچسپ ہیں۔ ایوارڈ کی تقریب میں شرکت کا بہت دل چاہتا ہے مگر دوری کی مجبوری ہے۔ ایک ہفتے کے لیے پاکستان میں ہوں۔ دو کہانیاں بھیج رہی ہوں۔ دیکھیں آپ کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ ممتاز احمد، غزالہ کرن اور نزاہت افشاں کا بے حد شکریہ کہ انہوں نے نئے لوگوں کو خوش آمدید کہا۔ آج کے دور میں مخلص لوگ نعمت ہیں۔ رسالہ آپ کی شبانہ روز محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت، تندرستی اور ہمت عطا فرمائے اور ہمارا رسالہ یونہی دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتا رہے، (آمین)۔''

☆ اچھی بہن! پاکستان آ کر بھی ہمیں یاد رکھنا ہمارے لیے اعزاز ہے۔ اگر دورِ جدید کی سہولت موبائل سے بھی آپ استفادہ کر لیتیں تو اور اچھا لگتا، خوش رہیں۔

☆ لاہور سے ہماری بہت اچھی بہن اور لکھاری ساتھی حنا بشریٰ لکھتی ہیں۔'' کاشی بھیا پر اسرار نمبر 3 اپنی مثال آپ تھا۔ اداریہ میں منزہ سہام صاحبہ نے تو دلوں کو جھنجھوڑ ڈالا۔ دل بہت دکھی ہوا۔ احوال کا آغاز کاشی بھیا کی احساس میں ڈوبی باتوں سے ہوا۔ واقعی بھیا ہم عمر گزار دیتے ہیں مگر غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہنا نہیں سیکھتے۔ منزہ صاحبہ کی بڑی ہمشیرہ کی صحت یابی کے لیے دعا گو ہیں۔ شعبان کھوسہ کی والدہ کے لیے مغفرت کی بہت سی دعائیں اور اللہ لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، (آمین)۔ ممتاز احمد صاحب کے لیے صحت یابی اور زندگی کی ڈھیروں دعائیں، اللہ آپ پر اپنا کرم کرے۔ اس بار احوال کی رونق نے دل خوش کر دیا۔ یوں ہی احوال کی محفل سجی رہے اور کاشی بھیا کی محبت بھری باتیں سب پڑھنے اور لکھنے والوں کی یونہی حوصلہ افزائی کرتی رہیں۔ بے شک بھیا یہ حقیقت ہے کہ بہت سے ٹوٹے دل آپ کی محبت سے جڑتے ہیں۔ اس کا آپ کو بہت اجر بھی ملے گا۔ ندا فاضی کا'' والد کے جانے کے بعد'' بہت متاثر کن تھا۔ احمد سجاد بابر نے لیڈی ڈیانا کے بارے میں بہت اچھا لکھا۔'' لکڑی کی ملکہ'' اور'' درگاہ کا مجذوب'' واقعی بہت خاص تحریریں تھیں۔ ممتاز احمد صاحب کی'' رازداری شرط ہے'' بہت اچھی تھی۔ ارم ناز ہر بار کی طرح منفرد تحریر لائیں۔ وہ چیتل کا دیا، بے چین روح، گاؤں والا مندر بھی بہت ہولناک تحریریں تھیں۔'' ماہر'' بہت حیران کن رہی۔ بنت حوا نے زہر بھرا انتقام اور کنزہ ملک نے بلا میر المحسن پر بہت اچھا لکھا۔'' سحر رقص سیرے دانی'' واقعی پر اسرار تحریر تھی۔ خواب کے زخم، بچ گیا ایمان بس، غیبی امداد اور ناگن بھی اپنی اپنی جگہ بلاشبہ اچھی تحریریں تھیں۔ سب نے بہت اچھا لکھا۔ احوال میں مورش حسین، حنیف عاصم بلوچ، عبدالعزیز جی آر، ممتاز احمد، صائمہ بشیر، عظمیٰ شکور، فیصل ندیم بھٹی، رضوانہ کوثر کے خطوط بہت جاندار تھے۔ بہت اچھا لگا کہ اس بار سب کے

جب تک ہے جان

دل دل پاکستان

کہتا رہے گا

پورا جہان

بہت یاد آؤ گے

بہت رُلاؤ گے

الٰہی تیری چوکھٹ پر

ترے محبوب کے در پر

ترا بندہ یہ پہنچا ہے

PK661 ...... تُو بھی امر

سفر تمام ہوا

ستارہ آسماں کا ہوا

ہر دل کی آواز ...... جنید جمشید

اب ہم میں نہیں

خلوص و محبت بھرے تھے۔ تنقید و تحقیر کا پہلو کہیں نظر نہیں آیا۔ یہ کریڈٹ کاشی بھیا کو جاتا ہے۔ بھیا بے حد شکریہ۔ ''زہر عشق'' اس بار بھی زبردست رہی۔ ''ہائیڈ پارک'' بہت خوب تھا۔ رسالہ بہت زبردست رہا۔ نئے سال کی سب کو بہت مبارک باد۔''

☆ اچھی بہن! یقین کرو تمہارا مستقل تبصرہ ہمیں بہت کچھ کرنے کی ہمت دیتا ہے۔ اپنا بہت خیال رکھو۔ اسی ماہ ملاقات تو ہو ہی رہی ہے اپنے سب پیاروں کے ساتھ...... خوش رہو۔

☆☆ کراچی سے ہماری بہت پیاری بہن فرح انیس لکھتی ہیں۔ ''امید ہے سب خیریت سے ہوں گے۔ سچی کہانیاں کا پراسرار نمبر 3 موصول ہوا۔ احوال میں سب کے تبصرے پسند آئے۔ ممتاز احمد اب آپ کیسے ہیں۔ شکر ہے اللہ کا کہ آپ کی زندگی محفوظ رہی۔ اللہ سب کو اپنی امان میں رکھے۔ (آمین)۔ سردیاں اتنی نہیں ہوئیں مگر پراسرار نمبر پڑھ کر ایک سردی لہر ضرور دوڑ رہی تھی۔ خاص کہانیوں میں ''سہیلی'' نے جسم و جان میں سردی لہر دوڑا دی کہ جب لینڈ لائن نہیں تھا تو وہ بات کس سے کرتی تھیں۔ محمد بلال فیاض تسی چھا گئے ہو۔ ماشاء اللہ زبردست تحریر تھی۔ پڑھ کر صحیح کا ڈر لگا۔ مہتاب خان کی تحریر بھی بہت اچھی لگی۔ پراسرار گھر کی پراسراری سیر، ممتاز احمد اور ایڈیسن ادریس مسیح کی تحریریں بھی پسند آئیں۔ ''عشق زادہ'' میں ایک جن کے عشق نے شہر بانو کو کس قدر اذیت میں مبتلا کیا۔ ''ماہر'' کہانی نے بھی حیرتوں کے سمندر میں ڈال دیا۔ ناگ بیتیاں تینوں ہی بہت زبردست لگیں۔ ''زہر عشق'' بھی ماشاء اللہ زبردست چل رہا ہے۔ باقی تحریریں ابھی پڑھی نہیں ہیں۔ بہت شکریہ کاشی بھیا میری کہانی لگانے کا۔ زندگی نے وفا کی تو اگلے ماہ ملاقات ہوگی۔''

☆ پیاری فرح! تمہیں پرچہ پسند آیا، ہماری محنت وصول ہوگئی اور تم کیسے ڈر گئیں! اس بار تو تم نے بھی قارئین کو خوب ڈرایا تھا۔

☆☆ اسلام آباد سے ہماری نٹ کھٹ عظمیٰ شکور اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ ہمارے ساتھ ہیں، لکھتی ہیں۔ ''سرورق دیکھ کر اندازہ ہوگیا کہ رسالے میں کیسی کیسی چیزیں ہمارے انتظار میں ہیں کہ ہم پڑھیں اور لکھیں اپنی رائے۔ ایڈیٹر صاحب وہ دن دور نہیں جب میری پراسرار کہانی آپا رضیہ کی زبانی شائع ہوگی۔ قسم سے یہی ہونے والا ہے میرے ساتھ۔ اب تو اگلے دس دن تک یہ جنات روحیں میرا پیچھا نہیں چھوڑنے والی۔ ہاں ناں!! جانے آپ کیوں اتنے متاثر ہیں ان پراسرار کہانیوں سے۔ لوگ ڈر ڈر کر مر جائیں گے، ان پر ترس نہیں آتا آپ کو۔ احوال میں سب ساتھیوں سے ملاقات زبردست رہی۔ میرے ایک لندن بھائی ہیں وہاڑی سے انہیں میرا اسلام اور بہت سی دعائیں۔ سب سے مزے کی کہانی ''بڑی آپا'' ایڈیسن ادریس صاحب کی تحریر کردہ تھی۔ واقعی میں ان کا لکھا جن خوب تھا۔ پہلے تو میں خوفزدہ ہوگئی پھر جب پتا چلا کہ بڑی آپا ذہنی مریضہ تھیں تو ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ رضیہ مہدی کا لکھا سہیلی کچھ سمجھ نہ پائی کون تھی، تبسم کوئی روح یا کوئی اور مخلوق۔ معذرت کے ساتھ رضیہ جی! ''جوگی'' واہ جی انسان تو رہے ہی نہیں محبت کرنے کو اب جوگی ہی ڈھونڈیں جی۔ کیوں ارم ناز! ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں میں قسم سے۔ بہرحال جی! اسٹوری اچھی تھی جو لڑکیاں خوب صورت نہیں انہیں جوگی ہی مل جائے ورنہ کیسے جی پائیں گی۔ ''بے چین روح'' فرح انیس ایک تو آپ کی اسٹوری خوفناک اوپر سے اسٹوری پر لگی حسین تصویر۔ اسٹوری کو چار چاند لگا گئی۔ اب رات کو اگر کوئی گیٹ بجائے تو سمجھ جائیے کہ کوئی روح ہی تنگ کر رہی ہے۔ دسمبر کے اس مہینے میں پسینے نے ثابت کر دیا کہ آپ کامیاب رہیں۔ ڈراؤنی کہانی لکھنے میں ''محوِ رقص سرمے دانی'' جی سیدہ تبسم زہرہ رضوی بس اب تو باز آئے سرمہ لگانے سے کاجل ہی بیسٹ ہے۔ اچھی لگی اسٹوری، حنا بشریٰ آپ کی اسٹوری نے ثابت کیا کہ جناب اپنی محبت میں کتنے ثابت قدم ہوا کرتے ہیں۔ مجال ہے جو عبدالرحمن اپنی بات سے ہٹا ہو۔ واہ جی کمال اسٹوری تھی ''عشق زادہ'' بس جی اب پرستان ہی جانے کا قصد کیا جائے۔ ایک لمحے کو مجھے بہت ترس آیا بے چارے عبدالرحمن پر۔ مگر جن تو جن ہے اور ایڈیٹر صاحب ''ہائیڈ پارک'' میں، میں نہیں تھی۔ پھر آپ کہتے ہیں کہ میں کہاں بھولی۔ سب ہی تحریریں ہائیڈ پارک میں خوب تھیں۔ ''نیم کش'' میں اعیہ معین کا شعر زبردست تھا۔ سب لکھنے والوں، پڑھنے والوں اور رسالے کو بہترین بنانے والوں کو بہت ساری دعائیں۔''

عشق نمبر

عشق نمبر کی شاندار پذیرائی کے بعد نئے سال میں آپ کے لیے ایک اور تحفہ عشق نمبر 1 ماہِ فروری کا شمارہ عشق نمبر ہوگا۔ وہی عشق کی وارداتیں، عشق کی گھاتیں، عشق کی فتح اور عشق کی ناکامی سے جڑی وہ کہانیاں، جن سے ابنِ آدم اپنی زندگی میں ضرور گزرا ہوگا۔

جی ہاں! سچی کہانیاں کا ماہِ فروری کا شمارہ '**عشق نمبر**' ہوگا

پُراسرار کہانی نمبر

خوف اور دہشت میں لپٹی سچ بیانیاں، ارواحِ خبیثہ کا شاخسانہ بننے والوں کی کہانیاں، فراعنہ کی سرزمین سے 'اسرار بھرے راز عیاں کرتی خصوصی داستانِ حیرت' پوشیدہ دنیا سے بہت خاص طلسم کدے میں قید کرتی وہ کہانیاں جو آپ کبھی فراموش نہ کرسکیں گے۔

تو پھر دیر کس بات کی ہے......

ماہِ فروری میں 'عشق نمبر' اور ماہِ مارچ میں 'پُراسرار کہانی نمبر' کی کاپیاں آج ہی بک کرالیجیے۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

Email : pearlpublications@hotmail.com

سچی کہانیاں کا فروری 2017ء کا شمارہ عشق نمبر ہوگا

سچی کہانیاں کا مارچ 2017ء کا شمارہ پُراسرار نمبر ہوگا

🖋 اچھی عظمیٰ! تمہارا تبصرہ ہمیں بہت پسند ہے۔ اپنا خیال رکھنا اور کہانی جلد پڑھ کر رائے دیں گے۔

☆ خیر پور ناتھن شاہ، بورڑی شریف سے یہ آمد ہے ہماری بہت پیاری بہن تحسین جونیجو کی، لکھتی ہیں۔ ''بہت اچھے بھیا اور سچی کہانیوں کی خدمت میں سلام۔ نئے سال 2017ء کی آمد ہے۔ نئی امنگوں، نئی خواہشوں، نئی سوچوں کے سنگ سال نو تمام احباب کو بہت بہت مبارک۔ سچی پکی دعائیں آپ سب کے نام۔ 2016ء کا اختتام پرنور ماہ مقدس ربیع الاول کے ڈھلتے سورج کے سائے میں ہوا۔ یہ یقین ہے کہ پرامن 2017ء کے ٹھہرنے کی نوید بھی لائے گا، انشاء اللہ۔ 2016ء بہت زخم دے کر جارہا ہے۔ اتنے آنسوؤں کا سیلاب بہا کہ اب تک کی جتنی زندگی جی ہے تمام کسر نکال دی۔ ماہ اگست میں میری ہردلعزیز بچپن کی پیاری دوست رینا مجھ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی۔ وہ بھی صرف 21 برس کی عمر میں۔ ایسا غم ملا کہ اس کی یاد میں اب تک آنسو آنکھ میں ٹھہرے رہتے ہیں۔ اللہ پاک اس کے درجات بلند فرمائے۔ اس کے بچھڑنے کے بعد سے ہی میں نے احوال میں شرکت کرنا چھوڑ دی۔ بہت ممنون ہوں کاشی بھیا کی کہ ان کی پکار پر چلے آئے۔ ''ادب کی دنیا میں دوست کوئی نہیں ہوتا'' واہ مزہ آ گیا، کتنی سچی بات کہی بھیا نے۔ واقعی ہم کتنے بے وقوف ہیں تاکہ ہر کسی پر اندھا اعتماد کرتے ہیں لیکن اب آنکھیں کھل گئی ہیں۔ کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ ہر طرف دھوکا اور فریب ہے ہماری نظر کا۔ اصل میں جیسا انسان خود ہوتا ہے ویسا ہی دوسروں کو بھی مانتا ہے۔ 2017ء میں سمجھدار ہونے کی کوشش کریں گے۔ مور شاہد بھائی ہم خیریت سے ہیں۔ آپ کی دعائیں چاہیے ہیں، خوش رہیے۔ رضوانہ کوثر آپی کی آمد بھلی گی۔ سلامتی ہو۔ ''راستے کھو گئے ہیں'' بہت عمدہ کہا بھائی۔ ایوارڈ تقریب کے منتظر ہیں۔ تمام انتظامات خوش اسلوبی سے طے پا جائیں۔ بیسٹ آف لک کاشی بھیا۔ اب چلتی ہوں بھیا۔ شمارہ چونکہ 10 دسمبر کو ملا تو بھلا کس طرح تبصرہ کر پاتی۔ 11 دسمبر کو اتوار اور 12 کو ربیع الاول کی بھی چھٹی ہے۔ سو اس لیے آج ہی شمارہ ملنے کے ساتھ۔ احوال پڑھ کر تبصرہ کر رہی ہوں تاکہ نئے سال کی آمد پر میری حاضری لگ جائے اور ساتھیوں کو میرے زندہ ہونے کی خبر بھی ہوجائے۔ یقیناً میرا تبصرہ آپ تک 13 دسمبر کو پہنچ جائے گا۔ ہاں حسب روایت اس بار بھی سچی کہانیاں پراسرار نمبر 3 کا ٹائٹل شاہکار تھا۔ اجازت۔ منزہ آپی کے اداریے ''فیصلہ بدل دے'' پر آمین کہا۔ امید ہے ماہ جنوری کا شمارہ شاید ہمیں وقت پر موصول ہوجائے تاکہ پرچے پر تفصیلی تبصرہ کیا جاسکے۔''

🖋 پیاری گڑیا! تمہارا خاموش احتجاج ہمیں دکھی کرگیا۔ کوشش ہے کہ آنے والے نئے برس آپ سب کو پرچہ بروقت موصول ہوجائے۔ تبصرے کا شکریہ، اوی زرینہ کو سلام کہنا۔

☆ محمد قاسم خان بلوچ، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ چک 184 گ ب سے بڑے دنوں بعد ہمارے احوالی بن رہے ہیں، لکھتے ہیں۔ ''دسمبر کا خوب صورت پراسرار نمبر 3 کچھ لیٹ ملا۔ لیکن ذرا بھی افسوس نہیں ہوا۔ دیر سویر تو ہوتی رہتی ہے۔ بہرحال پراسرار نمبر کا ٹائٹل بہت زبردست رہا۔ احوال بھی اس بار ٹائٹل کی طرح بہت زبردست تھا۔ احوال کے شروع میں جو باتیں سچی کہانیاں کے پڑھنے والوں اور لکھاریوں کے بارے میں کاشی بھیا نے لکھیں وہ ایک آئینے کی طرح تھیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس آئینے میں دیکھ کر کون عمل کرتا ہے اور سمجھتا ہے کیونکہ کچھ لوگ سچی کہانیاں کی اس خوب صورت محفل میں بگاڑ پیدا کر رہے ہیں۔ سید ملازم حسین شیرازی، مور حسین شاہد کے تفصیلی تبصرے پسند آئے۔ نئے قلمی ساتھی اور بہترین قلم کار حنیف عاصم خان بلوچ کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ حنیف عاصم کے لفظوں میں کمال کا ہنر اور باتوں کا انداز بہت اچھا تھا۔ ثمینہ طاہر بٹ، پیاری آنٹی نفیسہ فضل، فیصل ندیم بھٹی، نسیم سحر، بہن حنا بشریٰ، پیارے ممتاز، بہن صائمہ بشیر، عظمیٰ شکور اور رضوانہ کوثر ان سب لوگوں کے تبصرے بھی کمال کے تھے۔ سب لوگوں کو ایوارڈ تقریب کا بڑی شدت سے انتظار ہے لیکن ہر نئے آنے والے پرچے میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ ایوارڈ تقریب اور تاریخ کا اعلان اگلے ماہ کردیا جائے گا۔ ''راستے کھو گئے'' کاشی بھیا کی نظم بہت پسند آئی۔ کہانیاں کچھ مختصر تھیں مگر کمال تھیں۔ ''محو رقص سرمہ دانی'' سیدہ تبسم زہرہ رضوی، بچ گیا ایمان بس، جنوں والا بنگلہ، لکڑی کی ملکہ، ایک راز، عشق زادہ، خونی خزانہ، وہ چڑیل کا دیا، گاؤں والا مندر، ناگن، اکتالیسویں رات، لوہاری گیٹ کا وہ مکان، پیاس ادھوری ہے، اس کے بعد کچھ نئے لکھاریوں کی کہانیاں

نئے سال میں ...... ہم اور آپ ...... ہم قدم

آپ کا اپنا سچی کہانیاں نئے سال میں آپ کے لیے...... اُن نئے سلسلوں کا آغاز کر رہا ہے' جو یقیناً آپ کے لیے، بہت کارگر ثابت ہو سکتے ہیں۔ صرف آپ کے لیے......

ایک سیلفی ہو جائے:

قارئین کی خوشیوں سے جڑا وہ سلسلہ جس میں آپ اپنی خوشیوں بھرے دن کی ایک یادگار تصویر بھیج سکتے ہیں۔ اُس تصویر کو ہم سچی کہانیاں کی زینت بنا دیں گے۔ جلدی کریں اور ہمیں بھیج دیں اپنا ایک یادگار پل۔

سپر ریڈر ایوارڈ:

نئے سال 2017ء میں سب سے زیادہ سالانہ خریدار بننے یا بنانے والے قاری یا لکھاری کے لیے ایوارڈ تقریب میں...... سپر ریڈر ایوارڈ کا اعلان کیا جائے گا (تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ سوچنا چھوڑیں اور سالانہ خریدار بن جائیں)

I Am The Best

نوجوانوں کے لیے بہترین موقع...... اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ سلور اسکرین کے لیے پرفیکٹ ہیں۔ اداکاری آپ کے خون میں شامل ہے تو فوری طور پر اپنی چار مختلف پوز میں تصاویر ہمیں بھیج دیجیے۔ ہم آپ کے اور سلور اسکرین کے درمیان پل کا کام کریں گے۔

پڑھنے کو ملیں۔ کہانیاں اچھی تھیں۔ میں ان کو سچی کہانیاں میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ ہائیڈ پارک میں کارنامہ اور عدل، سنہری باتیں، ایسا بھی ہوتا ہے، سید جمال الدین افغانی، عامر بشیر کے انتخابات بہت پسند آئے۔ ''تیر نیم کش'' میں عاصم خان نیازی، خضر حیات، منشی محمد عزیز مئے کے اشعار بہت پسند آئے۔ آخر میں ان لوگوں سے کچھ کہنا ہے جو حسد کرتے ہیں۔ الزام تراشیاں کرتے ہیں دوسروں پر۔ اور اپنے آپ کو دوسروں کی نظر میں بہت سمجھدار ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ خود احمق ہوتے ہیں۔ بس اتنی گزارش ہے کہ اپنا کام کریں اور الزام تراشیاں چھوڑ دیں۔ ممتاز بھائی کے حادثے کا سن کر دلی افسوس ہوا۔ ان کی صحت کے لیے دل سے دعا گو ہوں۔''

☜ اچھے قاسم! تم نے بڑے دن بعد ہمیں یاد کیا۔ تمہارے گلے شکوے سر آنکھوں پر مگر بھائی ڈاک نہ ملنا ہمارا قصور کہاں؟ ہم تو ہر ممکن طریقے سے کوشش کرتے ہیں کہ جتنی سہولت اپنے قاری اور لکھاری کو دے سکیں دیں مگر...... ہزاروں خواہشیں ایسی...... ڈاک خانے والے کہاں کسی کی سنتے ہیں۔

☆ رحیم یار خان سے ہمارے احوالی بن رہے ہیں سنی سانگی۔ لکھتے ہیں۔ ''اس امید کے ساتھ حاضر ہوا ہوں کہ محفل محبت میں ایک بار پھر جگہ عنایت فرمائیں گے۔ آخر سال گزر گیا، مالک دو جہاں سے دعا ہے کہ آپ کا اور میرا آنے والا سال میں ساتھ یوں ہی برقرار رہے۔ اب شمارے کی کیا تعریف کروں یہ تو ہمیشہ کی طرح اپنی مثال آپ ہی رہا۔ پراسرار نمبر 3 دراصل میری خواہش نمبر 3 ہے۔ کاشی بھیا آپ کا بھی کوئی ثانی نہیں بھیا جی آپ کی کہانی ''زہر عشق'' کمال کی ہے۔ جوگی، ناگن، ایک راز، ماہر اور عشق زادہ بہت عمدہ تحریریں تھیں۔ ''تیر نیم کش'' کے تمام اشعار خوب تھے۔ گاؤں والا مندر، بہن نزہت جبیں، ضیاء کی کہانی میرے دل کو لگی اور آخر میں ''راستے کھو گئے ہیں'' اب اگر آپ سچ پوچھو تو بھیا جی میں نے راستہ پالیا ہے۔ بھیا جی آپ کی محبتوں کا میں آج بھی ممنون ہوں۔ اگلے ماہ تک کے لیے اجازت۔''

☜ پیاری سنی! خوش رہو خدا تمہیں مسکراتا رکھے۔ تبصرہ تمہارا بہت اچھا لگا۔

☆ مراد خان کوٹ رادھا کشن سے عرض کرتے ہیں۔ ''سلام محبت کاشی بھائی جگ جگ جیو ہزاروں سال کاشی بھائی بہت مدت بعد آج پھر آپ کی محفل میں حاضر ہوا ہوں۔ امید ہے سب لوگوں کے مزاج اچھے ہوں گے۔ سچی کہانیاں تو ہمیشہ میرے ساتھ ہوتا ہے، میں جہاں بھی جاتا ہوں، جب بھی کام سے ٹائم ملتا ہے تو میں سچی کہانیاں پڑھتا ہوں۔ دسمبر کا شمارہ پراسرار نمبر بہت زبردست تھا۔ کہانیوں کی بات کریں تو میرا خیال ہے سب کہانیاں اچھی تھیں لیکن کچھ کہانیاں زیادہ پسند آئیں۔ لوہاری گیٹ کا وہ مکان، راز داری شرط ہے، سہیلی، بچ گیا ایمان بس، جوگی، مجو رقص سرے والی، عشق زادہ، ماہر، ناگن، پیاس ادھوری ہے، درگاہ کا مجذوب اور لکڑی کی ملکہ، فریب نظر۔ کاشی بھائی یہ کہانیاں اس شمارے میں بہترین کہانیاں تھیں۔ ان لوگوں نے خوب محنت کی اور ان کو ان کی محنت کا پھل مل گیا۔ آئندہ پراسرار نمبر میں ان لوگوں کو خصوصی طور پر شامل کیا جائے۔ خضر حیات کی نظم اچھی تھی۔ ''تیر نیم کش'' میں منشی محمد عزیز مئے، محمد قاسم خان بلوچ، محمد وسیم کے شعر پسند آئے۔ کاشی بھائی آپ کی محنت خوب رنگ بکھیر رہی ہے۔ امید کرتا ہوں اگلے پراسرار نمبر اس سے بھی بڑھ کر اچھا ہوگا۔''

☜ پیارے مراد! تمہاری محبتوں کے مقروض ہیں بھائی۔ کیا تم ہر ماہ اپنا قرض ادا کرنا نہیں چاہتے؟

☆ بھائی ایم وارث بیگ ٹوبہ ٹیک سنگھ، چک 190 گ ب سے زمانوں بعد ہمارے ساتھ ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ''سچی کہانیاں کا نیا شمارہ اپنے دلکش ٹائٹل کے ساتھ دل کو چھو گیا۔ تمام کہانیاں لاجواب تھیں سب سے پہلے اپنی غیر حاضری کی وجہ بتا دوں۔ دراصل میں ایک فوجی بندہ ہوں (نیا نیا) چھ ماہ سے کوئٹہ میں EME کی ٹریننگ پر تھا۔ سو ہر شے سے رابطہ کٹ سا گیا تھا۔ سچی کہانیاں کی یاد تو آتی تھی مگر فرض کے ہاتھوں مجبور تھا۔ آج خدا نے اس قابل کر دیا ہے کہ میں ملک عزیز کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ میں ملک کی سلامتی کے لیے اپنی جان قربان کرنے کے لیے ٹرین ہو گیا ہوں۔ بھائی قاسم خان بلوچ میرے دوست ہیں۔ بڑے دن ہوئے ان کی کوئی کہانی نہیں پڑھی۔ اگر چھ ماہ کے دوران کوئی

خواتین کی محبوب قلم کار

'رفعت سراج' کا تازہ ترین شاہکار 'دامِ دل'

رفعت سراج کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں جو قارئین کی دھڑکنیں بے ترتیب کر رہی ہیں

"دامِ دل" ...... دوشیزہ ڈائجسٹ میں مقبولیت کی بلندیوں پر

"دامِ دل" ...... کہانی ہے محبت کرنے والے ایک جوڑے کی ...... اور جب محبت کرنے والے سماج کی آنکھوں میں کھٹکنے لگ جائیں تو ......

"دامِ دل" ...... کہانی ہے اُس ماں کی ...... جسے بیٹیوں کی پیدائش پر سسرالی رویوں نے سولی چڑھا دیا

"دامِ دل" ...... کہانی ہے محبت کی دنیا میں آگ لگانے والے کریہہ چہروں سے نقاب اُتارنے والوں کی

"دامِ دل" ...... کہانی ہے معاشرے کے ان لالچی کرداروں کی ...... جن کی ہوس نے محبت کی زمین کو اجاڑ ڈالا

تو پھر پڑھنا نہ بھولیے گا۔

رفعت سراج کا شاہکار ناول "دامِ دل"

آپ کے اپنے ماہنامہ "دوشیزہ" ڈائجسٹ میں ہر ماہ شائع ہو رہا ہے

کہانی شائع ہوئی ہو تو پلیز بھائی قاسم مجھے پہنچا دو۔ (اگست 2016ء میں "بس ذرا سی چھاؤں لی تھی" شائع ہوئی تھی) باقی اس ماہ تمام کہانیوں کے لکھنے والوں کو بہترین کہانیوں پر مبارک دیتا ہوں۔ "تیر نیم کش" کے تمام شعر مجھے پسند آئے۔ بابا جی مسئلے حل کر کے بہت بڑا ثواب کما رہے ہیں۔ خدا ان کو حیاتی دے۔ باقی آپ سب سے گزارش ہے کہ دعا کریں خدا مجھے میرے وطن پر جان نثار کرنے کی ہمت دے۔ نیا سال آپ سب کو مبارک ہو۔"

☜ اچھے سے فوجی بھائی! خدا تمہیں عزت، صحت اور جذبہ ایمانی میں استحکام نصیب کرے۔ تبصرہ کر کے تم نے ہمارا دل جیت لیا۔ خوش رہو، ہماری بھی یہی دعا ہے کہ کامیابی تمہارے قدم چومے، (آمین)۔

☆ کرن ناز تحصیل سمندری، خانیوال سے بڑے دنوں بعد احوال میں حاضر ہیں۔ لکھتی ہیں۔ "کاشی بھائی! بڑے دنوں بعد احوال میں حاضر ہوں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ شاید پہلی بار آپ سب سے مل رہی ہوں۔ بھیا یقین جانیں چاہ کر بھی تبصرہ نہ کر سکی۔ کچھ مصروفیات اس قدر تھیں کہ بس! دسمبر کا شمارہ بہت اچھا نکالا آپ نے۔ حنا بشریٰ کی کہانیاں بہت زبردست ہوتی ہیں۔ مجھے ان کی کہانیوں کا انتظار رہتا ہے۔ ممتاز احمد، جاوید راہی، ارم ناز، محمد بلال فیاض، مہتاب خان، صداقت حسین ساجد، ملک این اے کاوش، فرح انیس، سیدہ تجسم زہرا، سید وجاہت علی، احمد سجاد بابر، شاہدہ ذاکر، جواد احمد، افتخار چوہدری اور رضیہ مہدی کی کہانیاں سپر رہیں۔ احوال میں سید ملازم حسین شیرازی، مورشاہد حسین، محمد عاصم خان بلوچ، ثمینہ طاہر بٹ، نفیسہ فضل، عبدالعزیز جی آ، فیصل ندیم بھٹی، منشی محمد عزیز میمن، نعمان احمد آرائیں، نسیم سحر، حنا بشریٰ، نیر شفقت، صائمہ شبیر، ممتاز احمد، فرزانہ گل، تنزیلہ تانی، غزالہ کرن اور عظمیٰ شکور کے تبصرے جاندار اور شاندار تھے۔ مزہ آگیا۔ آپ کی نظم راستے کھو گئے...... واہ بھیا کمال کر دیا، جلدی سے آپ اپنی نظموں کی بک لے آئیں۔ (نئے سال میں آپ سب کے لیے ویلنٹائن کا تحفہ ہوگی) ہائیڈ پارک، تیر نیم کش بھی اچھے لگے جب کہ ناول اے ون جا رہے ہیں۔ محمود شام کا سفرنامہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ بہت اچھا تھا سفرنامہ۔ منزہ جی کے اداریے بھی اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔"

☜ پیاری کرن! گڑیا تم اتنے دنوں بعد آئی ہو، وجہ نہیں پوچھنا مجھے مگر اتنا ضرور کہنا ہے کہ اتنے دن بعد تو دنیا ادھر سے ادھر ہو جایا کرتی ہے۔ محبتیں فقط انتہائیں مانگتی ہیں۔ اگلے ماہ انتظار رہے گا۔

☆ ڈرائیور اسد علی خان خانیوال سے پہلی بار احوال میں بریک لگا رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ "السلام علیکم! میں سچی کہانیاں میں پہلی بار آپ سے مخاطب ہوں۔ جناب ڈرائیور بندہ ہوں۔ پڑھنے لکھنے کا شوق رکھتا ہوں۔ سچی کہانیاں گزشتہ دس بارہ سال سے پڑھ رہا ہوں۔ سچ مچ سچی کہانیاں میں بڑی ترقیاں ہوئی ہیں (ارے......) اب تو جی پرچہ منہ سے بولتا ہے کہ مجھے پڑھو۔ دسمبر کے شمارے میں ٹائٹل بڑا اچھا لگایا آپ نے۔ لیڈی ڈیانا میری فیورٹ تھیں۔ آپ نے ان کے بارے میں لکھ کر دل خوش کر دیا جی۔ ممتاز احمد کی کہانیاں میں بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ بھائی جاوید راہی اور احمد سجاد بابر بھی کمال لکھاری ہیں جی۔ ایم اے راحت صاحب کا ناول مجھے بہت پسند ہے۔ کاشی چوہان کا ناول "زہر عشق" کے تو جی کیا ہی کہنا۔ پڑھ کر مزہ آجاتا ہے۔ آگے اللہ مالک ہے۔ پتا نہیں صنوبر بی بی کا کیا بنے گا۔ راز داری شرط ہے۔ وہ چیتل کا دیا، ایک راز، درگاہ کا مجذوب، لکڑی کی ملکہ، جوگی، بچ گیا ایمان بس، ماہر، ناگن، بلا میر الحسن وغیرہ بہت اچھی لگیں۔ تمام لکھاری دوستو! کو نیا سال مبارک۔ اچھا جی رب راکھا۔ اللہ نے چاہا تو اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔"

☜ پیارے بھائی ڈرائیور اسد! خوش آمدید! امید ہے اب ہر ماہ آپ کی بریک ہمارے احوال میں لگے گی۔ خیر آپ کی آمد نے خوشی دی یہ تو سچ ہے اور امید قوی ہے کہ ہر ماہ آپ سے ملاقات ہوگی۔

☆ سرگودھا سے یہ آمد ہے ہمارے بہت پیارے لکھاری ساتھی ممتاز احمد کی۔ لکھتے ہیں۔ "کاشی بھائی اس بار ذرا گھر میں کچھ کنسٹرکشن کا کام جاری رہا اور پھر میرا ایکسیڈنٹ...... لہٰذا ان پے در پے مشکلات نے مجھے سچی کہانیاں سے غافل تو نہیں کیا البتہ تھوڑا لیٹ ضرور کر دیا۔ اس ماہ میرے چچا صاحب کا انتقال بھی ہو گیا۔ چونکہ چچا بھتیجا کا رشتہ بڑا قریبی اور دوستانہ ہوتا ہے اس

زرد لومڑی

قارئین! بھائی ایم اے راحت ان دنوں صاحب فراش ہیں۔ 'زرد لومڑی' کی اقساط موصول نہ ہو پانے کی صورت میں زیر اشاعت ناول آپ نہیں پڑھ پائیں گے۔ جیسے ہی راحت بھائی کی طبیعت میں بہتری آئی آپ پھر سے 'زرد لومڑی' پڑھ پائیں گے۔

لیے میں نے چچا جان کے بے وقت انتقال کے بعد خود کو بے حد تنہا محسوس کیا، خدا ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ درجات عطا کرے (آمین)۔ لیجیے اپنی باتوں میں بھول گیا کہ تبصرہ لکھنے بیٹھا تھا۔ سرورق حسب روایت انتہائی شاندار رہا اور اسے دیکھ کر آپ لوگوں کے ذوق کی داد دیے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ اداریہ میں بہن منزہ سہام نے ہزیمہ نصیر کے دکھ کو صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا۔ جسے پڑھ کر آنکھیں نم ہوگئیں۔ احوال میں کاشی بھائی آپ نے جو باتیں لکھی ہیں اگر کوئی بھی ایک بار ان پر عمل کرنے تو یقیناً اس کی زندگی سنور جائے گی۔ یہ میرا دعویٰ ہے۔ سال 2016ء اپنی اچھی بری یادیں دے کر گزر گیا۔ نئے سال 2017ء کو خوش آمدید کہتے ہوئے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ سب اپنے دلوں سے رنجشیں بھلا کر بس محبتیں بانٹیں اور 2017ء کو محبتوں کا سال بنا دیں۔ پیارے دوستو! آپ کی دعاؤں سے میری پہلی کتاب جس میں سچی کہانیاں کے سلسلے پلیٹ فارم میں شائع ہونے والی کہانیاں شامل ہیں۔ پلیٹ فارم کے نام سے مارکیٹ میں آگئی ہے (بہت مبارک باد بھائی) آپ کی دعائیں درکار ہیں۔ اس مرتبہ تو پرچہ کمال تھا مگر اتنا لیٹ کیوں مارکیٹ میں آیا۔ احوال میں تمام احوالیوں کو نیا سال مبارک۔ ''راستے کھو گئے'' نظم کمال تھی احوال کے اختتام پر۔ ''لائف بوائے اسٹوری'' اسماء اعوان نے ہمیشہ کی طرح بہترین لکھی۔ لیڈی ڈیانا پر اتنا خوب صورت مضمون، دلکش تصاویر کے ساتھ اس نے یادگار کی حیثیت حاصل کرلی۔ احمد سجاد بابر کے قلم نے کمال کردیا۔ مزید کمال آخری کہانی ''درگاہ کا مجذوب'' نے کیا۔ واہ احمد جیو۔ حنا بشریٰ بہن کی ''عشق زادہ'' ہمیشہ کی طرح شاہکار تھی جب کہ ارم ناز کا ''جوگی'' بھی بہترین لگا۔ محمد بلال فیاض کی ''لوہاری گیٹ'' کا وہ مکان افتخار چوہدری کا ''بچ گیا ایمان بس'' اور سید وجاہت علی کا ''ماہر'' بھی مہارت کی منہ بولتی تصاویر تھیں۔ بہن رضیہ مہدی کی ''سہیلی'' نے روح کو جھنجھوڑ دیا۔ ایڈیسن اور لیس مسیح کی ''بڑی آپا'' اور بہن سیدہ تبسم زہرا کی ''محوِ رقص سرے والی'' نے بھی گھما کر رکھ دیا۔ ''چیتل کا دیا'' لے کر بے چین روح، خونی خزانے کے ساتھ ''زرد لومڑی'' تک پہنچی اور پھر گاؤں والے مندر سے ایک راز نے خواب کے زخم دکھائے۔ محسن بلّے نے غیبی امداد کی اکتالیس راتیں پوری کرکے ناگن سے زہر بھرا انتقام لے لیا مگر ابھی پیاس ادھوری ہی تھی کہ جنوں والا مکان، لکڑی کی ملکہ کے سحر میں قید کر گیا اور ہمیں ''زہر عشق'' پی کر ''ہائیڈ پارک'' میں مکتی ملی اور یوں ایک شاہکار شمارے پر بساط بھر کوشش کے بعد تبصرہ مکمل کرلیا ہے۔ امید ہے تھوڑا سا مختلف انداز آپ سب کو بھی پسند آئے گا۔ انشاء اللہ نئے برس میں ہم سب پہلے سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی پہلی تقریب میں اکٹھے ہوں گے۔ اللہ سب کو اپنی امان میں رکھے۔ عبدالغفار عابد کو شادی کی بہت مبارک باد اور ان کے ماموں کی وفات پر دلی افسوس ہے۔ بہن رعنا قیصر کی صحت یابی کے لیے بھی دعاگو ہوں۔ ساتھ ہی بھائی ایم اے راحت صاحب کی صحت کے لیے بھی ہاتھ بلند ہیں۔ بھائی کاوش صدیقی کو خانقاہ کے آغاز پر پیشگی مبارک باد۔ اگلے ماہ ملاقات ہوگی۔ تب تک کے لیے خدا حافظ۔''

☜ پیارے بھائی ممتاز احمد! کتاب کی مبارک باد قبول فرمائیں تبصرہ ہمیشہ کی طرح بہترین کیا آپ نے۔ آپ کی صحت کے لیے بھی ہم سب دعاگو ہیں۔

☆ غزالہ کرن کی گلفشاں کالونی جھنگ روڈ سے آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ ''ماہ دسمبر 2016ء کا آخری شمارہ موصول ہوا جو کہ پراسرار نمبر 3 تھا۔ احوال میں محفل خوب سجی تھی۔ سب سے پہلے بات کروں گی انکل عبدالعزیز جی آ صاحب کے خط کی جن کو احوالیوں کی محبت پھر سے کھینچ لائی آپ کی آمد بہت اچھی لگی اب ہر ماہ آپ نے آتے رہنا ہے۔ آپ نے میرے خط کو دل آویز خط لکھا تو دل بہت خوش ہوا۔ کاشی آپ نے احوال کے آغاز میں جن خوب صورت باتوں کے موتی پروئے ہیں

یقین کریں ایسے لگا جیسے میرے دل کی باتوں کو آپ نے زبان دے دی ہے۔ کاش لوگ اپنے کام سے کام رکھیں۔ محنت کریں دوسروں کی راہ میں روڑے نہ اٹکائیں۔ اب بات ہو جائے کہانیوں کی۔ ''لائف بوائے'' کمرشل کہانی بہت خوب رہی۔ احمد سجاد بابر کی تحقیق، خواب، گلاب اور خوشبو، ڈیانا دل میں گھر کر گئی۔ لیڈی ڈیانا کی زندگی کے متعلق مکمل آگاہی حاصل ہوئی۔ پہلی پراسرار کہانی ''رازداری شرط ہے'' پراسرار نصیحت آموز اور ایمانداری، حصول رزق حلال کا درس دیتی شاندار کہانی تھی۔ بڑی آپا کا انجام چونکا دینے والا تھا۔ عاملہ نے آپا پر عاشق جن کا پول کھول دیا۔ ''بچ گیا ایمان'' بہت زبردست کہانی تھی۔ کیلی، جوگی، لوہاری گیٹ کو وہ مکان، وہ چیتل کا دیا، بے چین روح، محو رقص سرے دانی، خونی خزانہ، عشق زادہ اور ایک راز بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ کاشی جی اب ایوارڈ تقریب کی تاریخ اور مقام کا اعلان کر ہی دیں بس اب اور انتظار نہیں ہوتا۔ میں تقریب میں ضرور آؤں گی اگر آپ نے بلایا تو......! گو کہ مجھے تو کوئی ایوارڈ نہیں ملے گا مگر دیگر لکھاری بہن بھائیوں کو ایوارڈ وصول کرتے دیکھ کر دل خوش ہوگا۔ اب اجازت چاہتی ہوں۔''

☜ پیاری غزالہ! تم جم جم آؤ ایوارڈ تقریب میں۔ یہ تقریب تو ہے ہی تم سب کی۔ تبصرہ اچھا لگا تمہارا۔

☆ تنزیلہ عرف تانی منڈی بہاؤ الدین سے شامل احوال ہیں۔ ''سب سے پہلے سچی کہانیاں ادارہ، تمام لکھاریوں اور قارئین کرام کو میری طرف سے نئے سال کی بہت بہت مبارک ہو۔ دعا کرتی ہوں کہ نیا سال سب کے لیے ڈھیروں خوشیوں کا پیغام لے کر آئے، (آمین)۔ دسمبر کا شمارہ چھ تاریخ کو ملا۔ اس بار پراسرار نمبر تھا۔ ٹائٹل بہت دلکش اور جاذب نظر تھا۔ بہت پسند آیا۔ احوال میں رنگ برنگے خط جگمگا رہے تھے۔ پیاری ثمینہ طاہر بٹ آپ کی پر خلوص دعاؤں کا بہت شکریہ۔ رضوانہ کوثر صاحبہ کا خط دیکھ کر دل شاد ہو گیا۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے، (آمین)۔ غزالہ کرن کیسی ہو؟ فیصل ندیم بھٹی صاحب آپ ہمارے شہر منڈی بہاؤ الدین سے گزر کر کدھر گئے تھے؟ فرزانہ گل جی کیا حال ہیں؟ آپا بشریٰ کنول سلام قبول فرمائیں۔ ممتاز احمد صاحب روڈ ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں زخمی ہوئے اور ہیر کی ہڈی تڑوا بیٹھے پڑھ کر افسوس ہوا اللہ جلد صحت یاب کرے، (آمین)۔ لائف بوائے، ہر مہم میں ساتھ نبھائے بہت عمدہ کہانی تھی۔ احمد سجاد بابر نے ''خواب، گلاب اور خوشبو'' کے موضوع سے لیڈی ڈیانا کے حالات زندگی بہترین لکھے۔ ''رازداری شرط ہے'' بہت لاجواب کہانی تھی۔ ممتاز احمد نے اچھا درس دیا۔ انسان اگر رزق حلال کمانے کا تہیہ کرلے تو اللہ کی طرف سے غیبی مدد ملتی ہے اور بندہ دنگ رہ جاتا ہے۔ افتخار چوہدری کی کہانی ''بچ گیا ایمان'' پڑھ کر دل دہل گیا۔ بلاشبہ کہانی بہت بہترین تھی۔ اس بار ارم ناز کی کہانی ''جوگی'' نے وہ مزہ نہیں دیا۔ جو پہلے کہانیوں میں ہوتا ہے۔ لوہاری گیٹ کا وہ مکان، وہ چیتل کا دیا، بے چین روح، خونی خزانہ، عشق زادہ، ایک راز، خواب کے زخم، لکڑی کی ملکہ اور درگاہ کا مجذوب بہت اچھی کہانیاں تھیں اب اگلے ملاقات ہوگی، تب تک کے لیے اجازت۔''

☜ اچھی تنزیلہ! تبصرہ بہت اچھا کیا تم نے۔ باقی اب تمام باتیں تقریب میں ہوں گی۔

☆ بشریٰ کنول فیصل آباد سے لکھتی ہیں۔ ''امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ دسمبر کا پراسرار نمبر 3 کا ٹائٹل بہت خوب صورت اور دلکش تھا۔ پراسراریت کے حوالے سے ٹائٹل کا انتخاب بہت خوب تھا۔ احوال میں کافی رونق لگی تھی۔ آپ کا بہت شکریہ آپ نے میرا تبصرہ پسند کیا۔ سب احوالیوں نے بہت اچھے اچھے تبصرے لکھے۔ کاشی بھائی آپ نے احوال میں بہت اچھا پیغام دیا، اب اللہ کرے لوگوں پر آپ کی باتیں اثر کر جائیں اور وہ سدھر جائیں۔ احوال میں کچھ نئے احوالیوں کے نام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ایک مدت کے بعد عبدالعزیز جی آ اور منشی محمد عزیز مئے کی آمد بہت بھلی لگی۔ اب آپ کی غیر حاضری نہیں ہونی چاہیے۔ اب تک صرف چند ایک کہانیاں ہی پڑھ سکی ہوں جو کہانیاں اچھی لگیں ان میں لیڈی ڈیانا، رازداری شرط ہے، بڑی آپا، بچ گیا ایمان، جوگی، ایک راز اور ناگن شامل ہیں۔ مصنفین نے اچھا لکھا۔ مجموعی طور پر شمارہ بہت شاندار رہا۔ تمام کہانیوں کا انتخاب اچھا تھا۔ تمام قارئین کرام کو میری طرف سے نیا سال 2017ء مبارک ہو۔''

☜ بشریٰ جی! آپ کو بھی نیا سال مبارک ہو اور تبصرہ آپ کا بہت اچھا تھا۔

فروری 2017ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کررہا/کررہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام: ________________

مکمل پتا: ________________



فروری 2017ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی: ________________ تعداد صفحات: ________________

نام: ________________

مکمل پتا: ________________

____

فون/ سیل نمبر: ________________



فروری 2017ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: ________________ مصنف: ________________

دوم، عنوان: ________________ مصنف: ________________

سوم، عنوان: ________________ مصنف: ________________

نام: ________________ شہر: ________________

سانحہ ارتحال

ہماری بہت عزیز لکھاری ساتھی دلشاد نسیم کے ماموں محمد خالد مسعود گزشتہ ماہ وفات پا گئے۔ ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں ان کے ساتھ ہے اور اہل خانہ کے لیے صبر کی دعا کرتا ہے۔

☆ کراچی سے ہماری بہت پیاری لکھاری اور بہن نازیہ بتول رضا اپنی محبتیں لیے حاضر ہیں، لکھتی ہیں۔ ''کافی عرصے بعد حاضری لگا رہی ہوں جس کے لیے معذرت امید ہے آپ سب نے مجھے یاد رکھا ہوگا۔ عشق نمبر بہترین رہا۔ کہانیوں میں ''ایک تھی زینو'' بہترین تھی اور ویسے بھی اقبال بانو میری فیورٹ لکھاری ہیں جو لکھتی ہیں بہترین لکھتی ہیں اس کے علاوہ ایڈیسن اور لیس مسیح کی تحریر ''بے غیرت کہیں کی'' انفرادیت برقرار رکھے ہوئے تھی۔ بے شک ایڈیسن مسیح کی ہر تحریر قاری کو جکڑ لیتی ہے ویلڈن بھائی! اس کے علاوہ ''عشق کی بارگاہ میں'' اور ''عشق کی شاخ کا الو'' نے متاثر کیا۔ باقی لکھاریوں نے بھی اچھا لکھا۔ اب آتے ہیں پراسرار نمبر کی طرف۔ جی ہاں پراسرار نمبر بھی ہمیشہ کی طرح بہترین رہا۔ کاشی آپ کی کافی محنت ہے جو نظر آ رہی ہے۔ آپ کا ''زہر عشق'' ہر بار سنسنی لیے ہوتا ہے، مزا آتا ہے پڑھنے میں اور میری بیٹی سیدہ فاطمہ رضا تو دیوانی ہے آپ کے ناول زہر عشق کی۔ رسالہ آتے ہی پڑھنے بیٹھ جاتی ہے۔ کہانیوں میں راز داری شرط ہے، بچ گیا ایمان بس اور درگاہ کا مجذوب اچھی لگیں۔ باقی رسالہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ کاشی بھائی آپ سے ایک شکوہ ہے کہ آپ میری کہانیاں شاید بہت نیچے دبا دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا نمبر بہت دیر میں آتا ہے۔ آپ سب پڑھنے والے اپنا بہت خیال رکھیے گا، اللہ سب کا حافظ و ناصر ہو، (آمین)۔''

✍ پیاری بہن! آپ کا شکوہ گلہ سر آنکھوں پر مگر اب آپ کو تو قطعاً شکایت نہ ہوگی، وعدہ!

☆ احسن ابرار رضوی ساہیوال سے عرض کرتے ہیں۔ سچی کہانیاں ماہ دسمبر 2016 چار دسمبر کو ملا، سرورق پُراسراریت بھرا تھا جو پُراسرار نمبر 3 کی نوید دے رہا تھا۔ اداریہ بھی سبق آموز تھا۔ احوال کی محفل میں کاشی بھائی معاشرے کی کارستانیاں پیش کر رہے تھے اور نوجوان نسل کے کارناموں پہ روشنی ڈال رہے تھے۔ احوال بھی اچھے تھے۔ ایک دوسرے کی خیر خیریت دریافت کرتے قاری اور لکھاری شامل تھے۔ اب تو سنا بلکہ پڑھا ہے پہلی ایوارڈ تقریب ہونے جا رہی ہے۔ چلیں جی ایوارڈ وصول کرنے والوں کو پیشگی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ کہانیوں میں، بڑی آپا، راز داری شرط ہے، ناگن، ماہر، سہیلی، عشق زادہ، راز، جوگی، بے چین روح، خونی خزانہ، بلا میرا احسن اچھوتی تحریریں تھیں۔ لیڈی ڈیانا اور لائف بوائے خوب تھیں، تصویر کہانی نے بھی متاثر کیا۔ زہر عشق نے اپنے عشق میں مبتلا کر رکھا اور زرد لومڑی دوڑتی، بھاگتی جا رہی ہے۔ مستقل سلسلے تیر نیم کش، ہائیڈ پارک، بہت خوبصورتی سے سجائے جاتے ہیں۔

✍ بھائی احسن! تبصرے کا شکریہ، احوال کی رونقیں تم سب سے ہی ہیں۔ بھائی اسی لیے تو کہتا ہوں ہر ماہ حاضر رہا کرو۔

☆ کنزہ ملک قاسم پور کالونی ملتان سے عرض کر رہی ہیں۔ ''آداب! سال 2016 بھی داغ مفارقت دے گیا، ایسے ایسے داغ دیے جو مٹائے نہ مٹیں۔ جنوری سے لے کر دسمبر تک اس نے روز ہی ڈرایا، دھمکایا۔ کاشی بھیا، آپ بھی کہہ رہے ہوں گے کہ یہ لڑکی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی۔ لیکن میں اتنی جلدی جان چھوڑنے والی کہاں ہوں۔ میں تو آسیب کی طرح ہوں، پل پل ساتھ ساتھ، سچی کہانیاں لیٹ ملتا رہا جس کی وجہ سے احوال کی محفل میں شامل نہ ہو سکی۔ لیکن سچی کہانیاں کا باقاعدہ مطالعہ رہا۔ دسمبر کے پُراسرار نمبر 3 میں ہماری کہانی ٹاٹک کر دل جیت لیا مگر پرچہ تو ملا نہیں؟ (بغیر پتے کے کیا جادو سے بھیجتے) ممّا، بلا میرا احسن پڑھ چکی ہے۔ کہتی ہے کنزہ تیرے چھن اچھے شگون نہیں دے رہے۔ احوال کی محفل میں کسی نے جھوٹے منہ بھی مجھے یاد نہیں کیا۔ سچی کہانیاں کے قاری، لکھاری اتنے بھلکڑ ہیں۔ پل میں بھول جاتے ہیں، کیوں؟ کوئی ایک دو ماہ غیر حاضر ہو جائے کوئی پوچھتا نہیں، اور ایک ہمارے کالج کی پرنسپل ہیں جو ایک دن غیر حاضر ہو جائے تو واٹ لگا دیتی ہیں۔ کہانیاں اس بار ڈراتی رہیں، پُراسرا، خوف

ویراس پھیلاتی کہانیاں بہت پسند آئیں۔ جوگی، راز داری شرط ہے، راز، ماہر، سہیلی، عشق زادہ، بے چین روح، نے متاثر کیا۔ زہر عشق نے اپنا دیوانہ کر دیا ہے۔ سفرنامہ، زرد لومڑی، اور لیڈی ڈیانا، درگاہ کا مجذوب زبردست تحریریں تھیں۔ کاشی بھیا سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی پہلی تقریب ہو نے جا رہی ہے لیکن ہم یوں منہ اٹھائے کیسے آ سکتے ہیں، ایوارڈ نہ پھول، پھر ہم......؟ لو ہم ابھی سے ناراض ہو رہے ہیں...... ہاہاہاہا...... اب منا ؤ تو جانیں۔''

☜ پیاری کنزہ! جلد دعوت نامہ بھی مل جائے گا تمہیں۔ یہ دنیا ہے یہاں یاد دلانے کے لیے اپنا بار بار احساس دلانا پڑتا ہے لڑکی! تبصرے کا شکریہ۔

☆ ایم مجاہد حسین جائی بستی شاہ گردیز سے لکھتے ہیں۔ ''سچی کہانیاں دسمبر کا پرچہ خوبصورت سرورق کے ساتھ ملا، طبیعت ہشاش بشاش ہو گئی۔ احوال میں چند ناموں سے واقفیت تھی سو نئی کترا کر کہانیوں کے نگر میں جا پہنچا اور سب سے پہلی جوگی پڑھی۔ ماہر، عشق زادہ، سہیلی، راز، راز داری شرط ہے، بڑی آپا، گاؤں والا مندر، درگاہ کا مجذوب پسند آئیں۔ باقی بھی یقیناً اچھی ہوں گی کیونکہ ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ پڑھ کر رائے دی جا سکتی ہے۔ زہر عشق کے لئے رسالہ خریدتا ہوں۔ کیا ہی اچھا ہوتا قسطوں میں مرنے سے بچایا جاتا۔ کتابی صورت میں ہوتی تو ایک ہی نشست میں پڑھتے۔ اللہ کرے سال 2017ء اہل اسلام کے لیے امن و سکون اور خوشیوں والا ہو۔ (آمین)۔''

☜ اچھے مجاہد! تمہارا بہت شکریہ کہ تم کسی بھی وجہ سے سہی پرچہ خریدتے تو ہو، تبصرے کا شکریہ۔

☆ صائمہ مجید ملتان شریف سے۔ ''السلام علیکم! اُمید کرتی ہوں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ٹھیک ٹھاک ہوں گے۔ جہاں رہیں خوشیاں بانٹیں۔ سب سے پہلے جشن عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم مبارک اور سال نو مبارک۔ اللہ تعالیٰ آنے والا سال سب کے لئے خوشیوں، مسرتوں، راحتوں بھرا ہو۔ امن ہو، خوشیاں ہوں، آپس میں پیار ہو، محبتیں ہوں اور پیارا پاکستان ہو۔ سچی کہانیاں چار تاریخ کو ہماری دسترس میں آیا۔ سرورق خوبصورت تھا۔ اداریہ میں منزہ سہام دل گیر باتیں کر رہی تھیں۔ احوال میں کاشی بھیا رخصت ہونے والے سال میں ہمارے کارنامے بیان کر رہے تھے۔ اللہ کرے آنے والے سال میں ہم سے کوتاہیاں، غلطیاں نہ ہوں اور دین اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ احوال میں خوب رونق لگی ہے۔ سبھی آپس میں محبتوں کو فروغ دے رہے ہیں لیکن یہ کیا سال کے آخری پرچے میں احوالیوں کی تعداد کم تھی۔ کہاں گئے؟ لوٹ آئیں۔ مصروفیات سے وقت نکال کر حاضری لگوایا کریں۔ میری بہنیں، بھائی مجھے اپنے احوال میں یاد رکھتے ہیں۔ میں سب کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرتی ہوں۔ امید ہے یہ محبتیں سلامت رہیں گی۔ کاشی بھیا میرے سرتاج مصروف ضرور ہیں لیکن سچی کہانیاں کے دیوانے ہیں۔ کہانیوں میں لائف بوائے، جوگی، بڑی آپا، راز داری شرط ہے (انکل ممتاز احمد جی! اب طبیعت کیسی ہے؟ آپ کے چچا جان کا افسوس ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے (آمین)۔ خواب کے زخم، خونی خزانہ، گاؤں والا مندر، بلا میر المحسن، جنوں والا مکان، درگاہ کا مجذوب، غیبی امداد، لوہاری گیٹ کا وہ مکان، سہیلی، ماہر، عشق زادہ، ناگن، وہ چیتل کا دیا بہترین کہانیاں تھیں۔ لیڈی ڈیانا احمد سجاد بابر نے خوبصورت تحریر لکھی۔ زہر عشق خوب چل رہی ہے۔ زرد لومڑی بھی اچھی جا رہی ہے۔ جنوری 2017ء سے نئے سلسلے شروع ہو رہے ہیں ضرور کامیاب ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سچی کہانیاں کو کامیابی کی تمام سیڑھیاں عبور کرائیں۔ (آمین)۔''

☜ اچھی بہن صائمہ! تبصرہ بہت شاندار رہا۔ بھائی مجید ہر پرچے کو جنون کی حد تک چاہتے ہیں۔ اللہ اس بندے کو مزید ہمت دے محبتیں بانٹنے کی۔

☆ یہ آمد ہے احوال میں پہلی بار کمالیہ سے ماریہ جاوید کی۔ لکھتی ہیں۔ ''پیارے کاشی بھائی! 2015ء میں، میں نے پہلی بار سچی کہانیاں پڑھنا شروع کیا تھا اور آج میں دسمبر 2016ء کا پُراسرار نمبر 3 پڑھ کر خط لکھنے کے لیے مجبور ہو گئی ہوں۔ میں آپ کے پرچے ہی میں نہیں بلکہ کسی بھی پرچے میں یہ میرا پہلا خط ہے۔ اگر آپ نے مجھے خوش آمدید کہا تو میری حوصلہ

سانحہ ارتحال

ہماری بہت عزیز لکھاری ساتھی فصیحہ آصف خان کے ماموں عزیز الرحمٰن گزشتہ ماہ وفات پا گئے۔ ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں ان کے ساتھ ہے اور اہلِ خانہ کے لیے صبر کی دعا کرتا ہے۔

افزائی بھی ہوگی اور اگلی بار قلم اٹھانے کی ہمت بھی بڑھ جائے گی۔ سچی کہانیاں ایک بہت اعلیٰ ڈائجسٹ ہے۔ اس میں شائع ہونے والی کہانیاں بے مثال ہوتی ہیں۔ ان کہانیوں میں پیش کی جانے والی سچائیاں پڑھ کر دنیا سے نبرد آزما ہونے کی ہمت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ دسمبر کے پرچے میں گو کہ پراسرار کہانیوں کا راج تھا مگر بیچ گیا ایمان بس، بڑی آپا، خونی خزانہ، بجو رقص سرے والی، سہیلی، راز داری شرط ہے، عشق زادہ، پیاس ادھوری ہے، ماہر، اکتالیسویں رات وہ کہانیاں ہیں جو اپنے اندر بہت معنی رکھتی ہیں اور ان کو پڑھ کر ایک سبق سیکھنے کو ملتا ہے۔ ''زرد لومڑی'' اور ''زہرِ عشق'' بہت شاندار ناول ہیں۔ ہر ماہ ان کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ منزہ سہام کا اداریہ ہر ماہ زبردست ہوتا ہے۔ احوال کی محفل کی رونقیں ہر ماہ عروج پر ہوتی ہیں۔ ''ہائیڈ پارک'' اور ''تیر نیم کش'' اچھے سلسلے ہیں۔ ''مسئلہ یہ ہے'' میں ہمارے ہی مسائل کا حل بتایا جاتا ہے۔ آخری دونوں کہانیاں شاہکار ثابت ہوئیں۔ ''لکڑی کی ملکہ'' اور ''درگاہ کا مجذوب'' واہ واہ کیا زبردست کہانیاں تھیں، مزہ آ گیا پڑھ کر۔ اچھا جی اب اجازت دیں اگلے ماہ ملاقات ہوگی اگر خدا نے چاہا تو۔''

☆ پیاری گڑیا! خوش آمدید لو ہم نے تمہیں اس سچی کہانیاں فیملی کا ممبر بنا لیا۔ اب تم باقاعدہ احوالی بن کر شامل رہنا۔ تمہارا پہلا تبصرہ ہی کمال کا ہے۔ خوش رہو۔

☆ بھائی ملازم حسین شیرازی کوہاٹ سے احوال میں رونق افروز ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ''ڈیئر کاشی السلام علیکم! آج کل آپ کی مصروفیات بڑھ گئی ہوں گی۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو دنیا کی آزاد فضاؤں میں قدم بہ قدم شاہراہِ حیات پر رواں دواں ہیں۔ ہم جیسے پسِ دیوار زنداں قیدی آہنی سلاخوں کے پیچھے صرف امیدوں اور آرزوؤں کی بازیابی اور تکمیل کی طلب میں شب و روز گزار رہے ہیں۔ رائٹرز ایوارڈ تقریب میں شریک سب بہن بھائیوں کو دل کی گہرائیوں سے ایڈوانس سلام پیش ہے اور دعاؤں میں یاد رکھنے کی استدعا ہے۔ دعا ہے کہ زندگی میں ہمیشہ ایسی محفلوں اور تقاریب میں آپ سب رونق افروز ہوں، آمین۔ ماہِ دسمبر کا سرورق نظروں کو بھاتا، دل میں اترتا، خوب صورت رنگوں سے آراستہ، خوشبوؤں کی مہک سے سجا سرورق تھا۔ اداریہ میں مدیرہ اعلیٰ کی جنبشِ قلم سے لکھے گئے قلبی جذبات کتنے ذہنوں میں شعور اور دلوں میں آگاہی اجاگر کرتے ہیں، کسی بھی درپیش مسئلے کی سنگینی پر سلیس پیرائے میں گفتگو کرنا، ضبطِ تحریر میں لانا کمالِ ادب ہے۔ راز داری شرط ہے، عشق زادہ، ایک راز، جوگی، لکڑی کی ملکہ، درگاہ کا مجذوب اعلیٰ پائے کی کہانیاں تھیں۔ باقی ساری کہانیاں بھی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ''احوال نامے'' سارے خطوط نہایت دلچسپ اور موثر ہیں۔ حنیف عاصم بلوچ! آپ نے صحیح لکھا۔ حقوق کے طلب گار بنتے ہیں تو فرائض کو بھی نظر میں رکھیں۔ حنا بشریٰ! آپ میرے لیے دل سے دعا کرتی ہیں۔ رب العزت آپ کے دل کی دنیا کو آباد رکھے، سدا سکھی رہیں، شکریہ۔ عائشہ نور! کہانی ''کفارہ'' کو پسندیدگی کی سند عطا کی۔ پہلا نمبر دیا۔ بہت عنایت۔ رفعت ناز، ثمینہ طاہر بٹ، تنزیلہ تانی، غزالہ کرن، فیصل ندیم بھٹی، مجید احمد جائی، نسیم سحر، رضوانہ کوثر، مسز نفیسہ فضل، مور شاہد حسین، آپ سب کو سلام تبصرے کہانیاں پسند کرنے پر آپ سب کا شکر گزار ہوں۔ مقصود احمد بلوچ کو سلام۔ چونکہ دوسروں کی حق تلفی کا امکان پیش نظر ہوتا ہے اس لیے ہاتھ قلم کو روکنا پڑتا ہے۔ ایڈیٹر صاحب کو بھی آزمائش میں ڈالنا مناسب نہیں ساری کہانیاں، خطوط، تبصرے دل اور ذہن پر دستک دیتے نظر آتے ہیں۔ ڈیانا پر لکھی گئی تحریر، مسئلہ یہ ہے، تیر نیم کش، ہائیڈ پارک، کاشی صاحب کی نظم، سب بہترین اور مناسب ہیں۔ دسمبر کا شمارہ سال 2016ء کی کاوشوں کا نچوڑ ہے۔''

☆ اچھے بھیا! آپ کی محبت کی قدر کرتے ہیں۔ تبصرہ ہمیشہ کی طرح شاندار رہا۔ دعاؤں میں ہمیشہ یاد رہتے ہیں آپ۔

☆ہماری بہت اچھی بہن صائمہ بشیر سرگودھا سے لکھتی ہیں۔ ''اس بار بھی احوال میں تمام خطوط بہت ہی اچھے تھے۔ بشریٰ کنول صاحبہ کا مشورہ پسند آیا، شاعری کی کتاب ضرور چھپواؤں گی، انشاء اللہ۔ ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ سب ہو جائے تو پھر دوسرا اقدم کتاب کی چھپائی کی طرف اٹھے گا۔ بہت شکریہ۔ بشریٰ کنول اللہ آپ کو خوش رکھے۔ ممتاز احمد نے تو کمال ہی کر دیا ایسا کرتب دکھایا کہ پوری بس کو اپنے پاؤں کے اوپر سے گزار لیا۔ اپنا خیال رکھا کرو ممتاز احمد (اے زندگی موڑ نئی آنی) اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو اور صحت کاملہ سے نوازے، (آمین)۔ سب بہن بھائی تمہارے لیے دعا گو ہیں۔ کاشی اور کیا لکھوں اس وقت مجھے بھی 101 بخار نے گھیرا ہوا ہے اور میں احوال میں حاضری کے لیے پوری کوشش کر رہی ہوں کہ جلدی جلدی اس خط کو بھیج سکوں۔ خدا تم سب کا حامی و ناصر ہو۔''

☆اچھی بہن! تبصرہ مختصر ہی سہی مگر محبتوں کا مان رکھنا بہت بڑی بات ہے۔ آپ کی صحت کے لیے دعا گو ہوں۔

☆ایم حنیف عاصم بلوچ، میاں چنوں سے ہمارے ساتھ ہیں، لکھتے ہیں۔ ''بھیاجی دسمبر کا شمارہ ذرا تاخیر سے ملا۔ بہرحال جب ملا تو سب گلے شکوے جاتے رہے۔ یاد فرمائی کا بے حد شکریہ۔ آپ نے میرا خط مفصل چھاپا، بے حد خوشی ہوئی اور اس سے بھی مزید خوشی تب حاصل ہوگی جب خط میں کی گئی میری درخواست پر میرے پیارے اور قابل احترام لکھاری و دیگر پڑھنے والے بہن بھائی اک ذرا ہی سہی اگرچہ عمل کریں گے تو۔ اب میں احوال کی طرف آتا ہوں۔ احوال میں ابتدائیہ پڑھ کر یقین جانیں میرا ضمیر جھنجھنا اٹھا ہے۔ آپ کے ایک ایک کھرے اور سچے لفظ نے کم از کم مجھے تو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ باضمیر انسانوں کے لیے بھی لکھا بہت کچھ ہے۔ کوئی نہ سمجھے تو پھر اس کا اللہ ہی حافظ ہے۔ اب سب سے پہلے جن بہن بھائیوں نے میری کہانی ''عشق زندہ رہے گا'' کی تعریف کر کے مجھے مستقبل میں بھی بے حد حوصلہ بخشا ہے ان کی حوصلہ افزائی میرے لیے باعث خوشی ہی نہیں بلکہ میرے قلم کی روشنائی بھی ہے۔ قمر شہداد کوٹ کے شاہد حسین، کراچی کی نفیسہ بہن، محترم مقصود احمد بلوچ، ممتاز احمد سرگودھا، فیصل آباد کی بشریٰ کنول، منڈی بہاؤالدین کی تنزیلہ، فیصل آباد کی غزالہ کرن میری قابل احترام چھوٹی اور پیاری بہنوں اور بھائیوں مجھ بھائی کی ڈھیر ساری دعائیں قبول ہوں۔ فیصل ندیم بھٹی، ممتاز احمد جائی، محترم بھائیوں ویری ویری تھینکس۔ آپ نے بے حد حوصلہ بخشا ہے۔ لاہور سے رضوانہ کوثر میری بہن میری گڑیا آپ کا نام پڑھ کر مجھے ایک منہ بولی بہن بہت آئی جو کچھ عرصہ سے اپنی ناگزیر وجوہات کی بنا پر مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔ خیر آپ بھی تو میری بہن ہو۔ سدا سکھی جیو میری گڑیا سی بہن۔ کاشی بھائی کہانیاں مختصر لیکن بہت اچھی تھیں۔ ''رازداری شرط ہے'' ممتاز احمد بھائی خوب محنت کی اللہ اور دے زور قلم زیادہ، رضیہ مہدی بہنا ''سہیلی'' بھی خوب رہی۔ جیتی رہو۔ افتخار چوہدری ''خوب ایمان بچایا'' ارم ناز بہنا ''جوگی'' بہترین تحریریں تھیں۔ آپ نے اچھی محنت کی ہے۔ محمد بلال فیاض، مہتاب خان کی تحریریں بھی قابل ستائش ہیں۔ ملک این اے کاوش ''خونی خزانہ'' بہترین کاوش تھی۔ ''عشق زادہ'' حنا بشریٰ میری بہن آپ نے سچ لکھا ہے۔ آپ کے قلم میں کافی جان ہے۔ مجید احمد جائی ''ایک راز'' کو بہت اچھا نبھایا۔ آپ نے سبق آموز اور خوب صورت تحریر تھی۔ باقی کچھ کہانیاں ابھی تک نہیں پڑھ سکا ہوں۔ بہرحال مجموعی طور پر بہت اچھا شمارہ تھا۔ آخر میں اپنے تمام بہن بھائیوں کا بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے میری حوصلہ افزائی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ اور ادارے کے تمام کارکنان کو اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے، (آمین)۔''

☆اچھے بھائی! خط میں کچھ باتیں حذف کرنا ہماری مجبوری ہے۔ امید ہے مائنڈ نہیں کریں گے۔ تبصرے کا شکریہ۔ اگلے ماہ آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔

☆پیارے بھائی فیصل ندیم بھٹی چک نمبر 58 شمالی، سرگودھا سے عرض گزار ہیں۔ ''2016ء کا آخری شمارہ سچی کہانیاں چار دسمبر کو ملا۔ ٹائٹل میں لڑکی زلفیں بکھیرے خوب صورت انداز کے ساتھ بھلی لگ رہی ہے۔ اشتہارات کو دیکھتے پڑھتے ہوئے منزہ سہام کے اداریے ''فیصلہ بدل دیے'' کو پڑھ کر دل بہت غمزدہ ہوا۔ احوال میں کاشی بھیا 2016ء سال کی بات کر رہے تھے۔ واقعی ہم سب کو چاہیے کہ اس گزرتے سال کے اختتام پر اپنا احتساب کریں اور آنے والے سال 2017ء

کے لیے عہد کریں کہ ملک پاکستان کے لیے اچھا جو ہو سکتا ہے کوشش ضرور کریں گے۔ کاشی بھیا اس کی بہت اشد ضرورت ہے کہ ہم غلط کو غلط کہیں، میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں محنت کو جاری رکھنا چاہیے پھر انشاء اللہ کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔ احوال میں سب سے پہلے ملازم حسین شیرازی کرسی صدارت پر براجمان تھے۔ میری دعا ہے کہ اللہ ماہ ربیع الاول کے صدقے آپ کو جلد رہائی عطا فرمائے، (آمین)۔ احوال میں نئے آنے والے احوالیوں کو خوش آمدید، جن میں قابل ذکر دیا آفرین، غلام مرتضیٰ، فہد علی عباسی، آئندہ بھی شامل احوال ہوتے رہنا جی۔ عبدالعزیز جی آصاحب بہت خوشی ہو رہی ہے۔ تبصرہ بھی کمال کیا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مند و سلامت رکھے۔ ممتاز احمد، عظمیٰ شکور، حنا بشریٰ، ثمینہ طاہر بٹ، رضوانہ کوثر کے تبصرے شاندار تھے۔ منشی عزیز مئے خوش آمدید۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کے مسائل میں آسانیاں پیدا فرمائے۔ مجید احمد جائی، صائمہ مجید، تنزیلہ عرف تانی، مقصود بلوچ، سدرہ انور علی، فرزانہ گل، کنزہ ملک کو سلام۔ شعبان کھوسہ کی والدہ محترمہ کے انتقال کا سن کر افسوس ہوا اور محترمہ رعنا قیصر صاحبہ کی صحت یابی کے لیے دعا گو ہوں۔ سچی کہانیاں رائٹر ایوارڈ تقریب لاہور میں منعقد ہونا بڑے اعزاز کی بات ہے۔ تاریخ کے اعلان کا بے چینی سے انتظار ہے۔ کہانیوں پر تبصرے کی طرف آتے ہیں۔ اسماء اعوان کی "لائف بوائے" واقعی کمال ہے۔ خواب، گلاب اور خوشبو" زبردست تھی۔ "رازداری شرط ہے" بہترین سبق آموز ہے جس میں ایک کلرک کی ایمانداری، نماز روزہ اور تہجد قرآن پاک کی تعلیمات کا درس دیا گیا۔ "بڑی آپا" ایڈیسن ادریس نسیج، "سہیلی" رضیہ مہدی، "بچ گیا ایمان" افتخار چوہدری کی شاندار کہانیاں تھیں جب کہ "جوگی" ارم ناز کی عقل سے ماورا کہانی ہے۔ اس کے علاوہ "لوہاری گیٹ کا وہ مکان" بلال فیاض، "ایک راز" مجید احمد جائی، کنزہ ملک "بلا میر الحسن" بھی اچھی کاوشیں تھیں۔ "زہر عشق" کی قسط نمبر 21 کاشی بھیا کی بہترین قسط ہے۔ پڑھتے پڑھتے انسان پر عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ زبردست۔ باباجی کے فیض سے ہزاروں لوگوں کو فیض یاب ہوتے دیکھ کر دل بہت خوش ہوتا ہے۔ "ہائیڈ پارک" بہترین مراسلوں سے ترتیب دیا گیا، آخر میں تمام قارئین اور اسٹاف کو سلام۔"

پیارے سے فیصل! تمہارا تبصرہ دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ سلامت رہو، انشاء اللہ ایوارڈ تقریب میں ملاقات ہوگی۔

☆ ملک علی رضا نثار کالونی فیصل آباد سے لکھتے ہیں۔ "امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ بندہ ناچیز ادارہ پرل پبلی کیشنز کے لیے ہر وقت دعا گو رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ادارے کے سربراہ، کارکنان اور دوست کاشی چوہان کو اس قدر ترقی سے نوازے کہ پوری دنیا میں سچی کہانیاں رسالے کو نمایاں مقام حاصل ہو۔ دسمبر کا شمارہ دیکھا تو مزہ آ گیا۔ رسالے کا معیار اس دفعہ بہت اچھا ہے۔ "لائف بوائے" اسماء اعوان کا بہت خیال افروز ہے۔ وہ بات سے بات پیدا کرنے کا فن جانتی ہیں۔ اتنا خوب صورت لکھ کر انہوں نے کمال کر دیا ہے۔ ارم ناز، ایم اے راحت، دانیال شمسی، حنا بشریٰ ممتاز احمد، کنزہ ملک، نزہت جبیں ضیاء، محمود شام کی کہانیاں لاجواب تھیں۔ رائٹر حضرات سے گزارش ہے کہ پچھلے ماہ Love 2016 اسٹوری شائع ہوئی اس طرح کی اسٹوریاں لکھ کر بھیجا کریں پلیز پلیز پلیز۔ احوال میں کراچی سے نفیسہ فضل، گوجرہ سے غلام مرتضیٰ علوی، فہد علی عباسی، منشی محمد عزیز، افضل آزاد، ساہیوال سے قاسم خان بلوچ، رانا حبیب الرحمن، نیر شفقت، عائشہ نور، مقصود بلوچ، فیصل آباد سے بشریٰ کنول اور غزالہ کرن صاحبہ نے بہت خوب صورت لکھا۔ دوستو تیار ہو جاؤ اب انتظار کی گھڑیاں ختم، جلد ملاقات ہوگی سب احباب سے آخر میں سب قارئین کو اللہ تعالیٰ خوش آباد رکھے اور تندرستی عطا فرمائے، (آمین)۔"

اچھے سے بھیا! لو ہم نے پرنٹنگ رکوا کر تمہارا خط شائع کر دیا، خوش اور اس خط کے ساتھ ہی ساتھیو! اس ماہ تک ہماری آپ کی ملاقات اپنے اختتام کو پہنچی۔ اگلے صفحات پر 2016ء کے ایوارڈز یافتگان کی مکمل فہرست شائع کی جا رہی ہے۔ انشاء اللہ اسی ماہ کے اختتام پر آپ اور ہماری ملاقات اب دوران تقریب ہی ہوگی۔ تمام سرٹیفکیٹس اور ایوارڈز پانے والے ساتھیوں کو بہت بہت مبارک باد۔ اجازت دیجیے۔ اللہ نگہبان۔

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

سچی کہانیاں رائٹر ایوارڈ حاصل کرنے والے لکھاریوں کی مکمل فہرست

2016ء کے ایوارڈ یافتگان

ایوارڈ ماہ	ایوارڈ یافتہ کہانی	مصنف / مصنفہ	شہر
جنوری 2016ء	اجنبی مسیحا	صداقت حسین ساجد	شورکوٹ سٹی
	یاد رکھے گی دنیا	مجید احمد جائی	ملتان
	آخری دعا	فصیحہ آصف خان	ملتان
فروری 2016ء	آپ اپنے دام میں	محمد قاسم خان بلوچ	ٹوبہ ٹیک سنگھ
	روایات کی دلدل	ثمینہ فیاض	کراچی
	حرام خور	فوزیہ احسان رانا	حاصل پور
مارچ 2016ء	گم شدہ چہرہ	شانی خامان	کراچی
	کمرہ نمبر 607	نفیسہ سعید	کراچی
	باندی	شائستہ انور	اسلام آباد
	نجات	الماس فاطمہ ارمان	کراچی
اپریل 2016ء	کرم کے فیصلے	عبدالغفار عابد	چیچہ وطنی
	دو کوڑی کی عورت	عقیلہ حق	کراچی
	پکا پھل	نزہت جبیں ضیاء	کراچی
مئی 2016ء	انگاروں پہ رقص	ریاض حسین شاہد	قبولہ شریف
	محلہ کی بیٹی	اُم عادل	کراچی
	خانہ برباد عشق	مہر پرویز احمد دولو	میاں چنوں
	کتنی محبت باقی ہے	عظمٰی شکور	اسلام آباد
جون 2016ء	کس نے کھیل کھیلا ہے	شمسہ قمر	کراچی
	شیشہ، عزت اور پتھر	راحت وفا راجپوت	لاہور

سچی کہانیاں رائٹر ایوارڈ حاصل کرنے والے لکھاریوں کی مکمل فہرست

2016ء کے ایوارڈ یافتگان

ماہ	کہانی	مصنف	شہر
جولائی 2016ء	ہیرو	ریحانہ آفتاب	کراچی
	زربخت اور شب گل	سیدہ عطیہ زہرہ	لاہور
	ملن	جمیل میتلو	کراچی
اگست 2016ء	جائز	وقاص حسین	رحیم یار خان
	وہ کنگن	شیما عبدالقیوم	لاہور
	VICTIM کون؟	ماہ وش طالب	لاہور
	آخری فرعون	ملک صفدر عباس اعوان	جہانیاں
	فرعون کے مجرم	بنتِ حوا	لیہ
ستمبر 2016ء	جرم	محمد بلال فیاض	ملتان
	اکیلی عورت	سیمیں غزالہ نیہاں	کراچی
	اصلی چہرہ	نادیہ ملک	اوکاڑہ
	رفوگر	نسیم سکینہ صدف	ڈسکہ
اکتوبر 2016ء	ابلیس	ضرغام محمود	کراچی
	مرد اور عورت	عطیہ ہدایت اللہ	پشاور
	روشنی والا رستہ	رئیسہ خالد	اسلام آباد

سچی کہانیاں رائٹرایوارڈ حاصل کرنے والے لکھاریوں کی مکمل فہرست

2016ء کے ایوارڈ یافتگان

ایوارڈ ماہ	ایوارڈ یافتہ کہانی	مصنف/مصنفہ	شہر
نومبر 2016ء	بے غیرت کہیں کی	ایڈیسن ادریس مسیح	کراچی
	عشق کی شاخ کا الو	ثمینہ طاہر بٹ	لاہور
	نجم، سحرش اور حسینہ	ایم حسن نظامی	قبولہ شریف
دسمبر 2016ء	بچ گیا ایمان بس	سید افتخار چوہدری	گوجرانوالہ
	سہیلی	رضیہ مہدی	کراچی

سچی کہانیاں اسپیشل ایوارڈز

☆ لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ۔ سید نور (لاہور)

☆ بیسٹ رائٹر آف دی ایئر۔ احمد سجاد بابر۔ (لودھراں)

☆ بیسٹ رائٹر آف دی ایئر۔ حنا بشریٰ (لاہور)

☆ موسٹ پاپولر رائٹر آف 2016ء ممتاز احمد (سرگودھا)

☆ موسٹ پاپولر رائٹر آف 2016ء ارم ناز (کراچی)

☆ قارئین! ان تمام ایوارڈز کے نتائج کے بعد جیوری نے حتمی طور پر اس برس دو ایوارڈز مزید دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ Best Critic Award Of 2016

ان ایوارڈز کو پانے والے لکھاری جاوید راہی اور اقبال بانو ہیں۔

نوٹ: پہلا سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈز اور سرٹیفکیٹس جنوری 2017ء کے آخری ہفتے میں اپنی روایتی شان و شوکت کے ساتھ لاہور میں منعقد ہونے والی تقریب میں مصنفین کو دیے جائیں گے۔

لائف بوائے... بالوں کا ہر مسئلہ سلجھائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

پن چکی کی آواز نے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ لگتا تھا سورج کے اندھیرے سے نکلنے سے پہلے گاؤں میں یہ آواز ہر سو معمول کے مطابق اپنا جادو جگانا شروع کر دیتی تھی۔ تاجاں نے اٹھتے ہی کے ساتھ ہی منہ پر لپ جھپ پانی کے چھینٹے مارے اور نئے دن کو خوش آمدید کہنے چل دی۔ بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہی اُس کے منہ سے سسکی نما چیخ بلند ہوئی اور وہ......

''سی......'' کر کے رہ گئی۔ سارا سارا دن کھیتوں میں کام کر کے اُس کی کمر اکڑ جاتی تھی۔ اوپر آگ برساتا سورج ہوتا تھا اور نیچے فصلوں کی اپنی گرمائش...... کیا خیال رکھتی اپنا یا اپنے بالوں کا...... بس بالوں میں اصلی سرسوں کی کھلی سے سر دھویا اور تیل لگا کر وہ خدا کی اس حسین نعمت پر گویا احسانِ عظیم کر دیا کرتی تھی۔ اسکول جانا ابھی حال ہی میں چھوڑا تھا کیونکہ اچانک سے ماں کے انتقال نے اُسے پندرہ برس کی عمر میں ہی بہت سمجھدار کر دیا تھا۔ اب ماں کی ساری ذمہ داریاں اُس کے کاندھوں پر تھیں۔ گھر کا چولہا ہانڈی کھیتوں کا کام...... وہ تو گویا گھر اور کھیت کے پاٹوں میں پس رہی تھی۔ ایک ہی سہیلی تھی شکیلہ اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنا سارا دکھ سکھ شیئر کر لیتی تھی۔

تاجاں نے بیدار ہو کر باورچی خانہ سنبھالا تھا۔ ناشتے کے بعد لسی بلو کر اُس نے مکھن کا پیڑا کٹوری میں نکالا اور روٹی کے چھلکے پر دیسی گھی لگا کر بابا کے لیے چائے کے پیالے سمیت لے آئی۔

''نمانی دھیے تیرا رب راکھا ہووے...... تُو نے تو میری بچی دھی اپنی ماں کا سارا کام اپنے ہاتھ میں لے کر اس گھر کو زندگی دے دی بچی۔''

'' ارے بابا...... تُو ہے نا میری ماں اور میرا باپ...... تو پھر فکر کیسی۔'' اُس نے دلار سے باپ سے کہا تو باپ کی آنکھوں میں دو آنسو تیر گئے۔ وہ اپنی اکلوتی بچی کی تنہائی کے خیال سے دوسری شادی کا سوچ رہا تھا تاکہ بچی کے ساتھ دوسری عورت ماں بن کر ساتھ ہو جائے۔

وہ جانتی تھی کہ بابا اب اُداس ہو جائے گا لہٰذا اُس

نے وہاں سے جانے ہی میں عافیت جانی اور گھر کے
کام دھندوں میں لگ گئی اور بابا کھیتوں کو نکل گیا۔

☆......☆......☆

بابا کے لیے کھانا لے کر وہ نکلی تو اپنی ہی دھن
میں چلتی چلی جا رہی تھی۔

"تاجاں اے تاجاں!" قدرے فاصلے سے آتی
آواز پر تاجاں کے قدم ٹھٹک کر رک گئے۔ اس کے
ہاتھ میں لسی کا برتن اور سر پر روٹیوں کی چنگیر تھی،
دوسرے ہاتھ میں اُس نے ایک چھڑی پکڑی ہوئی
تھی، جس سے وہ گاہے بہ گاہے زمین کریدتی آگے
بڑھ رہی تھی۔ اُس نے گردن گھما کر اِدھر اُدھر نظر
دوڑائی مگر کوئی نظر نہ آیا۔

"ارے او تاجاں!" پہلا قدم اُٹھاتے ہی آواز
پھر آئی لیکن اب یہ قریب سے آئی تھی پھر کماد کی
بھرپور فصل میں سے شکیلہ کا چہرہ اور پھر پورا جسم
نمودار ہوا۔

"یہ تُو ہے، یہاں کیا کر رہی ہے؟ اور مجھے آواز
کیوں لگا رہی تھی؟" اُس نے چھڑی سے شکیلہ کے
بازو کو چھوا۔

"تجھ پر نظر پڑی تھی تو آواز لگالی، ویسے ایویں
آواز نہیں لگائی۔ کچھ پوچھنا تھا تجھ سے۔"

"کیا؟"

"ہم شہر جا رہے ہیں۔ وہ ماسی صغراں ہے ناں،
پاس والے گاؤں والی، اُس کی بیٹی کی شادی ہے۔ اسے
خریداری کرنا ہے، ماں کے پاس آئی تھی وہ۔ میں، مینو،
کاجل اور عائشاں بھی جائیں گے، تجھے چلنا ہو تو چل۔"

"میں کیا کروں گی جا کر؟" اُس نے بے
پروائی سے کہا۔

"تو؟" وہ زور سے ہنس پڑی۔

"سُنا ہے، چاچا شادی کر رہا ہے۔ تو تُو تیاری
نہیں کرے گی؟"

"مجھ سے ایسا مذاق نہ کیا کر۔" تاجاں برا مان گئی۔

"لے مذاق کیسا...... کیا خبر چاچا سچ مچ ہی
شادی کر رہا ہو۔ سنا ہے، اُسے تیری فکر رہتی ہے کہ
جوان سیانی بیٹی گھر میں اکیلی رہتی ہے۔ ماں ہو گی تو
دیکھ بھال تو کرلے گی۔"

"ہاں، ننھی بچی ہوں نا میں۔" وہ تنتنا کر بولی۔

"اسی لیے تو فکر ہے۔" شکیلہ پھر ہنس دی۔

"اونہہ......" تاجاں نے منہ پھیر لیا۔

"اچھا بات تو سن...... چھوڑ چاچا کو، تجھے اپنے
لیے کچھ نہ لینا ہو پر ایسے ہی چل، سچ بڑا مزہ آئے گا۔
سیر کریں گے شہر کی اور...... اور چاٹ بھی کھائیں
گے بازار میں۔" شکیلہ للچا رہی تھی۔

"شکیلہ...... او شکیلہ...... میری پیاری سہیلی ذرا یہ
دیکھ میرے بالوں کا کیا حشر ہوتا جا رہا ہے۔ قسم اللہ
پاک کی...... کوئی ناغہ کیے بغیر میں سرسوں کا تیل سر پہ
لگاتی ہوں اور کھلی سے سر دھوتی ہوں مگر میرے بال
ایسے کھردرے اور بے رونق ہونے لگے ہیں کہ
بس...... مجھے تو ایسا لگتا ہے کسی دن یہ گھونسلہ خود بخود
ٹوٹ کر میرے ہاتھوں میں آ جائے گا۔" اُس کی
وحشت اُس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔ شکیلہ اُس کی
پریشانی سے واقف تھی مگر یہ تو گاؤں کی ہر لڑکی کا
مسئلہ تھا۔ دیسی ٹوٹکوں کے علاوہ وہ لوگ بالوں اور
چہرے پر ہر چیز کا استعمال حرام سمجھتی تھیں۔ کتنی ہی
لڑکیاں بالوں کی نشوونما نہ ہونے کے باعث بالوں
سے ہاتھ دھو بیٹھی تھیں اور پھر بڑے بڑے پراندوں
میں رہے سہے بال چھپاتی پھرتی تھیں۔

"تُو ایسا کر میرے گھر آنا پھر اماں سے مل کر
کوئی بات کرتے ہیں۔"

"چل ٹھیک ہے۔"

اِن لوگوں کے لیے شہر میں بہت کشش تھی اور
اگر کسی سبب ان کو شہر جانا پڑ جاتا تھا تو گویا اِن کی

پکنک ہو جاتی تھی۔"

"بابا سے پوچھتی ہوں۔"

"جا' جلدی سے چاچا کو روٹی دے آ...... اور وہ کہہ دے تو پھر ادھر ہی آ جانا۔ میں چاچا کے کھیت پر ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" تاجاں چھڑی لہراتی آگے بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

شہر جانے کا سوچ کر اُس کے چہرے پر خوشی جھلملانے لگی تھی۔ جسم میں خود بخود پھرتی اور توانائی آ گئی تھی۔ بابا نے اسے خود ہی مسکراتے دیکھا تو چونک کر دیکھنے لگا۔

"دھی رانی کیا بات ہے؟ بہت خوش ہے؟" وہ ٹٹولنے والی نظر سے دیکھ رہا تھا۔

"بابا میں شہر جاؤں؟"

"کس کے ساتھ؟"

"وہ شکیلہ کے گھر والے جا رہے ہیں' خریداری کرنے۔"

"پر تُو نے کیا کرنا ہے جا کے' میرے ساتھ چلنا۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"لیکن بابا......" شکیلہ کے ساتھ نہ جانے کے خیال سے وہ کچھ اُداس ہو گئی۔ بابا کے ساتھ وہ مزا بھلا کب آتا جو شکیلہ' کاجل' مینو اور عائشاں کے ساتھ آتا۔ بابا نے اس کے اُداس چہرے کو دیکھا تو مسکرایا۔

"اچھا چل جا...... اور ہاں' اپنے واسطے دو جوڑے بھی لیتی آنا۔"

"کیوں بابا؟" وہ حیرانی سے مسکرا دی۔

"بس لے آنا۔" اس نے کھیسے میں سے پیسے نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

وہ بلاوجہ ہی ہنس دی۔ ایک تو شہر جانے کی اجازت مل گئی اوپر سے بابا نے پیسے دے کر دو جوڑے بھی لینے کو کہہ دیا تھا۔ بات تو خوشی کی تھی ناں۔

☆......☆......☆

"سلام ماسی!" تاجاں نے شکیلہ کے گھر آتے ہی اُس کی ماں شمیم کو سلام جھاڑا۔

"جیتی رہ میری دھی! بڑی مصروف ہو گئی ہے تُو' ماسی کے واسطے تیرے پاس اب ٹیم (وقت) ہی نہیں ہوتا۔" شمیم نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شکوہ بھی کر ڈالا۔

"ماسی! تجھے تو پتا ہے نا گھر کے کام دھندوں میں کہاں ٹیم ملتا ہے' میں تو بس شکیلہ کے ساتھ شہر جانے کے لیے بابا سے اجازت لے کر آ گئی ورنہ کہاں نکلتی ہوں۔" وہ بے بسی سے بولی تو شمیم کو اپنی بات کا افسوس ہونے لگا۔

"چل تو اُداس نہ ہو...... اور ہاں شکیلہ کہہ رہی تھی کہ تُو اپنے بالوں کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔ دھی رانی میں پچھلی مرتبہ شہر سے ایک شیمپو کی بوتل لائی تھی۔ مانو اُس جادو کی بوتل نے تو کمال ہی کر دیا۔ اب ہم آج تیرے لیے بھی وہ جادو کی بوتل خرید لیں گے۔ باقی اللہ مالک!"

"ماسی تُو سچ کہہ رہی ہے؟"

"ہاں میری دھی! رُک میں شکیلہ کو بلاتی ہوں۔ وہ تجھے وہ جادو کی بوتل دکھائے گی۔ نی شکیلہ...... نی کڑیے جلدی آ باہر تاجاں آئی ہے۔"

"دے دی چاچا نے تجھے اجازت۔" شکیلہ اُس سے ملتے ہی خوش دلی سے بولی۔

"ہاں...... بابا نے ہنسی خوشی اجازت ہی نہیں دی ہے بلکہ میرے لیے دو جوڑے کپڑوں کے پیسے بھی دیے ہیں۔" تاجاں نے رومال میں بندھے پیسے اُسے دکھاتے ہوئے کہا۔

"ارے پگلی! میں نے تجھے اس لیے آواز دی تھی کہ تو ذرا جا کر وہ شیمپو کی بوتل دکھا اپنی تاجاں کو جو ہم پچھلی واری شہر سے لائے تھے۔"

ماں کے کہنے کی دیر تھی کہ شکیلہ شیمپو کی بوتل اُٹھا

کر لے آئی۔ لال ڈھکن والی اس بوتل پر بادام بنے تھے۔ اور ایک ماں بیٹی نمایاں نظر آ رہی تھیں۔

"یہ کون سا شیمپو ہے ماسی!"

تاجاں نے بوتل کو ہاتھ میں پکڑ کر غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"یہ ہے لائف بوائے شیمپو۔ دھی رانی اس وقت تمہیں ہی نہیں بلکہ ہر ایک کو اسی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بال ہیں تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ نہیں۔ شکیلہ جلدی سے ٹیم بتا میں چادر اوڑھ کر آتی ہوں۔ دیر ہو رہی ہے۔" اتنے میں شکیلہ کے گھر میں بجتا ریڈیو لائف بوائے شیمپو کا اشتہار سنانے لگا۔

"بالوں کے معاملے میں نو شارٹ کٹس...... نو چانس...... صرف لائف بوائے شیمپو...... آپ کے بالوں کے ہر مسئلے کا حل۔ 30 فیصد سے زیادہ بالوں کو مضبوط اور گھنا بنائے۔ اپنے ملک پروٹین اور روغنِ بادام کی طاقت کے ساتھ۔"

شکیلہ اور تاجاں لائف بوائے شیمپو کے اشتہار میں اتنا مگن تھیں کہ پتا ہی نہ چلا کب شمیم چادر اوڑھ کر اُن کے سامنے تھی۔

"ارے کیا ہوا تم دونوں کو۔" وہ چلائی تو دونوں جیسے ٹرانس سے باہر آئیں۔

"بالوں کے معاملے میں نو شارٹ کٹس۔"

دونوں یک زبان ہو کر بولیں۔

"اوہو شارٹ کٹ کیسانی کڑیوں! چلو دیر ہو رہی ہے صغراں بھی ہمیں اُڈیک (انتظار) رہی ہوگی۔" اور پھر وہ تینوں شہر جانے کے لیے گھر سے نکل گئیں۔

☆......☆......☆

تاجاں شہر سے لائف بوائے شیمپو لے آئی تھی۔ کھلی سے سر دھونا بھی برقرار تھا اور سرسوں کے تیل کی چمپی بھی مگر اس کے ساتھ ساتھ جادو کی بوتل یعنی لائف بوائے شیمپو کا باقاعدہ استعمال بھی جاری تھا۔ لائف بوائے کے مسلسل استعمال نے اُس کے بالوں کو چار چاند لگا دیے تھے اور تاجاں کے چمکتے' لہراتے بالوں کی دھوم مچ گئی تھی۔ گاؤں کی لڑکیاں شکیلہ اور تاجاں کے بالوں سے متاثر ہو کر لائف بوائے شیمپو استعمال کرنے لگی تھیں اور لائف بوائے شیمپو کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

آج ان کے گاؤں میں لائف بوائے شیمپو والوں نے اشتہاری مہم کا آغاز کیا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران تھے کہ اُن کی اس مہم سے پہلے ہی گاؤں والے لائف بوائے شیمپو کی اہمیت اور افادیت سے جانکاری رکھتے تھے۔ اتنے میں تاجاں' شمیم اور شکیلہ بھی لائف بوائے شیمپو خریدنے اُن کے پاس آ گئیں۔

"لائف بوائے شیمپو ہی آپ کی پہلی ترجیح کیوں ہے؟" اسٹال پر جو میڈم بیٹھی تھیں انہوں نے ان تینوں سے سوال کیا۔

"کیونکہ بالوں کے معاملے میں نو شارٹ کٹس...... بالوں کی زندگی کا ضامن ہے۔ ہمارا نیو لائف بوائے شیمپو اور کچھ نہیں۔"

تاجاں اور شکیلہ یک زبان بولیں تو لائف بوائے شیمپو کی آگاہی مہم کی ٹیم بھی مسکرانے لگی۔

"لیجیے آپ کا بھروسہ اور آپ کا اعتماد...... ہماری طرف سے بطور گفٹ آپ کے لیے۔"

میڈم نے خوش ہو کر تینوں کو لائف بوائے شیمپو کی ایک ایک بوتل پکڑاتے ہوئے کہا۔ تینوں نے شکریہ کہہ کر خوشی خوشی اپنے قدم گھروں کی جانب بڑھا دیے تھے۔

سچ ہے لائف بوائے شیمپو نہ صرف شہروں بلکہ گاؤں دیہات میں بھی اپنی اہمیت و افادیت سے بالوں کے مسائل سلجھا رہا ہے۔ اپنے اعتماد اور بھروسے کا نشان ہر ایک پر ثبت کرتا جا رہا ہے

☆☆......☆☆

دِل دِل پاکستان...... جان جان پاکستان

جنید جمشید



احمد سجاد بابر

ہر پاکستانی کے دل میں آباد اُس شخصیت کی کہانی جس کی آواز ہمیشہ زندہ رہے گی

ایسی زمیں اور آسماں
ان کے سوا جانا کہاں
بڑھتی رہے یہ روشنی
چلتا رہے یہ کارواں
دل دل پاکستان جاں جاں پاکستان
دل دل پاکستان جاں جاں پاکستان
دل دل سے ملتے ہیں تو پیار کا چہرا بنتا ہے چہرہ بنتا ہے
پھول اک لڑی میں پروئیں تو پھر سہرا بنتا ہے چہرہ بنتا ہے
دل دل پاکستان جاں جاں پاکستان
دل دل پاکستان جاں جاں پاکستان
گھر اپنا تو سب کو جی جان سے پیارا لگتا ہے تارہ لگتا ہے
ہم کو بھی اپنے ہر ارمان سے پیارا لگتا ہے تارہ لگتا ہے
دل دل پاکستان جاں جاں پاکستان
دل دل پاکستان جاں جاں پاکستان

14 اگست 1987 پی ٹی وی سے نشر ہونے والے 4 منٹ اور 28 سیکنڈ کے ملی نغمے نے ملک بھر کے طول و عرض میں سرشاری کی ایک لہر دوڑا دی، ملک میں چار سو ایک گھٹن چھائی تھی، ایسے میں یہ ملی نغمہ تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند آیا اور ہر طرف چھا گیا۔ چار نوجوانوں سلمان احمد، شہزاد حسن، روحیل حیات، جنید جمشید پر عکس بند کیا یہ نغمہ ایک لمحے میں مقبولیت کے ریکارڈ توڑتا چلا گیا، ویڈیو کے بیشتر مناظر میں ان نوجوانوں کو سائیکل اور کہیں کہیں ایک جیپ (گاڑی) چلاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ایک منظر میں ان کو ایک پہاڑی ڈھلوان پر کھڑے ہو کر گاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اختتام پر تمام ارکان ایک سٹوڈیو میں دکھائی دیتے ہیں اور اس کے بعد ویڈیو ختم ہو جاتی ہے۔ ان ہی چار کے درمیان سبز شرٹ اور سفید پتلون میں ملبوس ایک دبلا پتلا نوجوان بھی ہے، جس کی آواز دھیمی اور ملائم ہے، لیکن اس کے باوجود آواز، شاعری، موسیقی، اور ان سب سے بڑھ کر کچھ ایسا جوش و جذبہ ہے کہ ساری چیزیں مل کر ایسی کیمسٹری پیدا کرتی ہیں کہ یہ گانا ملک کے ہر دل میں دھڑکنے لگتا ہے۔ اس گروپ کا نام وائٹل سائنز تھا، جو موسیقی کی دنیا میں واقعی وائٹل سائنز بننے جا رہا تھا۔

دل دل پاکستان اپنے منظر عام پر آنے کے فوراً بعد ہی عوام میں بے پناہ مقبول ہو گیا۔ اس کی شہرت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کو عملی طور پر پاکستان کے پاپ ترانہ یا دوسرے الفاظ میں ثانوی قومی ترانہ کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ دل دل پاکستان'' ایک دوبار ہی ٹی وی اسکرین پر آیا اور اس کے بعد تو گویا دیکھتے ہی

دیکھتے لاکھوں دلوں کی آواز بن گیا۔ اس وقت کا شاید ہی کوئی ٹی وی پروگرام، ٹاک شو، یا میوزک پروگرام ایسا ہوگا جس میں اس نغمے کا ذکر نہ ہوتا ہو ورنہ شادی بیاہ سے لے کر تک دیگر تمام نجی تقریبات تک میں جنید جمشید اور ان کا ملی نغمہ چھایا رہتا۔ یوم آزادی، یوم پاکستان اور دیگر قومی دنوں پر تو اس کی دھنیں بجنا لازمی سا بن گیا تھا۔ 2003ء میں بی۔ بی۔ سی۔ نے اپنی ویب سائیٹ پر گیتوں کے ایک عوامی انتخاب کا اہتمام کیا اور ناظرین کو دعوت دی کہ وہ دنیا بھر سے 7000 گیتوں میں سے 10 بہترین گیتوں کو منتخب کریں۔ BBC کے مطابق دنیا کے 155 "ممالک/جزائر" سے لوگوں نے اس مقابلے میں ووٹ دیے۔ دل دل پاکستان سرفہرست 10 گیتوں میں سے تیسرے نمبر پر تھا۔

اس کی ویڈیو پاکستان کے دارالحکومت شہر اسلام آباد میں فلمائی گئی۔ یہ ویڈیو پاکستان کی چند اولین پاپ ویڈیوز میں سے ہے۔ اپنی ہمعصر دوسری ویڈیوز کی نسبت دل دل پاکستان کی ویڈیو نہ صرف سادہ تھی بلکہ اسلام آباد کے دلکش مناظر نے اس کو چار چاند لگا دیے تھے۔ اس نغمے کی بدولت جنید جمشید موسیقی کی دنیا پر ایسے چھائے کہ اگلی پوری دھائی میں ان کو کوئی جوڑ پیدا نہ ہو سکا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جادوئی شخصیت کے مالک جنید جمشید کی پیدائش 3 ستمبر 1964 کو کراچی میں ہوئی، والد کا تعلق پاکستان ائیر فورس سے ہونے کے باعث آپ کے والد نے ابتدائی طور پر کوشش کی کہ آپ کو اسی شعبے سے وابستہ رکھا جائے۔ والد کی خواہش پر لبیک کہتے ہوئے جنید جمشید ائیر فورس کا حصہ بنے تاہم نظر کمزور ہونے کی وجہ سے وہ اپنی خواہش ایف 16 کی اڑان نہ بھر سکے اور فضائیہ کو خیر باد کہا بعد ازاں لاہور کی یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی میں داخلہ حاصل کر کے تعلیم کو جاری رکھا اور بیچلرز کی ڈگری حاصل کی اور پاک فضائیہ میں بطور کنٹریکٹ اپنی سروس کا آغاز کیا۔ دور طالب علمی میں میوزک سے لگاؤ ہونے کے بعد دوست احباب کے ساتھ مل کر ایک بینڈ تشکیل دیا، جس نے 1983 میں پشاور اور پھر اسلام آباد یونیورسٹی میں اپنی فن کا مظاہرہ کیا۔

جنید جمشید گلوکاری کی طرف منصوبہ بندی سے نہیں آئے تھے۔ انھوں نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ انھوں نے گلوکاری اپنے بھائی ہمایوں کی وجہ سے شروع کی۔

"میں گٹار بجاتا تھا وہ گاتا تھا۔ جب وہ نہیں ہوتا تھا تو میں اس کے گانوں کی ریکارڈنگ مسلسل سنا کرتا تھا، اور ساتھ ساتھ گاتا رہتا تھا۔ اس طرح میں بھی گانے لگا، حالانکہ اس کی آواز مجھ سے کہیں اچھی ہے۔"

اسی زمانے میں اسی اتفاقیہ گلوکار پر موسیقار روحیل حیات کی نظر پڑ گئی، جنھوں نے جنید کو اپنے ساتھ گانے کی دعوت دی۔ بقول ان کے

"مجھے شروع ہی میں بیحد تخلیقی گروپ مل گیا جس میں سلمان احمد، روحیل حیات، شہزاد، نصرت حسین، رضوان الحق شامل تھے۔ میں ان سب کو اپنا گرو مانتا ہوں۔"

اس گروپ کی صحبت میں جنید جمشید کی وہ تربیت ہوئی جس نے نامور موسیقار کمپل رعنا کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا۔

"میں نے اپنی پروفیشنل زندگی میں تم جیسا 'فینا منا' نہیں دیکھا۔ ان نوجوانوں کے قائم کردہ میوزک بینڈ کو بڑی آسانی سے پاکستان کا مقبول ترین میوزک بینڈ کہا جا سکتا ہے۔"

شہرت، عزت، دولت، چاہت، گلیمر جنید کے پیچھے تھا، وہ نوجوان نسل کے دل کی دھڑکن بن گیا، اس کی شخصیت وجاہت اور ذہانت کا مجموعہ تھی، اس وجہ سے وہ ہر گھر کا حصہ بن گیا۔ ملکی اور عالمی میڈیا میں اس کا نام گونجنے لگا، یہ وہ وقت تھا جب پر جوش جنید سوچتا تھا کہ کیا موسیقی سے اچھی کوئی اور فیلڈ بھی ممکن ہے؟ موسیقی میں دولت، عزت اور شہرت اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے اور وہ اس دولت ہفت اقلیم کا اکلوتا شہزادہ تھا۔

وائٹل سائنز نے تقریبا 15 سال پاکستان کی میوزک انڈسٹری کو لاجواب گانے دیئے۔ جنید جمشید کے ساتھ شہزاد حسن، روحیل حیات، نصرت حسین اور سلمان

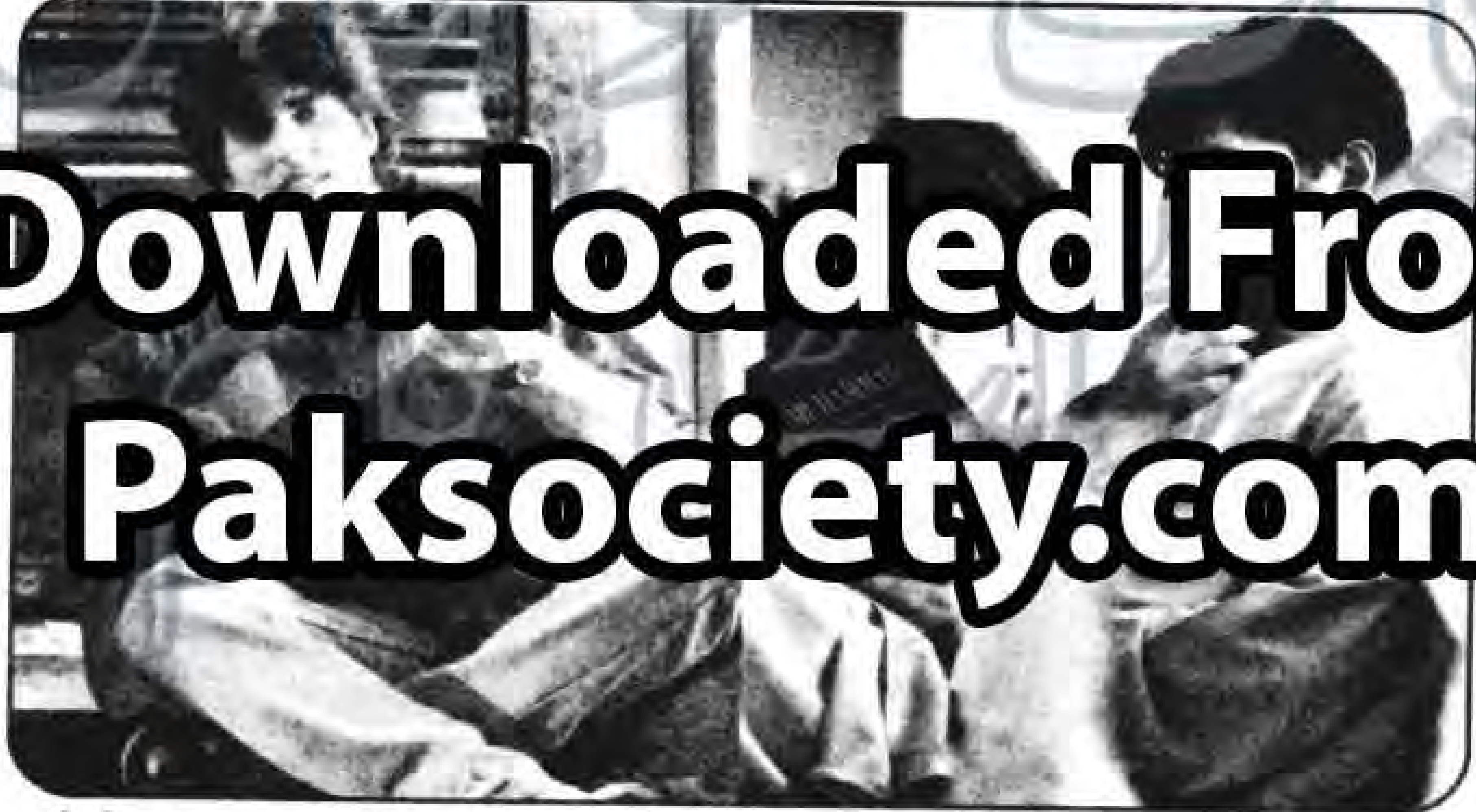
احمد نے بھی وائٹل سائنز میں اپنے فن کا لوہا منوایا۔ تاہم جنید اور وائٹل سائنز لازم وملزوم بن گئے تھے۔ جنید جمشید نے 1994 میں خود ایک البم لانچ کیا جس کا نام جنید آف وائٹل سائنز تھا۔ اس البم کے بعد ان کے البمز "اس راہ پر" اور "دل کی بات" نے بھی خوب شہرت پائی۔

☆☆☆☆☆☆

پھر اچانک تبدیلی آ گئی، ایسی تبدیلی کہ جس نے دنیا کو حیران کر دیا، ہر طرف سوال، ہر طرف سرگوشیاں، ہر طرف چہ میگوئیاں۔۔۔۔ یہ دیوانہ ہو گیا ہے۔۔۔۔ دیکھنا چند دن کا خمار ہے۔۔۔ کون اس گلیمرس دنیا کو چھوڑ پایا ہے۔ یہ بھی لوٹ آئے گا۔۔۔۔ جنید جمشید نے موسیقی کی دنیا کو خیر آباد کہہ دیا۔۔۔ کیوں، کیسے کا سوال ہر کسی کی زبان پر تھا۔ اچانک تبدیلی پر جنید جمشید نے متعدد بار

جس وقت جنید جمشید نے شوبز کو خیر باد کہا اور معروف تبلیغی جماعت سے وابستہ ہوئے، اب جو جنید سامنے آئے تو سب انھیں دیکھ کر چونک گئے۔ چہرے پر کلین شیو کی بجائے سیاہ داڑھی تھی، تن پر جینز اور شرٹ کی بجائے کرتا، اور ہاتھوں میں گٹار کی بجائے تسبیح اور منہ پر رومانوی گیتوں کی بجائے حمد ونعت کا ورد تھا۔

اس وقت جنید جمشید کے کئی بڑی نامی گرامی شوبز کمپنیوں سے معاہدے تھے، جس کو ختم کرنے کیلئے بھاری معاوضے ادا کرنے پڑے۔ گانے چھوڑنے اور معاوضے ادا کرنے کے بعد جنید جمشید کے گھر میں فاقوں کی نوبت آ گئی، اور شدید مالی پریشانی کے بعد بھی جنید جمشید نے ہار نہیں مانی اور اللہ کی راہ سے جڑے رہے۔ مولانا طارق جمیل سے پہلی ملاقات شاید تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت



گفتگو کرتے ہوئے واقعے کا ذکر کیا کہ گھر سے میوزیکل شو میں جاتے وقت ڈیفنس کے علاقے میں کار کی ٹکر سے ایک کتا جاں بحق ہو گیا تھا، اس واقعے پر انہوں نے اتر کر کتے کو سڑک سے ہٹایا اور قریب میں واقع خالی پلاٹ پر دفنایا اور اللہ کو گواہ بنایا۔ بس اسی لمحے انہوں نے زندگی تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ 2002 میں تبلیغی جماعت سے وابستگی کے بعد جنید جمشید نے اپنے معاشی حالات کے باعث میوزیکل شوز جاری رکھے تاہم 2004 میں موسیقی کی دنیا کو مکمل خیر باد کہہ دیا

ہوئی جب ایک دوست ان کو اجتماع میں لے گیا لیکن نہیں تبدیلی تو اندر چل رہی تھی۔ جب جنید نے مولانا طارق جمیل کو کہا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ بولتے جائیں اور میں سنتا جاؤں، مجھے وہ سب کچھ حاصل ہے جو آج کے نوجوان کا خواب ہے مگر میرے اندر اندھیرا ہے، میرا اندر گھٹا ہوا ہے، میں وہ کشتی ہوں جس کی کوئی منزل نہیں، جس کا کوئی ساحل نہیں۔۔۔۔!!

وہ تلاش میں تھا، سچ کی تلاش میں تھا، حق کی تلاش میں تھا اسی وجہ سے وہ اپنی زندگی سے مطمئن نہیں تھا۔ یہ

مشکل راستہ تھا، یہ آزمائش کی راہ تھی، اس میں طعنے تھے، لوگوں کے سوال تھے، معاشی تنگی کی آزمائش تھی، پھر ایک دن ایسا بھی آیا جب گھر میں سو روپے بھی نہیں تھے، بچے اعلیٰ سکولوں سے اٹھ لئے گئے، گھر کا بجٹ دوبارہ بنایا گیا، یہ امتحان گاہ تھی، جنید جمشید خود کہتے ہیں کہ جو اللہ کا ہو جاتا ہے، اللہ اسے چیک تو کرتا ہے نا، مجھے بھی بارہا آزمایا گیا کہ میں ڈگمگا تو نہیں جاؤں گا مگر میں ٹوٹا نہیں، میں ہارا نہیں کہ یہ راہ میں نے محبت سے چنی تھی۔

''میں یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں میوزک سے بڑا کام ہی کوئی نہیں، دیکھو کتنی شہرت مل رہی ہے، دنیا جہان کا میڈیا میرے پیچھے ہے۔ میں تو اسے ہی سب کچھ سمجھتا جا رہا تھا یہاں تک کہ میری ملاقات کچھ ایسے لوگوں سے ہوئی جنہوں نے مجھے کہا کہ ٹھیک ہے جنید آپ یہ کام کر لیں لیکن غور کر لیں کہ کیا واقعی آپ کو اس کام کے لئے بھیجا گیا ہے۔ غور کریں کہ آپ کا ٹیلنٹ اتنا زیادہ نہیں مگر اللہ آپ کو زیادہ نواز رہا ہے، کوئی تو وجہ ہے نا''

یہ بتاتے ہوئے جنید ماضی کے ایام میں کھوئے ہوئے تھے۔

''کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ دونوں چیزوں کو ساتھ لے کر چلتے.....''

''سیب سیب ہے مالٹا نہیں ہے یا پھر مالٹا مالٹا ہے سیب نہیں ہے۔ دو کشتیوں میں پیر رکھ کے بندہ چل ہی نہیں سکتا''

جنید کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

کلین شیو اور مغربی طرز کے جدید کپڑوں میں نظر آنے والے گلوگار، موسیقار لمبی سی داڑھی کے ساتھ ٹیلی ویژن پر نعتیہ کلام اور حمد و ثنا، کرتے نظر آنے لگا۔ ان کی نعتوں اور حمدیہ کلام پر مشتمل پہلا البم 'جلوہ جاناں' سن 2005ء میں ریلیز کیا۔ بعد ازاں 'محبوب یزداں' 2006 میں اور 'بدر الدجا' 2008 میں اور 'بدیع الزماں' 2009 میں ریلیز کیا۔

جنید جمشید نے 2004 میں میوزک انڈسٹری کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کیا۔ جنید جمشید نے انکشاف کیا تھا کہ ان کے قریبی دوست نے انہیں کئی بار دعوت تبلیغ دی تھی۔ مگر وہ ہمیشہ ادھر ادھر ہو جاتے تھے۔ تاہم ایک بار وہ تبلیغ جماعت کے ساتھ منسلک ہوئے تو گویا ان کی دنیا ہی بدل گئی۔ کئی ایسے موڑ آئے کہ جنید جمشید ڈگمگائے مگر تبلیغ میں شمولیت نے ان کا ایمان مزید پختہ کر دیا۔ جنید جمشید نے بارہا کہا کہ وہ موسیقی کے میدان میں وہ سکون نہ حاصل کر سکے جو انھیں تبلیغ کے میدان میں میسر آیا۔

جنید جمشید کی زندگی میں ایک اور اہم نام مولانا طارق جمیل کا ہے۔ طارق جمیل نے جنید جمشید کو تبلیغ میں ہمیشہ ساتھ رکھا۔ دونوں نے مل کر اسلام اور دین کی خوب خدمت کی۔ دونوں نے کئی بیرون ملک دورے بھی کیے اور ہزاروں افراد کو دین اور ایمان کی دولت سے متعلق اہم بیانات دیئے۔ جنید جمشید اور طارق جمیل نے ہزاروں افراد کو حج بھی کروائے۔ دونوں رہنماؤں کے ساتھ حج کرنے کے لیے لوگ کئی کئی ماہ سے تیاریاں شروع کرتے تھے۔ دونوں رہنماؤں نے ایک ساتھ متعدد حج کیے۔ دنیا کے سامنے ایک مثال تھی جو قائم کی جا رہی تھی کہ اللہ کے لئے سب کچھ چھوڑا جا سکتا ہے!!

☆☆☆☆☆

الٰہی تیری چوکھٹ پر بھکاری بن کے آیا ہوں
سراپا فقر ہوں عجز و ندامت ساتھ لایا ہوں
بھکاری وہ کہ جس کے پاس جھولی ہے نہ پیالہ ہے
بھکاری وہ جسے حرص و ہوس نے مار ڈالا ہے
متاع دین و دانش نفس کے ہاتھوں سے لٹوا کر
سکون قلب کی دولت ہوس کی بھینٹ چڑھوا کر
لٹا کر ساری پونجی غفلت و نسیاں کی دلدل میں
سہارا لینے آیا ہوں ترے کعبے کے آنچل میں

ملک کے طول و عرض میں رقت بھری آواز گونجتی تو آنکھیں نم اور دل میں اجالا ہو جاتا تھا۔ اسی دوران جنید جمشید نے قرض لے کر جے ڈاٹ کے نام سے ملبوسات کا کاروبار بھی شروع کر دیا جو آج پاکستان کے نمایاں ترین فیشن برینڈز میں سے ایک ہے۔ اللہ نے ان کے کاروبار میں برکت ڈالی اور ملک کا بڑا برانڈ بن کر ابھرا۔ جنید جمشید اب سارا وقت تبلیغ دین کو دینے لگے اور عام دنیا کے علاوہ ٹیلی ویژن پروگراموں میں بھی دین کی دعوت دینے لگے۔ ان کی پہچان ٹی وی اسکرین پر ''مذہبی دانشور'' کی حیثیت سے ہو چکی تھی۔ انہوں نے ایک نئی

جنید جمشید دوران حج اپنے صاحبزادوں کے ہمراہ

دنیا سے خود کو روشناس کروایا جس میں خوش بھی تھے۔ جنید نے لوگوں کو اپنے حسن و اخلاق سے ہمیشہ متاثر کیا۔ ان کا دھیما لہجہ اور مسکراتا ہوا انداز دیکھنے والوں کی دل میں گھر کر جاتا تھا۔ جنید جمشید یاروں کے یار تھے۔ انتہائی مصروف وقت کے باوجود وہ ہمیشہ سماجی کاموں کے لیے بھی تیار رہتے تھے۔ وہ ایک نرم مزاج آدمی تھے۔ وہ ہمیشہ درگزر کا معاملہ کیا کرتے تھے۔ اگر کوئی اسے گالی بھی دے دیتا تو مسکرا دیا کرتے تھے۔ ان پر لوگوں نے فتوے بھی لگائے۔ مگر جنید جمشید ان افتادگرنے والوں کیلئے ہمیشہ دعا کیا کرتے تھے۔

ایک بار انہوں نے کہا تھا کہ "2003ء میں میں نے کہیں پڑھا کہ ایک خاتون کو زچگی کے لیے جھنگ سے تانگے پر فیصل آباد لے جایا جا رہا تھا، جو راستے میں ہی دم توڑ گئی۔ نہ تو جھنگ میں زچگی کے لیے کوئی ہسپتال تھا اور نہ اس خاتون کو بہتر ٹرانسپورٹ میسر آسکی، جس کے باعث اس کی جان چلی گئی۔ یہ واقعہ پڑھ کر مجھے شدید جھٹکا لگا۔ میں نے اس خاتون کا شہری عورتوں کے ساتھ موازنہ کیا۔ میری بیوی نے چار بچوں کو جنم دیا، ہر بار اسے بہترین سہولیات میسر آئیں، کیونکہ وہ شہر میں رہتی تھی۔ میں نے سوچا کہ آخر ہماری دیہات کی خواتین ہی کو یہ تکلیف کیوں برداشت کرنا پڑتی ہے۔"

انہوں نے کہا کہ اس واقعے کے بعد میں نے دیہی خواتین کے لیے کام کرنے کی ٹھان لی۔ کچھ تحقیق کرنے پر انہیں معلوم ہوا کہ ایک فلاحی تنظیم "مسلم چیرٹی" پسماندہ علاقوں میں زچہ بچہ کی صحت کے لیے کام کر رہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے مسلم چیرٹی سے رابطہ کیا اور اس سے وابستہ ہو گئے۔ تب سے اپنے آخری وقت تک جنید جمشید نعت خوانی اور اپنی عوامی پذیرائی کو بروئے کار لاتے ہوئے فنڈز اکٹھے کرتے رہے اور مسلم چیرٹی کے ساتھ مل کر اب تک پسماندہ علاقوں کی خواتین کے لیے 5 ہسپتال قائم کر چکے تھے۔

☆☆☆☆☆

اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور انسان کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ ہر انسان کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا۔

ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ (القرآن)

خالق کائنات نے ہر جاندار کیلئے موت کا وقت اور جگہ متعین کر دی ہے۔ موت نہ نیک لوگوں پر رحم کھاتی ہے اور نہ ظالموں کو بخشتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد اور تبلیغ کرنے والوں کو بھی موت اپنے گلے لگا لیتی ہے اور گھر میں بیٹھنے والوں کو بھی موت نہیں چھوڑتی۔ ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے۔ ہر انسان کسی نہ کسی کیلئے اہم ہوتا ہے، کوئی ماں باپ کیلئے تو کوئی بیوی بچوں کیلئے اور کوئی عزیز اقربا کیلئے، مگر کچھ

لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ماں باپ، بیوی بچوں، عزیز واقرباء کے ساتھ ساتھ دنیا والوں کیلئے بھی اہم ہوتے ہیں۔سب ہی انسانوں کا ایک وقت متعین ہے۔مگر کچھ انسان دارفانی سے کوچ کرنے کے بعد بعد بھی دلوں میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

بروز بدھ تین بجکر چالیس منٹ پر گلگت ائر پورٹ سے PK661 نے اڑان بھری تو کسے پتا تھا کہ یہ اڑان ان مسافروں کی آخری اڑان ثابت ہوگی، کسے پتا تھا کہ اسلام آباد جانے کی نیت سے جہاز میں بیٹھے، 47 افراد بجائے اسلام آباد کے کہیں اور پہنچ جائیں گے۔ گلگت سے اسلام آباد کیلئے روانہ ہونے والا جہاز PK661 سوا چار بجے ایبٹ آباد کے قریب حویلیاں میں گر کر تباہ ہوگیا، جہاز میں 42 مسافر اور عملے کے پانچ ارکان بھی شامل تھے جو سب کے سب شہید ہوگئے، کہا جاتا ہے کہ جہاز کا انجن یا تو پھٹ گیا تھا یا اس میں آگ لگ گئی تھی، پائلٹ نے بستی کو بچانے کے لئے جہاز کو پہاڑ سے ٹکرادیا۔حادثے میں جاں بحق ہونے والے سب ہمارے لئے خاص تھے۔ مرحومین میں معروف شخصیات جنید جمشید اور ڈی۔سی۔او چترال اوسامہ احمد وڑائچ شامل تھے۔ اس حادثے میں مرنے والے سب لوگ اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں مگران میں اسماء عادل (ائیر ہوسٹس) بھی شامل ہیں جو دو معصوم بچوں کی ماں تھیں۔گویا یہ حادثہ کئی رشتوں کو نگل گیا۔ پورا ملک اس حادثے پر سوگوار ہے۔ 31 مرد 9 خواتین اور 2 بچے اس حادثہ میں اپنے خالق حقیقی سے جاملے ان میں تین غیر ملکی بھی شامل ہیں مگر اس جہاز کے سیٹ نمبر 37 پر بیٹھا ہوا ایک شخصیت ہم سب کیلئے بہت ہی خاص تھی۔میری مراد جنید جمشید سے ہے۔جنید جمشید، اسلام و پاکستان کی آن اور شان تھا۔اس بدقسمت جہاز میں وہ اپنی بیوی اور سسر کے ساتھ سوار تھا۔جنید مرحوم مستورات کی جماعت میں اپنی بیوی اور سسر کے ساتھ چترال کے دورے پر گیا تھا۔

اللہ تعالی نے اپنے دین کی وجہ سے جنید جمشید کو ایک عظیم مرتبہ عطا کیا، ورنہ جہاز میں تو اور لوگ بھی سوار تھے، لیکن صرف جنید جمشید کا ہی نام کیوں زبان زد عام ہے۔ ہر چینل، ہر اخبار، تمام سوشل میڈیا پر صرف جنید جمشید کا ہی تذکرہ ہو رہا ہے۔میڈیا ہاؤسز والے کسی بھی مہمان کو بلاتے ہیں تو وہ پورے حادثے میں صرف جنید جمشید کو ہی فوکس کر رہے ہیں، آخر ایسا کیوں ہے۔۔۔؟۔اگرچہ اس حادثے میں اور بھی قیمتی جانیں ہلاک ہوئیں، تمام انسانی جانوں کے ضیاع پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔آپ لوگ چاہے کچھ بھی سوچیں، لیکن جو بات میں سمجھ پایا ہوں وہ صرف جنید جمشید کا دین سے لگاؤ تھا اور محبت تھی۔ اور وہ محبت اور لگاؤ ایسا نہیں تھا کہ جو انہیں فری گفٹ کے طور پر ملا تھا۔ بلکہ اس کیلئے انہوں نے باقاعدہ جدوجہد کی تھی اور اپنے نفس سے جہاد کیا تھا۔ کہاں مغربی ثقافت کا مزین جنید جمشید، ہاتھوں میں گٹار، جینز اور شرٹ، گلیمر کی زندگی، رنگینوں کا دور دورہ اور کہاں سنتِ رسول سے روشن چہرہ، درس و تدریس کی محافل، چٹائی کا بستر اور دین اسلام کی تبلیغ کی زندگی بسر کرنے والا جنید جمشید جو ہمہ وقت اپنا دل بدلنے کی دعا کرتا نظر آتا۔یہی وہ چیز تھی جو جنید جمشید کو باقی مسافروں سے ممتاز کرتی ہے، حالانکہ جہاز میں انجینئر، ڈاکٹر، ڈی سی اور دیگر اہم انسان بھی سوار تھے، لیکن صرف جنید جمشید کا ہی نام سب سے نمایاں ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو اللہ اور اُس کے دین کیلئے وقف کردے پھر دنیا کی ساری عزتیں، توقیریں اور عظمتیں اُس کے گرد حصار بنا کر کھڑی ہو جاتی ہیں، پھر چاہے وہ زندہ ہو یا موت کی دہلیز پار کر چکا ہو۔ آج ہر آنکھ اشکبار ہے۔ سب کو جنید جمشید یہی کہہ رہا ہوگا کہ حشر میں پھر ملیں گے اپنا خیال رکھنا۔ ایک عجب اتفاق ہے۔کہ جب ان کے والد فوت ہوئے وہ تب بھی اللہ کی راہ تبلیغ میں ہی تھے۔ آج جب خود انتقال کیا تو خود بھی اللہ کی راہ میں نکلے ہوئے تھے۔ انہوں نے سماجی رابطے کی ویب سائٹ پر اپنی آخری یادگار تصاویر پوسٹ کیں جن میں انہوں نے کہا کہ میں اپنے دوستوں کے

ہمراہ جنت میں ہوں اور دین کا کام کر رہا ہوں۔ جہاز میں سوار ہونے سے پہلے ان کے دوست نے کہا کہ جہاز کی آواز مجھے تبدیل لگ رہی ہے، آپ رک جاؤ تو جنید نے اسے تسلی دی کہا اللہ مالک ہے کچھ نہیں ہوتا۔ جنید جمشید نے چترال میں 10 دن تبلیغ دین کا کام کیا اور وہاں سے روانگی سے قبل انہوں نے چترال میں آخری خطاب کیا جس میں انہوں نے موت اور آخرت کے موضوع پر بات کی تھی۔

جنید جمشید نے 3 شادیاں کی تھیں ان کی بڑی بیگم عائشہ جنید سے ان کے 3 بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ہی انھوں نے اپنے بڑے بیٹے تیمور جنید کی شادی دھوم دھام سے کی تھی۔ ان کی دوسری بیگم کا تعلق اسلام آباد سے ہے اور حادثے میں جاں بحق ہونے والی نیہا جنید کا تعلق لاہور سے تھا۔ دونوں بیگمات سے ان کی کوئی اولاد نہیں ہے۔

حادثے کا شکار ہونے والی قومی ایئر لائن کی پرواز کی تحقیقات جاری ہیں۔ تحقیقاتی ٹیم نے جائے حادثہ کا دورہ بھی کیا۔ ٹیم مختلف پہلوؤں سے حادثے کی تحقیقات کر رہی ہے۔ تفتیشی ٹیم نے فرانسیسی کمپنی کے حکام سے رابطہ کر لیا ہے۔ تحقیقاتی ٹیم نے سول ایوی ایشن اور پی آئی اے حکام کو سانحہ کو تیلیاں کی تحقیقات مکمل ہونے تک طیارے کا ملبہ نہ ہٹانے کا کہہ دیا۔ تفتیشی ٹیم نے طیارے کے بلیک باکس اور دیگر شواہد پر فرانسیسی کمپنی کے حکام سے تفصیلی گفتگو کی ہے۔ طیارہ کا بلیک باکس فرانس بھیجنے کی تیاریاں بھی مکمل کر لی گئی ہیں۔ تحقیقاتی ٹیم کے دو افراد بلیک باکس لے کر آئندہ 48 گھنٹوں میں فرانس جائیں گے۔ طیارے کا بلیک باکس فرانس میں ڈی کوڈ کیا جائیگا جس کے بعد تحقیقات میں مزید پیش رفت متوقع ہے۔

اس دنیائے فانی میں انسان آتے ہیں چلے جاتے ہیں، یہ سلسلہ ازل سے جاری ہے مگر بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دلوں میں گھر کرتے ہیں، جن کا جانا خبر بن جاتا ہے، جن کے لئے لوگ روتے ہیں، کچھ تو ان میں ہوتا ہے، کوئی تو الگ بات ہوتی ہے جو ان کے لئے ہر آنکھ روتی ہے، جنید جمشید میں بھی بہت کچھ الگ تھا، افسوس تو یہ ہے کہ چراغ بجھتے جا رہے ہیں، اماوس کی حکمرانی ہے، 2016 عبدالستار ایدھی کو لے گیا، امجد صابری کی مدھر تا خاموش ہوئی اور اب جنید جمشید جیسا سورج بجھ گیا، اخلاق زندہ رہتے ہیں، اعمال ساتھ جاتے ہیں، جنید کا معاملہ اللہ کے سپرد مگر اس بات کے سب گواہ ہیں کہ وہ اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے، رہے نام اللہ کا۔۔۔!!!

☆☆☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



اپنے دیس سے، اپنے شہروں سے موصولہ، وہ سچ بیانیاں
جن کو پڑھ کر، اپنی مٹی کی خوش بو، آس پاس محسوس ہوتی ہے

پہلی سچ بیانی

جیون بن باس ٹھہرا

ام مناہل



اس دوشیزہ کا زندگی نامہ جو خوب صورت شکل تو لائی مگر خوب صورت نصیب نہ لاسکی تھی

میری پیدائش پاکستان کے خوب صورت شہر پشاور کے علاقے حیات آباد کے ایک متوسط گھرانے میں ہوئی۔ سات بہن بھائیوں میں میرا نمبر پہلا تھا جن میں ہم چار بہنیں اور تین بھائی شامل تھے۔ میرے ابو کی پرچون کی بہت بڑی دکان تھی۔ لہٰذا پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ہمارے گھر میں ایک ٹائم میں کم از کم تین سالن تو ضرور پکتے تھے۔ ان میں سبزی، دال اور گوشت تینوں شامل ہوتے تھے کیونکہ ابو کو اچھا کھانا اور دوسروں کو کھلانا بہت پسند تھا۔ کوئی مہمان ہمارے گھر سے خالی پیٹ اور کوئی ضرورت مند خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا اور پھر کھانا دکان پر بھی جاتا تھا۔ ہر وقت ہمارے گھر کا دسترخوان مہمانوں سے بھرا رہتا تھا۔ وہ ہماری زندگی کا بہت حسین دور تھا۔ ہر طرف خوشیاں رقص کرتی تھیں۔

پٹھان فیملی سے تعلق ہونے کی وجہ سے ہم سب بہن بھائی حسن میں اپنی مثال آپ تھے۔ دوسری صورت میں اچھی خوراک، ذہنی سکون اور گھر کے خوشگوار ماحول نے ہماری صحتوں پر اچھا اثر ڈالا تھا۔

زندگی یونہی خوشیوں کی طرف گامزن تھی کہ ہمارے گھر کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی اور ہمارا خوشیوں بھرا گھر ایک دم ویران ہوگیا۔

ان دنوں میں اٹھارہ برس کی تھی، ابو کے دوستوں میں سے میرا بہت اچھا رشتہ آیا ہوا تھا۔ لڑکا ایئر فورس میں پائلٹ آفیسر تھا۔ امی ابو اس رشتے پر غور و فکر کر رہے تھے کہ میری سب سے چھوٹی بہن جو اس وقت صرف چار برس کی تھی کو یرقان جیسی مہلک بیماری ہوگئی جو کہ بعد میں بگڑ کر کالا یرقان میں تبدیل ہوگئی۔ ہر طرح کا علاج کروایا مگر بیماری کم ہونے کی بجائے بڑھتی ہی گئی اور اس تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے ایک دن یہ ننھی سی جان امی کے ہاتھوں میں ختم ہوگئی۔ ہماری یہ بہن دنیا سے کیا گئی ہم پر تو جیسے خوشیوں کے دروازے ہی بند ہوگئے۔ اس کے انتقال کے بعد تو موت نے ہمارے گھر کا دروازہ ہی دیکھ لیا۔ کھڑکی، دروازوں، در و دیوار حتیٰ کہ گھر کے ہر کونے سے ہمیں موت ناچتی ہوئی دکھائی دیتی۔

چھوٹی بہن کے انتقال کو ابھی پورا سال بھی نہیں گزرا تھا کہ مجھ سے چھوٹی بہن کو موتی بخار ہوا۔ ڈاکٹروں نے بخار توڑنے کی بھرپور کوشش کی مگر تمام تدبیریں بے سود ثابت ہوئیں۔ میری یہ کھلتی ہوئی کلی جیسی بہن بھی ہفتے بھر بخار میں مبتلا رہنے کے بعد

جنت سدھار گئی۔

ابھی ہم بہنوں کا غم نہیں بھولے تھے کہ ایک دفعہ پھر قسمت کا کاری وار سہنا پڑا۔ وہ ایک عام سا دن تھا۔ میرا سب سے بڑا بھائی جو اس وقت صرف سولہ برس کا تھا۔ اسکول سے آ کر اپنی سائیکل لے کر گلی میں چلانے نکلا۔ اسے گئے ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ہمارے ایک محلے دار نے آ کر خبر دی ثاقب کا ایک کار سے ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ اسے لے کر اسپتال گئے ہیں۔ میں اور امی فوراً اسپتال پہنچے اور ابو کو اطلاع کرائی۔

ثاقب کو پٹیوں میں جکڑا دیکھ کر امی تو اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں۔ میں نے ہمت سے کام لے کر امی کو سنبھالا۔ ثاقب کے سر اور بازوؤں پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ ڈاکٹر بہت تشویش کا اظہار کر رہے تھے۔ ہم لوگوں کو ایک ایک لمحہ پہاڑ کی مانند لگ رہا تھا۔ اس زمانے میں آپریشن تھیٹر میں اتنی سہولیات بھی نہیں ہوتی تھیں۔ بہرحال زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے اسے زندہ رکھنا مقصود ہو تو ہر صورت بچا لیتا ہے اور اگر زندگی کی سانسیں ختم ہو چکی ہوں تو تمام تر سہولیات کی باوجود انسان جی نہیں پاتا۔ ثاقب بھی ابو کے اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی چند گھنٹوں تکلیف میں مبتلا رہنے کے بعد دنیا سے منہ موڑ گیا۔ کار والا جاتے جاتے ہمارے گھر پر ایک اور بم گرا گیا تھا۔ ثاقب تو تمام تکلیفوں سے آزاد ہو کر اپنی جان چھڑا گیا مگر جاتے ہوئے ہمیں پریشانیوں کی گہری کھائی میں دھکیل گیا۔ نہ جانے کیسے ثاقب سائیکل چلاتے ہوئے مین روڈ تک چلا گیا تھا۔

تین بچوں کی موت کے بعد امی تو غم سے نڈھال ہو ہی چکی تھیں مگر ابو نے تو ان کی موت کا ایسا صدمہ لیا کہ ہر وقت گم صم رہنے لگے۔ گھر سے دکاندار اور دکان سے گھر اس کے علاوہ جیسے ہر چیز سے ان کا ناتا ٹوٹ چکا تھا۔ ایک دن ابو کو دکان گئے ہوئے کچھ دیر گزری تھی کہ دکان سے ایک لڑکا آیا اور بولا۔ ”مالک کی حالت بہت خراب ہے۔ لوگ انہیں اسپتال لے کر گئے ہیں۔“



امی چھوٹے بھائی کے ساتھ اسی لڑکے کی ہمراہی میں اسپتال گئیں تو پتا چلا ابو کو فالج کا اٹیک ہوا ہے۔ ابو بیمار کیا ہوئے زندگی ایک دم سے جام ہوگئی۔ جمع پونجی ابو کے علاج پر اور پرچون کی دکان گھر میں خرچ ہو رہی تھی۔ ہمیں تو چاروں طرف سے پریشانیوں نے ایسا گھیرا کہ ان سے نکلنا مشکل ہوگیا۔ اب ہمارے گھر کا وہ وقت نہیں رہا تھا جب روزانہ ایک وقت میں تین سالن پکتے تھے اس لیے امی صرف ایک ہی سالن پر اکتفا کرتیں۔ زندگی یوں بھی ایک دن پلٹا کھائے گی، ہم نے کبھی سوچا نہ تھا۔

بظاہر تو امی چلتی پھرتی نظر آتیں مگر اندر سے کس طرح گھل رہی ہیں یہ مجھے ان کا چہرہ دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا۔ اچھے وقت کے بعد برے وقت کی آمد انسان کو بہت دکھ دیتی ہے اور وہ ماضی کی خوشگوار یادوں سے نکل نہیں پاتا۔ یہی کچھ امی کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ میں ہر پل امی کو صبر کی تلقین کرتی مگر امی ماضی کو یاد کر کے ٹھنڈی آہیں بھرتی رہتیں۔

نہ جانے تقدیر ہمارا کون سا امتحان لے رہی تھی۔ میرا رشتہ جہاں تھا وہیں رہ گیا اور آنے والے پائلٹ آفیسر نے تو ایسی اڑان بھری تھی کہ واپسی کا راستہ ہی بھول گیا۔ شاید وہ بھی ہمارے گھر کے حالات دیکھ کر گھبرا گیا ہو۔ اندھیرے میں چلنے سے تو ہر کوئی گھبراتا ہے اور ہمارے گھر تو چار سو اندھیرا اور ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ ابو الگ پلنگ سے لگے ہوئے تھے۔ وہ نہ چل پھر سکتے تھے نہ بول سکتے تھے مگر دیکھ تو سکتے تھے اور اپنے ہنستے بستے گھر کے بگڑتے حالات دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر کر تڑپ کر رہ جاتے۔ علاج تو برابر ہو رہا تھا مگر افاقہ ہونے کی بجائے بیماری بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ان کا سب سے بڑا جو مرض تھا وہ غم اور صدمہ تھا جو اب زندگی بھر ان کے ساتھ تھا۔ بچوں کی موت نے انہیں کھوکھلا کر کے رکھ دیا تھا۔

ایسے وقت میں تو ہمارے رشتے داروں نے بھی ہمارا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ پشاور میں ہمارے جتنے رشتے دار تھے۔ حالات خراب ہونے کے بعد کبھی انہوں نے پلٹ کر ہماری خبر نہیں لی تھی۔ خودغرض اور مطلب پرست انسان ایسے ہی ہوتے ہیں جنہیں صرف اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے کسی کے دل پر کیا گزر رہی ہے، اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

ہم سب تنہا اپنے حالات سے لڑ رہے تھے۔ ادھر دکان کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ وہ بھی مسلسل گھاٹے میں جارہی تھی کیونکہ سنبھالنے والے ورکر لڑکے نوعمر اور ناتجربہ کار تھے اور بھائی چھوٹے تھے۔ وہ دکان کی دیکھ بھال کرنے سے قاصر تھے۔ ہمارے حالات بد سے بدتر ہوگئے۔ دکان بند ہوگئی۔ جمع پونجی ابو کے علاج پر ختم ہوگئی۔ جس گھر کا دسترخوان تینوں وقت مہمانوں سے بھرا رہتا تھا اس گھر میں دسترخوان بچھنا خواب بن گیا۔ یہ کیسی آزمائش تھی۔ یہ کیسا امتحان تھا جو ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ ایک ایک کر کے گھر کی چیزیں بکنے لگیں۔ دکانداروں نے ادھار دینا بند کر دیا۔ گھر میں فاقوں کی نوبت آگئی۔

ابو کی حالت سدھرنے کی بجائے مزید بگڑتی گئی اور وہ بھی ایک دن ہم سب کو روتا چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور ہمارے لیے اذیتوں کے لاتعداد مصائب چھوڑ گئے۔

اُدھر ابو فالج زدہ زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہوئے اُدھر امی دل کے مرض میں مبتلا ہو کر پلنگ سے لگ گئیں۔ ابو جس حالت میں بھی تھے ہمارے لیے بہت بڑا سہارا تھے۔ ہمارے گھر سے دو سال میں چار افراد چٹ پٹ ہو کر منوں مٹی تلے جا سوئے تھے۔ گھر ایک دم سے خالی ہوگیا تھا۔ گھر کی چوکھٹ پر اداسیوں نے ڈیرے ڈالے تو خالی گھر کے در و دیوار سے ہر وقت وحشت ٹپکتی رہتی اور گھر کی ویرانی دیکھ کر امی ہر وقت ہولتی رہتیں۔ چھوٹے بہن بھائی کا ساتھ تھا امی کسی کام کے قابل نہیں رہیں۔ جب کہیں سے کوئی آسرا نہیں رہا تو امی نے اپنے زندہ رہ جانے والے بچوں کی زندگی کی خاطر کراچی ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ دکان تو ختم ہو ہی چکی تھی۔ ابو کا بہت ارمانوں سے بنایا ہوا خوب صورت گھر بیچ کر لوگوں کے قرضے ادا کیے اور کراچی کے لیے روانہ ہوگئے۔ یہاں ہماری قسمت

نے ساتھ دیا اور گھر بہت اچھی قیمت پر چلا گیا۔

پشاور سے کراچی تک کا تھکا دینے والا طویل سفر تو ختم ہو گیا مگر میری زندگی کا مشکل ترین اور کٹھن سفر جو شروع ہوا وہ تاحال جاری ہے اور میری موت کے ساتھ ہی ختم ہوگا۔

☆......☆

کراچی میں امی کی ایک کالج کے زمانے کی سہیلی رہتی تھیں۔ ان کا نام یاسمین تھا۔ ہم نے کچھ عرصہ ان کے یہاں قیام کیا، میں آج بھی یاسمین آنٹی کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے اس مشکل وقت میں ہمارا ساتھ دیا۔ اپنوں نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا تھا۔

اسی دوران گھر کا چولہا جلانے کی خاطر میں نے گھر سے باہر قدم نکالا۔ یاسمین آنٹی کی معرفت مجھے ایک نجی اسکول میں ٹیچنگ کی جاب مل گئی۔ پرکشش تنخواہ تھی لہٰذا ہمارے گھر کے حالات کچھ حد تک سدھر گئے۔ کرائے پر گھر بھی مل گیا۔ گھر کا چولہا بھی جل گیا اور بہن بھائیوں کے اسکول میں داخلے بھی ہو گئے اور امی کا علاج بھی صحیح طرح سے ہونے لگا۔ مگر ابھی بھی ہماری آزمائش ختم نہیں ہوئی تھی۔ کراچی بھی ہمارے لیے کوئی خوشیوں کا پیامبر ثابت نہیں ہوا۔ یہاں آ کر مزید ایک بہن اور ایک بھائی کا رضائے الٰہی سے انتقال ہو گیا اور سات بہن بھائیوں میں ہم دو بہن بھائی رہ گئے۔ بھائی مجھ سے تقریباً دس سال چھوٹا تھا اور امی کی امیدوں کا واحد سہارا تھا۔

ان دنوں یاسمین آنٹی کے رشتے داروں میں سے میرا پھر ایک رشتہ آیا۔ لڑکے کا اپنا گارمنٹس کا کاروبار تھا۔ اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے مگر امی نے نہ جانے کیا سوچ کر اس رشتے سے انکار کر دیا۔ شاید وہ اپنی اکلوتی بیٹی کو نظروں سے دور کرنے کی روادار نہ ہوں یا پھر انہیں بھائی کی تعلیم ادھوری رہ جانے کا خدشہ ہو۔ گھر کے تمام مسائل میری تنخواہ سے پورے ہو رہے تھے۔ میں مسلسل جدوجہد کر رہی تھی جو تنخواہ آتی وہ گھر کے اخراجات پر صرف ہو جاتی۔ مجھے تو کراچی آ کر احساس ہوا تھا کہ گھر چلانا کیا ہوتا ہے اور پیسہ کمانا کسے کہتے ہیں۔

جب تک ابو کے کندھے سلامت رہے کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ گھر کی ذمہ داری کیا ہوتی ہے اور اپنے گھر کی چھت کسے کہتے ہیں۔ جب گھر کا کرایہ، بجلی گیس کے بل، اسکول کی فیس، گھر کا راشن ان سب کی ادائیگی کے بعد ہاتھ میں سوائے قسمت کی لکیروں کے کچھ نہیں بچتا مگر میں مطمئن تھی کہ بھائی پڑھ لکھ کر کسی قابل ہو جائے تو میرا سہارا بن جائے گا۔ میں نے اسکول ٹائم کے بعد بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ فارغ ٹائم میں لوگوں کے کپڑے سینے لگی۔

جس سے آمدنی میں کچھ اضافہ ہوا اس کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ بی اے کے پیپروں کی تیاری بھی کرتی گئی۔ میرا خیال تھا بی اے کے بعد بی ایڈ کر کے گورنمنٹ جاب کے لیے اپلائی کر دوں گی۔ پھر بی ایڈ کرنے کے بعد مجھے یاسمین آنٹی کے ایک رشتے دار کی معرفت گورنمنٹ ہائی اسکول میں پرنسپل (ہیڈ مسٹریس) کی جاب مل گئی اب ہمارے گھر کے حالات کافی حد تک بہتر ہو گئے تھے۔

☆......☆

ان ہی دنوں میری ایک ساتھی ٹیچر کی بدولت پھر میرا ایک رشتہ آیا۔ لڑکا پاکستان نیوی میں کیپٹن کے عہدے پر فائز تھا۔ اتنا اعلیٰ رشتہ قسمت والی لڑکیوں کو ملتا ہے۔ وہ بھی ان حالات میں جب لڑکی کے سر پر باپ کی شفقت اور بڑے بھائی کا سہارا نہ ہو مگر اس رشتے کا حشر بھی پہلے والے رشتے جیسا ہوا۔ امی کے منہ سے میری شادی کے لیے کبھی ہاں ہی نہیں نکلی۔ اس کے بعد میرا جو بھی رشتہ آتا وہ ہر لحاظ سے فٹ ہونے کے باوجود امی کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ انہیں شاید اپنی بیٹی کے لیے کسی کوہ قاف کے شہزادے کا انتظار تھا۔ وہ اب تک ماضی کی بھول بھلیوں میں گم تھیں یا دوسرے لفظوں میں ''میں'' امی کے لیے پیسہ کمانے والی مشین بن چکی تھی۔

☆......☆

بھائی نے میٹرک بھی رو دھو کر کیا اور میری لاکھ منتوں کے باوجود تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں نے

اسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھائی کہ دیکھو آنے والا وقت اس سے زیادہ مشکل ترین ہوگا۔ تم اپنی تعلیم تو مکمل کرو تاکہ آگے کسی اچھی نوکری کا بندوبست ہو سکے مگر اس نے میری کسی نصیحت پر عمل نہیں کیا۔ جس بھائی کی خاطر میں نے اپنی زندگی برباد کرلی تھی اس نے میرے ارمانوں پر پانی پھیر کر میری امیدوں کو مٹی میں ملا دیا۔ اس بات پر ہمارے گھر میں پہلی بار کافی ان بن ہوئی کیونکہ امی نے یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ کہیں نہ کہیں چھوٹی موٹی نوکری مل جائے گی تو اس کی ماں نہ بن۔“

اب امی بات بات پر مجھے بھائی کی ماں نہ بننے کے طعنے مارا کرتی تھیں۔ اتنی قربانیاں دینے کے باوجود امی نے کبھی میری دلجوئی نہیں کی۔ میرے کان امی کے منہ سے محبت کے دو لفظ سننے کے لیے ترس گئے۔ ان کی ساری ممتا بھائی کے لیے رہ گئی۔ ہر وقت میرا اکلوتا بچہ میرا اکلوتا بچہ کرتی رہتیں مگر نہ انہیں اپنی اکلوتی بچی نظر آتی نہ اس کی خوشیاں عزیز تھیں۔

امی اپنی بیماری اور گھر کے حالات کی وجہ سے بہت چڑ چڑی ہوگئی تھیں۔ میں امی کی خدمت کرتی جاتی اور بدلے میں ان کے لعن طعن اور کوسنے کھاتی جاتی۔ مجھے آج تک یہ پتا نہ چل سکا کہ امی میرے ساتھ ایسا رویہ کیوں اختیار کرتی تھیں۔ اگر وہ اپنی بیماری کی وجہ سے ایسا کرتی تھیں تو بھائی کے معاملے میں کیا ان کی بیماری ختم ہو جاتی تھی اگر بھائی اکلوتا تھا تو میں بھی تو امی کی ایک ہی بیٹی تھی۔ میں نے تو امی کا کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا۔ ہمیشہ بڑی اولاد بن کر اپنی ذمہ داریاں نبھائی تھیں۔

☆......☆

میں بھائی کی نوکری کے لیے مسلسل کوششیں کر رہی تھی آخر ایک دن میری کوششیں رنگ لے آئیں۔ میری ایک ٹیچر کے بھائی انٹرمیڈیٹ بورڈ میں چیئرمین تھے جن کی معرفت بھائی کو ہائی اسکول میں کلرک کی جاب مل گئی اور بھائی کی پوسٹنگ حیدرآباد میں ہوئی، مگر کراچی سے حیدرآباد کا سفر کرنا اور حیدرآباد میں اکیلے رہنا بھائی کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتا کیونکہ وہ 1986-87ء کا زمانہ تھا۔ حیدرآباد ان دنوں سندھی مہاجر فسادات کی لپیٹ میں تھا۔ آئے دن کرفیو، ہڑتال، پتھراؤ، گھیراؤ نے لوگوں کی زندگیوں کو مفلوج کردیا تھا اور پھر بھائی تو ایسے حالات کا مقابلہ کرنے کا اہل نہیں تھا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اسے زمانے کا ڈر ہوتا امی نے اپنی محبت میں اسے بالکل ناکارہ کردیا تھا۔ پھر حکومت بدلی اور حالات معمول پر آگئے۔

میں نے کوشش کر کے بھائی کا ٹرانسفر کراچی کروالیا مگر بھائی کو آرام طلبی کی عادت ہوگئی تھی لہٰذا وہ اکثر و بیشتر چھٹیاں کرتا رہتا۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر اس کا آفس ریکارڈ کافی خراب ہوتا رہا جس کی وجہ سے تنخواہ بھی کٹ کر ملتی لہٰذا اس کی تنخواہ نہ ہونے کے برابر ہی رہی حالانکہ بھائی کو اتنی کم ایجوکیشن پر سرکاری نوکری اتنی آسانی سے مل گئی تھی کہ وہ اللہ کا جتنا شکر ادا کرتا کم تھا مگر اسے محنت کے بغیر روٹی کھانے کی عادت ہوگئی تھی۔

☆......☆

بڑھتی عمر اور حالات کے مصائب نے بہت جلد میرے اعصابوں کو شل کر دیا تھا اور میرے بالوں میں چاندی کے آثار نمایاں ہوگئے تھے مگر خوب صورتی اب تک میرے اندر ویسے ہی برقرار تھی۔ نوکری کرنے سے بھی میرا حسن ماند نہیں پڑا تھا جو مجھے ایک بار دیکھتا وہ عزت سے میرے گھر رشتہ لے کر ضرور آتا مگر امی نہ کہہ کر اس کے ارمانوں پر پانی پھیر دیتیں۔

میدہ کی لوئی جیسا سفید رنگ، نشیلی آنکھیں، لمبا قد اور پھر لمبے بالوں کی کمر سے نیچے آتی چوٹی میرے حسن میں چار چاند لگا دیتی مگر یہ حسن بھی میری قسمت کے دروازے نہ کھول سکا تھا۔

☆......☆

بھائی کو نوکری ملتے ہی امی کے دل میں بھائی کے سر پر سہرا سجانے کا ارمان جاگ اٹھا۔ بھائی کی تنخواہ کے چار پیسے تو امی کے ہاتھ میں آئے نہیں تھے کہ امی بھائی کے اوپر اتنی بڑی ذمہ داری ڈالنے کا سوچنے لگیں۔ میں نے امی کو سمجھایا ابھی کچھ رقم تو جمع ہو لینے

دیں پھر شادی کریں گے۔ اس بات پر امی بہت ناراض ہوئیں اور بولیں۔
"تیری شادی نہیں ہوئی اس لیے تو بھائی کی خوشیوں سے جلتی ہے۔ آنے والی اپنا نصیب خود لے کر آئے گی۔"
امی کی بات سن کر میں اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔ اتنی قربانیاں دینے کے باوجود آج مجھ پر یہ الزام بھی لگ گیا تھا کہ میں بھائی کی خوشیوں سے جلتی ہوں۔ لہٰذا میں اپنی خوشیوں کو پس پشت ڈال کر خوشی خوشی بھائی کی شادی کی تیاریوں میں لگ گئی۔ اس کے لیے پہلا مرحلہ لڑکی تلاش کرنا تھی جو امی نے یاسمین آنٹی کے خاندان میں پسند کر لی تھی۔
امی کی پسند بھائی کی پسند تھی۔ میری پسند کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میری حیثیت صرف اتنی تھی کہ اپنا پیسہ خرچ کر کے امی کی بہو کی بَری تیار کرنا اور شادی کا سارا انتظام کرنا کیونکہ بھائی کی تنخواہ تو اتنی جمع ہی نہیں ہوئی تھی جس سے شادی کا خرچا اٹھایا جا سکتا۔
میں بھائی کی شادی کے لیے دن رات ایک کر کے پیسہ جمع کر رہی تھی۔ امی کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سماتی تھیں۔ بیٹے کے سہرے کے پھول ان کی سانسوں میں بھینی بھینی خوشبو کی طرح سرائیت کرتے جا رہے تھے۔ اپنے بارے میں تو میں نے صبر کا دامن تھام لیا تھا۔ میں بھائی کی شادی کی تیاریاں کرتی جاتی اور امی کی بددعاؤں اور غصے کا کڑوا گھونٹ پیتی جاتی۔ اس آس پر کہ گھر میں بھابی آئے گی تو اس سے دل کا حال کہہ کر من کا بوجھ ہلکا کر لیا کروں گی۔ پھر بھائی کی شادی کے ہنگامے بھی سرد پڑ گئے اور میرے من کی خواہش من میں ہی رہ گئی۔
بھابی بھی سونے پر سہاگا ثابت ہوئی۔ میرے اور بھابی کے درمیان تقریباً بیس سال کا فرق تھا۔ مطلب بھابی میرے سامنے کی بچی تھی مگر جب یہ کل کی بچی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہم ماں بیٹی کو بولنے کا موقع دیئے بغیر لڑتی تو میں اور امی اس کا منہ تکتے رہ جاتے۔ ہمارے گھر کی بے سکونی کی سب سے بڑی وجہ بھائی کی نااہلی تھی۔ بھابی جب خاندان میں بہوؤں کو اچھے گھروں میں اچھا کھاتے پہنتے دیکھتی یا میکے میں بہنوں اور بھاوجوں کو عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے دیکھتی تو اس کے دل کے ارمان دل میں ہی رہ جاتے اور وہ حسد کی آگ میں جل کر سارا لاوا ہم ماں بیٹی کو بددعائیں دے کر نکالتی حالانکہ ہم دونوں کی تنخواہ سے اتنا تو گزارہ ہو جاتا تھا کہ کسی دن ہم بھوکے نہیں سوئے تھے نہ کوئی خوشی تہوار ایسا تھا جب بھابی نے نیا جوڑا نہ پہنا ہو مگر جو ناشکرے ہوں وہ کسی حال میں خوش نہیں رہتے۔ بھابی کو بھی شکر کرنے کی عادت نہیں تھی اور بھائی بھی بس اتنی نوکری کرتا ہفتے میں دو دفعہ جا کر اپنی حاضری لگا کر آجاتا اور مہینا بھر بعد اپنی تنخواہ لے آتا جس پوسٹ پر لوگ ہزاروں روپے کما لیتے ہیں بھائی بس گزارے لائق کما پاتا۔
☆......☆
پھر بھتیجا بھتیجی کی آمد شروع ہوئی تو میں نے ساس بننے کی ساری ذمہ داری اٹھائی۔ بھابی کو پلنگ پر بیٹھے کھلایا، نوکری کے ساتھ بھابی کی بھی ہر طرح سے خدمت کی کہ اس بہانے بھابی خوش تو ہو گی مگر ہر طرح سے خدمت کرنے کے باوجود میں بھابی کے دل میں جگہ نہ بنا سکی۔
زندگی کی مشقتیں اور دردناک مصائب سے نبرد آزما ہوتے ہوئے میں بہت تھک چکی تھی۔ میرا دل چاہتا میں نوکری چھوڑ کر گھر میں آرام کروں۔ دہری ذمہ داری مجھ سے اٹھائی نہیں جاتی تھی مگر جب بھی گھر میں نوکری سے ریزائن دینے کی بات کرتی، بھابی طعنے تشنے دینے لگتی۔
"تمہارا بھائی تو بدحرام ہے اگر تم نے بھی نوکری چھوڑ دی تو گھر کا چولہا کیسے جلے گا۔" ان باتوں پر گھر میں خوب ہنگامہ ہوتا پھر بھابی کے ساتھ بھائی بھی شریک لڑائی ہو جاتا تو دونوں مل کر ایسے ایسے جملوں سے نوازتے کہ میرا دل کٹ کر رہ جاتا اور میں خود پر جبر کر کے رہ جاتی حالانکہ نوکریوں کی خاطر جب سے میں نے گھر سے باہر قدم نکالا تھا۔ قدم قدم پر گندی نظروں کا سامنا بھی کیا تھا اور ایسے بھی لوگ ملے تھے جنہوں نے عزت سے میرا ہاتھ تھامنا چاہا مگر میں

زندگی کے ہر موڑ پر ثابت قدم رہی۔ ماں باپ کی عزت کو سرِ عام رسوا نہیں کیا اور ان رشتوں کو گھر کے اندر پہنچنے سے پہلے ہی ختم کردیا کہ نہ جانے امی میرے بارے میں کیا سوچیں گی۔ میں کن چکروں میں باہر نکلتی ہوں اور جب میں اپنی عزت کی حفاظت کرتے ہوئے سکون حاصل کرنے کی خاطر گھر میں داخل ہوئی تو اس وقت اپنی ہی نظروں میں گر جاتی۔ جب لڑتے ہوئے بھائی ان گالیوں سے نوازتا جو طوائف کے لیے استعمال ہوتی ہے اور میں یہ سوچ کر صبر کرلیتی کہ میں تو شروع سے ہی منحوس ہوں۔ پہلے خدمت کے بدلے میں امی کی گالیاں اور بددعائیں ملتی تھیں اور اب بھائی بھابی کی۔ میری ڈیوٹی میں تو کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ نہ میرے نصیب کی گالیاں ختم ہوئی تھیں۔ بس دینے والے لوگ بدل گئے تھے لیکن جب اپنے ہی خون سے وفا نہ تھی تو بھابی سے کیا شکایت کرتی۔ وہ تو پھر غیر خاندان کی عورت تھی۔

کاش امی بھائی کو بھی بتا سکتیں کہ تو اپنا نصیب اپنے ساتھ لے کر آئی ہے۔ بھابی تو گھر کے اتنے برے حالات میں آئی بھی نہیں تھی جتنے برے حالات میں نے دیکھے تھے۔ کہتے ہیں پیسہ عورت کی قسمت سے اور اولاد مرد کی قسمت سے ہوتی ہے۔ میرے بھائی کی قسمت میں تو آدھا درجن بچے تھے مگر اس کے نصیب میں پیسے کی خوشی نہیں تھی اگر اس کا نصیب اچھا ہوتا یا صبر کرنے والی عورت ہوتی تو بھائی اپنی ذمہ داریوں سے کوتاہی برتنے کے بجائے حالات کو سنجیدگی سے سمجھتا۔

☆......☆

حالانکہ بھابی کے آجانے کے بعد بھی میں نے امی کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر رکھی تھی۔ کبھی بھابی کو اس کی زحمت نہ دی۔ صبح اسکول جانے سے پہلے امی کو ناشتا کرواکر، کپڑے بدلوا کر دوائی وغیرہ کھلا کر اور امی کے استعمال کی ہر چیز ان کے پاس رکھ کر جاتی کیونکہ امی کو جب سے کمر کی تکلیف ہوئی تھی انہیں چلنے پھرنے میں بہت دقت ہوتی تھی بھابی کو بس دوپہر کا کھانا اور امی کو باوقت ضرورت باتھ روم لے جانا ہوتا مگر بھابی کو وہ بھی گراں گزرتا۔ میں چھٹی والے دن امی کو نہلاتی۔

ایسے ہی حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے میری زندگی کے دس سال گزر گئے بھائی بھابی کے رویئے کے بعد آج امی کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا تھا اور وہ ہر پل میری شادی کے لیے دعا گو رہتیں مگر امی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ لڑکی کے رشتے آنے کی ایک عمر ہوتی ہے وہ گزر جائے تو خواہشات ناتمام رہ جاتی ہیں۔

☆......☆

ان ہی دنوں امی مجھے اس ظالم دنیا کے رحم وکرم پر اکیلا چھوڑ کر قبر کی آغوش میں جا سوئیں بظاہر امی پلنگ پر بیٹھی تھیں مگر میرے لیے بہت بڑا سہارا تھیں مجھے ایسا لگا جیسے میں ایک دم سائے سے کڑی دھوپ میں آگئی ہوں۔ سورج کی تیز حدت مجھے اندر تک جھلسا رہی ہو۔ امی کی لعن طعن کے باوجود امی کے ہوتے ہوئے میں نے اپنے آپ کو کبھی اکیلا محسوس نہیں کیا تھا کیونکہ ان کے کوسنوں میں بھی محبت کی ایک جھلک ہوتی تھی۔ امی کی موت کے بعد میری زندگی تنہائی میں بسر ہونے لگی۔ بھائی بھابی اپنی زندگی میں مگن تھے۔ وقت کا پہیہ اپنی مخصوص رفتار سے چلتا رہا۔

☆......☆

میری عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ جب میرے لیے ایک ایسے شخص کا رشتہ آیا جس کی بڑی بیٹی کی شادی ہونے میں چند ماہ باقی تھے کہ اچانک اس کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ تب خاندان والوں کے مشورے پر پہلے اس نے اپنی شادی کے بارے میں سوچا کہ گھر میں ایک عورت آجائے پھر بیٹی بیاہی جائے۔ مطلب یہاں بھی مجھے باندی بن کر جانا تھا۔ ماں باپ تو میرے تھے نہیں جن سے مشورہ لینا تھا جو کچھ کرنا تھا بھائی بھابی کو کرنا تھا اور وہ دونوں اس رشتے پر دل و جان سے فدا تھے کیونکہ وہ بہت امیر کبیر بندہ تھا اور پھر بھائی کے کندھوں پر کوئی بوجھ بھی نہیں آتا کیونکہ شادی کا سارا خرچہ میں اپنی تنخواہ سے اٹھاتی لیکن میں اس رشتے پر دل سے خوش نہیں تھی۔ اول تو اس عمر میں، میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

دوسرے وہ شخص بھی تقریباً ستر (70) سال کے لگ بھگ تھا یعنی ہم دونوں میں تقریباً بیس بائیس سال کا فرق تھا لیکن دل کے فیصلے سے کیا ہوتا ہے۔ اصل چیز تو تقدیر ہوتی ہے اور میں اپنی تقدیر کے لکھے کو قبول کر کے اس رشتے کے لیے ہاں کہہ چکی تھی کہ شاید شادی کے بعد میری زندگی میں کچھ سکون آئے مگر یہاں بھی میری خوشی عارضی ثابت ہوئی۔

شادی کی پہلی رات ہی مجھ پر یہ انکشاف ہو گیا تھا حاکم علی اپنے نام کی طرح ہی صرف حکم چلانے والے انسان ہیں۔ انہوں نے شادی صرف بچوں کی خاطر کی ہے۔ شادی کے بعد میری زندگی میں صرف اتنی تبدیلی آئی تھی کہ مجھ پر پڑنے والے کوسنے اور گالیاں ختم ہو گئی تھیں مگر میرا عہدہ اور ڈیوٹی نہیں بدلی تھی۔ بس خدمت کروانے والوں کے رشتے اور چہرے بدل گئے تھے۔ پہلے ماں کی خدمت پھر بھائی بھاوج کی خدمت پھر بھتیجا بھتیجی کی خدمت اور اب بیمار شوہر کی تیمارداری اور اس کے جوان بچوں کی دیکھ بھال میرا نصب العین بن گئی اور پھر آتے ہی بیٹی کی شادی کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہو گئی تھی۔

شادی کے بعد میں بیوی تو نہ بن سکی تھی مگر ماں، ساس، دادی، نانی یہ رشتے مجھے نکاح ہوتے ہی مل گئے تھے۔ لہٰذا اب مجھے یہی رشتے نبھانے تھے۔ حاکم علی نے شادی کے بعد میری نوکری تو چھڑوا دی تھی مگر اپنے ہی گھر میں گورنس کی نئی جاب دے دی تھی۔ شادی کے بعد میری پھر سے وہی ڈیوٹی شروع ہو گئی تھی جو امی کے لیے سرانجام دیتی تھی۔ صبح فجر میں اٹھ کر حاکم علی کو وضو کروانا، نماز سے فارغ ہونے کے بعد اپنے اور حاکم علی کے لیے ناشتا تیار کرنا۔ تیل ڈال کر سر کی مالش کرنا، تین ٹائم کا کھانا، وقت پر پابندی کے ساتھ دوا کا خیال رکھنا، پانی گرم کر کے نہلانا (کیونکہ بیماری کی وجہ سے وہ اپنا کام صحیح سے انجام نہیں دے پاتے تھے) غرض کہ صبح سے شام تک پن چکی کی طرح میری زندگی ایک ہی محور پر گھومتی رہتی۔

حاکم علی سے رشتہ جڑے پندرہ برس بیت چکے تھے۔ ان پندرہ برسوں میں جو ہنگامے پوشیدہ تھے ان کا مقابلہ جس طرح میں نے کیا تھا وہ میرا ہی دل جانتا تھا۔ گھر بنانے کا جو خواب شروع سے ہی میرے دل میں تھا اسے زمانے کی گرد نے دھندلا دیا تھا اور پھر شادی کے بعد تو میں نے اپنے خوابوں کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک کر اسے ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا تھا۔

ان برسوں میں حاکم علی کے مزید بچوں کی بھی شادیاں ہو گئی تھیں۔ وہ سب دوسرے شہروں میں اپنی بہترین زندگی گزار رہے تھے۔ گھر میں ہم دو بڑھاپے کی دہلیز پر بیٹھے ہوئے انسانوں کا وجود رہ گیا تھا۔ ان پندرہ برسوں میں حاکم علی نے بھی مجھ سے کبھی محبت کے دو بول نہیں بولے تھے۔ کبھی میری محنت کو نہیں سراہا تھا، کبھی مجھ سے میرے دل کا حال نہیں پوچھا۔ ہمیشہ اپنے دل کی سناتے۔

کبھی میرے من کی منشاء نہیں پوچھتے۔ ان کے دل میں آج بھی پہلی بیوی بسی ہوئی تھی جو ان کے بچوں کی ماں تھی جو ان کی زندگی کے سفر کی شروع کی ساتھی تھی مگر بڑھاپے میں اچانک ان کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ وہ کہتے اس گھر کے در و دیوار سے مجھے آج بھی مہرالنساء کی پائل کی گونج محسوس ہوتی ہے۔

ان کی یادوں میں ان کی باتوں میں آج بھی مہرالنساء چھائی ہوئی تھی اور میں یہ باتیں سن کر سوائے مسکرانے کے کچھ بھی نہ کر سکتی تھی۔ ویسے بھی برداشت تو اللہ نے شروع سے ہی مجھے بہت دی تھی۔ لہٰذا حاکم خان کی کڑوی کسیلی باتوں کو بھی صبر کے ساتھ برداشت کرتی، اپنے دل کا حال کس سے کہتی کوئی سننے والا ہی نہیں تھا۔ سوائے میرے رب کے اور میں جب بھی اپنے رب کے سامنے بیٹھتی سوائے شکر کے کوئی شکوہ میری زبان پر نہیں ہوتا۔

☆......☆

ان دنوں حاکم خان کی حالت مزید خراب ہو گئی تھی۔ بظاہر انہیں کوئی بیماری نہیں تھی مگر سب سے بڑی بیماری بڑھاپا اور ان کا اکیلا پن تھا۔ بیٹے

بہو کے ہوتے ہوئے ان کا گھر بچوں کی قلقاریوں سے ناواقف تھا۔ بچے اتنا فرض ادا کرتے کہ مہینے میں باپ کے نام پیسے ٹرانسفر کر دیتے۔ جس سے گھر کا خرچ چل رہا تھا مگر انہیں پیسے کی نہیں بیٹے کی ضرورت تھی۔ پیسہ تو ان کے پاس اپنا بھی بہت جمع تھا پھر جب حاکم علی کی بیماری نے مزید تیزی پکڑی تو ان کی تمام اولادوں کو خبر دے دی گئی انہیں صرف اپنی اولادوں کے آنے کا انتظار تھا اور یہ انتظار ختم ہوتے ہی وہ خاموشی سے زمین کی گود میں جا سوئے۔ میری زندگی میں ایک دفعہ پھر اندھیرا ہو گیا مگر جاتے ہوئے میری ذات پر یہ احسان کر گئے کہ اپنی جائیداد کا ایک حصہ میرے نام سے بینک میں جمع کروا کر آگے کا مستقبل محفوظ کر گئے۔

میرے لیے تو ان کا یہی احسان کافی تھا کیونکہ میرے نام کا ایک حصہ بھی کروڑوں میں تھا اس کے بعد مجھے یہ یقین تھا کہ میرے واپسی کے سفر سے بھائی بھابی کے منہ ٹیڑھے نہیں ہوں گے۔ جس گھر میں ہم لوگ رہتے تھے وہ حاکم خان کے بچوں کے نام تھا۔ انہوں نے اسے فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے صرف عدت تک اس گھر میں رکنے کی اجازت مانگی جس پر وہ راضی ہو گئے اور پھر پندرہ سال بعد میری کشتی ایک دفعہ پھر اسی سمت سفر کر رہی تھی جہاں سے چلی تھی۔ ایک دفعہ پھر میرے لیے امتحان تھا۔ آزمائش تھی تقدیر نے ایک دفعہ پھر مجھے اسی مقام پر لا کھڑا کر دیا تھا جہاں قدم قدم پر میری تذلیل ہوتی رہی تھی۔

ان برسوں میں میرے بھتیجا بھتیجی بھی جوان ہو چکے تھے اور کالج یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے تھے۔ بھائی کے گھر کے آج بھی وہی مسائل تھے گھر کا کرایہ، بجلی گیس کے بل، بچوں کی فیس ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اپنے پیسے سے ایک دو کمروں کا گھر خرید کر بھائی کے نام کر دیا تاکہ بھائی کی سب سے بڑی پریشانی (جو کرائے کے گھر کی تھی) وہ ختم ہو جائے۔ باقی پیسے بینک میں جمع کروا دیئے تاکہ میرے کفن دفن پر بھائی کو کوئی پریشانی نہ ہو، نہ میرا بوجھ بھائی کو محسوس ہو کیونکہ میں نے گورنمنٹ جاب بیچ میں چھوڑ دی تھی جس کی وجہ سے مجھے حکومت کی طرف سے کوئی رقم نہیں ملی تھی اور بینک سے جو پرافٹ آتا وہ گھر میں خرچ ہو جاتا لیکن اتنا کچھ کرنے کے باوجود بھابی کے ماتھے کے بل ختم نہیں ہوتے۔ ایک دفعہ پھر میرے لیے کوسنے اور طعنے شروع ہو چکے تھے۔

بھابی کہتی تم تو ہو ہی شروع سے منحوس، کم سے کم اتنا پیسا اپنے نام لکھواتیں جس سے اتنا بڑا گھر خریدا جاسکتا کہ جس میں بچوں کی شادیاں آسانی سے ہو جاتیں۔ اس گھر میں بچوں کی شادیوں کے بعد کیسے گزارہ ہوگا۔ کم سے کم تمہاری بھتیجوں کا کچھ جہیز ہی بن جاتا یا پھر وہ گھر ہی اپنے نام لکھوالیتیں جس میں تم رہتی تھیں وہ تو گھر کیا پورا محل تھا اور بھابی کی نظر تو نہ جانے کب سے اس گھر پر تھی۔ بھابی نے بھی خود غرضی کی اعلیٰ مثال قائم کی تھی میں زندگی کے کس کس مقام پر اپنی تقدیر کا ماتم کرتی۔

میری تو پوری زندگی ہی ماتم کدہ تھی۔ بھابی کی کڑوی کسیلی باتیں سن کر میں صبر کا گھونٹ پی کر رہ جاتی تھی کیونکہ یہ باتیں تو اب روز کی کہانی ہو گئی تھیں مگر اس دن مجھے بہت تکلیف ہوئی اور میرے صبر کی حد ختم ہو گئی۔ جب بہت چھوٹی سی بات پر بھابی نے بھری محفل میں میری تذلیل کی، مجھے ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیا تب مجھے بے پناہ رونا آیا، اس دن میری زبان سے اپنی مرحومہ ماں کے لیے زندگی میں پہلی دفعہ بُرے الفاظ نکلے اور میں نے دل میں عہد کیا کہ میں کبھی اپنی ماں کو معاف نہیں کروں گی۔ حشر میں ان کا دامن ضرور پکڑوں گی۔ آج میری اس زندگی کی ذمہ دار میری ماں ہے۔ بھابی نے اپنے رویے سے بالآخر میری مرحومہ ماں کے لیے برے الفاظ نکلوا دیئے تھے۔

☆......☆

گزرتے وقت کے ساتھ میں اپنے ہی گھر میں اجنبی ہو گئی۔ تین وقت میرے کمرے میں کھانا پہنچا کر اپنا فرض پورا کر لیا جاتا، میرا دل چاہتا میں اپنے

کنبے کے ساتھ بیٹھ کر ہنسوں بولوں۔ کوئی مجھ سے گزری زندگی کے بارے میں پوچھے اس وقت مجھے کسی ہمدرد ساتھی کی ضرورت تھی جو میرے ساتھ بیٹھ کر میری دلجوئی کرتا مگر کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوتی۔ سارا دن اپنے کمرے میں لیٹے لیٹے مجھے کوفت ہونے لگتی۔ ماضی کی یادیں ناگن کی طرح مجھے ڈستی رہتیں۔ میرے نصیب نے مجھے کیسے کیسے زخم دیئے تھے، کوئی میرے دل کو چیر کر دیکھتا جہاں رستے ہوئے زخم تھے اور ان زخموں میں ماضی کی کرب ناک یادیں تھیں۔ آج بھی میں گھر کے فالتو کوڑا کرکٹ کی طرح ہوں جسے صفائی کرنے کے بعد گھر کے ایک کونے میں ڈھیر کر دیا یا تو جلا دیا جاتا ہے یا باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ مشین کا ایک فالتو پرزہ ہوں جسے خراب ہونے کے بعد نکال کر اس کی جگہ دوسرا پرزہ ڈال دیا جاتا ہے۔

زندگی تو میری کورے کاغذ کی مانند ہے جس پر کوئی لفظ لکھا ہی نہ گیا ہو مگر حیثیت کاپی کی ردی کی مانند ہے جس کے بھر جانے کے بعد اسے جلا دیتے ہیں یا بیچ دیتے ہیں۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ میں موت کے قریب ہوتی جا رہی ہوں۔ جب زندگی کی تھکا دینے والی صعوبتوں کو برداشت کرتے کرتے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو بے اختیار اپنے نصیب پر رونا آ جاتا ہے اور ابو کی یادیں مجھے بے چین کر دیتی ہیں۔ میری زندگی سے جڑا صرف ایک رشتہ ایسا تھا جو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ پیار کرتا تھا اور وہ تھا "میرا باپ"۔ اس کے بعد ہر رشتے نے مجھے صرف اپنے مفاد کی خاطر استعمال کیا، میں تو بس اپنے باپ کے گھر کی شہزادی تھی اس کے بعد تو ہر شخص کی کنیز بن کر رہی لیکن مجھے اپنی تقدیر سے کوئی شکوہ نہیں، شاید اللہ تعالیٰ نے مجھے اس آزمائش کے قابل سمجھا تھا جب ہی تو میری زندگی پیچیدہ مسائل میں الجھی رہی۔ میری تقدیر کا ستارہ تو اس دن ماند پڑ گیا تھا جب میری ننھی بہن نے امی کے ہاتھوں میں دم توڑا تھا۔

کاش اللہ تعالیٰ نے میری شکل کی طرح میرا نصیب بھی اتنا ہی خوب صورت بنایا ہوتا اللہ نے مجھے شکل تو بہت خوب صورت دی مگر قسمت کھوٹے سکے کی مانند دی تھی اگر امی میری شادی صحیح وقت پر کر دیتیں تو آج میں بھی اپنے گھر میں خوش و خرم زندگی گزار رہی ہوتی۔

☆......☆

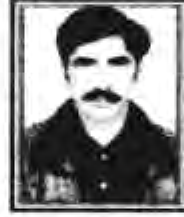
آخر میں میری تمام والدین سے گزارش ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کی شادی میں بلاوجہ تاخیر نہ کریں۔ وقت گزر جانے کے بعد کچھ حاصل نہیں ہوتا بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہونا ماں باپ کے لیے حج کے برابر سعادت ہے اور بے وجہ بیٹی کو بٹھائے رکھنے والے والدین کے لیے آخرت میں سخت عذاب ہے اور بے وجہ رشتے میں عیب نکالنا اللہ کی ناراضگی کو دعوت دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے نصیب میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہ اسے ہر حال میں مل کر رہتا ہے خوب سے خوب تر کی تلاش میں انسان اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے جو اسے وقت پر مل رہی ہوتی ہے۔

☆......☆

قارئین کرام! ان دنوں ہماری رہائش لاہور میں تھی تب ہمارے پڑوس میں آئی ہوئی ایک مہمان خاتون نے اپنی یہ کہانی اشکوں اور سسکیوں کے درمیان سنائی تھی۔ شاید وہ اپنے دل کی بات کہنے تک ہی زندہ تھیں کیونکہ کہانی سنانے کے دوسرے ہی دن ان کا انتقال ہو گیا تھا اور انہیں لاہور کے قبرستان میں ہی دفن کر دیا گیا تھا۔ ان کے انتقال میں، میں بھی گئی تھی۔ کفن میں لپٹی اس عورت کی میت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ موت انسان کو کتنا معصوم اور معتبر بنا دیتی ہے ان کے چہرے سے بلا کی معصومیت اور نور ہی نور جھلک رہا تھا۔ مرنے کے بعد بھی ان کا چہرہ اتنا ہی خوب صورت لگ رہا تھا جتنا کبھی تو جوانی میں ہوگا۔ انہوں نے بالکل صحیح کہا تھا کہ ان کا پشاور سے کراچی تک کا طویل سفر تو ختم ہو گیا تھا مگر زندگی کا پر پیچ سفر جو شروع ہوا تھا وہ ان کی موت کے ساتھ ہی ختم ہوا۔

☆☆☆

یہ بھٹے کے پتھیرے



منشی محمد عزیز مئے

حقیقت کو عیاں کرتی' وہ کہانی جسے پڑھ کر آپ خود سچ اور جھوٹ کے درمیان فیصلہ کر سکیں گے

لڈن مارکیٹ میں دس کلومیٹر کے مربع علاقے میں اٹھارہ بھٹہ خشت ہیں۔ ان میں تین دولتانہ برادری کی ملکیت ہیں۔ ایک آرائیں خاندان کا ہے اور بقیا کے چودہ بھٹوں کے مالکان کا تعلق لکھویرا برادری سے ہے۔

ہمارے یہاں لڈن میں کہتے ہیں کہ اینٹوں کا کاروبار صرف لکھویرا فیملی ہی کر سکتی ہے اور کوئی نہیں۔

بہرم خان لکھویرا اور محبت خان لکھویرا دونوں سگے بھائی تھے اور ان کی اولاد نے اب سب کاروبار سنبھال رکھے ہیں۔ بہرم خان کے چار بیٹے حاجی عطاء خان، افلاطون خان، انور خان اور طالب خان تھے اور محبت خان کے تین بیٹے تھے۔ حاجی محمد بخش، حاجی معراج خان اور حاجی نواز خان۔

بہرم خان کے چاروں بیٹے مکمل طور پر بھٹہ خشت کا کاروبار کرتے ہیں۔ محبت خان کے تینوں بیٹے زمیندار بھی ہیں اور ان کے اپنے بھٹے بھی ہیں۔

خیر یہ ایک ضمنی بات ہے۔ دولتانہ برادری میں سے ایک بھٹہ مالک کا نام میاں محمد یار خان تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے میاں محسن خان نے اپنا بھٹہ ٹھیکے پر اظہر خان پٹھان کو دے دیا ہے۔ دوسرا بھٹہ میاں مختار احمد خان دولتانہ کا ہے اور انہوں نے بھی ٹھیکے پر ذوالفقار خان لکھویرا اور حاجی احمد رضا خان لکھویرا کو دیا ہوا ہے۔ تیسرا بھٹہ مالک میاں ایاز خان دولتانہ ہیں۔ یہ بہت بڑے زمیندار بھی ہیں اور اپنا بھٹہ بھی خود چلا رہے ہیں۔ میاں ایاز خان دولتانہ بہت ہمدرد اور ملنسار قسم کے انسان ہیں۔ اپنے ملازمین اور کارندوں سے دوستوں کی طرح برتاؤ کرتے ہیں وہ کسی کی حق تلفی نہیں کرتے بلکہ ان کا اپنے منشی حضرات کو یہ حکم ہے کہ کسی غریب ملازم کی حق تلفی ہرگز نہ ہو۔ بھلے میری کچھ رقم کسی ملازم کے پاس چلی جائے تو کوئی بات نہیں لیکن کسی بھی غریب سے چھین کر قلم کی بے ایمانی سے مجھے نہ دیئے جائیں۔''

☆......☆

حافظ محمد صادق ایک غریب آدمی تھا۔ اس کے چھ بیٹے تھے۔ حافظ صادق ایک مسجد میں بستی کے بچوں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ اس کے بدلے میں ان کو اتنا کچھ ملتا کہ وہ بمشکل اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔

گزرتے وقت کے ساتھ گھر کے اخراجات بڑھتے گئے مگر آمدنی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ بچوں کو اسکول بھیجنا مشکل تھا۔ حافظ صادق خود ہی دیگر بچوں

کے ساتھ اپنے بچوں کو بھی قرآن مجید پڑھاتے تاکہ دنیاوی نہ سہی دینی تعلیم تو حاصل کر ہی لیں۔ آہستہ آہستہ بچے جوان ہوتے گئے۔ سب سے بڑا بیٹا اللہ داد جب ذرا کمانے کے قابل ہوا تو اس نے والد سے کہا۔

''ابا جی! ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ آپ کی اس نام نہاد آمدنی میں بڑی مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ اس لیے آپ مجھے اجازت دیں تو میں کسی بڑے شہر جا کر محنت مزدوری کروں گا تاکہ ہمارے حالات بھی ذرا بہتر ہو سکیں۔''

''ٹھیک ہے بیٹا جی۔'' حافظ صادق نے کہا۔ ''ہماری طرف سے کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ بس اتنا خیال رہے کہ ہمیشہ رزق حلال کھانا اور ہمیں بھی کھلانا اور کوئی ایسا قدم مت اٹھانا جس کی وجہ سے بعد میں شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔''

''ابا جی! آپ بے فکر رہیں۔'' اللہ داد نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''میں کوئی ایسا غلط کام نہیں کروں گا جس کی وجہ سے مجھے یا آپ کو شرمندگی ہو۔''

''بس بیٹا تو پھر ہماری طرف سے اجازت ہے۔'' حافظ نے بیٹے کو اجازت دیتے ہوئے کہا۔

ان کی برادری کے کچھ لوگ کراچی میں کام کرتے تھے۔ اللہ داد انہی کے پاس چلا گیا اور وہیں اپنے ایک رشتے دار معمار کے ساتھ کام کرنے لگا لیکن کراچی کا پانی اسے راس نہیں آیا اور وہ بیمار پڑ گیا۔ گھر سے اتنی دور اس کی تیمار داری کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ اس کے ساتھی صبح کے نکلے شام کو واپس تھکے ہارے گھر آتے تھے اور ان میں اتنی سکت نہیں ہوتی تھی کہ وہ اللہ داد کی خبر گیری کرتے۔ اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے سبھی نے یہ متفقہ فیصلہ کیا کہ اسے کرائے کی رقم دے کر گھر واپس بھیج دیا جائے اور پھر سبھی نے ایک شام اللہ داد کو بس پر بٹھا کر کرائے کے علاوہ دو تین سو روپے اضافی دے دیئے اور کہا کہ بھائی! ناراض مت ہونا ہم مزدور آدمی ہیں تمہارے لیے اتنا ہی کر سکتے ہیں۔ ناراض نہیں ہونا۔''

''نہیں بھائی، اس میں آپ کا کیا دوش۔'' اللہ داد نے کہا۔ ''آپ کا یہ احسان کیا کم ہے جو میں

آپ لوگوں سے ناراض ہوں گا۔ میری اپنی قسمت ہے۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں میں گھر پہنچ جاؤں گا۔'' اور وہ لوگ چلے گئے۔

اللہ داد جب گھر پہنچا تو اس کی حالت دیکھ کر سب لوگ پریشان ہو گئے اور انہوں نے یہ بات طے کر لی کہ بھوکے رہ لیں گے لیکن گھر سے دور نہیں جائیں گے۔ اس کے بعد وہ لوگ یعنی اللہ داد اور اس کے بھائی ممتاز اور ریاض اپنے ہی علاقے میں کام کرنے لگے۔ جہاں کبھی کام مل جاتا اور کبھی ناغہ ہوتا۔ یونہی زندگی بیت رہی تھی کہ سرور نامی ایک شخص سے اللہ داد کی ملاقات ہوئی۔ وہ شخص بھٹہ خشت پر پتھیروں والا کام کرتا تھا یعنی اینٹیں تھاپتا تھا۔ اس شخص نے اللہ داد سے کہا۔ ''بھائی! جس طرح آپ لوگ کام کر رہے ہیں اس طرح تو آپ کا گزارہ نہیں ہوگا۔ آخر کو آپ نے شادیاں بھی کرنی ہیں۔ اخراجات میں اضافہ ہوتا جائے گا اور آپ کی آمدنی کم سے کم ہوتی جائے گی۔''

''تو میرے بھائی! مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟'' اللہ داد نے بے بسی سے کہا۔

''تم تین بھائی کمانے والے ہو۔'' سرور نے کہا۔ ''میرے ساتھ بھٹہ پر چلو وہاں مستقل کام ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ اینٹیں بنانے کا ہنر آ ہی جائے گا۔ اس کام میں اچھی خاصی آمدنی ہے۔ تم اگر دو بھائیوں کی کمائی خرچ کرو اور تیسرے کی بچت کرو تو بھی زندگی آسان ہو جائے گی۔''

''بھائی! ہمیں تو یہ کام بالکل آتا ہی نہیں ہم کیسے کر سکتے ہیں؟'' اللہ داد نے پوچھا تو سرور ہنسنے لگا۔

''یار! کوئی بھی کام ماں کے پیٹ میں تو نہیں سیکھا جاتا۔ چند ہی دنوں میں، میں تمہیں پتھیر ابنا دوں گا۔''

''میں اپنے بھائیوں اور والد صاحب سے مشورے کے بعد ہی کچھ کہہ سکوں گا۔'' اللہ داد نے کہا تو سرور نے کہا۔ ''اگر کہو تو ہم ابھی تمہارے گھر چلتے ہیں اور حافظ صاحب سے اجازت لے لیتے ہیں۔'' اللہ داد نے ہامی بھر لی اور وہ دونوں حافظ صادق کے پاس پہنچ گئے۔

اللہ داد نے اپنے والد سے ساری بات کہی اور کہا۔

''اب آپ کا مشورہ درکار ہے۔''

''بیٹا جی! مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' حافظ صادق کہنے لگا۔ ''البتہ لوگوں کی زبانی سنتا ہوں کہ یہ بھٹہ مالک بڑے ظالم قسم کے ہوتے ہیں اور پتھیروں کو قید کر لیتے ہیں اور بہت ظلم و ستم کرتے ہیں۔''

''بالکل بکواس ہے یہ۔'' سرور جوش سے کہنے لگا۔ ''مجھے آٹھواں سال ہے یہ کام کرتے ہوئے۔ مجھے تو آج تک کسی نے اف نہیں کی۔ میں اپنا کام باقاعدگی اور دیانتداری سے کر رہا ہوں اور بھٹہ مالک مجھ سے مطمئن ہیں۔''

''دیکھو بھائی! ہم سیدھے سادے لوگ ہیں۔'' حافظ صادق نے کہا۔ ''اور دوسروں سے بھی یہی امید رکھتے ہیں کہ وہ ہم سے کوئی ہیر پھیر نہیں کریں گے۔''

''چاچا جی! آپ اطمینان رکھیں۔'' سرور نے کہا۔ ''آپ کے اعتماد کو میں بالکل ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے لے جاؤ ان کو کام پر۔'' حافظ صادق نے اجازت دے دی۔

☆......☆

اس کے بعد وہ تینوں بھائی بہاولپور میں ایک بھٹہ پر کام کرنے لگے۔ شروع میں تو ان کو یہ کام بڑا عجیب سا لگا لیکن آہستہ آہستہ وہ اس ماحول میں رچ بس گئے۔ بھٹہ سے متعلق ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا گیا۔ انہیں پتا چلا کہ پتھیروں کا ایک ذمہ دار ہوتا ہے جو کہ لفظ بگڑنے کے بعد جمعدار بن گیا ہے اور وہ جمعدار پتھیرے سے متعلق ہر بات کا ذمہ دار ہوتا ہے کیونکہ کوئی بھی پتھیر اجب کسی بھٹہ پر کام کی غرض سے جاتا ہے تو اس کا ذمہ دار (اب یہ لفظ جمعدار لکھا جائے گا) اس کے ساتھ ہوتا ہے جو کہ بھٹہ مالک یا ٹھیکیدار سے یہ بات طے کرتا ہے کہ وہ پتھیرے ایک لاکھ روپے پیشگی رقم کے عوض روزانہ ایک ہزار یا پندرہ سو یا دو ہزار اینٹ بنا کر دے گا۔ اس وقت بھٹہ مالک جمعدار کو اس پتھیرے کے نام لکھ کر لاکھ روپے دے دیتا ہے لیکن بعد میں پتھیرا طے شدہ اینٹ اکثر اوقات نہیں بنا کر دیتے اس کے باوجود بھی وہ لوگ کام کرتے رہتے ہیں۔

اللہ داد نے پیشگی کے طور پر کوئی رقم نہیں لی تھی اور

بغیر ایڈوانس کے کام کرتے تھے۔ جمعرات کے روز ان کی اینٹوں کی جتنی رقم بنتی وہ اتنی ہی لیتے تھے اور جمعدار اور ٹھیکیدار کے کہنے کے باوجود بھی اضافی یا ایڈوانس رقم نہیں لیتے تھے۔

آہستہ آہستہ ان کی آمدنی میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ لوگ جمعرات کو خرچہ لے کر گھر چلے جاتے تھے اور جمعہ کی شام کو واپسی بھٹہ پر پہنچ جاتے تھے۔ کچھ عرصے بعد وہ لوگ وہ بھٹہ چھوڑ کر بہاولپور چلے گئے کیونکہ وہاں ان کو زیادہ مزدوری مل رہی تھی۔ انہوں نے ایک موبائل فون اپنے والد صاحب کو دے دیا اور ریاض اور اعجاز دونوں بھائیوں نے بھی علیحدہ علیحدہ اپنے پاس موبائل رکھ لیے اور تب وہ ہر جمعرات کو خرچہ لے کر گھر چلے جاتے اور جمعہ کی شام کو واپس بھٹہ پر پہنچ جاتے۔

ایک روز جب وہ کام کر رہے تھے کہ ریاض کے موبائل پر ایک اجنبی نمبر سے فون آیا۔ ریاض کے ہاتھ اس وقت مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے اور موبائل اس نے پہلے ہی نکال کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔ اس کے موبائل تک پہنچنے اور ہاتھ صاف کرنے تک موبائل خاموش ہو چکا تھا۔ اس نے نمبر دیکھا تو وہ کوئی اجنبی نمبر تھا اور موبائل کی گھنٹی ایک بار پھر بجنے لگی۔ اس نے اوکے کر لیا اور کان سے لگا کر اپنی مادری زبان سرائیکی میں کہا۔

''سلاماں لیکم سائیں۔''

''وعلیکم السلام۔'' دوسری طرف ایک نسوانی آواز نے شائستہ لہجے میں کہا اور پھر سوال کیا۔ ''کون؟''

''سائیں! فون تساں کیتے۔'' ریاض نے اپنی مادری زبان ہی میں کہا کہ جناب فون آپ نے کیا ہے جس پر تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی اور پھر آواز آئی۔

''وہ...... میں نے اپنی سہیلی نائلہ کو فون کیا تھا۔''

''نہیں جناب۔'' ریاض نے اردو بولنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ایتھے کوئی نائلہ نہیں ہے۔''

''آپ کون ہیں اور کہاں سے بات کر رہے ہیں؟'' مہذب لہجے میں سوال کیا گیا۔

''جی میں ریاض ہوں اور اپنی زبان سے بات کر رہا ہوں۔'' ریاض اپنی مادری زبان میں بات کرنے لگا جس پر لڑکی نے قہقہہ لگایا اور کہا۔

''وہ تو مجھے پتا ہے کہ آپ اپنی زبان سے بات کر رہے ہیں۔ میں کون سا کہہ رہی ہوں کہ آپ میری زبان سے بات کر رہے ہیں۔''

''بولیں بی بی۔'' ریاض اکتا گیا تھا۔ ''کام کی بات کریں۔''

''کیا آپ بہت بڑے بزنس مین ہیں؟'' لڑکی کھل کر بات کر رہی تھی لیکن ریاض کو اس کے اس فقرے کی سمجھ نہیں آئی اور اس کی زبان سے صرف اتنا نکلا۔

''جی! کیا کہا؟'' یہ الفاظ بھی اس نے سرائیکی میں ہی ادا کیے تھے۔

''اچھا چھوڑیں ساری باتوں کو۔'' لڑکی نے کہا جس نے بعد میں اپنا نام چندا بتایا تھا۔ ''آپ سرائیکی میں بات کر رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کا تعلق کسی سرائیکی علاقے سے ہے؟''

''جی۔'' ریاض نے کہا۔ ''ہمارا ضلع بہاولپور ہے اور ہم اس وقت کام بھی بہاولپور میں ہی کر رہے ہیں۔''

''اچھا۔'' لڑکی کی دلچسپی برقرار تھی۔ ''کیا کام کرتے ہیں آپ؟''

''جی ایک بھٹے پر کام کرتا ہوں۔'' ریاض اس کے سبھی سوالوں کے جواب ایمانداری سے دے رہا تھا۔

''بھٹے پر کیا کام کرتے ہیں؟'' چندا نے سوال کیا تو ریاض نے کہا۔

''دیکھو بی بی! ہم غریب مزدور لوگ ہیں۔ اینٹیں بناتے ہیں اور اپنا گھر چلاتے ہیں۔''

''اچھا!'' چندا نے لفظ کو کھینچتے ہوئے کہا۔ ''گویا آپ پتھیرے ہیں؟''

''جی ہاں۔'' ریاض کا لہجہ تھوڑا تلخ ہو گیا۔ ''اب آپ مہربانی کیجیے اور مجھے کام کرنے دیجیے۔''

''وہ کیوں جی؟'' چندا اترا کر بولی تھی جس پر ریاض کی تلخی دوچند ہو گئی اور وہ اپنے غصے کو دباتے ہوئے بولا۔

''دیکھیں! آپ مجھے کسی امیر گھرانے کی لگتی ہیں آپ کو تو کوئی فکر نہیں ہے لیکن ہمیں تو کام کرنے دیں۔''

''اچھا ایک بات بتائیں۔'' چندا اس کی تلخی کو نظر انداز کر گئی۔

''جی پوچھیں۔'' ریاض کو الجھن ہو رہی تھی لیکن اس نے خود پر قابو پالیا۔

''آپ شادی شدہ ہیں؟'' چندا نے اپنی ہنسی کو دباتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں!'' نہ جانے کے باوجود بھی ریاض کو غصہ آ گیا۔

''کیا آپ نے شادی کرنی ہے میرے ساتھ؟''

''یہ بھی ہو سکتا ہے۔'' چندا نے اطمینان سے کہا۔ یوں لگتا تھا گویا وہ ریاض کو چڑا رہی ہو یا اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔

''ہاں شادی شدہ ہوں۔'' ریاض نے جھوٹ بولا۔ ''بلکہ دو بار شادی شدہ ہوں۔''

''اچھا! وہ کیسے؟'' چندا نے سوال کیا تو ریاض نے کہا۔ ''خدا کے لیے میری جان چھوڑ دو۔ مجھے کام کرنا ہے۔ اللہ حافظ۔'' اور اس نے موبائل بند کر دیا لیکن فوراً ہی گھنٹی بج اٹھی۔ ریاض نے نمبر دیکھا تو وہی تھا۔ اس نے نظر انداز کر دیا لیکن چندا بھی ڈھیٹ بنی ہوئی تھی۔ بالآخر ریاض کو کال ریسیو کرنا ہی پڑی۔

''اب کیا ہے؟'' وہ پھٹ پڑا لیکن چندا پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔

''میں نے آپ سے کوئی سوال کیا تھا؟'' ریاض کو اس پر شدید غصہ آ رہا تھا اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس لڑکی سے جان چھڑا سکتا اگر وہ موبائل کو پاور آف کر دیتا تو اسے خدشہ تھا کہ کہیں گھر سے واپس صاحب کا فون نہ آ جائے۔ اس نے اپنے بھائی اعجاز کو آواز دی۔

''اعجاز! تمہارے موبائل کی بیٹری چارج نہیں ہوئی؟''

''ہو گئی ہے بھائی۔'' اعجاز نے دور ہی سے جواب دیا۔

''اپنا موبائل آن کرو۔'' ریاض نے اپنا موبائل بدستور کان سے لگا رکھا تھا۔ ''میں اپنا موبائل بند کر رہا ہوں۔''

''دیکھو، موبائل پاور آف کرنے سے پہلے میری بات غور سے سن لو۔'' چندا نے تیزی سے کہا تو ریاض بولا۔

''میں اسی وجہ سے فون بند کرنے لگا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، میں بعد میں بات کر لوں گی۔'' چندا نے کہا تو ریاض نے اطمینان کا سانس لیا۔

''شکر ہے، تم نے بھی جانے کا نام تو لیا۔''

''اللہ حافظ، بعد میں بات ہو گی۔'' چندا نے بات کاٹ دی۔

اس کے بعد اکثر چندا کا فون آنے لگا۔ ریاض پہلے تو اس سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا تھا لیکن پھر وہ بھی چندا کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا۔ چندا نے اپنا اصل نام شائلہ بتایا تھا اور بقول اس کے میٹرک کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد وہ گھر میں قید تھی۔

''موبائل والدین کی اجازت سے لیا ہے یا مخفی طور پر رکھا ہوا ہے؟'' ریاض کے اس سوال کے جواب میں چندا نے بتایا تھا کہ موبائل اس کے والد صاحب نے خود اسے لے کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ لوگ گھٹیا اور سطحی سوچ کے مالک نہیں تھے اور وقت کی ضروریات کے مطابق چلتے تھے۔

چندا کے والد کا ایک جنرل اسٹور تھا اور وہ صبح کے نکلے رات گیارہ بارہ بجے سے پہلے کبھی گھر نہیں آئے تھے۔ چندا سے ایک بڑی بہن عاصمہ تھی اور اس کی شادی ہو چکی تھی۔ عاصمہ کا شوہر فوج میں حوالدار کے عہدے پر فائز تھا اور وہ رشتے میں چندا کا ماموں زاد لگتا تھا۔

عاصمہ کے ایک جیٹھ کی بیوی فوت ہو چکی تھی اور وہ رنڈوا تھا۔ عاصمہ کے سسرال والوں کی خواہش تھی کہ چندا کی شادی ان کے رنڈوے بیٹے عقیل سے ہو جائے اور اپنی اس خواہش کا اظہار ان لوگوں نے عاصمہ سے کر دیا تھا۔ ذاتی طور پر عاصمہ بھی یہی چاہتی تھی کہ اس کی بہن اس کی جیٹھانی بن جائے۔ عاصمہ کے ساتھ ساتھ ان کی والدہ صفیہ بی بی کا ووٹ بھی بھتیجے کے حق میں تھا، بھلے وہ چندا سے پندرہ سال بڑا کیوں نہ تھا لیکن چندا اور اس کے والد اس شادی کے حق میں نہ تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ریاض، چندا کا عادی

ہوتا گیا۔ اگر کبھی کسی وجہ سے چندا کا فون آتا تو وہ بے چین ہو جاتا مگر دوسرے دن چندا اسے اپنی کوئی مجبوری بتاتی تو وہ شکوہ کرنے پر معذرت کر لیتا۔ ایک دن چندا کہنے لگی۔

''ریاض! سچ بتاؤں مجھے تمہاری زبان سرائیکی بہت پسند ہے۔ مجھے بھی سکھا دوناں۔''

''ایسے کیسے سیکھ سکتی ہو؟'' ریاض نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک لمبا چوڑا پروجیکٹ ہے۔'' ریاض اس سے تھوڑی بہت انگریزی سیکھ چکا تھا اور اپنی باتوں میں ایک آدھ انگریزی کا لفظ ٹانک دیا کرتا تھا۔ اس کا یہ جواب سن کر چندا کی حیرت سے چیخ نکل گئی اور بے ساختہ پوچھنے لگی۔

''کیا! کیا کہا تم نے؟'' وہ دونوں ایک دوسرے کو تم کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

''میں نے کہا یہ ایک طویل المیعاد کام ہے۔'' ریاض زیر لب مسکرا رہا تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' چندا نے مصنوعی غصے سے پوچھا تھا۔

''مطلب صاف ظاہر ہے۔'' ریاض سادگی سے بولا۔ ''مجھ سے شادی کر لو، سرائیکی بولنا سکھلا دوں گا، ورنہ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ تم سے مغز ماری کرتا پھروں۔''

''اچھا! تو یہ بات ہے؟'' چندا نے اچھا کو لمبا کھینچتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' ریاض نے کہا تو چندا نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''کیا ہوا؟'' ریاض نے پوچھا تو چندا کہنے لگی۔

''سچ ریاض! میں بھی تمہاری باتوں کی عادی ہو گئی ہوں اور تمہارے بغیر خود کو ادھورا محسوس کرتی ہوں۔''

''میری بھی کچھ ایسی ہی حالت ہے۔'' ریاض نے کہا۔ ''کچھ سوچا ناں میرے بارے میں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' چندا کی آواز آئی۔ ''میں کچھ کرتی ہوں۔'' اور اس نے فون بند کر دیا۔

اس کے بعد دو دن چندا کا موبائل بند رہا۔ ریاض بہت بے چین ہو گیا۔ اسے اپنا ہوش نہ رہا۔ اس کے دوستوں اور چھوٹے بھائی اعجاز کو بھی ساری بات کا پتا تھا انہوں نے اسے دیوانا کہنا شروع کر دیا اور اس کا مذاق اڑاتے لیکن ریاض کو اس وقت کسی کی پروا نہ تھی۔

تیسرے دن چندا کا موبائل اسے آن ملا۔ اس نے بڑی بے تابی کے ساتھ فون اٹینڈ کیے جانے کا انتظار کیا لیکن اس کا فون کسی نے بھی ریسیو نہیں کیا۔ اس نے دوبارہ رابطہ کرنا چاہا تو دوسری طرف سے نمبر مصروف کر دیا گیا۔ اس نے تین چار مرتبہ نمبر ملایا مگر وہ مسلسل مصروف جا رہا تھا اسے شدید غصہ آ رہا تھا خود پر بھی اور چندا پر بھی۔ قریب تھا کہ وہ اپنا موبائل ہی توڑ دیتا۔ اسے یاد آیا کہ ہمیشہ چندا ہی اسے کال کرتی تھی اور اس نے کبھی بھی ریاض کی کال ریسیو نہیں کی تھی بلکہ وہ نمبر بزی کر کے واپس اسے کال کرتی تھی۔ تب وہ تھوڑا پرسکون ہوا اور اس نے موبائل ایک طرف رکھ دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے بے تابی سے موبائل اٹھایا اور نمبر دیکھے بغیر ہی او کے کر دیا۔

''میں دو دنوں سے بہت پریشان ہوں اور تمہیں کوئی پروا نہیں ہے۔''

''میں کون سا خوش ہوں۔'' دوسری طرف سے چندا کی رو دینے والی آواز آئی۔ ''ریاض! جلدی کچھ کرو ورنہ میں مر جاؤں گی۔''

''کیا ہوا۔ کچھ تو بولو۔'' ریاض نے تیزی سے پوچھا۔ ''کیا مسئلہ ہے؟''

''ریاض! پہلے تو ابو میری حمایت کرتے تھے لیکن اب وہ بھی ان ہی کی طرف داری کرنے لگے ہیں۔ وہ لوگ میری شادی عقیل سے کرنا چاہتے ہیں۔''

چندا رو رہی تھی۔ ''میں مر جاؤں گی مگر اس سے شادی نہیں کروں گی۔''

''تم گھر سے بھاگ آؤ۔'' ریاض کہنے لگا۔ ''ہم عدالت میں شادی کر لیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' چندا نے رضامندی ظاہر کر دی۔

''میں تیار ہوں تم چکوال چلے آؤ۔''

''ٹھیک ہے۔'' ریاض بھی تیار ہو گیا۔ ''میں آتا ہوں چکوال۔''

ریاض نے اپنے ایک دوست اللہ دتہ کو ساری بات

بتائی۔ ساری بات سن کر اللہ دتہ کہنے لگا۔

''ریاض بھائی! تم بلاوجہ اس کے عشق میں اندھے ہو چکے ہو۔ تیز ترین دور ہے تم ٹھہرے ایک مزدور آدمی۔ ایسی چالاکیوں کو سمجھ نہیں سکتے۔ وہ تمہیں بے وقوف بنا رہی ہے اور تم بن رہے ہو۔''

''نہیں یار ایسا نہیں ہو سکتا۔'' ریاض نے کہا۔ ''تم اگر میرے ساتھ نہیں جانا چاہتے تو تمہاری مرضی میں اکیلا ہی چلا جاتا ہوں۔''

''نہیں یار ناراض مت ہو۔'' اللہ دتہ نے جلدی سے کہا۔ ''میں تو تمہارے خیال سے کہہ رہا تھا اگر نہیں مانتے تو کوئی بات نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

☆......☆

وہ دونوں دوست چکوال کی طرف چل دیے۔ راستے میں اللہ دتہ نے ریاض کو سمجھایا کہ تم چندا کو کسی دوسرے شہر کی طرف آنے کا کہو۔ اگر وہ واقعی تم سے محبت کرتی ہے اور ڈرامہ نہیں رچا رہی تو وہ ادھر بھی چلی آئے گی۔ بصورت دیگر ڈراما ہونے کی صورت میں ان کے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہو سکتی تھی۔'' ریاض کی سمجھ میں اللہ دتہ کی بات آگئی اور ملتان پہنچ کر اس نے بس سے اتر کر چندا کے ساتھ رابطہ کیا اور اس سے کہا کہ وہ چکوال کی بجائے کسی دوسرے شہر کا انتخاب کرے۔ چندا نے کہا۔

''تم بولو کہاں تک آ سکتے ہو؟'' ریاض نے اللہ دتہ کے مشورہ سے میانوالی کہہ دیا اور چندا نے منظور کر لیا۔ اللہ دتہ کا ایک دوست میانوالی میں رہتا تھا اور اسی وجہ سے اس نے میانوالی کا نام لیا تھا تاکہ کوئی مسئلہ اگر درپیش آئے تو اس دوست کی مدد لی جا سکے۔

رات گئے وہ لوگ میانوالی پہنچ گئے، جہاں اللہ دتہ کا دوست رحمت اللہ ان کا انتظار کر رہا تھا۔ رحمت اللہ نے ان کے کھانے پینے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ ریاض اور اللہ دتہ نہا دھو کر تازہ دم ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے کھانا کھایا لیکن ریاض کی توجہ کھانے کی طرف کم تھی۔ اس بات کو محسوس کر کے رحمت کہنے لگا۔

''ریاض بھائی! بے فکر ہو کر کھانا کھائیں اگر آپ کی محبوبہ نے سچ کہا تو آپ کے وارے نیارے اور اگر وہ ڈراما رچا رہی ہے تو یہاں کوئی اس کا حل [illegible] تک نہیں لگا سکتا۔''

''نہیں بھائی!'' ریاض ڈٹ گیا۔ ''اب اتنا سفر کر کے آگئے ہیں تو اب کیا ڈرنا۔''

''شاباش!'' رحمت نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''ایسے ہی ڈٹے رہو۔'' ان کی باتوں کے دوران ریاض کا موبائل بج اٹھا۔ دوسری طرف چندا تھی۔

''ریاض! میں لاری اڈے پر تمہارے انتظار میں کھڑی ہوں، تم کہاں ہو؟''

''بس پانچ منٹ انتظار کرو۔'' ریاض نے دوستوں کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم کال ڈراپ نہ کرو، ہم بھی لاری اڈے کی حدود میں ہیں۔ اپنا حدود اربع ذرا بتاؤ تو۔''

وہ تینوں دوست نکل پڑے۔ فون پر رابطہ برقرار تھا اور جلد ہی ان کو ایک نقاب پوش حسینہ نظر آگئی جو کہ ویٹنگ روم کے باہر ان کی منتظر کھڑی تھی۔

''السلام علیکم۔'' ریاض نے اس کے قریب جا کر سرائیکی میں کہا تو چندا نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

''میں ریاض ہوں۔'' ریاض نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا اور یہ میرے دوست ہیں اللہ دتہ اور رحمت۔''

''اوہ!'' وہ چندا ہی تھی۔ ''گویا جناب کو مجھ پر اعتبار نہیں تھا؟'' اس کا لہجہ تھوڑا طنزیہ ہو گیا تھا۔

''نن...... نہیں۔'' ریاض نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں، بس احتیاطاً ہم دو آئے ہیں، بھائی رحمت تو یہیں کے رہائشی ہیں اور ہم ان کے مہمان ٹھہرے تھے۔''

''اچھا اب صفائی پیش کرنا بند کرو اور یہاں سے چلو۔'' چندا نے کہا اور وہ چاروں واپس رحمت اللہ کے مکان کی طرف چل دیے۔ وہاں جا کر انہوں نے واپسی کا پروگرام طے کیا پھر طے شدہ پروگرام کے مطابق رحمت اللہ نے فون پر کسی سے رابطہ کر کے ایک ایئر کنڈیشنڈ بس میں ان کے لیے تین سیٹیں بک کروائیں اور بس کی روانگی سے بیس منٹ پہلے وہ لوگ دوبارہ

لاری اڈے کی طرف چل دیے۔ جہاں رحمت نے ان کو بس پر بٹھایا اور بس بہاولپور کی جانب روانہ ہوگئی۔

سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی وہ لوگ بہاولپور پہنچ گئے۔ بس سے اتر کر انہوں نے ہلکا پھلکا ناشتا کیا۔ ناشتے کے دوران ریاض نے چندا سے کہا۔

''بھئی! میں تو جو بھی ہوں جیسا بھی ہوں تمہارے سامنے ہوں لیکن تم بھی تو ذرا اپنا دیدار بھرپور کروا دو ناں تاکہ مجھے بھی پتا تو چلے کہ ہمارا چاند کیسا ہے۔'' اس نے مذاق میں یہ بات کہی تھی جس پر چندا نے اپنا نقاب اتارتے ہوئے کہا تھا۔ ''جناب! اب جیسی بھی ہوں آپ کو مجھے قبول کرنا پڑے گا۔ بصورت دیگر میری موت کا ذمہ دار تم ہوں گے۔''

''اللہ نہ کرے۔'' ریاض نے اس کے منہ کے آگے ہاتھ کر دیا۔ وہ اس کے حسن سے مرعوب ہو گیا تھا۔ ''مریں تمہارے دشمن، میں تو بس گپ لگا رہا تھا۔''

اسی دن وہ لوگ عدالت میں چلے گئے اور وہاں جا کر کورٹ میرج کر لی۔ اس معاملے میں اللہ دتہ نے ان کی بھرپور مدد کی تھی۔ خود اللہ دتہ نے کورٹ میرج کی تھی اور وہ اس معاملے میں کافی ہوشیار تھا۔

چندا گھر سے اپنے زیورات اور پچاس ہزار روپے نقد بھی ساتھ لائی تھی لیکن ریاض کی غیرت نے یہ بات گوارہ نہیں کی کہ وہ اپنی بیوی سے رقم لے چنانچہ جب چندا نے اپنے زیورات اور نقدی والی پوٹلی اس کے حوالے کی تو اس نے کہا۔

''دیکھو چندا! ہم لوگ غریب ضرور ہیں لیکن بے غیرت نہیں ہیں۔ مجھے نہیں پتا تم نے کس مجبوری یا جذبے کے تحت مجھ سے شادی کی ہے لیکن اب تمہاری ہر چیز کا ذمہ دار میں ہوں، یہ زیورات اور نقدی تمہاری امانت ہیں جب چاہو مجھ سے بلا جھجک مانگ سکتی ہو۔''

''جب میں آپ کی ہو چکی ہوں تو پھر میرے زیورات اور رقم آپ کے کیوں نہیں ہو سکتے؟'' شادی کے بعد چندا اسے آپ کہنے لگی تھی۔ ''اب میرا سب کچھ آپ ہی ہیں اور میرا سب کچھ بھی آپ ہی کا ہے۔''

''ٹھیک ہے حضور۔'' ریاض نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''جو حکم سرکار۔''

''اچھا جی اب مسکے لگانا بند۔'' چندا نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

☆......☆

ریاض کے والدین کو بھی اس کی شادی کا پتا چل چکا تھا۔ اور وہ لوگ ریاض سے ناراض تھے کہ اس نے ایک اچھا کام غلط طریقے سے کیوں کیا تھا۔ ان کے والد حافظ صادق کی علاقے میں کافی عزت تھی اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی اولاد میں سے کوئی بھی فرد ایسا کام کرے جس سے ان کی نیک نامی پر حرف آئے لیکن وہ بیٹے کو اس شادی سے روکنے میں ناکام رہے تھے کیونکہ انہیں اطلاع بعد میں پہنچائی گئی تھی۔

دوسری طرف چندا کے والدین اور ان سے زیادہ عاصمہ کے سسرالی رشتے دار بہت غصے میں تھے۔ انہوں نے چندا کی چھوٹی بہن نائلہ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ نائلہ چونکہ چندا کی ہمراز تھی۔ سوائے ساری بات کا پتا تھا لیکن اپنے فرار کی خبر چندا نے نائلہ کو بھی نہیں بتائی تھی کہ مبادا وہ اسے روک لے۔ نائلہ اپنے والدین اور رشتے داروں کے تیکھے سوالات سے جلد ہی گھبرا گئی اور اس نے ساری بات اپنی ماں کو بتا دی۔ اس کی ماں نے اپنے شوہر کو اور دیگر رشتے داروں کو بتا دی۔ اس وقت چندا کی بڑی بہن عاصمہ کے سسرال والوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ چندا اور اس کے بوائے فرینڈ کی تکا بوٹی کر دیتے۔ عاصمہ کے شوہر شکیل نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے نائلہ سے پوچھا۔

''اس کمینے کا فون نمبر تو تمہیں معلوم ہوگا جس سے چندا گپیں لگاتی تھی۔''

''جی بھائی۔'' نائلہ اپنا تھوک نگلتے ہوئے بولی اور اس نے نمبر شکیل کو بتا دیا۔

شکیل نے اپنے تعلقات سے اتنا پتا چلا لیا کہ وہ سم ریاض احمد کے نام تھی جو کہ ضلع بہاولپور کا رہائشی تھا۔ انہوں نے پولیس اسٹیشن بات کی اور پھر وہ لوگ ایک کار اور پولیس کی ایک گاڑی میں ریاض کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ پوچھتے پوچھتے وہ لوگ ریاض کے گھر پہنچ گئے اور انہوں نے حافظ صادق کو پکڑ لیا۔ اس وقت گھر میں ریاض

کے چھوٹے بھائی موجود تھے اور بھی بڑے بھائی بھٹے پر تھے۔

پولیس نے جب حافظ صادق کو پکڑا تو اسے فوراً پتا چل گیا کہ اس کی بہو کے میکے والے ہیں لیکن اس نے تصدیق کے لیے پوچھا۔ ''جناب! خیریت تو ہے مجھے کس سلسلے میں گرفتار کیا جا رہا ہے؟'' پولیس کو دیکھ کر اس نے اپنے شاگرد بچوں کو چھٹی دے دی تھی جنہوں نے اپنے اپنے گھر جا کر انکشاف کیا تھا کہ ماسٹر جی کو پولیس گرفتار کرنے آئی ہوئی ہے۔ حافظ صادق سے پولیس نے مختلف سوال کیے تو انہوں نے ساری بات سچ سچ بتا دی اور آخر میں کہا۔ ''میں ذاتی طور پر اپنے بیٹے سے ناراض ہوں کہ اس نے کسی کی بہن بیٹی کو بھگا کر اچھا کام نہیں کیا ہے۔''

''اب آپ ریاض کو کسی طریقے سے یہاں بلائیں۔'' پولیس اور شکیل وغیرہ کی کوشش تھی کہ بات زیادہ نہ پھیلے اور اصل مجرم ہتھے لگ جائیں تو بہتر ہے۔

''جی میں کوشش کرتا ہوں۔'' حافظ صادق نے کہا اور موبائل منگوا کر ریاض کا نمبر ملایا۔ نمبر بزی جا رہا تھا۔ اس نے اعجاز سے رابطہ کیا اور چھوٹتے ہی کہا۔ ''ریاض کہاں ہے؟ پولیس آئی ہے اس کے سسرال والے بھی ساتھ ہیں اور ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر ریاض نہ ملا تو وہ مجھے گرفتار کر کے لے جائیں گے۔ عمر کے اس حصے میں تم لوگوں نے میری عزت کا جنازہ نکال دیا ہے۔''

''ابا آپ پریشان نہ ہوں۔'' اعجاز نے کہا۔ ''ہم کوئی بندوبست کرتے ہیں۔''

''آپ ہمیں بھٹے پر لے چلیں۔'' شکیل نے کہا۔ ''وہاں سے ہم اپنی لڑکی لے لیں گے اور آپ کو کچھ نہیں کہیں گے۔''

''بیٹا! مجھے اس بھٹے کا پتا نہیں ہے۔'' حافظ صادق نے کہا مگر پولیس نے یقین نہ کیا اور اسے پولیس کے ڈالے میں بٹھا لیا اردگرد لوگ جمع ہو چکے تھے۔ شکیل نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ریاض سے کہنا کہ اگر باپ کی زندگی عزیز ہے تو جتنی جلدی ہو سکے لاوہ ضلع چکوال کے پولیس اسٹیشن میں اپنی بیوی کو لے کر پہنچ جائے ورنہ......'' اور وہ لوگ واپس چلے گئے۔ حافظ صادق نے اپنا موبائل چھوٹے بیٹے کو دے دیا تھا۔

جب ریاض اور اس کے بھائیوں کو ساری صورت حال کا پتا چلا تو وہ بہت پریشان ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے سیدھے سادے باپ کے لیے تھانہ کسی جہنم سے کم نہیں ہے۔ وہ فوراً بھٹہ مالک کے پاس گئے اور اسے ساری بات بتا کر مدد چاہی لیکن اس بھٹہ مالک نے معذرت کر لی کہ وہ کسی قسم کے قانونی یا غیر قانونی پھڈے میں ٹانگ نہیں اڑانا چاہتا۔'' وہ لوگ مایوس ہو گئے۔

ان کا ایک رشتے دار لڈن میں ایک بھٹہ پر جمعدار تھا۔ اس کا نام تو نور محمد تھا لیکن وہ مچھر کی عرفیت سے مشہور تھا۔ ریاض کے بڑے بھائی اللہ داد نے اسے فون کیا اور ساری صورت حال بتانے کے بعد مدد چاہی۔ ساری بات سننے کے عبد نور محمد کہنے لگا۔

''تم پریشان نہ ہو۔ میں کوئی نہ کوئی راستہ نکالتا ہوں۔''

نور محمد کے ماتحت دو بھٹوں پر لیبر یعنی پتھیرے کام کرتے تھے۔ کسی بھی بھٹے پر بغیر کسی ذمہ دار (جمعدار) کے کوئی بھی ٹھیکیدار یا بھٹہ مالک ہر ایرے غیرے کو پیشگی کے طور پر رقم نہیں دیتا۔ نور محمد چونکہ جمعدار تھا اور لڈن میں بھٹوں کی مارکیٹ میں اس کی اچھی خاصی عزت تھی۔

''میں ابھی جاتا ہوں اور کچھ کر کے ہی آؤں گا۔'' نور محمد نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا اور فون بند کر کے حاجی افلاطون خان کے پاس گیا اور انہیں ساری بات بتا کر مدد مانگی لیکن انہوں نے معذرت کر لی۔

''حاجی صاحب!'' نور محمد نے انہیں ترغیب دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''بدلے میں وہ لوگ بغیر کسی پیشگی رقم کے ہمیں پانچ ہزار ڈیلی دیں گے۔''

(ڈیلی سے مراد وہ پکی اینٹ ہوتی ہے جو پتھیرا، یومیہ کے حساب سے بھٹہ مالک کو دینے کا پابند ہوتا ہے لیکن یہ صرف رسمی کارروائی ہوتی ہے۔ حقیقت میں کوئی بھی پتھیرا مقررہ ڈیلی بھٹہ مالک کو نہیں دیتا)۔

نور محمد جمعدار حاجی افلاطون خان کا جواب سن کر میاں ایاز خان دولتانہ کے پاس گیا اور انہیں ساری بات

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایمایے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

بتانے کے بعد کہا کہ وہ لوگ صرف اپنے والد صاحب کو پولیس کے چنگل سے آزاد کرانا چاہتے ہیں اور اس کے بدلے میں وہ لوگ کسی پیشگی رقم کے بغیر ہمارے اس بھٹے پر کام کریں گے۔''

میاں ایاز خان نے اپنے منشی حضرات سے مشورہ کیا اور پھر نور محمد سے کہا کہ وہ اللہ داد، ریاض اور ان سب لوگوں کو بھٹے پر بلوا لے۔ چنانچہ شام سے پہلے ہی وہ سب لوگ میاں ایاز خان کے بھٹے پر پہنچ گئے۔

میاں ایاز خان دولتانہ نے اللہ داد وغیرہ سے تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایاز خان کا ایک دوست چوہدری ظفر پنجاب پولیس میں تھا۔ وہ بڑے دھڑلے والا اور بے باک قسم کا آفیسر تھا اور قانون کے بھی قانونی اور غیر قانونی قسم کے ہتھکنڈوں سے بخوبی واقف تھا۔

چوہدری ظفر نے ریاض اور اس کی بیوی شمائلہ عرف چندا کا تفصیلی انٹرویو لیا اور مطمئن ہو کر ان سے اسٹام لکھوالیا کہ حافظ صادق کو رہائی دلوانے کے بعد وہ لوگ میاں ایاز خان کے بھٹے پر کام کریں گے۔ اس کام سے فارغ ہو کر چوہدری ظفر نے ریاض اور چندا کو میاں ایاز خان کی کار میں بٹھایا اور اپنے کزن اور میاں ایاز خان کے منیجر شوکت علی سہو کے ہمراہ چکوال کے علاقے لاوہ کی طرف چل دیے۔

راستے میں چوہدری ظفر نے اپنے مختلف دوستوں کے ساتھ ریاض کے معاملے پر بحث کی اور ان کو ساری صورتحال سے آگاہ کیا۔ لاوہ تھانے میں پہنچنے سے قبل انہوں نے پولیس ہیڈ کوارٹر راولپنڈی اور میر چکوال رابطہ کر لیا تھا۔ ان کی خوش نصیبی کہ لاوہ پولیس اسٹیشن کا ایس ایچ او چوہدری ظفر کا پرانا یار نکلا۔ چنانچہ ان کی گاڑی جیسے ہی پولیس اسٹیشن کے اندر داخل ہوئی۔ تین چار کانسٹیبل تیزی سے ان کی جانب بڑھے اور چوہدری ظفر کو سیلوٹ مارا۔ حالانکہ اس وقت چوہدری ظفر عام لباس میں تھے۔ چوہدری ظفر نے ان سے ہاتھ ملایا اور ان کے کچھ کہنے سے قبل ہی ایک سپاہی کہنے لگا۔

''سر! ایس ایچ او صاحب اپنے کوارٹر میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''ہمیں لے چلو۔'' چوہدری ظفر نے حکم دیا اور سپاہی نے مستعدی سے انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوگ ایس ایچ او آصف حیات کے کوارٹر میں پہنچ گئے۔ جہاں وہ ان کا منتظر تھا۔ چوہدری ظفر کے ساتھ اس نے طویل معانقہ کیا، شوکت سے گلے ملا اور ریاض سے ہاتھ ملانے کے بعد ایس ایچ او نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''تو یہ ہے وہ لیلیٰ مجنوں کا جوڑا۔'' اس نے ریاض اور شمائلہ کی طرف اشارہ کیا۔

''جی ہاں!'' چوہدری ظفر نے خوش دلی سے کہا۔

''ان کی کہانی حیرت انگیز ہے۔'' ایس ایچ او آصف حیات نے ان کی خوب تواضع کی اور کہا۔

''ظفر بھائی! آپ کا فون آنے کے بعد میں نے حافظ صادق کو تھانے سے نکال کر اپنے پاس ہی رکھ لیا ہے۔ وہ ہمارے بزرگوں جیسے ہیں اور ہم نے ان کو بڑی تعظیم سے رکھا ہے۔'' حافظ صادق نے بھی نہ صرف ایس ایچ او کی بلکہ تمام عملے کی تعریف کی اور مزید بتایا کہ ان کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے قیدیوں اور عملے نے نماز پڑھنا شروع کر دی ہے۔''

''آپ حافظ صادق کو بے فکر ہو کر لے جائیں۔'' کھانے سے فراغت کے بعد آصف حیات نے چوہدری مظفر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''یہاں جو بھی ہوگا ہم سنبھال لیں گے۔''

''بہت شکریہ آصف صاحب!'' چوہدری ظفر نے اٹھتے ہوئے کہا اور پھر وہ لوگ حافظ صادق کو اپنے ساتھ لے کر دوسرے دن واپس میاں ایاز خان کے بھٹے پر پہنچ گئے۔ ریاض کے رشتے داروں کو یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ لوگ بغیر کسی رشوت اور بے عزتی کے بخیر و عافیت شمائلہ سمیت گھر لوٹ آئے ہیں لیکن حقیقت سب کے سامنے تھی جسے وہ جھٹلا نہیں سکتے تھے اور یوں ایک کہانی اپنے خوشگوار انجام کو پہنچی اور اب تک ایک خوشگوار زندگی چندا اور ریاض گزار رہے ہیں۔

پتھیرو کی روایت کے عین مطابق ریاض اور اس کے بھائی میاں ایاز خان کے بھٹے پر کچھ عرصہ ایمانداری سے کام کرتے رہے لیکن پھر فرار ہو گئے۔ تا حال ان کا کچھ پتا نہیں۔

تیسری سچ بیانی

اے وطن تیرے لیے



سید ابو محمد آزاد

محبت کی وہ لازوال داستان جو بالآخر اپنی منزل پا گئی



یہ کاشانہ غضنفر ہے۔ بیوی کا نام معصومہ اور شوہر کا نام غضنفر علی تھا۔ دونوں تعلیم یافتہ تھے۔ غضنفر علی واپڈا (ترقی پاکستان) کے exn تھے۔ بیگم معصومہ ایک گھریلو خاتون تھا۔ ان دونوں کی شادی کے تقریباً بیس سال ہوگئے تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام نام اصغر دوسرے کا نام ظہور علی ہے دونوں زیر تعلیم تھے۔ گورنمنٹ کا دیا ایک بنگلہ تھا وہ جس میں رہائش پذیر تھے، ایک مالی پھول پودوں کے دیکھ بھال کے لیے تھا۔ بنگلے کے ساتھ ایک باغیچہ تھا جس کی وہ دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس باغیچہ میں طرح طرح کے پھول پودے لگے ہوئے تھے۔ بیگم غضنفر علی کو باغ بانی سے کافی شغف تھا۔

ان کی محبت صرف پھول پودوں سے ہی نہیں اپنے شوہر سے بھی بے انتہا تھی۔ صبح کا ناشتا وہ خود پکا کر اپنے میاں اور بچوں کو کھلاتی تھیں۔ گو ان کی ان کی شادی کو 30 سال ہوگئے مگر محبت کی حدت میں کوئی کمی نہیں تھی بلکہ اضافہ ہی ہوتا معلوم ہوتا تھا، حد تو یہ تھی کہ ڈرائیور فیض بابا، غضنفر علی کو دفتر لے جانے کے لیے جب آتا تو وہ انہیں خود رخصت کرتیں۔ حقیقت میں اس جوڑے کی زندگی محبت و پیار سے بھری ہوئی تھی۔ ایسے پریمی کو اپنے پریم کے اظہار کے لیے مشرقی پاکستان کی ہر طرف ہریالی اور گنگناتے بہتے دریا بہت موزوں لگتے تھے۔ یہ قیام پاکستان کے وقت سے ڈھاکا میں آباد تھے۔

ان کے انسان نواز مزاج کی وجہ سے ان کے تعلقات وسیع تھے۔ یہ سماجی کاموں میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ فلاحی اداروں کے ذریعہ غریب ماں باپ کی بیٹیوں کی شادی کراتے تھے زندگی کے ہر شعبے میں ان کا بڑا احترام تھا لیکن کسے معلوم تھا کہ ایک وقت وہ بھی آئے گا کہ یہ پیار ومحبت سے بھری زندگی عذاب بن جاتی تھی۔

وہ وقت سقوط ڈھاکا کی شکل میں آ ہی گیا۔ چہار طرف فضاؤں میں دھواں ہی دھواں اٹھ رہا تھا۔ اپنی زندگی کے لیے فضاؤں سے پرندے غائب تھے۔ انسان اپنی بقاء کے لیے پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ ایسے ہی حالات میں غضنفر علی کا ملازم فضلو بابا ہانپتا کانپتا بیگم معصومہ کے پاس آیا اور شہر کے حالات سے انہیں آگاہ کیا۔ اس کے آنے سے پہلے غضنفر علی دفتر جا چکے تھے۔ ان کے رشتہ دار محمد پور اور گلشن (ڈھاکا) میں رہتے تھے بیگم معصومہ کی

پریشانی دیدنی تھی۔

اپنے فون سے انہوں نے ایک رشتہ دار سے غضنفر علی کی خیر جاننے کی کوشش کی لیکن کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملا۔ اتفاق سے کرجی تولہ فوجی چھاؤنی سے رابطہ پیدا ہوگیا۔ ان کی تفصیل پر فوجیوں نے غضنفر علی کا پتا چلالیا یہ خبر پا کر بیگم معصومہ اللہ کے حضور سر بسجود ہوگئیں۔ کچھ دیر بعد فوجی جیپ آئی اور ان کو لے کر وایڈ ہاؤس چلی گئی۔ جہاں غضنفر علی چھپے ہوئے تھے۔ بیگم معصومہ ان کو پا کر خوشی سے رو پڑیں۔ ان دونوں کے جدا ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ یہاں سے وہ گلشن (ڈھاکا) چلے گئے لیکن ان کے رشتہ دار حالات کے جبر سے کسی اور جگہ منتقل ہوگئے تھے۔ وہاں صرف ان کا ایک پرانا ملازم چھپا ہوا تھا۔ رات کی تاریکی میں غضنفر علی اپنی بیگم اور دو بیٹوں کے ہمراہ محمد پور پہنچے، وہاں کا گھر بند پڑا تھا، پرانے ملازم نے گھر کھولا، محلّے کے اڑوس پڑوس میں بنگالیوں کو پتا نہیں چلا کہ کوئی غیر بنگالی وہاں رہائش پذیر ہے۔ بیگم معصومہ کے والدین اپنی جان بچانے محمد پور سے اپنے بنگالی رشتہ دار کے یہاں منتقل ہوگئے تھے۔ ان لوگوں کو کسی طرح معصومہ کی محمد پور آمد کی خبر ہوگئی تھی۔ وہ سب مذہبی دین دار لوگ تھے۔ ان کی مدد کے لیے رات میں ان کے پاس آتے تھے اور ان کی دامے درمے سخنے ہر طرح مدد کرتے تھے۔ غضنفر علی کی یہ کسمپرسی کی حالت تقریباً ایک سال سے تھی۔ اس دوران وہ سب ایک طرح سے محصور تھے۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اندر کوئی بیماری رہتا ہے۔ وہ باہر کی فضا اور سورج کی روشنی سے کلی طور پر محروم تھے۔ اس گھٹن اور ذہنی دباؤ کی وجہ سے غضنفر علی کو یرقان ہوگیا۔ مضبوط اوسان کی مالک بیگم معصومہ بھی اب جلد سے جلد حالات سے نجات



چاہتی تھیں مگر اپنے شوہر کے حوصلے کو کمزور کرنا نہیں
چاہتی تھیں۔ ادھر غضنفر علی روزانہ کا اک ہی منظر دیکھ
دیکھ کر تنگ آ چکے تھے۔ وہ اپنے وقت کے ایک
ایماندار، لائق فائق اور محب وطن افسر تھے۔ ان کی
حب الوطنی کا یہ عالم تھا کہ جب بچے یوم پاکستان
کے موقع پر اپنے گھر کو پاکستانی جھنڈیوں سے سجاتے
تو وہ بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے بلکہ بچوں کے ساتھ مل
کر 23 مارچ کی صبح پاکستانی جھنڈے کو سلامی دیتے
اور بچوں کے ساتھ قومی ترانہ گاتے۔ ماضی کی یادیں
ان کو اس طرح تڑپانے لگیں کہ ایک دن وہ اپنی بیگم
سے بہکے بہکے انداز میں کہنے لگے۔

''کیا معصومہ تم نے پاکستانی جھنڈا اور پی آئی
اے کا جہاز فضا میں اڑتے دیکھے؟ میں نے تو اب
تک نہیں دیکھے ہیں۔ ایک دن ضرور پاکستان کو
پالیں گے۔''

بیگم معصومہ ان کی باتوں سے بہت مضطرب
ہوگئیں ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ آنسوؤں کو
روکتے ہوئے کہنے لگیں۔

''انشاء اللہ ہم بہت جلد پاکستان پالیں گے۔
آپ ہی تو کہتے تھے کہ حوصلہ اگر بلند ہو کٹھن سے
کٹھن مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ آپ حوصلہ نہ ہاریں، ہم
بہت جلد پاکستان پالیں گے۔''

اس چھوٹی سی کوٹھری میں غضنفر علی کی فیملی کے چار
افراد رہتے تھے۔ ایک دن انہوں نے بیگم کو آواز
دے کر بلایا اور کہا۔

''اب تم تیار ہو جاؤ ہم بہت جلد پاکستان کی
تلاش میں ہندوستان جائیں گے۔''

بیگم نے ان کی باتوں سے ذرہ بھر بھی پریشانی کا
اظہار نہیں کیا۔ ایک دن غضنفر علی اپنے سر محترم کے
پاس پہنچ گئے اور اضطرابی کیفیت میں ان سے کہا۔

''میں پاکستان کی تلاش میں ہندوستان جارہا
ہوں، آپ ہمارے لیے دعا فرمائیں۔''

موصوف ان کی بات سن کر ہکا بکا رہ گئے، صرف
اتنا کہہ پائے۔

''عزیزم ابھی حالات ٹھیک نہیں ہیں کہ آپ
ہندوستان جائیں۔''

سر چڑھا جنون ان کو ارادے سے باز نہیں
رکھ سکا۔

بیگم معصومہ کا خاندان کھاتا پیتا خاندان تھا۔ ان
کے خاندان میں صرف خانقاہیں ہی نہیں تھیں، ان
کے چھوٹے بہنوئی راجہ بابو کے کئی مل بار چیز اور پتا
نہیں کیا کیا کاروبار تھے۔ اگر وہ غضنفر علی کی اس مہم
جوئی کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتیں تو ان کی گزر
اوقات کے لیے وسائل کی کوئی کمی نہ ہوتی لیکن غضنفر
سے اتنی محبت تھی کہ وہ انجان منزل کی طرف جانے
سے انکار نہیں کر سکیں۔ اس منزل کی راہوں میں جگہ
جگہ دشواریاں اور کٹھنائیاں تھیں۔ اس کے باوجود
منہ پہ چپلی لگائے رکھی رہیں۔ بالآخر وہ دن آ ہی گیا
جب بنگالی رشتہ دار امجد کے ساتھ اپنی فیملی کے ہمراہ
دریائی راستے سے ہندوستان بارڈر پار کرنے کے
لیے کھلنا شہر پہنچے۔ بیگم معصومہ کو صرف اتنا معلوم تھا
کہ ان کے کوئی رشتہ دار وہاں کی اللہ والی مسجد کے
پیش امام ہیں اور کلکتہ میں ان کے چچا سلطان مسجد
کے پیش امام اور مفتی ہیں جن کی رہائش جلیا ٹولی کی
مسجد میں ہے۔

ڈھاکہ سے کھلنا روانہ ہوتے وقت چھوٹے ظفر کو
فرگن دوا پلا دی تھی تاکہ وہ بات نہ کر سکے۔ لانچ نما
بڑی کشتی جب روانہ ہوئی تو راستہ میں کئی گھاٹ
(اسٹیشن) آئے مسافر کشتی پر چڑھتے اترتے گئے
اس دوران ایک گھاٹ سے تین مخصوص شکل سے قلی
معلوم ہو رہے تھے، انہوں نے اچٹتی نظروں سے
غضنفر علی کی فیملی کو دیکھتے ہوئے امجد سے پوچھا۔

''انی کیے آپ نے جیے مونے کورتے چھپن
انی نائی۔'' (آپ لوگ چھپتے ہوئے کیوں پھر
رہے ہیں)

امجد نے جواب دیا وہ تینوں آگے بڑھ گئے۔ ہر
مسافر کشتی سے اترتے گئے۔ پھر وہ تینوں شخص نظر
آئے۔ امجد میاں (بیگم معصومہ) کے رشتہ دار نے
ان کو کشتی سے اترنے کا اشارہ کیا۔ گھاٹ سے باہر
غضنفر علی نے اللہ والی مسجد جانے کے لیے اپنی فیملی کو

رکشہ پر سوار کیا۔ راستہ میں پھر وہ تینوں شخص (جو کشتی میں سوار تھے) نظر آئے جو ان لوگوں کا تعاقب کر رہے تھے۔ دور سے اللہ والی مسجد نظر آئی۔ بیگم معصومہ کے چہرے پر کچھ اطمینان سا معلوم ہونے لگا۔ غضنفر علی نے رکشہ سے اترتے ہوئے اپنی بیگم کو اشارہ کیا کہ وہ مسجد کے اندر چلی جائیں۔ اسی اثنا میں وہ تینوں تعاقبی شخص (جو رکشے کے ساتھ ساتھ آ رہے تھے) غضنفر علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امجد میاں سے پوچھنے لگے۔

''کیا وہ ان کا دلال ہے۔''

امجد میاں نے جواب دیا۔

''نہیں وہ بارڈر پر چھوڑنے آیا ہے۔''

اس کے بعد وہ وہاں نظر نہیں آئے۔ مسجد کے قریب ایک ہوٹل تھا۔ اسٹیشن سے نکلنے کے لیے غضنفر علی نے ان تینوں کے ہاتھ پکڑ کر اس ہوٹل میں داخل ہو گئے اور کھانے کا آرڈر دیا۔ کھانے کے دوران اس نے یہ کہہ کر غضنفر علی سے پیسے لیے کہ B.D.R کے ذریعے ان کو بارڈر پار کرا دیں گے۔ پیسے لینے کے بعد وہ بارڈر کراس کرنے کے وعدے سے مکر گئے۔

بیگم غضنفر علی مسجد میں داخل ہوئیں تو یہ دیکھ کر سکتے میں آ گئیں کہ چاروں طرف زخمی عورتیں اور بچے پڑے ہوئے تھے۔ وہ افسوس کے سوا کر ہی کیا سکتی تھیں۔ وہ پیش امام صاحب کے پاس چلی گئیں اور اپنا مدعا بیان کیا۔ انہوں نے ان لوگوں کو بارڈر کراس کرانے کے لیے دو دلال مہیا کر دیے۔ یہ دونوں ہندو تھے۔ ان کا نام دیپک اور منتو تھا۔ دلال اور غضنفر علی کے درمیان بارڈر کراس کرانے کے پیسے اور روانگی کے وقت طے ہو گئے۔ دوسری دفعہ رات میں جب عوامی لیگ کا مشعل بردار جلوس جا رہا تھا اسی وقت دونوں دلال آئے اور غضنفر کی فیملی کو رکشے پر لے کر نامعلوم مقام کی طرف چل دیے۔ بیگم معصومہ سارے راستے وظیفہ پڑھتی رہیں۔ اس سے پہلے وہ کبھی ایسے مسائل سے دوچار نہیں ہوئی تھیں۔

معصومہ بیگم کی اپنے شوہر سے دلی محبت تھی جس کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ ان کے چہرے سے ذرہ برابر پریشانی نہیں ٹپک رہی تھی۔ ان کو معلوم تھا کہ محبوب سے محبت وجود کی قربانی ہے۔ وہ سارے راستے غضنفر علی کے افسردہ چہرے کو دیکھ کر ان کو اشاروں کنائیوں سے پیام سحر دیتیں۔ ڈھاکا سے چلتے وقت زادراہ کے لیے کچھ بسکٹ اور خشک دودھ لے لیا تھا۔ راستے میں دونوں بیٹوں کو بسکٹ کے ٹکڑے دے کر دلاسہ دیتیں کہ بہت جلد ہم ان پریشانیوں سے نکل جائیں گے اور اپنی پسند کا اچھا اچھا کھانا کھائیں گے۔

یہ رکشہ کافی دیر کے بعد ایک جنگل میں پہنچا۔ یہ جنگل بہت گھنا اور بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ حیرانگی کی بات یہ تھی کہ اتنے بڑے جنگل میں وہاں ایک ٹوٹی پھوٹی کار کیسے تھی۔ دلال نے ان لوگوں کو اس کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب بہت خاموشی سے بیٹھ گئے۔ جوں جوں رات بھیگتی گئی، جنگل کے حشرات چیخنے چلانے لگے۔ ان کی آواز اتنی بھیانک تھی کہ اصغر اور ظہور اپنی ماں سے لپٹ گئے اور بیگم معصومہ نے ان دونوں کو سینے سے لگائے رکھا۔ کافی دیر کے بعد وہ دونوں دلال آئے اور ان لوگوں سے کہنے لگے۔

''جلدی جلدی چلو۔'' وہ سب ان کے اشاروں کی طرف چل پڑے۔ کافی دور رکشے کھڑے تھے۔ وہ سب رکشے میں بیٹھ گئے۔ دلال بھی ساتھ تھے، رات کا وقت تھا۔ اردگرد کے حالات بتا رہے تھے کہ وہ سب بازار سے گزر رہے تھے۔ حیرانگی کی بات یہ تھی کہ بازار کے دکاندار بھی ان کو بہت قہر آلود نظر سے دیکھ رہے تھے۔ اس طرح جیسے وہ سب ان کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسی اثناء میں یک بیک ادھر سے آواز بلند ہوئی۔

''بہاری سب بھاگ رہے ہیں۔'' گھاٹ آ چکا تھا۔ دلال نے اشارہ کیا کہ لگے ہوئے اسٹیمر پر وہ سب چڑھ جائیں۔ غضنفر علی اور ظہور (جو ٹائیفائیڈ میں مبتلا تھا) اسٹیمر کی اوپری منزل پر جہاں کوئی سایہ

نہیں تھا وہاں جا بیٹھے۔ ان کے پاس ایک کمبل تھا جو ظہور کو اوڑھا دیا گیا تھا۔ رات کی سیاہی چھٹنے لگی، طلوع آفتاب نئے دن کا پیغام دینے لگا تھا۔ اسٹیمر گھاٹ سے جا لگا۔ مسافر اپنی اپنی منزل پر اتر گئے۔ اترتے ہوئے ان کی نظر جب غضنفر علی کی فیملی پر پڑتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اپنے دشمنوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی تحریک اس طرح منظم اور مربوط تھی کہ قریہ قریہ، گلی گلی، گاؤں گاؤں کے باسیوں کو ذہن نشین کرا دیا گیا تھا کہ جب تک پاکستانی فوج اور اس کے ہمدردوں یعنی اردو اسپیکنگ والوں کو مفلوج نہ کر دیا جائے اس وقت تک ان کی فتح نہ ہوگی۔ سو انہوں نے اردو بولنے والی چڑیا کو بھی جان کی امان کے لیے سرحد پار جانے نہیں دیا۔ یہ معجزے سے کم نہیں تھا کہ کچھ اردو بولنے والے جان بچا کر بنگال سے ہندوستان پہنچے اور پھر نیپال سے پاکستان آئے۔

اس دوران دلال دیپک اور منٹو غضنفر علی کی فیملی کے پاس آئے اور اشارہ کیا کہ وہ سب گھاٹ سے لگی کشتی پر بیٹھ جائیں۔ وہ سب اپنے ناخدا کے اشارے پر کشتی میں بیٹھ گئے۔ صبح ہو چکی تھی۔ مطلع صاف تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد کشتی گھٹنے گھٹنے بھر پانی میں رک گئی اور اشارہ ہوا کہ وہ سب اتر جائیں۔ پانی میں چل کر وہ سب ایک مٹی کے گھر میں پہنچے۔ دلال کے اشارہ پر وہ سب اس گھر میں گئے۔ وہاں جو اللہ کی مخلوق نظر آئی ویسی پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ دیپک اور منٹو یہ کہہ کر چلے گئے وہ شام تک واپس آ جائیں گے۔ اس شام کیا دوسرے دن کی شام میں بھی وہ نہیں آئے۔ ان دونوں کے نہیں آنے پر اس گھر کی مالکہ بہت پریشان ہوئی اور غضنفر علی کی فیملی سے کہنے لگی کہ اس گھر کے اردگرد مکتی باہنی رہتے ہیں۔ ایسی باتوں کو سن کر ان لوگوں کے ہوش اڑ گئے۔ غضنفر علی بار بار اپنی بیگم سے پوچھتے اب کیا ہوگا۔ بیگم اوسان کی بہت مضبوط تھیں۔ وہ ان کو دلاسہ دیتیں کہ انشاء اللہ سب ٹھیک ہوگا۔ اللہ میری آپ سے محبت کا امتحان لے رہا ہے۔ ہم ساری کٹھنائیوں سے گزر کر پاکستان پالیں گے۔"

تیسرے دن صبح دونوں دلال آئے اور غضنفر علی کی فیملی کو کہا۔

"آپ لوگ بارڈر کراس کرنے کے لیے باہر کشتی میں بیٹھ جائیں۔" وہ سب کشتی میں بیٹھ گئے۔ یقیناً یہ خبر ان لوگوں کے لیے کے مژدہ سے کم نہ تھی۔ وہ سب انجان تھے اپنے سفر کی دوری سے۔ بہرحال یہ سفر ان کی امیدوں کی کرن سے کم نہ تھا۔ ڈھاکا سے روانہ ہوئے آج چھٹا دن تھا۔ کشتی نامعلوم سمت کی طرف رواں تھی۔ بچوں کو بھوک سے متلی ہونے لگی تھی۔ بسکٹ اور دودھ قریب قریب ختم ہو گئے تھے۔ شاید دلال بھی کشتی سے اتر کر ادھر ادھر کچھ کھانے کے لیے چلے گئے تھے۔ یہ سفر تقریباً دو دن چلتا رہا۔ دلال نے غضنفر علی کی فیملی کو سکھا دیا تھا کہ سامنے سے آتے ہوئے کشتی سوار جب یہ پوچھیں کہ تم لوگ کہاں جا رہے ہو تو جواب دو رشتے دار کے یہاں جا رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد کشتی رک گئی اور دونوں دلال کشتی سے اتر کر سامنے مٹی کے ٹیلے پر جا بیٹھے اور اس کشتی سوار کو کہنے لگے کہ اب ہم آگے نہیں جائیں گے جب تک کہ تم بقیا رقم ادا نہ کر دو۔ یہ سن کر غضنفر علی ہکا بکا رہ گئے۔ سفر شروع ہونے سے پہلے ڈھاکا ہی میں طے شدہ رقم غضنفر علی نے دلال کو ادا کر دیے تھے۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق انہوں نے بیگم سے مذکورہ سلسلے میں باتیں کیں۔ وہ ان کو کسی حال میں پریشان دیکھنا نہیں چاہتی تھیں۔ ان کے پاس جو پس ماندہ رقم تھی اس میں سے دے کر ان کی پریشانی دور کی۔ رقم پا کر دلال پھر آگے بڑھے۔ سامنے دریا نما کھیت جو گھٹنے بھر پانی سے بھرا ہوا تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان لوگوں سے کہا آپ لوگوں کو اس کھیت کو عبور کر کے آگے خشک راستے پر پہنچنا ہے۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔ بے خانماں فیملی کو کبھی ایسے کھیت سے گزرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا لہٰذا اس کھیت کے گدلے پانی میں گرتے چلے گئے۔ جسم کیچڑ سے اس طرح لت

پت ہو گئے کہ وہ خود ایک دوسرے کو پہچاننے سے قاصر تھے۔ اللہ اللہ کر کے وہ سب خشک راستے پر پہنچ گئے جس کے دونوں اطراف مٹی کے مکانات تھے۔ اسی اثناء میں ظہور نے اپنے پاپا کو کہا وہ دونوں دلال ہم لوگوں کا چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ دلال کی غیر موجودگی ان لوگوں کے لیے بہت تشویش کی بات تھی۔ کسی کو راستے کا کوئی پتا نہ تھا۔ بالآخر بیگم معصومہ اپنے لوگوں کی ہمت بڑھاتے ہوئے آگے آگے چلتی گئیں جب تک کہ دریا نہ آگیا۔ وہ سب ابھی دریا کے کنارے پہنچے ہی تھے کہ دائیں طرف سے 10-12 آدمی ہاتھوں میں ہتھیار اور اوزار لیے ان کے سامنے آگئے اور ان پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ کسی نے پوچھا۔ ''تم نے کتنے بنگالیوں کو مارا ہے، تم یہاں کیسے آئے، تم یحییٰ خان کے دلال ہو'' وغیرہ وغیرہ۔ غضنفر علی اور ان کی بیگم صفائی پیش کرتی رہیں مگر وہ سب ان کی جان کے پیچھے پڑ گئے اور قریب تھا کہ وہ سب ان کو قتل کر دیتے کہ دور سے 15-20 آدمیوں کی آواز آئی۔

''ٹھہرو، ٹھہرو'' فسادی ان کی طرف مڑے۔ آنے والے حالات کو جاننے کے بعد فسادیوں کو قتل کرنے سے باز رکھا۔ اسی دوران دونوں گروپ میں جھگڑے شروع ہو گئے۔ آنے والے گروہ نے غضنفر علی کو اشارہ کیا کہ وہ سب وہاں سے چلے جائیں۔ اشارہ ملتے ہی وہ سرپٹ بھاگے۔ کچھ دور جانے کے بعد انہوں نے دیکھا کہ بائیں طرف جنگل کے درمیان ایک راستہ سیدھا جا رہا ہے۔ اسی راستے پر یہ بے خانماں فیملی چل پڑی۔ گھنے جنگلات کی وجہ سے راستے کا صحیح پتا نہیں چل رہا تھا۔ یک بیک ایک نوجوان ہاتھوں میں رائفل لیے نمودار ہوا۔ اس نے ان لوگوں سے پوچھا۔

''تم لوگ بہاری ہو، کھلنا سے آ رہے ہو؟'' غضنفر اور بیگم معصومہ نے نفی میں جواب دیا اور کہا ہم بنگالی ہیں۔

''جان بچانے کے لیے تم لوگ جھوٹ بول رہے ہو، تم بہاری ہو۔ تم کہاں جاؤ گے؟ آگے بارڈر ہے۔ بی ڈی آر تم لوگوں کو مار دے گا۔ واپس چلو تم لوگوں کو کھلنا چھوڑ دیتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ بیگم معصومہ نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں ہمیں آگے جانے دو، تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔'' کچھ تاخیر کے بعد اس شخص نے کہا۔

''جاؤ میرے دل میں رحم آگیا ہے۔'' ابھی وہ سب کچھ دور ہی چلے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی۔

''ٹھہرو، ٹھہرو۔'' وہ سب رک گئے۔ پھر اس شخص نے یہی رٹ لگائی چو تم لوگوں کو کھلنا چھوڑ دیتا ہوں۔ کافی دیر اس کی منت و سماجت کے بعد ان لوگوں کو اس نے جانے دیا۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ رات کی سیاہی کی آمد آمد تھی۔ اس بے خانماں فیملی سے اب چلا نہیں جا رہا تھا۔ وہ سب طویل سفر کے بعد بہت تھک گئے تھے لیکن مرتے کیا نہ کرتے کسی طرح سے سب کچی آبادی میں داخل ہوئے۔ وہاں کی دکانوں والے لوگ ان لوگوں کو بہت اچٹتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ غضنفر علی نے اپنی بیگم سے سرگوشی میں کہا۔

''تیز تیز قدموں سے چلو۔'' اصغر اور ظہور بھوک سے بے حال ہو گئے تھے۔ پھر بھی جان کی امان کے لیے تیز تیز قدموں سے چلنے لگے تھے۔ گاؤں سے باہر نکلے تو ایک مچھیرا نظر آیا۔ اس سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ہندوستانی بارڈر قریب ہے۔ یہ سن کر بیگم معصومہ نے ہنستے ہوئے غضنفر علی سے کہا۔

''میری محبت بہت جلد آپ کو پاکستان دے دے گی۔'' غضنفر علی کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ کچھ دور مٹی کے لمبے پشتے نظر آنے لگے تھے۔ ان لوگوں کو یقین ہو چلا تھا کہ اس پشتے کے اس پار ہندوستان ہے۔ پیدل سفر سے ان سب پر بڑی کمزوری تھی۔ بیگم معصومہ کا بیٹا ظہور زمین پر گر گیا۔ اس اثناء میں بارڈر کی پولیس آئی اور ان سے پوچھنے لگی کہ ان کے پاس زیورات اور پیسے ہیں۔ بیگم معصومہ نے جواب دیا۔ ''سب کچھ رستے میں لوٹ لیا گیا۔ پھر بھی اس کے ہاتھ میں دس روپے تھما دیئے۔ سامنے جھونپڑے

کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس گھر کے اندر چلی جاؤ، صبح سویرے کشتی آئے گی تم سب کو دریا کے اس پار لے جائے گی۔''

اگرچہ موسم سرد تھا مگر تھوڑی تھوڑی بارش ہو رہی تھی۔ بہت مشکل سے وہ سب اس جھونپڑی تک پہنچے۔ جھونپڑی کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ یہ سب باہر ہی صحن میں لیٹے رہے۔ کچھ دیر کے بعد گھر کے اندر کھسر پسر کی آواز سنائی دی۔ بیگم معصومہ نے غضنفر کو دس روپے دے کر کہا۔

''دروازہ کھٹکھٹا کر مالک مکان سے کچھ کھانے کے لیے مانگ لو۔'' غضنفر کچھ دیر کے بعد 2۔3 روٹی لے کر آئے۔ ان لوگوں کی بھوک سے حالت بہت غیر تھی۔ سب ہی روٹی پر ٹوٹ پڑے۔ صبر کے دامن ہاتھوں سے چھوٹ چکے تھے۔ ظہور کو کمبل اوڑھا دیا گیا تھا کیونکہ وہ بخار میں مبتلا تھا۔ رات بھر سب دریا کی جانب تکتے رہے کیونکہ کشتی آنے کی امید تھی۔ اسی دوران سامنے بانس کے جھنڈ سے ایک فیملی نکلتی ہوئے نظر آئی۔ دوسری طرف کشتی بھی آ گئی۔ کشتی جوں ہی دریا کے کنارے لگی ویسے ہی غضنفر علی کی فیملی کشتی پر سوار ہوگئی لیکن بیمار ظہور کشتی پر سوار ہوتے ہوئے پانی میں گر گیا۔ بہت مشکل سے اسے نکالا گیا۔ کشتی دوسرے کنارے جا لگی۔ ہندو فیملی ایسے حالات سے واقف تھی۔ وہ تیزی سے کشتی سے اتر کر نظر سے اوجھل ہوگئی۔ غضنفر اس کے تعاقب میں چلتے رہے تھے۔ بہرکیف غضنفر علی کی فیملی آبادی میں داخل ہوگئی تھی کہ کسی زمین دار کے مکان کی فصیل شروع ہوئی۔ فصیل کے درمیان میں دروازے پر ایک شخص نظر آیا۔ ان کے برے احوال دیکھ کر اس کا دل بھر آیا اور اس نے بہت نرمی سے ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

''آپ لوگ ادھر آ جائیں، ڈریے نہیں، وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔''

بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ہندو وہاں کے بڑے زمیندار تھے۔ بیگم معصومہ بیٹوں کے ساتھ اس کے گھر کے اندر گئیں اور غضنفر علی مردان خانے میں رہے۔ اس زمیندار کے گھر کے احاطے میں بہت بڑا تالاب تھا۔ یہ دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک میں مرد نہاتے اور دوسرے میں عورتیں۔ غضنفر علی کیچڑ سے لت پت تھے۔ ان کو نہا کر کپڑے بدلنے کے لیے کپڑے دیئے گئے۔ صبح کا وقت تھا، ان لوگوں کے ناشتے کے لیے حلوہ پوری دی گئی۔ زمیندار کا سلوک ایسا تھا جیسے کوئی اپنا رشتے دار ہو۔ غضنفر علی کو سگریٹ نوشی کے لیے چار مینار نام کا سگریٹ دیا گیا۔ گھنٹے دو گھنٹے وہاں ٹھہرنے کے بعد اگلے دن سفر کے لیے زمیندار نے اپنے دو آدمیوں کو ان لوگوں کے ساتھ کر دیا۔ ان دونوں نے ان سب کو ریلوے اسٹیشن پہنچایا۔ بیگم معصومہ کے چہرے سے پتا چل رہا تھا کہ وہ خود کو محفوظ پا رہی ہیں۔ اس ملی جلی خوشی میں وہ اپنے محبوب میاں کو اشاروں کنایوں میں سلامتی و خیر کا پیغام دیتی رہی تھیں۔ غضنفر علی راستے کے اردگرد پر امن ماحول پا کر بہت ہشاش بشاش لگ رہے تھے۔

کلکتہ جانے والی ٹرین کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ شیر گھاٹ ریلوے اسٹیشن کے بیچ میں یہ سب بیٹھے تھے۔ سامنے ٹکٹ گھر کا کاؤنٹر تھا۔ کچھ دیر کے بعد کاؤنٹر کھل گیا۔ زمیندار کا ملازم ٹکٹ لینے کاؤنٹر پر گیا۔ غضنفر علی اور معصومہ کاؤنٹر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ زمیندار کے ملازم نے بکنگ کلرک سے ٹکٹ لینے میں کافی دیر لگائی جبکہ وہاں مسافر بھی نہیں تھے۔ یہ دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھنکا۔ اسی اثناء میں ٹرین آئی اور سب سوار ہو گئے۔ ٹرین جونہی اگلے اسٹیشن پر رکی دو ریلوے پولیس سیدھے غضنفر علی کے پاس گئے اور ان سے پوچھنا شروع کر دیا کہ وہ کہاں سے آ رہے ہیں؟

''ہم شیر گھاٹ سے آ رہے ہیں۔'' غضنفر علی نے جواب دیا۔

''نہیں آپ بنگلہ دیش سے آ رہے ہیں، شیر گھاٹ سے نہیں۔'' دوسرے مسافروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آخر ہم ان لوگوں کی آمد کے متعلق کیوں نہیں

پوچھ رہے ہیں۔ آپ ہی سے کیوں؟"

پولیس غضنفر علی اور ان کی فیملی کو ریلوے تھانہ لے گئی اور وہاں کے ایس ایچ او کو رپورٹ کیا کہ مذکورہ فیملی ڈھاکا سے آرہی ہے اور یحییٰ خان کے ایجنٹ ہیں۔"

اب ان لوگوں کے پاس اپنے دفاع کے لیے کچھ نہ تھا۔ ایسے موقع پر بیگم معصومہ ایس ایچ او کو مخاطب کر کے بولنے لگیں۔

"جناب ہم آپ کے یہاں پناہ لینے آئے ہیں۔ ہم آپ کے پاس امان کے لیے آئے ہیں۔ اس امید پر کہ آپ کے پردھان منتری جی نے اپنے بیان میں کہا کہ وہ لوگ جو صوبہ بہار سے مشرقی پاکستان گئے تھے وہ اب اپنے گھر واپس آسکتے ہیں اس لیے ہم آپ کے پاس امان کے لیے آئے ہیں۔"

یہ سن کر تھانیدار نے ان سے پوچھا۔

"آپ لوگ بنگلہ دیش میں کیوں نہیں رہ سکے۔"

"آپ سے کیا کہیں، بہت افسوس کی بات ہم پچیس سال رہے۔ تعلیم حاصل کی، شادی بیاہ وہاں کی مگر وہ ہمیں اپنا نہیں مانتے تھے اس لیے کہ ہم صوبہ بہار سے وہاں گئے تھے۔ وہ غیر بنگالی کا خون بہانا جائز سمجھتے تھے۔" تھانیدار خود سے ہمکلام ہوتے ہوئے کہا کہ "گویا وہاں صرف بنگالی رہ سکتے ہیں۔ نہیں نہیں ایسا ملک نہیں چل سکتا۔"

تھانیدار کے علاوہ جو پولیس وہاں تھی ان میں سے اکثر چھٹیوں پر جانے والے تھے کچھ دیر کے بعد کچھ پولیس اپنے گھر چلی گئی۔ ان کے جانے کے بعد غضنفر علی نے تھانیدار سے پوچھا۔

"کیا آپ بہار کے رہنے والے ہیں؟"

"جی ہاں۔" جواب دیا۔ "پہلے کیوں نہیں بتا دیا تھا۔"

صبح کا وقت تھا۔ تھانیدار نے ان لوگوں کے ناشتے کے لیے حلوہ پوری کا ناشتا منگوایا اور کہنے لگے۔ "مہاراج گھبرائیں نہیں۔ میں بھی بہار کا رہنے والا ہوں۔ میں آپ کو خیریت سے گھر پہنچا دوں گا۔ دفتر سے جو پولیس ابھی گئی ہے وہ واپس آئے گی۔ ان کا منہ بند کرنے کے لیے کچھ پیسے دیجیے۔"

بیگم معصومہ نے کچھ روپے تھانیدار کو دیے۔ چھٹی پر جانے والی پولیس واپس آگئی۔ تھانیدار نے غضنفر علی کی فیملی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے روانہ ہونے والی پولیس کو کہا۔

"ان لوگوں کو اپنی حفاظت میں لے جا کر سیالدہ چھوڑ دو۔ دیکھو ان لوگوں کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہو۔" سیالدہ جانے والی ٹرین آگئی اور وہ سب ٹرین پر سوار ہوگئے۔ چند ایک اسٹیشن کے بعد پولیس اتر گئی۔ بے خانماں فیملی پولیس کے سہارے کے بغیر سیالدہ کی طرف جارہی تھی۔ جوں ہی ریلوے جنکشن پر دوسری لائن پر سامنے سے آنے والی ٹرین رکی، دو تین اوباش لونڈے غضنفر علی کے پاس آئے اور ان کی آمد پر سوالوں کی بوچھاڑ کردی۔ ان سب کے آنے کا مقصد سمجھ رہے تھے، انہوں نے اپنی مٹھی میں پیسے لیے۔ ان میں سے ایک کو دیتے ہوئے کہا۔

"تم سب کو شرم نہیں آتی۔ میں تمہارے باپ کی عمر کا ہوں اور تم سب میرے ساتھ بدتمیزی کررہے ہو۔" ہاتھ میں دس روپے پا کر اس نے ان سے معذرت اور اپنے ایک ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جب ٹرین سیالدہ اسٹیشن سے پہلے ریلوے یارڈ میں رکے گی ویسے ہی یہ ٹرین سے اتر کر آپ لوگوں کو آپ کے جائے مقصود تک پہنچائیں گے۔"

غضنفر علی کی فیملی اس کے جلو میں ریلوے لائن عبور کر کے شاہراہ پر پہنچی۔ رات کا وقت تھا۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی بکھری ہوئی تھی۔ اس روشنی میں الٹے ہاتھ پر بلڈنگ پر سی آئی ڈی لکھا ہوا نظر آیا۔ یہ دیکھ کر بیگم معصومہ کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور ذہن میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہوگئے۔ نہیں ہمارا گائیڈ ہمیں گرفتار کرانے کے لیے سی آئی ڈی آفس تو نہیں لے جارہا ہے۔ اسی اثناء میں گائیڈ نے پوچھا۔

"آپ لوگ خضر پور بس سے جائیں گے یا ٹیکسی

سے؟'' غضنفر علی نے جواب دیا۔
''ٹیکسی سے۔'' اب اس بے خانماں فیملی کی جان میں جان آئی اور ان کو یقین ہو گیا کہ اب خوف ڈر کم ہو گیا ہے۔ حیرانگی کی بات یہ تھی کہ جہاں یہ فیملی جا رہی تھی وہاں کا پتا ان کے پاس ادھورا تھا۔ خدا کی شان اس ادھورے پتے جلیا ٹولی کی مسجد کے سامنے ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی روکی اور گائیڈ نے غضنفر علی سے پوچھا۔

''کیا اب میں جا سکتا ہوں؟''

''ہاں اب تم جا سکتے ہو۔ تمہارا بہت شکریہ۔'' غضنفر علی نے جواب دیا۔ مذکورہ مسجد بیگم معصومہ کے چچا مفتی عثمان صاحب کی تھی۔ اسی مسجد کے ایک طرف مفتی صاحب کی فیملی رہائش پذیر تھی۔ بیگم معصومہ کی ان لوگوں سے ملاقات تقریباً 25 سال بعد ہو رہی تھی مگر ان لوگوں نے ان کو پہچان لیا تھا۔

غضنفر علی کو کلکتہ سے آگے اپنے جائے پیدائش ''گیا'' شہر جانا تھا مگر سفر جاری رکھنے کے لیے رقم نہ تھی۔ بہت کشمکش میں تھے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ افطار کے بعد گھومتے ہوئے محمدیہ ہوٹل میں چائے پینے چلے گئے۔ چائے کی پیالی میں کشمکش کا طوفان اٹھا ہوا تھا، فکر لاحق تھی کہ اب وہ آگے ''گیا'' شہر کیسے جائیں گے۔ زادِ راہ کے لیے ان کے پاس پیسے نہ تھے۔ اسی سوچ کی انتہا میں دیکھا کہ ایک شخص برابر والی کرسی پر سلام کرتے ہوئے آ بیٹھا۔ انہوں نے اس سے پوچھا۔

''آئیے چائے پیجیے۔'' مگر انہوں نے معذرت کر لی۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد اس شخص نے غضنفر علی سے پوچھا۔

''آپ کہاں جائیں گے؟'' انہوں نے جواب دیا کہ میں ''گیا'' جاؤں گا۔ آنے والے شخص کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ اس لفافے کو غضنفر علی کی جیب میں ڈال دیا اور اٹھتے ہوئے کہا۔

''اللہ کرے آپ کا سفر خوشگوار ہو۔'' وہ وجیہہ صورت بوسکی کپڑے میں ملبوس تھا۔ غضنفر علی کو بہت بے چینی ہوئی یہ جاننے کے لیے کہ اس لفافے میں کیا ہے اور وہ آدمی کون تھا۔ بالآخر ہوٹل سے باہر نکل کر انہوں نے لفافے کو کھولا اور یہ دیکھ کر وہ حیران ہو گئے کہ اس میں پانچ سو روپے کے ساتھ ایک رقعہ میں یہ لکھا تھا۔

''سفر آپ کو مبارک اور یہ حقیری رقم آپ کے زادِ راہ کے لیے قبول فرمائیں، آپ کا محسن۔'' اب تو غضنفر علی کی ساری پریشانی کافور ہو گئی لیکن مفتی سلیمان صاحب کا ان سے پوچھنا کہ وہ ''گیا'' کب جائیں گے یہ ان کے دماغ پر بوجھ بنا ہوا تھا۔ وہ سیدھے بیگم معصومہ کے پاس گئے اور کہا۔

''چلو اللہ نے ''گیا'' جانے کے لیے رقم مہیا کر دی۔ آج ہی رات کی ٹرین سے چلتے ہیں۔'' وہ دونوں مفتی صاحب کے پاس گئے اور جانے کے لیے اجازت مانگی۔ مفتی صاحب نے ان کو دعائیں دیں اور ان سب نے روانگی کی تیاری کی۔

دوسرے دن رشتے داروں کے جھرمٹ میں وہ سب ریلوے اسٹیشن گئے اور وہاں سے بذریعہ طوفان میل ٹرین سے ''گیا'' روانہ ہو گئے۔ ان کے رخصت کرنے کے لیے یوں تو سب ہی تھے لیکن مولانا عبدالرحمن بہت نمایاں اس لیے تھے کہ وہ اپنی ہمشیرہ بیگم معصومہ اور اصغر، ظہور کے پاس اس وقت تک بیٹھے رہے جب تک کہ ٹرین چل نہ پڑی۔ مولانا عبدالرحمن مجسم محبت تھے۔ جب تک غضنفر علی کلکتہ میں رہے وہ ان پر سایہ فگن رہے۔ انہوں نے بڑی دعا دی۔ غضنفر علی اور ان کی بیگم معصومہ کی سیٹ کھڑکی کے آمنے سامنے تھی۔ دونوں باہر کا سفر دیکھ کر بہت محظوظ ہو رہے تھے۔ بیگم معصومہ بہت پرعزم ہو کر اپنے میاں سے کہہ رہی تھیں۔

''آپ سے میری محبت اس طرح اٹوٹ اور محفوظ ہے کہ راستے کی ناقابل بیان صعوبت سے بھی خوفزدہ نہ ہوئی اور نہ آپ کو حالات سے پریشان ہونے دیا۔ اس سے بڑھ کر آپ کے لیے میری طرف سے کیا تحفہ ہو سکتا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

''میں دل سے تمہاری محبت کا قائل ہوں۔ یہ جو

پاکستان پانے کی امیدیں قوی ہو رہی ہیں وہ سب تمہاری لازوال محبت کا کرشمہ ہے۔''

ٹرین دھواں چھوڑتی طوفان کی طرح مغربی بنگال کی سرحد عبور کر کے صوبہ بہار کی سرحد میں داخل ہو چکی تھی۔ جھریا، آسن سول، ہروان سے بھی آگے نکل چکی تھی۔ غضنفر اور بیگم معصومہ خود کو منزل سے قریب پا رہے تھے۔ پیاری نیند سے بے نیاز ہو کر رات تو آنکھوں میں گزار لی۔ طلوع آفتاب کے وقت ٹرین رفیع گنج جوں ہی پہنچی، غضنفر علی بول پڑے۔ ''بیگم تیار ہو جاؤ ''گیا'' اسٹیشن آنے والا ہے اور چند لمحوں میں ٹرین ''گیا'' اسٹیشن سے جا لگی۔ دونوں اپنے بیٹے اصغر اور ظہور کے ساتھ اسٹیشن سے باہر آ گئے۔ باہر رکشے قطار میں کھڑے تھے۔ یہ دیکھ کر انہیں حیرانی ہوئی کہ مسافر دیکھ کر کسی رکشہ والے نے قطار نہیں توڑی بلکہ جس کی باری تھی وہ سامنے آئے۔ غضنفر علی نے رکشے والے کو بلایا اور محلہ نادرہ گنج گئے۔ راستے میں اپنی بیگم کو شہر ''گیا'' کے متعلق بتاتے رہے۔ وہاں ان کے دو تین رشتہ دار رہتے تھے۔ وہ اپنے پھوپی زاد بھائی شفاقت اور خلیل بھائی کے گھر گئے۔

جوں ہی گھر کی گھنٹی بجائی ان کی بھتیجی حسینہ نے دروازہ کھولا اور غضنفر علی کو پہچانتے ہوئے بول اٹھی۔

''ابن بابا (غضنفر علی کا محبت کا نام) آئے ہیں۔'' اور بیگم معصومہ کا ہاتھ پکڑ کر گھر کے اندر لے گئی۔ ایک دوسرے سے جدا ہوئے تقریباً 25 سال ہو گئے تھے۔ ان کی ملاقات ہر ایک کے لیے حیران کن تھی۔ اسی دوران کسی طرف سے خط و کتابت نہ تھی۔

حسینہ نے آنے والے مہمان کو اپنے گھر کے لوگوں سے فرداً فرداً تعارف کرایا۔ کچھ دیر بعد جب وقت کو قرار ملا تو میزبان یہ جاننے کے لیے بے قرار نظر آئے کہ آخر آنے والے یک بیک کیسے آ گئے۔ بیگم معصومہ ماحول کی چاہت اور ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے گویا ہوئیں۔

''ہم شرمندہ ہیں کہ 25 سال کے عرصے میں ہم نے ان کو کبھی یاد نہیں کیا اور آج ہم یک بیک آپ کے یہاں آ ٹپکے۔ حقیقت میں انسان بہت خود غرض ہے۔ آج ہم پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے تو اپنی جان کی امان کے لیے آپ کے پاس آئے ہیں، آپ لوگ ہمیں معاف کر دیجیے۔ ہماری آمد کی وضاحت سے آپ لوگ ہماری مجبوریوں کو سمجھ گئے ہوں گے۔ اللہ کا کرم اور آپ لوگوں کی مدد شامل حال رہی تو ہم بہت جلد اپنی منزل کو پالیں گے۔''

جوں جوں بیگم معصومہ کی آمد کی خبر ملتی گئی ویسے ویسے عزیزوں و اقارب ان سے ملنے کے لیے آتے رہے۔ ان لوگوں کی قربت و محبت پا کر غضنفر علی کی فیملی بہت جلد خوف و ہراس سے نکل گئی اور ایک نارمل زندگی گزارنے لگی۔ ان کے حالات اتنے اچھے ہو گئے کہ غضنفر علی کو اب یہ ڈر ہو گیا کہ کہیں ان کی محبت ان کو پاکستان پانے کی لگن سے دور نہ کر دے۔ ان کے رشتہ دار شفاقت بھائی اگرچہ مالی لحاظ سے مضبوط تھے مگر ان کا دل بہت بڑا تھا۔ قریب قریب ہر روز رکشے کے ذریعے غضنفر علی کو رشتہ داروں سے ملانے لے جاتے۔ بیگم نظام الدین (والدہ سید شہاب الدین سابق سفیر اور ممبر لوک سبھا) سے غضنفر علی کی ملاقات کرائی۔ یہ پھوپی زاد بھائی سید نظام الدین کی بیگم تھیں۔ وہ بہت محبت سے ملیں اور ان کے آئندہ کے پروگرام کے متعلق پوچھا۔ مشورہ دیا کہ وہ ان کی کنسٹرکشن کمپنی نظام اینڈ سنز میں ملازمت کر لیں۔ عید کی آمد آمد تھی، اپنے بند ہاتھوں سے بھائی نے ایک اچھی رقم دیتے ہوئے کہا۔

''ان پیسوں سے اپنے بچوں کے لیے کپڑے خرید لو۔'' وہ ہر مقام پر اپنے ہندوستانی رشتہ داروں کے حسن سلوک سے حیران تھے۔ ان کی ہدایت کی پیشکش پر شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

''میں اپنی آپا کے یہاں سے واپس آ جاؤں پھر میں اس سلسلے میں بتاؤں گا۔''

چند دنوں بعد غضنفر علی اپنی بیگم اور بچوں کے ساتھ

اپنی ہمشیرہ کے یہاں روانہ ہوئے۔ یہ ملاقات بھی 25 سال کے بعد ہو رہی تھی اس عرصہ میں دنیا کافی بدل گئی تھی۔ ''گیا'' سے پچھرہ (غضنفر علی کی ہمشیرہ کا گھر تھا) کا سفر اب بہت آرام دہ ہو گیا تھا۔ سرکاری بس گیا سے داؤدنگر اور داؤدنگر سے پچھرہ رکشا سے سفر تھا۔ سڑکوں کے دونوں طرف بڑی بڑی عمارتیں بنی ہوئی تھیں، ضروریاتِ زندگی کی ساری چیزیں بس اسٹیشن پر دستیاب تھیں۔ غضنفر علی کا سفر بہت اطمینان بخش تھا۔ داؤدنگر سے پچھرہ کے درمیان نہر بہتی ہے۔ ان کا رکشا پچھرہ شام کے وقت پہنچا۔

پچھرہ ایک چھوٹی سی بستی ہے جہاں ہندو مسلمان رہتے ہیں۔ ان کی آمد کی خبر ان کے پہنچنے سے پہلے ان کے رشتہ داروں کو مل چکی تھی۔ چند ایک ان کو خوش آمدید کہنے کے لے نہر پر موجود تھے۔ اس پرتپاک استقبال سے وہ سب بہت محظوظ ہوئے۔ ہمشیرہ غضنفر علی نے اپنے رشتہ داروں، کے ساتھ آگے بڑھ کر ان کو خوش آمدید کہا۔ جوں جوں ان لوگوں کی آمد کی خبر لوگوں کو ملتی گئی لوگ ان سے ملنے آتے گئے۔ مصلحتاً ان لوگوں کی آمد کے متعلق ممبئی سے کہی گئی۔ غضنفر اور ان کے بہنوئی افتخار صاحب کافی دیر تک محو گفتگو رہے۔ اس کے بعد دونوں کھانا کھانے چلے گئے۔ بیگم معصومہ افتخار صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے بولیں۔

''بھائی صاحب! ہم شرمندگی محسوس کر رہے ہیں کہ بغیر آپ کو اطلاع کیے ہم آپ کے پاس آگئے ہیں۔ معاف کیجئے گا۔''

نہیں بہن! ایسی باتیں نہ کریں۔ آپ لوگوں کو زندہ پا کر ہم جتنا اللہ کا شکر ادا کریں وہ کم ہے۔ ہمارے گھر کا ہر فرد آپ لوگوں کو پا کر بہت خوش ہے۔'' افتخار صاحب نے کہا۔

اگرچہ غضنفر علی کی فیملی کے ساتھ ان لوگوں کا سلوک قابل قدر تھا مگر ان لوگوں نے محسوس کیا کہ افتخار صاحب کے معاشی حالات اچھے نہیں۔ زمینداری بہت پہلے ختم ہو چکی تھی۔ اب ان کی آمدنی صرف ہومیو پیتھک کلینک سے تھی۔ دس دن کے بعد افتخار صاحب کی اجازت سے غضنفر علی کی فیملی ''گیا'' واپس آ گئی۔

حسن اتفاق ایک دن روزنامہ ''روشنی'' اخبار میں یہ خبر آئی کہ بین الاقوامی ادارہ آئی سی آر سی کے ذریعہ وہ پاکستانی جو جو مشرقی پاکستان سے نیپال پہنچ گئے ہیں ان کو بہت جلد پاکستان بھیج دیا جائے گا۔ اس خبر سے ان کو یقین ہو گیا کہ اب وہ بہت جلد پاکستان چلے جائیں گے۔ اب ان کو ہندوستانی رشتہ داروں کی بے پناہ محبت دور ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ اخبار لے کر کبھی ایک رشتہ دار تو کبھی دوسرے رشتہ دار کو دکھاتے رہے۔ ان کی اس حرکتوں سے اختلاف کرنے کے لیے بیگم معصومہ کی محبت اجازت نہیں دے رہی تھی۔ حقیقت میں اس اخباری خبر کی صحت کا جاننا اس وقت ممکن تھا جب غضنفر علی نے نیپال میں پاکستانی ہائی کمشنر سے جانتے۔ اس کے لیے ان کے پاس رقم نہ تھی۔ ان کے کزن قمر الزماں صاحب کام آئے۔ انہوں نے کھٹمنڈو جانے کے لیے رقم دے دی اور وہ کھٹمنڈو روانہ ہوئے۔

وہاں پتا چلا کہ اپنی آمد کا دفتر پاکستانی کمشنر نے اندراج کے لیے فیملی ممبرز کا ہونا ضروری ہے۔ ان کے لیے یہ شرط کا پورا کرنا بہت محال تھا۔ ہندوستان سے فیملی کو لانا جوئے شیر سے کم نہ تھا۔ بالآخر ان کو ہندوستان واپس آنا پڑا اور اپنی روداد کو رشتہ داروں کے سامنے رکھنا پڑا۔ ان لوگوں نے دامے درمے سخنے ان کی مدد کی۔ بہتوں نے ہندوستان میں رہ جانے کا مشورہ دیا لیکن ان کے سر پر پاکستان جانے کا بھوت سوار تھا اور پھر ایک دن پاکستان پانے کے لیے ہندوستانی رشتہ داروں کو روتا چھوڑ کر اپنی فیملی کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

☆......☆

دنیا کا ساتواں عجوبہ (ہمالیہ) کھٹمنڈو (نیپال) جن کے اردگرد پہاڑوں اور چمکتا گلیشیروں کا نظارہ دیکھ کر غضنفر علی اور بیگم معصومہ مبہوت ہوئے۔ چند دن پیارے ملک نیپال کے سحر انگیز مناظر کے گوناں گوں

نظارے میں گم ہو گئے مگر تفکرات معاش ان کو کب چھوڑنے والے تھے۔ جس لاج میں یہ قیام پذیر تھے اس کا کرایہ بہت تھا۔ جو رقم لے کر چلے تھے وہ ختم ہو گئی تھی۔ نیپال ایک مہنگا ملک تھا وہاں کوئی اپنا نہیں تھا جو ان کی مدد کرتا۔ بیگم معصومہ کا بھی دل برداشتہ ہونا لازمی تھا مگر ان کی قوت برداشت مستحکم تھی جو ہر طرح کی آزمائش سے گزرنے کے لیے ہمہ وقت تیار تھی، ان کی قوت برداشت نے غضنفر علی کو حالات سے نمٹنا سکھایا۔ اپنے پروگرام کے تحت کھٹمنڈو کے نجی اور سرکاری دفاتر میں ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ ملازمت تو مل گئی، وہ تھی ہوٹل میں ویٹر کا کام۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق صاحب نے وہاں ویٹر کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ پہلا دن تھا گاہک کے ہر میز سے کھانے کا آرڈر لے کر ان کو سرو کرتے۔ جب ہوٹل کے ملازمین کا لنچ ٹائم شروع ہوا تو (سابق ایگزیکٹو انجینئر) نے بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کھانے میں شروع ہوئے۔ ہر ملازم کے کھانے کے برتن جدا تھے۔ اس دن کھانے میں روٹی کے علاوہ گوشت بھی تھا۔ نیپال کے ہندو سؤر کا گوشت بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ مزدوروں کے علاوہ ان کے حصے میں بھی سور کا گوشت آیا۔ وہ گوشت دیکھ کر ان کی طبیعت مکدر ہو گئی مگر وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ غضنفر علی وہاں ایک ہندو ملازم کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ کھانے کے دوران ان کے ساتھی گوشت کی لذت کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ ان سے بھی کسی ساتھی نے اس کی لذت کے متعلق پوچھا۔ ان کا جواب بھی تعریف میں تھا جبکہ کھانے کے دوران لوگوں سے نظر بچا کر گوشت کو کوڑے دان میں وہ پھینکتے چلے گئے تھے۔ اس قسم کی ملازمت کا تجربہ ان کے لیے پہلا تھا۔ گھر والے ان کی اس ملازمت سے آگاہ نہیں تھے۔ کام کر کے جب غضنفر علی گھر پہنچے تو بیگم کے پوچھنے پر ساری روداد سنائی۔

قریب تھا کہ صبر کا دامن چھوٹ جاتا اور وہ معصومہ رو پڑتیں مگر انہوں نے ضبط سے کام لیا اور غضنفر سے کہا کہ آئندہ اس ملازمت پر نہ جائیں۔

کہتے ہیں دیوانہ آدمی کو بناتی ہیں روٹیاں۔ منصب درجہ رتبے سب کو مشکلات پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے غضنفر علی ہر کس و ناکس کی چوکھٹ پر اپنی جبیں کو جھکایا کہ شاید ان کی پریشانی کا مداوا ہو جائے۔ ایسے میں ایک مولوی عبدالرشید سوٹ کیس والے نے کچھ رقم دے کر مشورہ دیا کہ وہ ان پیسوں سے چائے بنانے کے برتن خریدیں۔ چائے اور پکوڑے رینا پارک میں بیچیں۔ بیگم معصومہ نے اپنے دونوں بیٹوں کو پکوڑے اور چائے بیچنے کے لیے لگا دیا۔ ان کے میاں بھی لگ گئے۔ آہستہ آہستہ ہندوستان کاروباری (جو نیپال میں کاروبار کرتے تھے) بھی ان کو امان سمجھنے کے لیے دینے لگے۔ مولوی رشید صاحب کے ذریعہ جو بوسیدہ کمرہ جس میں سانپ بھی نکلتے تھے غضنفر علی کو رہائش کے لیے ملا تھا۔

اس پر ان کو آخری الٹی میٹم مالک دکان سے مل چکا تھا۔ مصیبت ان کی کٹ نہیں رہی تھی۔ غضنفر علی اپنی پریشانی سے تنگ آ کر گھر سے باہر چیخ چیخ کر اپنی فریاد اللہ سے کرنے لگے اسی اثناء میں ایک اللہ کا بندہ نیپالی آ کر ان کے کاندھے کو تھپ تھپاتے ہوئے کہنے لگا۔

"گھبرائیں نہیں آپ میرے گھر میں رہیں۔" یہ اللہ کی طرف سے غضنفر علی کی بہت بڑی مدد تھی۔ نئی دکان میں غضنفر علی کی فیملی شفٹ ہو گئی۔ اتنی ساری پریشانیوں کے باوجود ان کی پاکستان جانے کی جدوجہد کم نہ تھی۔ اکثر پاکستانی سفارتخانے معلومات حاصل کرنے جاتے۔ اگرچہ غضنفر علی کی فیملی پریشانیوں میں بے حد مبتلا تھی مگر بیگم معصومہ کا صبر و استقلال گھر کے لوگوں کو ٹوٹنے سے بچائے ہوئے تھا۔

اللہ کو صبر بہت پسند ہے بالآخر ان پر اللہ کو ترس آ ہی گیا۔ ایک دن کھٹمنڈو بازار میں سامان بیچ رہے تھے کہ سفارتخانے سے ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"بشیر صاحب، سیکنڈ سیکریٹری ان کو مع فیملی

بلا رہے ہیں۔ ان کے پاکستان جانے کا بندوبست ہوگیا ہے۔''

وہ ایسی باتیں پہلے بھی سن چکے تھے۔ انہیں یقین نہیں تھا۔ گھر آ کر بشیر صاحب کی بات بیگم معصومہ کو بتائیں۔ بیگم معصومہ نے کہا کہ اس میں کیا مضائقہ ہے۔ سفارتخانہ چلتے ہیں ہوسکتا ہے بات سچ ہو۔ بہرکیف غضنفر علی فیملی کے ساتھ بشیر صاحب سے ملے۔ انہوں نے ان کو پاکستان جانے کی مبارک باد دی اور پاکستان روانگی کے لیے پاسپورٹ ایشو کردیا۔

کاؤنٹر پر جو لوگ موجود تھے ان سے کہا غضنفر علی صاحب کا آپ لوگ شکریہ ادا کیجیے کہ ان کی متواتر کوششوں سے اسلام آباد سے آپ لوگوں کے پاکستان جانے کی اجازت مل گئی۔'' غضنفر علی بول پڑے۔

''نہیں نہیں، اللہ کا آپ لوگ شکر ادا کیجیے اس نے ہم پر رحم کیا۔'' لوگوں کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے۔ ان سب کو پاکر۔ نئی پاسپورٹ جاری کردیے گئے۔

دوسرے دن حسب ہدایت کھٹمنڈو ایئرپورٹ پہنچے۔ ہم سب کے لیے گلف ایئرلائن ایئرپورٹ پر موجود تھا۔ ہم سب کی منزل لاہور تھی۔ جہاز جب فضا میں اڑ رہا تھا بیگم معصومہ نے اپنے میاں سے کہا اگر میں آپ سے یہ کہوں تو آپ کو کیسا لگے گا'' میرے محبوب تیرے لیے'' یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ محبت قربانی مانگتی ہے اور میں آپ کی محبت میں جنگل، پہاڑ، دریا سب کو زیر کیا۔ میری زندگی کا مشن آپ سے محبت کو لازوال بنانا تھا جو میں نے کیا۔''

کھٹمنڈو سے لاہور کی فلائٹ چند گھنٹوں کی تھی۔ لاہور پہنچنے کا مژدہ سنایا گیا اور مسافر خوشیوں کے آنسو آنکھوں میں لیے لاہور ایئرپورٹ اترے۔ سب کو کیمپ لے جایا گیا۔ دوپہر کا کھانا کھلایا گیا۔ کچھ دیر آرام کے بعد جن کو جہاں جانا تھا وہاں کا ریلوے ٹکٹ اور 20 روپے ہر فرد کو دیے گئے۔ ان سب کو ریلوے اسٹیشن پہنچایا گیا۔

غضنفر علی کی فیملی پاکستان پاکر بہت خوش تھی لیکن ان کو یقیناً فکر دامن گیر ہوگئی کہ کراچی میں وہ کہاں رہائش پذیر ہوں گے۔ ان کے لیے کراچی نئی جگہ تھی۔ اللہ کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ غضنفر علی کی ایک جاننے والے کارخانہ دار نسیم قیصر سے ٹرین میں ملاقات ہوگئی۔ ان سے بھی غضنفر علی کی واقفیت تھی۔ دوران گفتگو جب ان کو معلوم ہوا کہ وہ نسیم کے دوست ہیں اور کراچی میں ان کا کوئی جان پہچان کا نہیں ہے تو انہوں نے پیشکش کی کہ وہ ان کے ساتھ ناظم آباد چلیں، وہاں نسیم کا اپنا گھر ہے۔''

کچھ دنوں کے بعد غضنفر علی چھوٹی موٹی ملازمت میں لگ گئے۔ نسیم صاحب بھی Prcsonary war سے چھوٹ کر آگئے۔ دونوں ایک دوسرے کو پاکر بہت خوش ہوئے۔ اسی اثناء میں غضنفر علی کرایہ کے مکان میں شفٹ ہوگئے، سب کچھ مل گیا تھا مگر بیگم معصومہ کی بیماری جان کو آرہی تھی۔ روز بروز ان کی طبیعت خراب ہوتی جارہی تھی جہاں تک غضنفر علی سے ہوسکا ان کا علاج معالجہ کیا۔ بیگم معصومہ کو اب اندازہ ہوگیا تھا کہ ان کی زندگی اب بہت تھوڑے دن کی ہے۔ اکثر اپنے میاں سے کہتیں

''دیکھا آپ نے، میری محبت کتنی انمول ہے۔ اس نے آخر آپ کو پاکستان پہنچادیا۔'' غضنفر علی مسکرا کر رہ جاتے۔ کسے معلوم تھا کہ حصول پاکستان کی قیمت بیگم معصومہ کی زندگی کی صورت میں چکانی ہوگی اور وہ ایک دن غضنفر علی کو روتا چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔

محبت کی یہ جدوجہد بھری داستان آپ کے لیے بھلے ہی کچھ دیر کی بصارتوں کا رزق ہوگی مگر حب الوطنی میں اپنا سب کچھ وارنے والوں کی داستان دلوں سے کبھی نہ بھلائی جاسکے گی۔ جب تک وطن سے محبت کرنے والے زندہ ہیں، کوئی طاقت جذبہ حب الوطنی کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

☆☆☆

پاسپورٹ

عارف شیخ

قانون کے محافظوں کی رگ سے واقف اُس پاکستانی نژاد نوجوان کا قصہ

جو بہر حال بدیسی پاسپورٹ کی اہمیت جانتا تھا

وہ کافی الجھن میں تھی۔ دماغ میں پریشانیوں نے اس طرح گھر کر لیا تھا کہ سکون نہیں مل رہا تھا۔ حالانکہ صرف ایک ماہ قبل اس کی صبح و شام پرسکون تھی لیکن اچانک تفکرات نے اس کی زندگی کی ہر خوشی چھین لی تھی۔ اب نہ دل گھر کے کام میں لگتا تھا۔ نہ نماز میں۔ قرآن لے کر بیٹھتی تو توجہ ہی نہیں کر پاتی تھی۔

اس وقت بھی رات کے دو بج رہے تھے اور نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ بستر پر لیٹی چھت کو گھور رہی تھی اور کان پڑوس کی آواز کی طرف لگے ہوئے تھے۔ اس کی بوڑھی آنکھوں میں صرف تشویش ہی نہیں سخت غصہ بھی تھا لیکن پوری زندگی میں اس نے اتنی بے عزتی کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

آخر کار وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور پیروں میں سلیپر ڈال کر دوپٹہ صحیح کرتے ہوئے وہ اپنی بالکونی میں آ گئی پوری گلی میں گہری تاریکی تھی۔ ہر گھر پر نیند کا راج تھا صرف اس کے مکان کے نیچے والے حصے میں زندگی جاگ رہی تھی۔ نا صرف جاگ رہی تھی بلکہ دوڑ رہی تھی گانے کی آواز کے ساتھ کئی لوگوں کی بے ہنگم آوازوں نے اس کا نیند و سکون دونوں چھین لیا تھا۔

اس کے مکان کے نیچے کئی گاڑیاں قیمتی کاروں کی صورت موجود تھیں۔ ان کے سوار اسی گھر میں موجود تھے جہاں دن کا سماں موج مستی میں مصروف تھا۔ جب اس کی بوڑھی ٹانگیں تھکنے لگی تو وہ دوبارہ اندر آ گئی۔ اب وہ اپنے گھر کے اندر ہی ٹہل رہی تھی۔ یہ عمل بھی وہ زیادہ دیر تک جاری نہ رکھ سکی۔ کیونکہ وہ جوانوں کی عمر سے بہت پہلے اپنا ناتا توڑ چکی تھی۔

وہ ایک مرتبہ پھر سے بستر پر آ گئی اور اب وہ فجر کے نزدیک آ گئی تھی اس لیے سب کچھ بھول کر اپنی نماز کا انتظار کرنے لگی تھی۔

☆......☆

”اس نے بند آنکھیں کھولیں تو کچھ دیر میں اسے احساس ہوا کہ صبح کے دس بج رہے ہیں۔ مکان کے نیچے کے حصے میں بھی سناٹا طاری تھا۔ اس نے نیچے جھانک کر دیکھا تو وہ کاریں جو رات بھر وہاں تھیں اب غائب ہو چکی تھیں۔ اس نے سکون کا سانس لیا اور اپنے لیے چائے تیار کرنے میں لگ گئی۔

بارہ بجے کے لگ بھگ وہ گھر سے روانہ ہوئی۔ وہ جوانی عمر کے ساٹھ برس مکمل کر چکی تھیں۔ ان کا نام سلمیٰ تھا۔ گھر سے باہر آ کر سڑک تک پیدل آنے کے بعد وہ رکشا لے کر اپنے مالک مکان کے گھر پہنچی تھیں۔

سلمیٰ بیگم کے مکان مالک جو انہی کے ہم عمر تھے انہوں نے بڑی عزت سے ان کا استقبال کیا اور انہیں اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔

''آپ نے کچھ نہیں کیا۔'' سلمیٰ بیگم نے شکایت کی۔ ''میری زندگی مشکل میں آگئی ہے۔ یہ احساس کہ میں کس گندگی کے ساتھ رہ رہی ہوں۔ میرا کھانا پینا، سونا نماز، قرآن سب کچھ چھوٹ گیا ہے۔''

''میں سمجھ سکتا ہوں آپ کس مشکل سے گزر رہی ہیں'' مالک مکان ابراہیم نے کہا۔ ''لیکن میں خود بھی بے بس ہو گیا ہوں۔''

''اس سے مکان خالی کیوں نہیں کراتے۔''

''میں نے کوشش کی تھی۔'' وہ بولے۔ ''اس سلسلے میں اسٹیٹ ایجنٹ جس نے اس عورت کو میرا وہ مکان کرائے پر دلوایا ہے۔ اس سے بات کی تھی۔ اس نے بھی کوشش کی تھی لیکن وہ کرائے دار عورت تو لڑنے لگی گالیاں دے کر اس ایجنٹ کو بھگا دیا۔''

''تو کیا یہ سلسلہ یونہی چلے گا۔''

''مجھے تو اب یہ ڈر ہے کہ کہیں میرے مکان پر قبضہ نہ ہو جائے۔''

''وہ جس طرح کی عورت ہے تمہارے مکان کو باآسانی ہتھیا لے گی۔'' سلمیٰ بیگم نے کہا۔

''میں نے زندگی میں اتنی بے بسی کبھی نہیں محسوس کی جتنی میں اس وقت کر رہا ہوں۔'' مالک مکان کی آواز اس کی سچائی کو ثابت کر رہی تھی۔ ''میں اب ریٹائرڈ ہو گیا ہوں اور میری پوری زندگی کی محنت وہ مکان ہی ہے اور اس مکان سے میں گزشتہ دس برس سے کرایہ لے رہا ہوں لیکن کرائے دار آتے رہے جاتے رہے کبھی ایسا نہیں ہوا۔''

''وہ غلط عورت ہے اس کے گھر ناچ گانا ہوتا ہے۔'' سلمیٰ بیگم نے کہا۔ ''پوری گلی پریشان ہے اور تو اور گھر کے اندر ہی یہ سب ہو رہا ہے۔''

''میں جانتا ہوں اور مجھے فکر بھی ہے میں بھی مکان خالی کروانا چاہتا ہوں۔'' مالک مکان نے کہا۔ ''کوئی نہ کوئی تجویز تو بنانی ہو گی۔ اس مشکل

سے نکلنے کی۔"
"لیکن جلدی کریں۔" سلمیٰ بیگم نے کہا اور توجہ مالک مکان کی بیوی کی طرف ہو گئی جو چائے لے کر آئی تھیں۔

☆......☆

سلمیٰ بیگم مکان مالک کے گھر سے لوٹی تو انہوں نے فیصلہ کن انداز میں اپنے مکان کے نیچے والے حصے کا دروازہ بجایا۔ تھوڑی دیر میں نیند بھری آواز کے ساتھ ایک آواز سنائی دی۔
"کون ہے۔" آواز اسی عورت کی تھی اور پھر دروازہ کھل گیا اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بستر سے نکل کر آئی ہے۔
"کیا کام ہے بڑھیا؟"
سلمیٰ بیگم جانتی تھیں کہ یہ بدمزاج عورت شروع سے لڑائی جھگڑا کرتی ہے لیکن انہوں نے تحمل مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔
"مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنا تھی۔ اس لیے تمہیں زحمت دی ہے۔"
وہ مسکرائی۔ "مجھے معلوم ہے تمہاری ضروری بات کیا ہے۔ پھر بھی آؤ اندر آجاؤ۔ آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ میں تمہیں اچھی سی چائے بھی پلاتی ہوں۔"
"نہیں میں اندر نہیں آؤں گی۔" سلمیٰ بیگم ڈر کر ایک قدم پیچھے ہو گئی تھیں۔ "ہم یہیں بات کر لیتے ہیں۔"
"میں اگر بات نہیں کروں تو۔" وہ اب مزہ لے رہی تھی۔ "تم میری بات نہیں مان رہی ہو میں تمہاری بات کیوں مانوں۔"
"میری التجا ہے۔" سلمیٰ بیگم نے کہا۔
"میں تمہارے گھر آجاتی ہوں۔ بلکہ چلو اوپر ابھی ساتھ میں چلتے ہیں۔"
"نہیں اس کی بھی ضرورت نہیں ہم یہیں پر بات کر لیتے ہیں۔" سلمیٰ بیگم خوف زدہ ہو گئی تھیں۔
"چل اب جلدی سے بک دے بڑھیا مجھے واپس جا کر سونا ہے۔" وہ دوبارہ سے اپنی جون میں آگئی تھی۔
"تم یہ گھر چھوڑ کر کہیں اور چلی جاؤ۔"
"کیوں چلی جاؤں۔" اس نے کمر پر ہاتھ رکھے۔ "میں کرایہ دیتی ہوں اور جو کچھ کرتی ہوں چار دیواری کے اندر کرتی ہوں۔"
"یہ شریفوں کا محلہ ہے اور تمہارا جو کام ہے وہ یہاں مناسب نہیں ہے۔" سلمیٰ بیگم اسے نرمی سے سمجھا رہی تھیں۔ "تم خود یہ بات سمجھ سکتی ہو کہ جو تمہارا کام ہے وہ کسی طرح سے مناسب نہیں ہے۔"
"بڑھیا! کام...... کام کیا لگا رکھا ہے۔" وہ لفظوں کو چبا چبا کر بولی۔ "یہ میرا بزنس ہے اور یہ جو رات کو میں مجرا چلاتی ہوں اس میں شریف لوگ ہی آتے ہیں۔ وہ شریف لوگ جو دن کے اجالے میں شرافت کا لبادہ اوڑھے رہتے ہیں۔ رات کو ان کے اندر کا شیطان باہر آجاتا ہے جسے ہم جیسے لوگ سنبھالتے ہیں۔ ورنہ ان کی شیطانیت سڑکوں پر سب کے سامنے ظاہر ہو جاتی۔"
"دیکھو تم سمجھنے کی کوشش کرو۔" سلمیٰ بیگم نے کہنے کی کوشش کی لیکن اس نے درمیان سے جملہ اچک لیا اور بولی۔
"تو سن لے بڑھیا۔ یہ کام تو اسی طرح چلے گا۔ تجھ میں یا پھر تیرے جو ساتھ ہے اس میں اگر ہمت ہے تو یہ کام بند کروا کے دکھا۔"
سلمیٰ بیگم سمجھ گئی تھیں کہ وہ ناکام ہو گئی ہیں اور یہ عورت نہیں مانے گی۔ وہ لاچاری کے انداز میں واپس اپنے گھر لوٹ آئی تھیں۔

☆......☆

سلمیٰ بیگم نے شام کے وقت اپنے علاقے کے دوسرے گھروں سے مدد لینے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں عملی قدم اٹھاتے ہوئے وہ کئی گھروں میں جا کر ان میں آباد لوگوں سے ملیں اور علاقے کی رسوائی اور ماحول کے خراب ہونے سے متعلق دلائل دیتے ہوئے انہیں اس بات کے لیے راضی کیا کہ سب مل کر مشترکہ کارروائی کرتے ہیں۔ لوگوں نے سلمیٰ بیگم کے عمل کو سراہتے ہوئے ساتھ دینے کا وعدہ کیا اور قانونی راستے سے اس لڑائی کو لڑنے کا مشورہ دیا۔ سارا معاملہ طے ہو گیا تھا۔ سلمیٰ بیگم کی سربراہی میں کچھ لوگ تھانے جا کر درخواست

دینے کے فیصلے پر رضامند ہو گئے تھے۔ سلمیٰ بیگم اپنے اس اقدام سے بہت مطمئن تھیں کہ اب وہ پولیس کی مدد سے اس عورت سے محلے کی جان چھڑالیں گی۔ اس رات پھر وہی ناچ گانا تھا لیکن کل صبح تھانے جانے کے حوصلے نے سلمیٰ بیگم کو حوصلہ دیا ہوا تھا۔

☆......☆

چار افراد تھانے پہنچ گئے تھے اور اس وقت انچارج صفدر میر کے سامنے موجود تھے۔ زبانی صورت کے ساتھ سلمیٰ بیگم کی تحریر شدہ درخواست بھی تھانے دار کو فراہم کر دی گئی تھی۔

''آپ فکر نہیں کریں۔'' انچارج نے انہیں تسلی کروائی۔ ''میں نے درخواست سمجھ لی ہے۔ میں خود تمام صورت حال کو دیکھتا ہوں اگر اس میں کوئی غیر قانونی عمل یا شکایت کا کوئی پہلو ہے تو قانون آپ کی مدد کرے گا۔''

''وہ عورت وہاں پر فحاشی کا اڈہ چلا رہی ہے، یہی عمل غیر قانونی، غیر اخلاقی اور غیر اسلامی ہے۔'' سلمیٰ بیگم نے غصے سے کہا۔

''میں نے آپ کی بات سن لی ہے اور سمجھ بھی لی ہے لیکن قانون ایک طرف تو نہیں دیکھتا ہے۔ مجھے دوسرے فریق کو بھی بولنے کا موقع دینا ہے۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''جناب سارے محلے کا ماحول خراب ہو رہا ہے۔'' ایک اور صاحب بولے۔

''ماحول سے پولیس کا تعلق نہیں ہوتا۔ ہم تو صرف قانون شکنی پر حرکت میں آتے ہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ قانون کی خلاف ورزی ہو رہی ہے یا نہیں۔''

''ٹھیک ہے انسپکٹر صاحب اب ہم آپ کی مدد کے منتظر ہیں۔'' ایک اور صاحب بولے۔

''میری مدد ضرور ملے گی آپ کو لیکن پہلے یہ طے ہو جائے کہ سامنے والا غلط اور آپ لوگ رائٹ ہو۔''

''اب چلتے ہیں۔'' پہلے والے صاحب نے کہا اور وہ سب تھانے سے باہر آ گئے۔ اب وہ دوبارہ اپنے گھروں کی طرف جا رہے تھے اس امید کے ساتھ کہ ان کو اس مسئلے سے نجات ملے گی۔

☆......☆

سلمیٰ بیگم اس وقت خوشی سے سرشار ہو گئیں جب انہوں نے پولیس کی موبائل اپنے گھر کے سامنے رکتی دیکھی۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ انسپکٹر ان کی درخواست پر عمل کرنے کے ارادے سے وہاں پہنچا ہے اور پھر انہوں نے اوپر سے دیکھا کہ وہ انسپکٹر اپنے سپاہیوں کے ہمراہ اندر چلا گیا تھا۔

سلمیٰ بیگم نے فوراً گھڑی دیکھی تو وہ رات بارہ بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ اب سلمیٰ بیگم کو آگے کی کارروائی کا انتظار تھا۔ وہ خود ہی کچھ اندازہ لگا رہی تھیں کہ تھانے دار نے کافی سختی رکھی ہو گی اور شاید کل صبح ہی وہ مکان خالی کر دے۔

وہ انہی خیالوں میں گم انسپکٹر اور سپاہیوں کے باہر آنے کا انتظار کرتی رہی وقت گزرتا چلا گیا کوئی باہر نہیں آیا تھا۔ جانے گانے بجانے کی آواز کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ کبھی کبھار ہنسنے کی بلند آواز بھی سلمیٰ بیگم کی سماعت تک پہنچ جاتی تھی۔

وہ یونہی اپنی بالکونی میں بیٹھی اچھے نتائج کا انتظار کرتی رہیں اور فجر کا وقت ہو گیا۔ اب انہیں مایوسی کا سامنا تھا۔ انہوں نے جو کچھ سوچا تھا ویسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ سلمیٰ بیگم نے خود کو مطمئن کرنے کے لیے سینے سے گہری سانس خارج کی اور پھر نماز کے لیے اندر چل دیں۔

☆......☆

دوپہر کے وقت سلمیٰ بیگم نے دروازے پر ہونے والی گھنٹی کی آواز پر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ سامنے ایک کانسٹیبل موجود ہے۔ وہ اس سپاہی کو تھانے میں اور رات تھانے دار کے ساتھ مکان کے اندر جاتے دیکھ چکی تھیں۔

''جی فرمائیے۔'' سلمیٰ بیگم نے پوچھا۔

''آپ کو تھانے آنا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کیوں؟''

''آپ کی درخواست پر صاحب کو بات کرنا ہے۔''

''کب آنا ہے؟''

''ابھی آنا ہے۔ چاہیں تو میرے ساتھ چلیں۔''
وہ بولا۔
''تم چلو میں آجاتی ہوں۔'' سلمیٰ بیگم نے کہا۔
اور پھر ایک گھنٹے کے بعد وہ رکشے کی مدد سے انچارج کے سامنے موجود تھیں۔
''اماں آپ کی درخواست پر ہم نے اس کی بھی انکوائری کی ہے آپ کے متعلق بھی معلومات حاصل کی ہیں۔''
''میرے بارے میں کیوں حاصل کی ہیں؟'' وہ کچھ سمجھی نہیں تھیں۔
''ہماری ذمے داری ہوتی ہے۔'' وہ بولا۔
''ابھی آپ کو میرے کچھ سوالوں کا جواب دینا ہے۔''
''کیسے سوال۔''
''آپ استانی تھیں پڑھانے کا کام کرتی تھیں۔'' انسپکٹر نے سوال کیا۔
''ہاں میں نے بیس برس بچوں کو پڑھایا ہے۔''
''تمہارے شوہر کے انتقال کو بھی بیس سال ہی ہوئے ہیں۔''
''میں نے اپنے شوہر کی موت کے بعد ہی ملازمت کی تھی۔'' سلمیٰ بیگم نے بتایا۔ ''اپنے بیٹے کو پالنا تھا۔''
''وہ بیٹا کہاں ہے؟''
''وہ ملک سے باہر چلا گیا ہے۔''
''اس کا مطلب ہے کہ تم تنہا رہتی ہو۔''
''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' وہ چونک کر بولیں۔
''اکیلے انسان کو کسی سے دشمنی لینے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔''
''میں دشمنی نہیں لے رہی ہوں، بلکہ گندگی سے اپنے گھر اور محلے کو بچا رہی ہوں۔''
''بڑی بی! وہ عورت قانون میں رہ کر اپنا کام کر رہی ہے۔'' تھانے دار بولا۔ ''اسے گھر کی چار دیواری کے اندر سب کچھ کرنے کی آزادی ہے۔''
سلمیٰ بیگم سمجھ گئی تھیں کہ پولیس نے اپنا رول ادا کر دیا ہے۔ وہ اس خراب عورت کے ساتھ جا ملی تھی۔ وہ بے بسی سے انسپکٹر کو دیکھ رہی تھیں۔
''اماں تم یا تو خاموشی سے اس مکان میں رہو یا پھر کہیں اور منتقل ہو جاؤ۔ ویسے بھی تم کرائے پر رہتی ہو۔ تمہارا ذاتی مکان تو ہے نہیں۔''
''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''میں تمہاری تجویز پر ضرور غور کروں گی۔''

☆......☆

رات کے کوئی دس بج رہے تھے کہ سلمیٰ بیگم کو دروازے کی گھنٹی نے چونکا دیا۔ ''اس وقت کون آ گیا۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی دروازے تک پہنچیں اور پوچھا۔ ''کون ہے؟''
''میں ہوں آپ کے نیچے والی نیلو۔'' ایک نسوانی آواز سنائی دی۔
سلمیٰ بیگم نے دروازہ کھولا تو سامنے وہی خراب عورت موجود تھی جس کے چہرے پر عجیب سی ہنسی تھی۔
''کیا بات ہے۔'' سلمیٰ بیگم نے سوال کیا۔
''اندر چل۔'' اس نے اتنے زور کا دھکا دیا کہ سلمیٰ بیگم لڑکھڑاتی ہوئی پیچھے کی طرف گر پڑی تھیں۔ وہ بھی اندر آ گئی تھی۔
''یہ کیا کر رہی ہو۔'' سلمیٰ بیگم کی آواز میں خوف اور غصہ دونوں تھا۔
''تیرا دماغ درست کر رہی ہوں تا کہ تجھے آگے سے کچھ کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔''
سلمیٰ بیگم نے دیکھا کہ وہ مکان کے اندر آ گئی تھی اور اس کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر کا موٹی موٹی مونچھوں والا شخص بھی اندر آ گیا تھا۔
''تم فوراً باہر نکل جاؤ ورنہ میں شور مچا دوں گی۔'' سلمیٰ بیگم کی کھوکھلی آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی۔
''جتنا چاہے شور مچا لے ہم اپنا کام مکمل کر کے جائیں گے۔''
''کون سا کام۔'' سلمیٰ بیگم بے حد خوف زدہ تھیں۔
''اس کو دیکھ رہی ہے۔'' نیلو نے مونچھوں والے کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ میرا خاوند ہے اور اس کا کام ہے ہمارے بزنس میں مداخلت کرنے والوں کے دماغوں کو درست کرنا۔ تو اگر عورت نہیں ہوتی تو یہ

اکیلا ہی آتا لیکن اگر تو نہیں مانی تو پھر یہ اپنی صلاحیت دکھائے گا۔"

"میں نے سن لیا تمہارا پیغام اب فوراً اپنے ناپاک وجود کو لے کر میرے گھر سے نکل جاؤ۔" سلمیٰ بیگم کی آواز کانپ رہی تھی۔ لیکن نیلو نے ایک نہیں سنی اور سلمیٰ بیگم کو کھڑا کیا اور بولی۔

"دھیان سے سن! اب تجھے یہ گھر خالی کرنا ہے۔ میرا کام بڑھ رہا ہے مجھے اور لڑکیوں کو یہاں لا کر رکھنا ہے۔ مجھے کمروں کی ضرورت ہے۔"

"میں بوڑھی کہاں جاؤں گی۔"

نیلو نے سلمیٰ بیگم کے گالوں کو تھپتھپایا۔

میری طرف سے جہنم میں جا لیکن چند روز میں اس مکان کو خالی کر دے ورنہ تیری موجودگی میں اس اوپر والے حصے کو رونقوں سے آباد کر دوں گی سمجھی اور پولیس ہمیشہ ہمارے ساتھ ہوتی ہے۔ ہمارا کاروبار شروع ہی پولیس اور تھانے کی اجازت سے ہوتا ہے بات تجھے اچھی طرح سے سمجھ آ جانی چاہیے۔"

"مجھے سمجھ آ گئی ہے۔" سلمیٰ بیگم نے جان چھڑانی چاہی۔

"چل آ جا۔ بعد میں شاید تیری ضرورت پڑے گی۔" نیلو نے اپنے ساتھ آنے والے مرد کو اشارہ کیا اور وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔

☆......☆

سلمیٰ بیگم کے لیے اب انتہا ہو چکی تھی اس لیے کہ محلے کا ہر آدمی ڈر رہا تھا۔ لہٰذا سلمیٰ بیگم نے اپنے بیٹے کامران کو فون ملا دیا۔ ان دونوں کے درمیان کوئی نصف گھنٹے تک بات چیت ہوتی رہی آخر کار کامران نے رضا مندی ظاہر کردی اور اس نے کہا کہ وہ پہلی فلائٹ لے کر آ جاتا ہے۔

سلمیٰ بیگم، کامران سے بات کر کے مطمئن ہوئی تو اس نے نیچے جا کر نیلو کو بتا دیا کہ اس کا بیٹا دو تین روز میں آ جائے گا۔ تو وہ گھر یہاں سے شفٹ کر لے گی۔

☆......☆

کامران واقعی تیسرے دن آ گیا تھا۔ ماں بیٹا گلے ملے تو سلمیٰ بیگم کی آنکھوں سے آنسو ایسے رواں ہوئے جیسے سیلاب میں بند ٹوٹ جاتا ہے۔ کامران کی ہر طرح کی تسلی کے باوجود ان کا رونا بند نہیں ہو رہا تھا۔

"ارے امی اب مسئلہ حل ہو گیا ہے میں جو آ گیا ہوں۔"

"یہ آنسو تمہاری آمد پر نہیں ہیں۔ اس دکھ اور بے عزتی کے ہیں جو اس عمر میں، میں نے برداشت کی ہے۔" وہ گویا ہوئیں۔ "پولیس اگر مدد کر دیتی تو ہرگز دکھ نہیں ہوتا۔"

"پولیس کیوں مدد کرے گی۔"

"کیوں پولیس کا کام نہیں ہے ہماری مدد کرنا۔" وہ چونک کر بولیں۔

"پولیس کا کام مظلوم کی مدد کرنا اس ملک میں قصے کہانیوں میں ہے۔ پولیس تو اب ظالم کے ساتھ، کریمنل کے ساتھ ہوتی ہے۔"

"اتنے ظلم پر آسمان کیوں نہیں ٹوٹ پڑتا۔" سلمیٰ بیگم کو غصہ آ رہا تھا۔

"ضرور ٹوٹے گا آسمان بھی ایسے لوگوں کا انجام بھی عبرت ناک ہوتا ہے۔" وہ ماں کو تسلی دے رہا تھا۔

"اب کیا کرنا ہے۔" وہ بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔

"اب آپ آرام کرو بعد میں ہم باتیں کریں گے۔" وہ ماں سے بولا۔ "کل صبح کوئی بندوبست کرتے ہیں۔"

سلمیٰ بیگم بیٹے کے کھانے پینے کی تیاریوں میں مشغول ہو گئیں۔ کامران اپنا سامان وغیرہ سیٹ کرنے لگا۔

☆......☆

رات دس بجے کے بعد اس محفل کا آغاز ہو گیا جو مکان کے نچلے حصے میں بجتی تھی۔ تیز موسیقی کے ساتھ آغاز ہوا تھا۔ بارہ بجے تک محفل عروج پر تھی۔ کافی گاڑیاں باہر موجود تھیں۔

کامران اور سلمیٰ بیگم اوپر سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ سلمیٰ بیگم کو بار بار غصہ آتا تھا لیکن وہ ماں کو تسلی دیتا تھا۔ دونوں کی رات یونہی آنکھوں میں کٹ گئی تھی صبح فجر کے وقت نیچے ادھم ختم ہوا تو سلمیٰ بیگم اور کامران بھی سونے کے لیے لیٹ گئے۔

☆......☆

اس کی آنکھ کھلی تو ابھی صبح کے صرف آٹھ ہی بجے تھے۔ "یہ وقت بالکل ٹھیک ہے۔" اس نے خود کلامیہ انداز اختیار کیا۔

وہ کامران تھا۔ اس نے اپنی ماں کی طرف دیکھا جو گہری نیند میں تھی۔ وہ اسے کچھ دیر محبت سے دیکھتا رہا۔ پھر وہ دوسرے کمرے میں جہاں ماں نے پرانا سامان رکھا ہوا تھا تھوڑی دیر میں اسے وہ ہاکی مل گئی تھی۔ وہ اسے برسوں پہلے استعمال کرتا تھا جب وہ ہاکی کھیلتا تھا۔ اس نے ہاکی ہاتھوں میں لے کر تولی اور پھر سیدھا بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازے کو باہر سے بند کر دیا تھا۔ اب وہ نچلی منزل پر آیا اور پھر اس دروازے پر جس کے پیچھے وہی عورت تھی جس نے اس کی ماں کی بے عزتی کی تھی۔

دروازے پر زوردار دستک نے اندر کے مکین کو باہر آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دروازہ نیلو ہی نے کھولا۔

کامران نے اسے ایک زوردار دھکا دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ وہ کوئی بات نہیں کر رہا تھا صرف ہوا میں ہاکی لہرا رہا تھا۔ نیلو جو گرتے بچتی تھی۔

"کون ہے کتے کے بچے۔" وہ بھڑک اٹھی۔

"اس مردو کو نکال جو تیرا شوہر ہے۔" وہ بڑے اطمینان سے بول رہا تھا۔

نیلو کے منہ سے گالیوں کا طوفان باہر امڈ آیا لیکن وہ جیسے ہی خاموش ہوئی کامران نے مارنے کے ارادے سے ہاکی بلند کی تو وہ گھبرا کر اندر کی طرف بھاگی اور تھوڑی دیر میں وہ موچھوں والا شخص جو نیلو کا شوہر تھا کامران کی ہاکی کی زد میں تھا۔ کامران نے مارا کم صرف ڈرایا تھا لیکن اس کا کام ہو گیا تھا کیونکہ سارے محلے میں شور مچ گیا تھا۔

سلمٰی بیگم بھی اس شور ہنگامے میں اپنی نیند قائم نہیں رکھ سکی تھیں اور دوڑ کر بالکونی میں آ گئی تھیں۔ کامران اس نچھو کو باہر گلی میں لے آیا تھا۔ نیلو چیخ چیخ کر دہائیاں دے رہی تھی اور کامران نے اس کے شوہر کی گردن سے میں ہاکی پھنسا رکھی تھی۔

"پھر کون خال کرے گا۔" کامران بولا۔

"کتے کمینے تو مجھے ابھی جانتا نہیں ہے۔" نیلو چیخی۔

"تو بتا دو کہ تم کون ہو۔" وہ تمسخر اڑانے کے انداز میں بولا۔ "سارے محلے کو پتا چل جائے گا کہ تم کون ہو۔"

سلمٰی بیگم کا ڈر کے مارے برا حال تھا انہیں بالکل توقع نہیں تھی کہ کامران یہ سب کرے گا۔ وہ اوپر سے چیخ چیخ کر کامران کو روک رہی تھیں۔

"یہ دیکھ میں کیا کرتی ہوں۔" نیلو نے اپنے ہاتھوں سے کپڑے پھاڑے۔ "تجھ پر ریپ کا الزام لگاؤں گی۔ تجھے اندر کروا دوں گی۔"

کامران کے اوپر کوئی فرق نہیں پڑا تھا اس کے آگے اس کا شوہر بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔

"میں اس جلیے میں تھانے جا رہی ہوں۔" وہ پھٹے کپڑوں کے ساتھ سڑک کی طرف بڑھی۔

"اسے بھی لے کر جا۔" کامران نے اس کے شوہر کو اس کی طرف دھکیلا لیکن وہ دوڑ کر گھر کے اندر چلا گیا اور خود کو محفوظ کرنے کے لیے دروازے بند کر لیے۔

وہ غائب ہو چکی تھی۔ کامران بھی اسی کے پیچھے چل دیا۔ وہ سیدھا تھانے آیا تھا حالانکہ ماں کی آوازیں اسے پکار رہی تھیں۔ محلے کے دوسرے لوگوں نے ماں کو آزادی دلوائی تو وہ بھی بیٹے کے پیچھے لپکی۔

کامران تھانے کے اندر سے ہوتا ہوا انچارج کے سامنے جا پہنچا۔ تو نیلو چیخ پڑی۔

"یہی ہے وہ کتے کا بچہ۔" وہ ڈرنے کی اداکاری کر رہی تھی۔

"اس سے مجھے بچاؤ یہ مجھے قتل کر دے گا۔"

اس سے پہلے کہ انسپکٹر کچھ کہتا کامران نے اپنا برٹش پاسپورٹ سامنے رکھ دیا۔

"میں برطانوی شہری ہوں۔ اپنی ایمبیسی کو میں اطلاع دے چکا ہوں۔ وہ لوگ وزارت داخلہ سے رابطے میں ہیں۔ کچھ دیر میں تم سے بھی رابطہ ہو جائے گا۔" وہ بول رہا تھا اور انسپکٹر سن رہا تھا۔ "اب کہو کیا کہتا ہے۔"

انسپکٹر جو اس صورت حال کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

"سر آپ بیٹھیے۔" اس نے خود کرسی پیش کی۔

''میں ابھی آپ کی شکایت کا ازالہ کرتا ہوں۔''
نیلو کو تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن وہ بیچ میں بول کر کوئی نئی مصیبت مول نہیں لینا چاہتی تھی۔
''سر جی تو مہمان ہیں ہمارے ملک میں۔ آپ کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔'' انسپکٹر التجائیہ انداز میں بولا۔ ''سر بس اوپر والوں تک بات نہ جائے۔''
کامران نے ہلا کر پاسپورٹ اپنی جیب میں ڈالا اور انسپکٹر کو کچھ سمجھانے لگا۔

☆......☆

کامران اور سلمیٰ بیگم اوپر اپنی بالکونی میں کھڑے تھے اور نیچے والوں کا سامان جا رہا تھا۔ اس دوران موبائل بھی چکر لگا چکی تھی۔ محلہ بھی یہ نظارہ شوق سے دیکھ رہا تھا۔
''امی جس پولیس کو اپنے لوگوں کا خیال رکھنا چاہیے۔'' کامران نے کہا۔ ''وہ برٹش اور امریکن پاسپورٹ سے ڈرتی ہے کہ کہیں اوپر تک بات نہ پہنچ جائے۔''
''بیٹا اسی لیے یہ اتنا خوب صورت ملک بدصورت ہو کر رہ گیا ہے۔'' سلمیٰ بیگم نے افسوس سے کہا۔
''امی میں اپنے پاسپورٹ کی طاقت جانتا تھا۔ اس لیے میں نے اس کا استعمال کیا۔ میں آپ کو نیا گھر بھی دلا سکتا تھا لیکن یہ محلے والے اس عذاب سے کیسے بچتے اس لیے میں نے یہ قدم اٹھایا۔''
''یہ تُو نے نیک کام کیا ہے۔'' ماں نے پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''چاہے تُو نے اپنا غیر ملکی پاسپورٹ ہی استعمال کیا ہو لیکن تو اپنے لوگوں کے کام آیا ہے۔''
''لیکن یہ نیلو تو ختم نہیں ہو گی یہ کسی اور محلے کو ناپاک کرے گی۔'' کامران افسردہ تھا۔
''کاش ہمارے پولیس ہمارے لوگ صحیح ہو جائیں تو یہ ملک مثالی ملک بن جائے۔''
''تُو نے اپنی ایمبیسی کب فون کیا۔'' ماں نے پوچھا۔
''وہ تو میں نے جھوٹ بولا تھا۔'' کامران ہنسا۔
''ڈرپوک کے لیے جھوٹ کارآمد ہو جاتا ہے۔''
وہ دونوں ہنس پڑے اور نیلو اپنے سامان اور اپنے غلیظ ماحول کے ساتھ وہاں رخصت ہو رہی تھی یہ بات باعث اطمینان تھی۔

☆☆☆

پانچویں سچ بیانی

غیرت کے نام پر

تحسین انجم انصاری

ایک نئی سوچ لیے' آگہی کے دوراہے پر کھڑی آج کی عورت کا فسانہ حیات



شیدو کمرے میں داخل ہوئی تو اتنی بدحواس تھی کہ نہ تو اسے اپنی اوڑھنی کا ہوش تھا اور نہ اپنی غیر متوازن چال کا خیال۔ قدم کہیں رکھتی اور پڑتے کہیں اور تھے۔

''وہ......وہ......''اس نے بمشکل اپنی اکھڑی سانس بحال کرنے کی ناکام کوشش کی۔

حسن آرا بیگم نے بے اختیار نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ کسی انہونی کے خیال نے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب کردیں۔ خدشات کے ناگ پھن اٹھا کر کھڑے ہوگئے۔

''کیا بات ہے شیدو......کیا ہوا؟'' وہ تیز آواز میں بولیں۔

''وہ......وہ جی......''اس کی گول گول آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھلی تھیں اور چہرہ لٹھے کی مانند سفید ہو رہا تھا۔ اب حسن آرا بیگم کو گھبراہٹ ہونے لگی۔

''کچھ بولو گی بھی یا وہ......وہ کرتی رہو گی۔ کچھ پھوٹو منہ سے۔ کیوں میرا دل دہلائے دے رہی ہو؟''

''وہ......ادھر......''اس نے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے باہر کی جانب اشارہ کیا۔

''کیا......؟؟ کدھر کیا کیا ہوا ہے۔ کم بخت کچھ بول منہ سے تجھے پتا ہے میں دل کی مریض ہوں۔ اگر کچھ ہو گیا میرا قتل تیرے سر آئے گا۔''

''جی......وہی تو......وہ قتل ہو گیا ہے......قتل۔''

وہ بے ربط لہجے میں بولی۔

''قتل......؟''قتل کے لفظ سے وہ بھی بدحواس ہو کر کھڑی ہو گئیں۔ ''کہاں قتل ہو گیا......کون؟ کون قتل ہو گیا؟''

''وہ......بیگم صاحبہ......وہ'' کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ لہرا کر فرش پر گری۔'' حسن آرا بیگم منجمد نظروں سے دیکھتی رہ گئیں۔

☆......☆

اریبہ نے پڑھتے پڑھتے نظر اٹھائی تو فری کتاب سامنے کھولے جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ اریبہ نے اس کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

''اے......فری! کہاں گم ہو۔ کیا سوچ رہی ہو؟''

''سوچ رہی ہوں۔ چوہدری کے بیٹے نے اپنی نوجوان بیوی کو قتل کر دیا ہے۔ اب تو وہ جیل ہی جائے گا نا؟''فری یوں پوچھ رہی تھی جیسے اسے یقین نہ ہو۔

اریبہ سے یقین چاہتی ہو۔
''نہیں جائے گا۔'' اریبہ فیصلہ کن آواز میں بولی۔
''کیوں نہیں جائے گا۔'' آخر بیوی کو قتل کیا ہے اس نے؟'' فری نے کنفیوز ہو کر اسے دیکھا۔
''بس نہیں جائے گا۔'' اریبہ دوبارہ بولی تو فری کو حیرت ہوئی۔
''حیران مت ہو فری۔ یہ کوئی پہلی بار تو نہیں ہوا کہ یہ بڑے لوگ قتل کر کے بچ جائیں۔''
''لیکن کیسے بچیں گے۔ بڑی سی رشوت دے کر؟'' اس نے سوال کیا۔
''نہیں میرا ایسا خیال نہیں ہے۔'' وہ طنزیہ مسکرائی۔
''کہہ دیں گے غیرت کے نام پہ قتل کیا ہے۔'' اریبہ کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔
''غیرت کے نام پر..... کیا مطلب؟'' وہ حیران ہوئی۔

''تم ابھی چھوٹی ہو..... تم نہیں سمجھو گی۔'' اریبہ تلخی سے بولی۔
''ہاں..... میں آپ کی طرح بہادر بھی نہیں ہوں۔ بہت ڈرپوک ہوں نا۔'' وہ سہم گئی۔
''میں نے کہا نا بے کار کی باتیں مت سوچو۔ یا تو پڑھائی کی طرف دھیان دو یا پھر سو جاؤ۔ میرا خیال ہے تمہارا ذہن بہت ڈسٹرب ہے۔ میں شیدو سے کہہ کر گرم دودھ منگواتی ہوں۔ وہ پی کر تم سو جاؤ۔''
''آپی! آپ واقعی بہادر ہیں۔ آپ پر تو اس خبر کا اثر بھی نہیں ہوا۔''
''بہادر.....؟'' وہ جیسے خلاؤں میں گھورتے ہوئے بڑبڑائی۔ ''بچپن سے سب سن سن کر دماغ کو عادت ہو گئی ہے۔ تم ابھی بچی ہو۔ تمہیں بھی ہو جائے گی بڑی ہو گی تو۔'' فری کو سلا کر وہ دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہوئی تھی کہ اس کی چچا زاد نسرین چائے کا کپ ہاتھ میں لیے آ گئی۔ وہ اریبہ کے برابر ہی تھی لیکن اس کا چہرہ بھی فری سے کم کنفیوژ



نہیں تھا۔ اریبہ نے ٹھنڈی سانس بھری اور کتاب بند کی پڑھنا ناممکن ہوگیا تھا۔

''اب تمہیں کیا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ ایک سپ لے کر خاموش ہوگئی لیکن اریبہ جانتی تھی کہ دل کا غبار نکالے بغیر وہ نہیں جانے والی۔

''پھر بھی چہرے پر بارہ کیوں بجے ہیں؟''

''بس کچھ سوچ رہی ہوں؟''

''آج ہی بتادوگی؟'' وہ بےزاری سے بولی۔

''عورت کی عزت اور حقوق تو صرف کتابوں اور قصے کہانیوں تک محدود ہوکر رہ گئے ہیں لیکن اصل میں تو اسے ذلیل و خوار کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جاتی۔ لیکن تم تو بہادر ہونا؟'' اریبہ کا دل چاہا سر پیٹ لے۔

''اب دو جملوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟''

''ہے......! اتنی بڑی بات ہوئی اور تمہارے اوپر کوئی اثر نہیں ہوا۔''

''تو کیا میں دھاڑیں مار مار کر روؤں گی یا لحاف میں چھپ کر آنسو بہاؤں گی تو پتا چلے گا کہ میرے اوپر بھی اثر ہوتا ہے یا تم کہتی ہو تو پاگل ہوکر جنگلوں کی طرف نکل جاؤں؟''

''میرا مطلب یہ نہیں تھا اریبہ!'' نسرین برا مان کر بولی۔ پتا نہیں اللہ میاں نے عورت کو پیدا ہی کیوں کیا۔ جب اس کی حیثیت پاؤں کی جوتی کے برابر بھی نہیں۔''

''افزائش نسل کے لیے۔'' وہ مسکرائی۔

''یا پھر مرد کو کھلونا چاہیے تھا۔''

''توبہ توبہ!'' نسرین نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''تم خدا تعالیٰ کے بارے میں ایسے خیالات رکھتی ہو سیدھی جہنم میں جاؤ گی۔''

''پہلے ہی جہنم میں ہوں۔ اس جہنم سے اگلے جہنم میں جاؤں گی تو پاگل ایسے بالکل ایسے ہوگا جسے تم شادی کر کے نچلی منزل اوپر کی منزل کی طرف سدھاروگی۔'' وہ نہایت اطمینان سے بولی۔ نسرین نے حیران ہوکر اسے دیکھا۔

''تم واقعی بہت بہادر ہو۔''

''اگر تم نے ایک بار اور یہ لفظ بولا تو میری بہادری کا ثبوت بھی دیکھ لوگی۔'' اسے غصہ آگیا۔

''کیا مطلب؟'' نسرین نے ہونقوں کی مانند اسے دیکھا۔

''اپنی بہادری کا ثبوت دینے کے لیے تمہیں قتل کردوں گی۔'' وہ آنکھیں نکال کر بولی تو نسرین نے نفی میں سر ہلایا۔

''تم ایسا نہیں کرسکتیں۔ مجھے پتا ہے تم مذاق کررہی ہو۔''

''کیوں نہیں کرسکتی؟''

''اس لیے کہ میں رحیم بھائی کی بہن ہوں۔ تمہاری اکلوتی نند۔'' اریبہ کا حلق تک کڑوا ہوگیا۔ آنکھوں میں عجیب سے تاثرات آگئے۔

''نام نہ لو اس شخص کا میرے سامنے۔'' وہ غصے سے بولی۔ ''انتہائی جاہل اور گنوار شخص ہے وہ اس پر تو تعلیم کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ ویسا ہی جانور ہے جیسے تعلیم حاصل کرنے سے پہلے تھا۔ پڑھا لکھا جاہل اور تم بڑا اکڑتی ہوا پنے بھائی پر تو سن لو اس کی نظر میں بھی عورت کی کوئی عزت نہیں ہے۔ وہ بھی عورت کو کمتر مخلوق سمجھتا ہے۔ بالکل لوفروں والے انداز ہیں اس کے۔ تہذیب تو اسے بھی چھو کر نہیں گزری ہوگی۔ محلے کی لڑکیوں کو ایسی نظروں سے دیکھتا ہے جیسے اس کی ذاتی جاگیر ہوں اور زمین کو ایسے روند کر چلتا ہے جیسے خدا نے یہ زمین اس کے قدموں سے تباہ کرنے کے لیے بنائی ہو۔ بے غیرت کہیں کا۔ گردن میں سریا ہے اس کے، بے شرم انسان۔'' جل کر بولی۔

''اب ایسے تو نہ کہو۔ آخر تمہارا ہونے والا شوہر ہے۔ عزت سے بولنا چاہیے اس کے بارے میں۔'' نسرین ذرا آہستہ سے بولی وہ جانتی تھی زیادہ کہا تو اسے پتنگے لگ جائیں گے۔

''تو اسے عزت سے نہیں بولنا چاہیے۔ میں بھی تو اس کی ہونے والی بیوی ہوں۔ اس کی عزت ہوں۔ اسے یہ احساس نہیں ہونا چاہیے؟''

"وہ مرد ہے اریبہ۔"

"تو ہمارے نبی نے کیا کہا ہے۔ تم میں سے بہترین مرد وہ ہے جو اپنی بیوی سے اچھا سلوک کرے۔ یہی پڑھا ہے نا ہم نے؟"

"یہ تو کتابی باتیں ہیں نا۔ جو ہم امتحان پاس کرنے کے لیے پڑھتے ہیں۔" نسرین کی نظریں جھک گئیں۔

"یہی تو مسئلہ ہے۔ ہم ان کو کتابی باتیں سمجھتے ہیں۔ اسی لیے عورت کی عزت کو بھی کتابی بات ہی سمجھا جاتا ہے۔ عزت کو کتاب میں ہی رکھ کر اسے زور سے بند کر دیا ہے۔ نہ کتاب کھلے گی نہ عزت۔" نسرین چپ ہو گئی تو اریبہ غصے سے بولی۔

"بس اب تم جاؤ۔ میرا دماغ مت کھاؤ۔ میرا خون کھولنے لگا ہے۔" نسرین چپکے سے اٹھ کر چلی گئی تو وہ بے دم ہو کر لیٹ گئی۔ پڑھائی کا موڈ نہیں رہا تھا۔

☆......☆

"اس بڑی سی حویلی کے کئی حصے تھے۔ ہر حصے میں علیحدہ خاندان آباد تھا۔ بڑے چچا اور ان کے چار بیٹے تھے۔ جن میں نسرین اور اس کا بھائی جہانگیر شامل تھا۔ تایا ابو کے بھی تین بیٹے تھے بیٹی کوئی نہ تھی۔ اس لیے وہ ہر بھائی کی بیٹی پر تنقید کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے کہ یہ تنقید پلٹ کر ان کی طرف نہیں آ سکتی تھی۔ سہیل بھائی، اریبہ اور فری تینوں چھوٹے چچا کی اولاد تھے۔ عالیہ پھوپو بھی اسی حویلی کے ایک حصے میں رہتی تھیں۔ افضال پھوپا گھر داماد ہونے کے خوب مزے لوٹتے تھے۔ عالیہ پھوپو کو ان کی تین اولادوں کے ساتھ خوب دبا کر رکھا ہوا تھا اور مزے کی بات یہ ہے کہ بھائیوں کو ان کی زیادتیاں نظر نہیں آتی تھیں۔ اگر آ بھی جاتیں تو خاموش رہتے کہ وہ خود بھی اپنی بیویوں کے ساتھ یہی کچھ کرتے تھے۔ کس منہ سے بولتے۔ شادیاں خاندانوں میں ہی ہوتی تھیں۔ اتنی لچک بہر حال تھی کہ اگر کسی کا جوڑ خاندان میں موجود نہ ہوا سے دوسرے خاندان میں حسب نسب کو خوب چھان پھٹک کر بیاہ دیا جاتا۔ حویلی میں عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کے لیے بہت گھٹن زدہ ماحول تھا۔ گھر میں زیادہ ہلا گلا اور اونچی آواز میں بولنے کی اجازت نہ تھی اور پردے اور کسی ملازم کے بغیر باہر جانے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ تھوڑی بہت جو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت تھی تو وہ بھی دس بارہ سال کی عمروں تک۔ اس کے بعد سب پرائیویٹ ہی امتحان دیتی تھیں۔ لڑکوں کو البتہ خوب آزادی تھی۔ گھڑ سواری کرتے، تیر اندازی اور نشانہ بازی سب میں تاک تھے۔ ایک بار سہیل بھائی نشانے کی مشق کر رہے تھے تو وہ منت سے بولی۔

"سہیل بھائی مجھے بھی سکھائیں نا۔ مجھے بہت شوق ہے سیکھنے کا۔"

"کیا سیکھنے کا شوق ہے تجھے؟" آج موڈ اچھا تھا۔ ورنہ وہ بھی دوسرے مردوں کی طرح ہی تھے۔

"یہ نشانہ بازی اور تیر اندازی۔"

"ارے بھئی لڑکیوں کو ان کاموں سے کیا مطلب۔ تم کیا کرو گی سیکھ کر؟"

"کچھ نہیں۔ بس دل چاہتا ہے۔" اس نے معصوم سی خواہش کا اظہار کیا تو وہ بہت زور ہنس پڑے۔

"چل ادھر آ اور یہ گن پکڑ لے۔" خوشی خوشی اریبہ نے گن پکڑ لی۔ پھر بھائی کے طریقہ کار سمجھانے پر جو نشانہ لگایا وہ عین درمیان میں جا کر لگا۔

"واہ بھئی واہ تم نے تو پہلی بار میں میدان مار لیا۔ کہاں سے سیکھا؟"

"بھائی میں نے کہاں سے سیکھنا ہے۔ آپ کی قسم یہ پہلی بار ہے جو گن اٹھائی ہے۔"

"گن لڑکیوں کے ہاتھ میں اچھی بھی نہیں لگتی لیکن تم چاہو تو سیکھ سکتی ہو۔ لگتا ہے تم میں نشانہ بازی کی خداداد صلاحیت ہے۔"

"تو کیا میں کل بھی آ سکتی ہوں آپ کے ساتھ؟" وہ بے پناہ اشتیاق سے بولی۔

"ہاں آ جانا لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ تم تو جانتی ہو بابا سائیں کو علم ہوا تو میرے ساتھ تمہاری بھی خیر نہیں۔" تازہ ہوا کا یہ واحد جھونکا آیا تھا اس کی

زندگی میں جب وہ بھائی کے ساتھ نشانہ بازی سیکھتی تھی۔ حالانکہ اسے گھڑ سواری سیکھنے کی بھی بے انتہا خواہش تھی۔ لیکن وہ کہتے ہوئے ڈرتی تھی۔ یوں تو دل ہی دل میں وہ سمجھنے لگی تھی کہ وہ بھائی سے کہیں زیادہ اچھی نشانہ باز ہے۔ لیکن کہہ نہیں سکتی تھی۔ کہیں مرد کی انا کو ٹھیس لگ گئی تو وہ بے موت نہ ماری جائے۔ وہ ڈرپوک نہیں تھی۔ حویلی کی خواتین میں وہ پٹاخہ کے نام سے مشہور تھی۔ عورتوں کے سامنے تو معاشرتی ناہمواریوں اور عورت کی ذات کے موضوع پر وہ بہت بولتی تھی۔ اماں کو پٹاخ پٹاخ جواب دیتی۔ چچی اور تائی بھی عورت کے مقام کے بارے میں اس کی تمام باتوں سے متفق تھے۔ لیکن ان میں کچھ کہنے کی یا اس کا ساتھ دینے کی ہمت نہ تھی۔ عورت کی بے توقیری پر اس کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ مرد اور عورت کے بارے میں ڈبل اسٹینڈرڈ پر اسے بے پناہ اعتراض تھا۔ جس پر کھل کر بولتی تھی اور اماں ڈرتی تھیں کہ اگر ان کے شوہر نامدار نے سن لیا تو اس لڑکی کا جانے کیا حشر کریں۔ اس نے گریجویشن کا آخری پیپر دیا تو چچی اور چچا جہانگیر کے ساتھ اس کی شادی کی تاریخ لینے آگئے۔ پہلے تو اس کا دل بیٹھ گیا۔ پھر غصے سے دل میں ابال اٹھنے لگے۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ جہانگیر نے صاف کہہ دیا کہ پہلے نسرین کی شادی ہوگی۔ جوان بہن گھر میں بیٹھی ہو تو وہ اتنا بے غیرت نہیں کہ اپنی شادی رچالے۔ اسے سکون محسوس ہوا مگر ساتھ ہی ہنسی بھی آگئی۔ یہ غیرت کا اچھا پیمانہ ہے۔ غیرت کو کون سے ترازو پر رکھ دیا جہانگیر نے۔

اس کی شادی زیادہ دن نہیں کی۔ نسرین کے ہاتھوں سے کتابیں چھین کر اس کی شادی طے کی اور اسے مایوں بٹھا دیا گیا۔ رشتہ تو بچپن سے طے تھا۔ اریبہ تلخی سے مسکرائی۔

''تو یہ سکون صرف چند دنوں کے لیے تھا۔''

اس روز باغیچے میں جہانگیر سے سامنا ہوگیا۔ اس کی مسکراہٹ اسے زہر لگی۔ وہ بھاگنے کو پر تولنے لگی تو وہ بولا۔

''بس کچھ دیر کی بات ہے۔ پھر تم بھی میرے نام لکھ دی جاؤ گی۔''

''میں کوئی جائیداد نہیں ہوں۔'' وہ پھنکاری۔

''جو تمہارے نام لکھ دی جاؤں۔''

''میں تو تمہیں اپنی جائیداد ہی سمجھتا ہوں۔'' وہ ذرا سنجیدہ ہوا۔ اریبہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ وہ پہلے والا لوفرانہ انداز کہیں نظر نہیں آیا۔ کتنی دیر تک اسے یقین نہ آیا۔

''میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

''اتنی ہمت ہے کہ تایا سائیں کے سامنے انکار کرسکو؟'' وہ اب بھی سنجیدہ تھا اور وہ مزید حیران۔

''پیدا کرلوں گی ہمت۔ اس کے بعد چاہے وہ مجھے قتل ہی کیوں نہ کردیں۔ تم سے شادی کرنے سے بہتر ہے مرجاؤں۔'' وہ بڑی بہادری سے بولی۔ وہ کچھ لمحے چپ چاپ اسے دیکھتا رہا اور اریبہ مارے حیرت کے بے ہوش ہونے والی تھی۔ آج جہانگیر کو کیا ہوگیا ہے نہ تو وہ چیپ انداز ہے اور نہ ہی اس کی باتوں پر غصہ کررہا ہے۔

''کیا کمی ہے آخر مجھ میں؟'' تھوڑی دیر بعد وہ اس کے قریب بیٹھا ہوا بولا۔

''تم میں ہے کیا...... اچھی شکل و صورت کے سوا؟'' وہ صاف صاف بولی تو وہ مسکرایا۔

''تو میری شکل اچھی لگتی ہے تمہیں۔''

''میں نے یہ نہیں کہا۔'' وہ بگڑ کر بولی۔

''مجھے اچھی نہیں لگتی۔ بس اچھی ہے۔''

''چلو کوئی خوبی تو ہے مجھ میں۔'' اس نے پھر مسکرا کر دیکھا۔

''یہ تمہاری خوبی تھوڑی ہے۔ یہ تو خدا کی دین ہے۔ لیکن تمہاری عادتیں تو تمہارا مسئلہ ہے نا۔ وہ تو ٹھیک کرنا تمہارے اختیار میں ہے۔'' ''کوشش کررہا ہوں نا۔'' وہ بولا۔

''تمہاری خاطر۔''

''میری خاطر نہ کرو۔ اپنی خاطر کرو۔'' وہ لاپروائی سے بولی۔

''اچھا پھر تو تمہیں مجھ سے شادی پر کوئی اعتراض

یقین

اپنے وطن کی قدر اور اسے اپنا جان لینے سے ہی بات بنے گی اور باہمی اعتماد ہمیں ایک دوسرے کے قریب تر لا سکتا ہے۔ ہم میں اعتماد کا فقدان ہو چکا ہے لیکن یہ ختم نہیں ہوا۔ ہمارا مذہب ایک دوسرے سے محبت کا درس دیتا ہے۔ ہم بن دیکھے خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس جذبے اور یقین کو کامل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اس بات کا تو یقین ہے کہ دو گولی ڈسپرین سے سر درد کو فوری آرام مل جائے گا۔ فلاں ہارٹ سرجن اگر آپریشن کرے گا تو مریض مر نہیں سکتا چاہے وہ کچھ دیر کے لیے مریض کے سینے سے دل باہر ہی نکال کے کیوں نہ رکھ دے لیکن ہمیں اس بات پر یقین نہیں ہوتا ہے کہ فلاں آیت مبارکہ پڑھنے سے سر درد کو فوری آرام مل جائے گا یا رزق میں برکت آئے گی۔ اس بات پر یقین نہیں کہ صدقہ دینے سے اس کا دس فیصد دنیا اور ستر فیصد آخرت میں اضافہ ملے گا۔ اگر صرف اس ایک بات پر عمل پیرا ہو جائیں گے، ہم انفرادی طور پر اپنے مالوں سے صدقہ، خیرات کرنا شروع کر دیں تو یقین کیجیے کہ کوئی محتاج یا زکوٰۃ لینے والا نہ رہے۔ ہم اگر باہمی اتحاد کا مظاہرہ کریں، مٹی سے پیار اپنے عقیدے میں شامل کر لیں اور خدا کی مکمل رحمت پر یقین کر لیں تو ہم ایسے بالکل نہ رہیں گے جیسے آج ہیں۔ اگر ہمیں دو گولی ڈسپرین سے زیادہ یقین اپنے ربّ کریم پر آ جائے اور ہم سرکار کو ایک طرف رکھ کر اپنے مسائل کی بابت خود سوچنے لگیں تو ہم زیادہ خوش وخرم اور توانا ہو جائیں گے۔ بات آنکھیں بند کر کے مکمل اور کامل یقین کی ہے اور اس یقین میں کوئی شک وشبہ یا وہم نہ ہو۔ ہمارا دل، جسم یک زبان ہو کر خدا کی قدرت پر یقین رکھ کر تھیا تھیا ناچ رہے ہوں پھر کسی شے نہ ہمیں جدا کرنے کا یارا ہوگا اور نہ ہمیں کسی پر تنقید کی ضرورت ہوگی۔ ہمارا نفس مطمئن ہوگا اور ہم کبھی پریشان حال نہ ہوں گے۔

اشفاق احمد کی کتاب ''زاویہ 3'' سے راز عدن، بحرین کا انتخاب

نہیں ہوگا۔'' وہ پھر سنجیدہ ہو گیا۔ اریبہ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اس نے اپنی حیران نظریں اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔ حویلی کے مغرور مرد...... اس طرح کسی عورت سے گفتگو کریں۔ یہ کیسے ممکن تھا۔ وہ سب کچھ بغیر بھی اسے حاصل کر سکتا تھا۔ کوئی اس پر اعتراض نہ کرتا۔ پھر وہ اس انداز میں گفتگو کیوں کر رہا تھا۔ سفید کرتے شلوار پر سیاہ واسکٹ اور سر کے اوپر بڑی سی سفید پگڑی پہنے وہ واقعی ہینڈسم لگ رہا تھا۔

''میں زبردستی کا بندھن نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں تم مجھے اپنی مرضی سے قبول کرو۔''

''لیکن کیوں جہانگیر۔'' وہ کنفیوز تھی۔

''تم مجھے میری مرضی کے بغیر بھی حاصل کر سکتے ہو پھر یہ سارا ڈرامہ کیوں؟''

''اس لیے کہ شاید۔'' وہ کچھ گم صم تھا۔

''شاید میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔''

''محبت......؟'' وہ شاکڈ تھی۔

''ہاں محبت! اسی لیے تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کرنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں تم میرے ساتھ سے خوش ہو اسے قید نہ سمجھو۔ میں سمجھوتے کی شادی نہیں چاہتا۔''

''اور یہ اتنی بڑی تبدیلی کیسے آ گئی تم میں؟'' وہ ابھی تک حیران تھی۔ یہ سب ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

''تمہاری وجہ سے، تمہاری محبت کی وجہ سے۔ میں بہت دیر سے غور کر رہا تھا۔ بہت عرصے سے سوچ رہا تھا کہ ایسی زندگی کا کیا فائدہ جو یہاں سب گزار رہے ہیں۔ اور جب تم سے محبت ہوئی یقین پختہ ہو گیا۔''

''لیکن تم تو مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ میں حویلی کی دوسری لڑکیوں کی طرح نہیں ہوں۔ میں آنکھ بند کر کے ہر ناجائز بات پر عمل نہیں کروں گی۔ میں زیادتیاں خاموشی سے سہنے والی لڑکی نہیں ہوں۔ تمہیں پتا ہے نا؟ پھر بھی؟''

''ہاں پھر بھی۔'' وہ مسکرایا۔ ''تمہاری یہی باتیں تو ہیں جن کی وجہ سے مجھے تم اچھی لگتی ہو۔ بہت جی دار ہو تم۔ مجھے دبو قسم کی لڑکیاں پسند نہیں۔''

''اور وہ تمہاری روایتی مردانگی۔ اس حویلی کے مردوں کی وہ پختہ عادات...... ان کا کیا ہوگا؟''

''سب چھوڑ دوں گا۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولا۔

''تمہاری خاطر۔''

''میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکی ہوں میری خاطر نہیں چھوڑو اپنی خاطر چھوڑو۔ پہلے تم خود سے محبت کرنا سیکھو۔ اپنی شخصیت کو ایسا بناؤ جیسی کہ ایک حقیقی مرد کی ہونی چاہیے۔ پھر دیکھنا تم سے خود بخود محبت ہو جائے گی مجھے۔''

''وعدہ۔'' جہانگیر نے اپنا مضبوط ہاتھ آگے بڑھایا۔

ایسا پہلے اس حویلی میں کہاں ہوا تھا کہ ایک مرد ایک کمزور عورت کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔

ہوا تو یہ بھی نہیں تھا کہ ایک مرد کی اس طرح تنہائی میں ملاقات ہوئی ہو۔ جو غیر شادی شدہ بھی ہوں۔ وہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھنے سے جھجکی تو اس مرد نے خود ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھ پر رکھا اور جذبات کی پوری شدت سے دبایا۔ وہ پوری جان سے کانپ گئی۔ کوئی برقی رو بھی جوان ہاتھوں سے ہوتی ہوئی اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ اس نے گھبرا کر ہاتھ چھڑایا اور ڈر کر ادھر ادھر دیکھا۔

''میں نے تو سنا تھا تم بہت بہادر ہو۔ پھر کیوں ڈر رہی ہو؟'' وہ دلکشی سے مسکرایا۔ اب وہ اسے کیا بتاتی کچھ چور دل کے ہوتے ہیں۔ جو بڑی خاموشی سے دل کے اندر داخل ہوتے ہیں تو اُن سے ڈرنا پڑتا ہے۔

☆......☆

ان کی شادی ہوگئی۔ اسے غرور تھا کہ اس حویلی کا ایک مرد دل کی تمام سچائیوں سے اس سے محبت کرتا ہے۔ اس کی عزت کرتا ہے۔ عورت کو محبت سے بھی زیادہ عزت کی خواہش ہوتی ہے۔ اس نے اریبہ کو عزت دی تو اس نے بھی تن من دھن اس پر قربان کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ اس پر قربان ہوتا تو وہ اس سے دس گنا زیادہ اس پر قربان ہوتی۔ اس حویلی میں اس سے پہلے تو زندگی اتنی حسین، اتنی پرکشش نہ تھی۔ اسے کبھی کبھی یوں لگتا جیسے وہ ایک طویل خواب دیکھ رہی ہو۔ کسی لمحے بھی آنکھ کھلی تو سارا طلسم ٹوٹ جائے گا۔ دو تین مہینے خواب کی حالت میں ہی گزر گئے

جہانگیر نے اسے اتنا پیار، اتنی محبت اور مان دیا تھا کہ وہ نکھر کر پھول کی مانند کھل گئی۔

آمنہ اس کی بہترین دوست تھی۔ کچھ عرصہ ہوا والدین کے ساتھ شہر میں بس گئی تھی۔ اچانک ہی اس کی شادی کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ آمنہ نے مہندی شادی اور ولیمہ تینوں فنکشنز پر اسے مدعو کیا تھا اور نہ آنے کی صورت میں ناراضگی کی دھمکی دی تھی۔ جہانگیر نے صاف انکار کردیا۔

''پورے تین دن...... نہیں اریبہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں کیا کروں گا تمہارے بغیر۔ نہیں میں تمہیں پورے تین دن خود سے جدا نہیں کرسکتا۔''

''پورے تین دن نہیں۔ صرف تین دن۔'' وہ ناز سے بولی۔

''یوں گزر جائیں گے۔'' اس نے ہنس کر چٹکی بجائی تو جہانگیر نے شکایت آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔

تمہارے لیے گزر جائیں گے۔ شادی کا ہنگامہ ہوگا۔ لیکن میرے لیے تو تین صدیاں ہوں گی۔'' چلو تین صدیاں ہی سہی۔'' اسے غرور سا ہوا۔

''لیکن جہانگیر ہمیں یہ تجربہ بھی کرنا چاہیے۔ تھوڑی سی جدائی ہو تو محبت بڑھتی ہے۔ پھر سوچو میں واپس آؤں گی تو دن کتنے جادو بھرے ہوں گے۔'' وہ خاموش رہا تو اس نے اپنی تھوڑی اس کے کندھے پر رکھی۔

''تم تو کہتے تھے۔ تم میری کوئی بات نہیں ٹال سکتے۔ بس دیکھ لی تمہاری محبت۔'' وہ جھٹکے سے روٹھ کر جانے لگی تو جہانگیر نے بازو سے کھینچ کر اسے سینے سے لگالیا۔

''میری محبت کو آزمانا چاہتی ہو۔ تو ٹھیک ہے میں نے تمہیں اجازت دی۔ لیکن اتنا جان لو یہ تین دن کانٹوں پر گزریں گے۔''

''اور تم بھی جان لو۔ میرے لیے بھی تین دن پھولوں کی سیج نہیں ہوں گے۔'' اور واقعی اریبہ کے لیے یہ تین انتظار کی سولی پر کٹے۔ آمنہ اس کی عزیز سہیلی تھی لیکن وہ کوئی تقریب دل سے انجوائے نہ کرسکی۔ جہانگیر کا خیال، اس سے دوری کی چبھن

سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ ہوتی۔ سارا عرصہ وہ کھوئی کھوئی سی رہی۔ خدا خدا کر کے دن گزرے تو اماں کے ساتھ ہی واپسی کا رختِ سفر باندھا۔ دل دھڑک دھڑک کر دیوانہ ہو رہا تھا۔ جہانگیر سے جدائی کے بعد ملنے کا خیال اتنا مسرور کن تھا کہ اس سے انتظار نہ ہو رہا تھا۔ آنا تو اس نے کل تھا لیکن اب وہ رہ نہ سکتی تھی۔ اس لیے آج ہی اماں سے ضد کر کے آ گئی۔ حویلی کے دروازے پر اترتے ہی وہ والہانہ انداز میں اندر اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ برآمدے میں شیدو پودوں کو پانی دے رہی تھی۔

''جہانگیر سائیں اندر ہیں نا۔''

''جی بی بی جی۔'' شیدو اس کی بے قراری پر مسکرائی۔ اس نے بے تابانہ دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئی۔ لیکن وہیں دہلیز پر پتھر کی بن گئی۔ قدم زمین نے جکڑ لیے۔ آنکھوں میں پہلے تو اذیت ابھری۔ پھر جیسے ٹوٹا ہوا کانچ بھر گیا۔ وہ سکتے کے عالم میں اپنے بیڈ پر دیکھتی رہ گئی۔ اس کی محبت جہانگیر اور وہ نئی شوخ چنچل ملازمہ رسیلی۔ انہیں تو اس کی آمد کا پتا ہی نہ چلا۔ لیکن وہ ان ہی قدموں پر مڑی۔ اس کے دل میں بھونچال اٹھ رہے تھے۔ پورا وجود بھی زلزلوں کی زد میں تھا۔ لیکن اتنی قوت اور ہمت تھی کہ بھاگتی ہوئی بابا کے کمرے میں گئی۔ دراز سے لوڈڈ گن اٹھائی اور اسی رفتار سے واپس آئی کمرے کا دروازہ کھولا۔ اور گرج دار آواز میں اسے پکارا۔

''جہانگیر!'' وہ بوکھلا کر گھبرا کر سیدھا ہوا۔ رسیلی کانپتی ہوئی نیچے اتری۔

''تو یہ تھی تمہاری محبت۔ تین دن صبر نہ ہو سکا۔''

اریبہ نے گن کا رخ عین اس کے دل کی طرف کیا۔ اس کی آنکھیں اور پورا وجود غیض و غضب کا جیتا جاگتا آتش فشاں لگ رہا تھا۔

''اریبہ! اریبہ پلیز میری بات سنو۔'' لیکن اس سے آگے وہ ایک لفظ نہ بول سکا۔ گولی عین دل کے مقام پر لگی کہ اس کا نشانہ پرفیکٹ تھا۔ جہانگیر کٹی ہوئی شاخ کی طرح بستر پر گر گیا۔

☆......☆......☆

تائی حسن آرا بیگم نے پانی منگوا کر شیدو کے منہ پر چھینٹے مارے۔ وہ ہڑبڑا کر ہوش میں آئی اور آنکھیں گھما گھما کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ پھر سب یاد آیا تو فوراً اٹھ بیٹھی۔ گھبرا کر حسن آرا کو دیکھا۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے شیدو کی طرف دیکھا۔ اس کے حواس کچھ بحال ہوئے تھے۔ لیکن سانس ابھی تک قابو سے باہر تھی۔

''وہ جی...... اریبہ بی بی نے جہانگیر سائیں کو قتل......'' وہ آگے نہ بولی تو حسن آرا چند لمحے سکتے کی حالت میں رہنے کے بعد اٹھیں اور اریبہ کے کمرے کی طرف چل دیں۔ وہاں کا منظر اپنی کہانی آپ بیان کر رہا تھا۔ جہانگیر کا بے تحاشا بکھرا خون رسیلی جو کانپتے ہوئے خود کو چادر سے ڈھانپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور اریبہ کی ہاتھ میں گن اور آنکھوں میں اترا خون تھوڑی دیر بعد وہ غصے میں اریبہ کی طرف بڑھیں۔

''کم بخت، جنموں جلی یہ کیا کر دیا تو نے؟''

''مار دیا...... مار دیا اسے۔ آپ نے دیکھا نہیں کیا کیا اس نے؟'' وہ سرگوشی میں بولی۔

''وہ تو میں دیکھ رہی ہوں۔ لیکن پھر بھی۔ یہ کیا کیا تو نے، کیوں کیا؟''

''غیرت کے نام پر تائی اماں اسے بے غیرتی کی سزا ملنی چاہیے تھی۔''

''غیرت کے نام پر؟'' اماں حیران ہوئیں۔

''غیرت کے نام پر تو مرد قتل کیا کرتے ہیں۔ لیکن تم...... تم نے یہ کیا کیا۔ حویلی کی عزت۔''

''کیوں تائی اماں؟'' اریبہ نے بات کاٹی۔

''اگر مرد غیرت کے نام پر عورت کو قتل کر سکتا ہے تو عورت غیرت کے نام پر کیوں قتل نہیں کر سکتی مرد کو؟'' حسن آرا نے اسے ایسے دیکھا جیسے وہ ذہنی توازن کھو چکی ہو۔

''اگر میں ایسا کرتی تو کیا جہانگیر مجھے قتل نہ کرتا۔'' وہ بے تحاشا قہقہے لگانے لگی۔ جب کہ حسن آرا بیگم سر جھکائے فرش کو دیکھے گئیں جب کہ اریبہ کے ساتھ آئی تائی اماں تیورا کر اسی فرش پر گر گئیں۔

☆......☆......☆

چھٹی سچ بیانی

زندگی کا دوسرا رُخ

خالد نذیر خالد

آج کے معاشرے سے اٹھا سوالِ زیست' جو شاید صدیوں سے بار بار
نام اور چہرے بدل کر دہرایا جاتا رہے گا

دفتر سے واپسی پر وہ راستے میں پڑتی ہوئی مارکیٹ میں چلا گیا۔ یہ وہ مارکیٹ تھی جو کہ دوسری مارکیٹوں سے قدرے مختلف تھی، گو ضروریات زندگی کی اشیاء یہاں با آسانی دستیاب ہو جاتی تھیں مگر ان کے نرخ قدرے زیادہ تھے۔ اسے زائد پیسے دے کر کبھی بھی اس بات کا احساس نہ ہوا تھا کہ اگر وہ کسی اور مارکیٹ میں چلا جاتا تو یہی اشیاء کم داموں میں بھی مل سکتی تھیں اطمینان کی بات یہی تھی کہ یہاں جو چیز ملتی تھی وہ صاف ستھری اور کوالٹی کے اعتبار سے بھی ایسی ہوتی تھی کہ انسان نہ چاہتے ہوئے بھی دوبارہ اس مارکیٹ کا رخ کر لیتا تھا۔ اس مارکیٹ میں فارنرز کی ایک بڑی تعداد خرید وفروخت کرتی ہوئی نظر آتی۔

کالج کے زمانے میں اس نے کہیں پڑھا تھا کہ ہمارے ملک کی بہترین پیداوار ہمارے ملک کے ایکسپورٹ سے منسلک ادارے زرِ مبادلہ کمانے کی خاطر دوسرے ملکوں کو ایکسپورٹ کر دیتے ہیں اور باقی جو بچ جاتا ہے وہ ہمیں پھر مارکیٹوں میں نظر آتا ہے۔ مارکیٹ سے اس نے گوشت کے دو بڑے پیکٹ، تازہ مچھلی اور کچھ دوسری اشیاء خرید کر وہ شاپرز کو مضبوطی سے پکڑے مارکیٹ سے باہر آ گیا۔ باہر آیا تو معاً اسے یاد آیا کہ اسے صبح بڑی بیٹی حرا جو کہ تقریباً چار سال سے زائد کی تھی نے فرمائش کی تھی کہ ''پاپا! واپسی پر میرے لیے انگور لانا۔''

اور دوسری طرف چھوٹا بیٹا احسن جو کہ دو سال کا تھا کیسے اس کی پینٹ پکڑے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اپنی توتلی زبان میں سمجھا رہا تھا کہ ''پاپا! اور میرے لیے بسکٹ۔''

اس نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک جگہ سے یہ دونوں اشیاء خریدیں کہ سامنے ہی اسے ویلفیئر ٹرسٹ کا ادارہ نظر آ گیا۔

عام طور پر وہ اس جیسے ملتے جلتے اداروں کے پاس سے یونہی گزر جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھار اس کے ذہن میں یہ خیال بھی آتا کہ پڑے ہوئے عطیات باکس میں وہ بھی اپنا حصہ ڈال دے مگر یہ خیال صرف چند سیکنڈ کے بعد اس کے ذہن سے مٹ جاتا اور وہ آگے بڑھ جاتا۔ ہاں بعض اوقات اتنا ہوتا کہ راستے میں اگر کوئی فقیر یا ضرورت مند نظر آ جاتا تو وہ اس کی ظاہری وضع قطع کو دیکھ کر اس کی مدد کر دیا کرتا مگر اب ایسا نہیں ہوتا تھا اس کے بڑھتے ہوئے قدم ویلفیئر



ٹرسٹ کو دیکھتے ہوئے من من بھر کے ہو جاتے اسے ایسا لگتا تھا کہ وہ ان اداروں کو دیکھتے ہوئے مزید ایک قدم بھی نہ چل سکے گا۔

آج صبح ہی اس نے بینک سے تنخواہ لی تھی اس کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف بڑھتا چلا گیا، عطیات والے بکس کے پاس پہنچ کر اس نے ہزار کا نوٹ نکالا۔ یہ کاغذ کا وہ ٹکڑا تھا جس کو جیب سے نکالتے ہوئے مخصوص سی آواز آئی تھی یہ آواز صاف بتا رہی

تھی کہ یہ نوٹ ابھی مختلف ہاتھوں میں نہیں پہنچا تھا ورنہ نوٹوں کا بوسیدہ پن ایک الگ کہانی سنا رہا ہوتا ہے۔

وہ اب عطیات والے بکس کے پاس کھڑا تھا اس نے چپکے سے بکس کے سوراخ میں ڈال دیا۔ اس سارے عمل میں نہ جانے آنکھوں میں کہاں سے ڈھیر ساری دھند امنڈ آ گئی تھی۔ آنسو پلکوں کی باڑ کو توڑ کر گرنے کو بے تاب ہوں۔ بکس کے قریب کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا باریش شخص اس کی نگاہ کے اٹھنے کا منتظر ہو اور سلام دعا کرنا چاہتا ہو مگر وہ نم آنکھوں کے ساتھ بغیر نظریں ملائے تیزی کے ساتھ وہ جگہ چھوڑ کر انسانوں کے ہجوم میں گم ہو گیا تھا۔

☆......☆

آج سے کچھ سال پہلے ان کا گھرانا کس قدر خوش و خرم تھا وہ اپنی تین بہنوں اور امی ابا کے ساتھ کتنی آسودہ زندگی گزار رہے تھے، اس کے والد ایک سرکاری ادارے میں گریڈ اٹھارہ کے عہدے پر تھے۔ اتفاق سے میاں بیوی دونوں ہی سمجھدار تھے انہیں اندازہ تھا کہ بچیاں جوان ہوں گی تو ان کی شادیوں پر روپے پیسے کی ضرورت بھی ہوگی۔ ماں سگھڑ تھی یوں تھوڑا تھوڑا جمع کیا ہوا پیسہ کام آ گیا۔ جونہی دونوں بہنوں نے ایک ایک سال کے وقفے سے گریجویشن کیا، والدین نے دونوں بیٹیاں، ناصرہ اور شاہدہ کا رشتہ اپنے بڑے بھائی اسد کے بیٹے طاہر کے ساتھ جو کہ ایک ٹیکسٹائل مل میں منیجر کے عہدے پر تھا کے ساتھ کر دیا اور دوسری بیٹی شاہدہ کا رشتہ گوجرانوالہ میں ماں نے اپنی بڑی بہن کے بڑے بیٹے رشید سے کر دیا۔

احمد نے خود ایم۔ بی۔ اے کیا ہوا تھا اور ایک سرکاری ادارے میں ایڈمن آفیسر تھا اور اُسے معقول مشاہرہ مل رہا تھا۔ احمد کے اپنے دو بچے تھے۔ حرا اور احسن اور بیوی فرزانہ کے ساتھ آج کے اس مہنگائی کے دور میں اچھی زندگی گزار رہا تھا۔ اس سے چھوٹی بہن نائلہ تھی جو اس سے چار سال چھوٹی تھی اور بی اے کرنے کے بعد گھر میں اپنی والدہ کا ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔ گو بہو کے گھر میں آنے سے کام تھوڑا تقسیم ہو گیا تھا چونکہ احمد کے بچے چھوٹے تھے لہٰذا فرزانہ زیادہ تر اپنے بچوں کے کاموں میں الجھی رہتی۔

☆......☆

شاہدہ کے ہاں پہلے بیٹے کی آمد ہوئی تو میاں بیوی نے گوجرانوالہ جانے کی ٹھان لی۔ واپسی پر وہ دونوں خوش و خرم آ رہے تھے کہ بدقسمتی سے روڈ ایکسیڈنٹ کا شکار ہو گئے۔ میاں تو زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے ملک عدم سدھار گئے اور بیوی اسپتال میں ایک ماہ تک داخل رہیں ان کے کولہے کی ہڈی میں شدید زخم آیا تھا۔ ڈسچارج ہونے کے بعد اگرچہ وہ ٹھیک ہو گئی تھیں مگر ایک ٹانگ میں تھوڑا سا لنگ آ گیا تھا یوں ٹھیک ہونے کے باوجود ان کے ذہن پر حادثے کا خوف رہا اور وہ بیٹی کے گھر دوبارہ جانے کی ہمت نہ کر سکیں۔ بیٹی اور داماد خود بچوں کے ہمراہ آ جاتے مگر وہ کوئی نہ کوئی عذر تلاش کر لیتی اور یوں بات آئی گئی ہو جاتی۔

☆......☆

نائلہ کی شادی بھی خاصی عجلت میں ہوئی تھی کسی جاننے والے نے رشتہ بتایا تھا کہ لڑکا سرکاری ملازم ہے اور اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق ہے۔ گھر والوں نے روایتی طور پر تھوڑی بہت چھان پھٹک کی اور ایک ماہ کے وقفے سے اس کی شادی کر دی۔ نائلہ چونکہ بھرے ہوئے سسرال میں گئی تھی۔ اس لیے وہاں کچھ روایتی باتیں بھی نظر آئیں۔ نائلہ مزاجاً خاموش طبع تھی جبکہ اس کی دونوں نندیں مزاج کی تیز تھیں۔ ساس کا رویہ اس کے ساتھ نسبتاً اچھا تھا مگر اس کا کیا کیا جائے کہ وہ جلد بیٹیوں کی باتوں میں آ جاتی تھیں اور بعض اوقات توازن قائم نہ رکھ پاتیں۔

نائلہ سمجھدار تھی اور ان سب باتوں کو سمجھتی تھی کہ بہرحال اس کو اپنے اسی سسرال میں، ان کے ماحول میں ڈھلنا ہے اور یہ سب کچھ برداشت کرنا ہے۔ نندوں کا کیا ہے ساس نے کون سا ان کو بٹھائے رکھنا

ہے۔

نائلہ کے شوہر تنویر کی بڑی خواہش تھی کہ ان کی شادیاں جلد از جلد ہو جائیں کہ ان کو کالج کی تعلیم مکمل کیے ہوئے ایک ایک دو دو سال ہو گئے تھے۔

ادھر نہ جانے خدا کو کیا منظور تھا کہ نائلہ کی شادی کو ایک سال ہونے کو آیا تھا مگر اللہ نے اس کی گود ہری نہ کی تھی۔ نائلہ کا شوہر تنویر اور اس کی ساس جانے کیوں جلدی میں تھے۔ شادی کے جونہی سات ماہ گزرے تو دبی دبی زبان سے دائیں بائیں باتیں ہونے لگیں۔ ملنے جلنے والیاں جب گھر آتیں تو ساس کو دو چار باتیں بھی کر جاتیں۔

''ہائے ابھی کوئی بھی خوشخبری نہیں۔ اللہ خیر کرے۔''

کوئی بہت ہی نزدیک کی رشتہ دار ہوتی تو رشتہ داری کا حق یوں جتایا جاتا۔

''ارے کہیں چیک اپ کرانا تھا۔ تمہیں تو پتا ہے عورتوں کے بے شمار مسائل ہوتے ہیں، خدانہ کرے کہ دیر ہو جائے اور یہ محرومی مستقل محرومی کی شکل اختیار کر جائے۔''

''ہاں بہن سوچتی تو میں بھی ہوں، آخر کار تنویر میری اکلوتی نرینہ اولاد ہے۔''

نائلہ کی ساس عورتوں کی زبان بولنے لگ جاتیں۔ شروع شروع میں یہ باتیں آپس تک رہیں پھر آہستہ آہستہ بیٹے کو بھی کہنا شروع کر دیا گیا اور یوں جب تنویر نے اس سے ایک دن اسی موضوع پر بات کی تو اسے بہت افسوس ہوا اور وہ کیسے دل گرفتہ لہجے میں اپنے شوہر کو کہہ رہی تھی۔

''دیکھیں ہماری شادی کو تو ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا اور پھر یہ ہمارے اختیار میں کب ہے، جب اللہ کی مرضی ہوگی، وہ دے دے گا۔''

وہ تسلی کا دامن پکڑے ہوئے تھی۔

''مگر میرا خیال ہے کہ کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر سے چیک اپ کروالینا چاہیے، اس میں حرج بھی تو کوئی نہیں ہے۔''

وہ اس کے یقین میں چھید کرنے لگا ہوا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ اس پر نائلہ کی کسی بات کا اثر نہ ہوا ہو۔

''بہرحال آپ کی مرضی۔'' نائلہ کے لہجے میں تھکن عود آئی۔

''تنویر آپ یقین کریں میرے سامنے تو ایسی بھی مثالیں ہیں کہ اللہ پاک نے دس سال بعد بھی اولاد کی نعمت سے نواز دیا۔''

نائلہ نہیں چاہ رہی تھی کہ بات خوامخواہ طول پکڑے اور اس کی ذات خوامخواہ موضوع بحث بنی رہے مگر گزرتے وقت کے ساتھ اس کی ساس اور تنویر کا اصرار بڑھتا گیا۔

پہلے ایک ڈاکٹر سے چیک اپ ہوا اور یوں دونوں میاں بیوی کی رپورٹ او کے آئی۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے ایک اچھے اسپتال سے چیک اپ کروایا تو پھر بھی ڈاکٹروں نے انہیں تسلی دی کہ ''خدا کے کاموں میں دیر ہے اندھیر نہیں۔''

ادھر خدا کی قدرت نائلہ اس عرصہ میں محرومی کا شکار رہی۔ یوں جو باتیں ڈھکے چھپے انداز میں ہو رہی تھیں۔ وہ شور کی شکل اختیار کر گئیں۔ حتیٰ کہ ساس نے ایک بار لڑتے ہوئے اسے۔ ''تھور کا پودا'' سے تشبیہ دے ڈالی کہ ''تم سے ہم کو اولاد نصیب نہ ہوگی۔''

نائلہ کو ان لمحات میں ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ دن بدن اپنا اعتماد کھو رہی ہے۔ پھر تو ایسے ہونے لگا کہ آئے دن کسی نہ کسی بات کو issue بنا لیا جاتا اور بات وہیں پر آ کر رک جاتی۔

نائلہ کے گھر والے اس ساری صورت حال سے آگاہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے کئی بار تنویر اور اس کی والدہ کو سمجھایا مگر انہیں اب لگ رہا تھا کہ وہ اس بات کو نائلہ کے گھر والوں کی کمزوری سمجھ رہے تھے۔

یوں ایک بار تو یہ لڑائی جھگڑا اتنا بڑھا کہ تنویر نائلہ کو اس کے گھر چھوڑ آیا۔ گھر والے صورت حال کی نزاکت کو سمجھ رہے تھے کہ یہ بیل اب منڈھے نہیں چڑھے گی، ادھر احمد کا غصے سے برا حال تھا۔ جب ماں نے رات کو احمد سے بات کی تو احمد بولتے بولتے

رو ہانسا ہو رہا تھا۔
''امی جان! آخر ان لوگوں نے ہمیں کیا سمجھ رکھا ہے۔ ہم نے بہن کی شادی کی ہے کوئی اپنی عزت گروی نہیں رکھ دی۔ اس ذلیل انسان سے اگر دو وقت کی روٹی دینا مشکل ہو رہا ہے تو ہمیں صاف صاف کیوں نہیں بتا دیتا۔''
''بیٹا! بس چھوٹے ذہن کے لوگ ہیں، ہم ان کے کیا منہ لگیں۔''
وہ ابھی بھی صبر کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دے رہی تھیں۔
''امی جان! اس بار ان کے فیملی کے بزرگ لینے آئیں گے تو ہم نائلہ کو بھجیں گے نہیں۔''
احمد اس روز روز کی چخ چخ کو کسی منطقی انجام تک پہنچانا چاہ رہا تھا۔
''احمد! مسائل کا یہ حل نہیں ہے۔ ہم نے نائلہ کی شادی اس کا گھر بسانے کے لیے کی تھی اور پھر لڑکی کا گھر وہی ہوتا ہے جہاں وہ شادی ہو کر جائے۔''
ماں نہیں چاہ رہی تھی کہ بیٹی کا بنا بنایا گھر خراب ہو اور بات بھی ابھی تک گھر تک محدود تھی۔ ورنہ رشتہ دار سن گن لینے والے بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔
''میرا خیال ہے ہمیں نائلہ سے بھی پوچھ لینا چاہیے، آخر وہ کب سے یہ نائک برداشت کر رہی ہے۔''
احمد نے نائلہ کی طرف دیکھا جو ابھی ابھی کچن سے باہر آ کر بیڈ پر بیٹھی تھی۔ پاس ہی فرزانہ ننھے احسن کو لے کر چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ جانے کیوں وہ اس معاملے میں بولنا نہ چاہ رہی تھی کہ ان کا آپس کا مسئلہ تھا اور پھر ویسے بھی امی جان جس طرح بات کو سنبھالا دے رہی تھیں وہاں پھر اب بولنے کی گنجائش نہ تھی۔ یوں جب نائلہ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو کیسے ٹپ ٹپ آنسو اس کی آنکھوں سے گر کر دامن میں جذب ہونے لگے تھے۔
''امی جان! وہ بدنصیب لڑکی ہی ہوگی کہ جس کا شوہر بھی سلامت ہو، سسرال بھی موجود ہے جو اپنا گھر خود برباد کرنا چاہے گی۔ باقی رہی اولاد کی بات تو اس دنیا میں کتنے لوگ موجود ہیں کہ جن کی شادی کے بعد اولاد نہ ہوئی مگر وہ صابر و شاکر ہے کہ خدا کی اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔''
جانے کیوں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے یہاں رہ کر وہ ان پر کوئی بوجھ بن گئی ہو۔ کتنا اچھا ہوتا ہے جب ماں باپ کی چھتری تلے سب بہن بھائی ازدواجی رشتوں میں بندھے ہوئے نہیں ہوتے ہیں تو ایسے لگتا ہے کہ ان بہن بھائیوں سے پیارا رشتہ کوئی نہیں ہے مگر یہی رشتے شادیوں کے بعد کیسے اپنے اپنے مفادات کو مدنظر رکھنے لگ جاتے ہیں۔
''نائلہ بہن! خدا کی قسم تمہارا بھائی اتنا گیا گزرا نہیں ہے۔ وہ تمہیں سنبھال سکتا ہے۔ خوانخواستہ تم یہاں اپنے آپ کو بھی بوجھ نہ سمجھنا۔ خدا ان کو بھی ہدایت دے جو پاگل پن کو چھو رہے ہیں۔''
احمد کو لگ رہا تھا کہ ماں اور بہن کسی بھی طور پر بات کو بگڑنے نہ دینا چاہ رہی تھیں، یوں تھوڑی بہت مزید بحث کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ نائلہ کو واپس سسرال چھوڑا جائے۔ نائلہ کی والدہ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو کوئی بھی تلخ بات کو پینے کا ہنر جانتے ہوں۔
یوں سسرال کی کڑوی کسیلی باتیں، شکوے شکایتیں سننے کے باوجود وہ نائلہ کو واپس چھوڑ آئے۔ نائلہ کی والدہ اگرچہ نائلہ کو سسرال میں چھوڑ تو آئیں۔ مگر داماد کے گھر سے نکلتے سے جانے کیوں دماغ میں وسوسوں کے ناگ نکل پڑے، کیسے بے اختیار ان کے دل سے نائلہ کی سلامتی کی بے شمار دعائیں نکل پڑیں۔
''خدایا! میری بچی کا تو ہی نگہبان ہے، اگر اولاد اس کے نصیب میں ہے تو اس کی جھولی بھر دے۔ اتنا سوچ کر نمکین آنسوؤں کا گولہ حلق میں اتر آیا۔
لیکن وہ جو کہتے ہیں نا انسان کیا کیا سوچتا ہے، کیا کیا منصوبے بناتا ہے اور دوسری طرف تقدیر انسان کی بے بسی پر ہنس رہی ہوتی ہے۔ نائلہ کو سسرال میں رہتے ہوئے ابھی بمشکل پندرہ دن بھی نہ گزرے

تھے کہ پھر اسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ تنویر کی ماں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس کا حلیہ بگاڑ دیں۔

''میرے تو بچے کے نصیب ہی اس کے ساتھ سو گئے، نجانے یہ منحوس کون سے وقت ہمارے پلے لکھ دی گئی تھی۔''

تنویر کی ماں پھاپھا کٹنیوں کی طرح ہاتھ ہلا رہی تھی نائلہ روتی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کی جیسے یہ آنکھ اس گھر کو آخری بار دیکھ رہی ہو، لڑائی ابھی شاید مزید شدت اختیار کر جاتی۔ تنویر جانے کیسے سڑک سے ٹیکسی لے آیا اسے بٹھایا اور گھر کی نکڑ پر چھوڑ کر چلا گیا۔ نائلہ تین کپڑوں میں ملبوس منتشر سوچوں کے ساتھ حواس باختہ کھڑی تھی، اس کا دماغ ماؤف تھا، سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ایسے لگ رہا تھا کہ بالکل ختم ہو گئی ہوں۔

اتفاق سے نائلہ کی ماں کسی کام کی غرض سے باہر نکلیں تو انہیں ایسا لگا کی جیسے دل اچھل کر حلق میں آ گیا ہو۔ ایسے لگ رہا تھا کہ کچھ دیر اور کھڑی رہیں تو گر جائیں گی۔

نائلہ ہاں...... وہ نائلہ تھی، ان کی بیٹی...... لٹے پٹے انداز میں کھڑی تھی۔ جلدی سے آگے بڑھیں اسے کندھے سے ہلایا اور اس کا بازو پکڑے پکڑے گھر لے آئیں۔ نائلہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا ہو، ماں نے اس کو آرام سے بستر پر بٹھایا اور روتے روتے اس کے لبوں سے پانی کا گلاس لگایا۔ تھوڑا سا پانی پی کر وہ تکیے پر ڈھے سی گئی، فرزانہ بھابی بھی بچوں کے ہمراہ نیچے آ گئیں نائلہ کو اس حالت میں دیکھ کر اس کا صبر کا بندھ ٹوٹ گیا اور وہ بلک بلک کر نائلہ سے لپٹ کر رونے لگ گئی۔ تھوڑی دیر میں یوں لگا کہ جیسے اس گھر میں کوئی ماتم ہو گیا ہو۔ جی ہاں ماتم ہی تو ہو گیا تھا ایک بیٹی معاشرے کے ٹھیکیداروں کے ہاتھوں غم کے اندھیروں میں ڈوب گئی تھی۔ شام کو احمد کو بھی ساری صورت حال کا علم ہو گیا وہ کہہ رہا تھا۔

''امی جان! تنویر اب ساری Limits کراس کرتا جا رہا ہے، اس سے پہلے کہ ہم اپنی پیاری بہن سے ہاتھ دھو بیٹھیں، ہم کو اس منحوس انسان سے پیچھا چھڑا لینا چاہیے، وہ خود اور اس کے گھر والے انسانوں کی کیٹیگری میں نہیں آتے، اب ان کے ساتھ کسی بھی قسم کی بات کرنا ہماری سخت توہین ہو گی۔''

احمد نے کچھ دن کے بعد گھر والوں اور بہنوئی وغیرہ سے مشورہ کیا اور طے پایا کہ خلع کی درخواست عدالت میں دائر کر دی جائے۔ ادھر انہوں نے وکیل کے توسط سے خلع کی درخواست عدالت میں دائر کر دی اور دوسری طرف انہیں اس جھگڑے کے فوراً بعد تنویر نے نائلہ کو طلاق ثلاثہ بھجوا دی۔ نائلہ کو یہ سب کچھ پتا چل گیا تھا... گویا اس شخص نے ہر رشتہ ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ کیسے روتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

''امی جان! کم ظرف لوگوں سے کسی بھی بات کی توقع رکھ لینا چاہیے، باقی امی مجھ میں حوصلہ ہے، میں

کینو

سنگترہ، مالٹا، موسمی، گریپ فروٹ، لیمن، میٹھے فروٹ، چکوترا وغیرہ کینو کے ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں یعنی یہ سب کینو کے بزرگ، بہن بھائی، کزن اور قریبی رشتے دار ہیں۔ یہ تمام ایسے پھل ہیں جن میں وٹامن سی بہت زیادہ مقدار میں پائی جاتی ہے۔ اسے اسکاربک ایسڈ بھی کہتے ہیں۔ یہ وٹامن سی یا اسکاربک ایسڈ انسانی جسم میں پیدا نہیں ہوتا اس لیے اسے ان ترش پھلوں یا سٹرس فروٹ سے حاصل کرنا بے حد ضروری ہے۔ کینو کا ذائقہ ترش، میٹھا اور کھٹا میٹھا ہوتا ہے۔ یہ انسانی جسم کے لیے وٹامن سی کے حصول کا سب سے اہم اور آسان ذریعہ ہے۔ اس پھل کا مزاج سرد ہے۔ کینو کے اندر قدرت نے کئی قیمتی خزانے پوشیدہ کر رکھے ہیں۔ اس میں پانی کی مقدار 80%، گلوکوز 12 فیصد ہے جبکہ اس کے علاوہ باقی مقدار میں کیلشیم، پوٹاشیم، فاسفورس، آیوڈین اور آئرن کے ملے جلے نمکیات موجود ہوتے ہیں۔

حسنِ انتخاب: زاہد گوراچی، گھوگی

برداشت کرلوں گی کہ زندگی نے مجھے بہت کچھ سمجھا دیا ہے۔'' اتنا کہتے ہوئے وہ ماں سے لپٹ کر رونے لگ گئی۔

پھر یوں محسوس ہوا کہ جیسے زندگی ایک ڈھب پر آ کر رک گئی ہو۔ ہنسی مذاق، قہقہے تو جیسے اس گھر سے روٹھ گئے تھے۔ نائلہ نے چپ کی چادر اوڑھ لی تھی ایسے لگتا تھا کہ غم کی شدت نے اسے گم سم کر دیا ہو۔ ماں سے اس کی کیفیت دیکھی نہ جاتی تھی۔ وہ اس کو کئی دفعہ کہہ چکی تھیں کہ بیٹا! ہم تمہارے ساتھ ہیں، کیوں چپ ہو، جو ہونا تھا وہ ہو گیا ہے۔'' نائلہ کیسے ٹوٹے لہجے میں شکوہ کناں تھی۔

''امی جان! قصور نہ ہوتے ہوئے بھی اتنی بڑی سزا... اور اب میں آپ پر بوجھ بن گئی ہوں۔''

جانے کیوں نائلہ سے یہ صدمہ جھیلنا مشکل ہو رہا تھا۔ حالانکہ دیکھا جائے تو اس غیر... اِن دور میں جب برداشت کم سے کم ہوتی جارہی ہے ایسے لمحات میں لوگ غموں کی پوٹلی سے سمجھوتہ کرنا سیکھ لیتے ہیں، مگر نائلہ کے ساتھ معاملہ کچھ اور تھا وہ اس صدمے کو بھول نہ پا رہی تھی۔

''نائلہ میری جان ایسا کبھی بھی نہ سوچنا یہ گھر بھی تمہارا ہے۔ کیا یہ بات تمہارے لیے اطمینان بخش نہیں کہ ماں بیٹی کا رشتہ اس گئے گزرے دور میں زندہ ہے، تمہاری ماں تمہارے لیے زندہ ہے۔ تمہارا ہر غم سمیٹنے کے لیے۔''

ماں کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ خوشیاں اگر درختوں پر لگ رہی ہوتیں تو وہ توڑ کر اس کے قدموں میں ڈال دیتیں۔

''امی جان عورت کا گھر کون سا ہوتا ہے۔ وہ تو بچاری ماں باپ کے گھر سے، شوہر کے گھر سے ہوتے ہوئے نجانے کون سے گھر میں پہنچ جاتی ہے۔''

ماں نے جب اس کی یہ دل دوز باتیں سنیں تو کلیجہ تھام کے رہ گئیں۔ گزرتے وقت کے ساتھ نائلہ عجب و غریب کیفیت میں مبتلا ہوتی جارہی تھی۔ ماں نائلہ کو آواز دیتی تھیں اور نائلہ گم سم سی کھنچی رہتی۔

کھانے پینے سے بھی وہ دور ہوتی جارہی تھی ایک جیتی جاگتی لڑکی کیسے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ اس کا واسطہ تعلق اب سب سے کم سے کم ہوتا جارہا تھا، ماں کو سمجھ نہ آرہی تھی کہ وہ اس کیفیت سے اُسے کیسے نجات دلائیں۔ بعض اوقات وہ سوچتیں۔ نائلہ بیٹی! اگر تم نے اس بات کا اتنا ہی اثر لینا تھا تو وہ ان سے منت سماجت ہی کرلیتیں مگر شاید وقت تیزی سے آگے بڑھ گیا تھا۔

☆......☆

اس دن تو بہت ہی برا ہوا۔ جب نائلہ رات کے نجانے کس پہر گھر سے نکل گئی۔ یوں پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی مگر نائلہ کا کچھ پتا نہ چل سکا۔ عزت دار لوگ تھے ابھی تک آپس میں باتیں کررہے تھے کسی کو کچھ بتایا نہ تھا، صبح کے گیارہ بجے نائلہ کی اطلاع آ گئی۔ نائلہ، تنویر کی خالہ زاد طاہرہ کے گھر نجانے کس کیفیت میں پہنچ گئی تھی، گھر والے بھاگم بھاگ وہاں پہنچے، بے پناہ ضبط کے ساتھ نائلہ کو گھر لایا گیا، بہن کو اس حالت میں دیکھا تو وہ اپنے آنسو ضبط نہ کرسکا۔ احمد بے اختیار رونے لگا۔ بہن کیسے اپنے آپ سے بیگانہ ہوتی جارہی تھی اور نائلہ کی یہ کیفیت دن بہ دن بہتری کے بجائے خرابی کی طرف جارہی تھی۔

نائلہ کو اس دوران مختلف ڈاکٹروں کو دکھانا شروع کردیا گیا۔ زیادہ تر نے یہی تشخیص کیا کہ کسی ذہنی صدمے کی وجہ سے ڈپریشن کی حالت میں چلی گئی ہے۔

اس حالت سے نکالنے کے لیے زیادہ تر ڈاکٹرز نے سکون آور ادویات تجویز کیں۔ ان ادویات نے جہاں رگ و پے میں سکون اتارا وہاں سائیڈ ایفیکٹ بھی چھوڑے۔ نائلہ عجیب سوتی جاگتی کیفیت میں سارا دن رہتی۔ یوں اس کی ذہنی حالت مزید بگڑتی چلی گئی۔ کھانے پینے کا تو اسے ہوش ہی نہ رہا تھا، حتیٰ کہ کئی دن گزر جاتے وہ یونہی نہائے اور منہ دھوئے بغیر پھرتی رہتی۔ پہنے ہوئے کپڑوں سے سرانڈ آتی رہتی گھر والے زبردستی اس کے کپڑے بدل دیتے

اور وہ اس سارے عمل میں چیختی چلاتی رہتی۔
اس کی اس ذہنی کیفیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ نے مشورہ بھی دے ڈالا کہ اسے دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل کروا دیا جائے۔ نائلہ کی والدہ بوڑھی تھیں اور ان کا برا حال تھا، بڑی مشکل سے بیٹی کو سنبھال رہی تھیں۔ دونوں بڑی بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کی تھیں داماد بیٹیوں کے ہمراہ آتے اور ساس کو نائلہ کے کاموں میں مگن پاتے۔ ایسے لگتا تھا کہ نائلہ نے اپنے آپ کو بالکل فراموش کر دیا تھا۔ بہنوں کا رو رو کر برا حال تھا۔ کیسے ایک جیتی جاگتی لڑکی موت کی دہلیز پر پہنچ گئی تھی۔ یوں داماد، بیٹیوں اور احمد کے مشورے سے طے پایا کہ نائلہ کو کسی ویلفیئر ٹرسٹ میں داخل کروا دیا جائے۔ نائلہ کی والدہ جوڑوں کے درد میں مبتلا تھیں اور اب ان سے اس کی دیکھ بھال مشکل ہوتی جا رہی تھی۔
نائلہ کو ویلفیئر ٹرسٹ میں اس لیے داخل کروایا جا رہا تھا کہ بہرحال وہ ابھی پاگل پن کی اسٹیج پر نہیں تھی۔ دوسرا وہ جس طرح بغیر بتائے گھر سے چلی جاتی تھی وہ بھی کچھ کم تکلیف دہ نہ تھا۔ گھر کے افراد لاک، کنڈیاں لگا لگا کر بے حال ہو گئے تھے۔ احمد اس سلسلے میں معلومات کے حصول کے لیے مختلف اداروں کے چکر کاٹتا رہا، اسے اس عرصے میں اندازہ ہوا کے معاشرے میں اس سے ملتے جلتے کتنے ادارے انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں جو انسانوں کے جی ہاں اپنے ہی جیسے انسانوں کے ظلم وستم کا شکار تھے۔
جب وہ ایک ادارے میں نائلہ کو داخلے کی غرض سے گیا تو کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے باریش شخص نے جب ادارے کے متعلق تعارف کروایا تو اسے اندازہ ہوا کہ لوگوں کے انہی رویوں اور بے حسی کی وجہ سے ان اداروں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ کیسے کیسے ہولناک واقعات وہ بزرگ سنا رہا تھا، معاشرے کے ان بے حس لوگوں کے متعلق اگر کوئی ان واقعات کو سن لے تو شاید وہ ہنسنا بھول جائے۔ نائلہ کو داخل کرواتے وقت اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو اتنی شدت کے ساتھ بہے کہ آنسو صاف کرتے ہوئے اس کی انگلیاں بالکل تر ہو گئیں اس نے پینٹ کی جیب سے ٹشو پیپر نکالا اور بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، باریش بزرگ اس نے لرزتے وجود کو تھامے ہوئے آہستہ آہستہ اس کی پشت سہلا رہا تھا، نائلہ کو اس نے برستی آنکھوں کے ساتھ دیکھا جو بے تاثر چہرے کے ساتھ نگران خاتون کے ساتھ لان سے ملحقہ کمرے کی طرف جا رہی تھی۔

☆......☆

آج جب وہ ویلفیئر ٹرسٹ کے پاس سے گزرا تو کیسے کیسے مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ وہ ان اداروں کے پاس سے یونہی گزر جایا کرتا تھا۔ اس کے ذہن میں کہیں یہ بات موجود تھی کہ یہ ادارے بھی دوسرے اداروں کی طرح زر کے حصول میں الجھ گئے ہوں گے مگر جب اس نے اپنی جان سے عزیز بہن کو یہاں داخل کروایا اور صحیح صورت حال کا اندازہ ہوا تو پتا چلا کہ ایک دنیا یہ بھی بستی ہے، نجانے کس کس حال کو پہنچی ہوئی لڑکیاں، بوڑھی خواتین، بوڑھے مرد اور بے شمار چھوٹے بچے، معاشرے کے نت نئے زخموں کے ساتھ یہاں زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ زندگی کا ایک رخ وہ تھا جو اس ادارے کے احاطے سے باہر تھا۔
جہاں زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موجود تھی، قہقہے تھے، خوشیاں تھیں اور فکروں سے آزاد لوگ اور زندگی کا دوسرا رخ اف خدایا! کتنا بھیانک اور تلخ تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ خوشی کے لمحات سے پہلے غم کہیں آس پاس پھر رہا ہوتا ہے اور بیماری سے پہلے صحت قہقہے لگا رہی ہوتی ہے اور کیسے انسان بے فکری سے زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ یہ رخ انسانوں کی زندگیوں میں نہ آئے تو کیسے پتا چلے کہ غم کیا ہے؟ ناکامی کیا ہے؟ صحت کیا ہے اور....اور دل کا ٹوٹنا کیا ہے، شاید آگہی یونہی نصیب ہوتی ہے!!!!

☆☆☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



باشے شاہ کا جادو



مہر پرویز احمد دولو

اُس بدبخت کا قصہ جو اپنے انجام سے بے خبر کالا علم سیکھ کر زمین کا خدا بن بیٹھا تھا



''نواز کے باپ کی رسم قل خوانی ہے۔ اس لیے بازار بند کر کے ٹینٹ اور قناتیں لگائی جا رہی ہیں۔ ایک سال کی مسلسل کوشش کے باوجود جب سلطان کا سراغ نہ مل سکا تو بیٹوں نے اللہ کی مرضی سمجھ کر اسے مرحوم تصور کیا۔ ختم دلا کر اسے ثواب پہنچانے کی غرض سے صبح مسجد میں اعلان کر کے تمام گاؤں کو مدعو کیا۔ اگرچہ بیٹوں کا غم کے مارے برا حال تھا۔ تلاش کے لیے بے پناہ وقت اور پیسہ برباد کیا۔ مگر مسلسل کوشش کے باوجود ناکام ہوئے سلطان کسی ایسی انہونی کا شکار ہوا کہ لاش بھی نہ مل سکی سو صبر کی سل سینے پر رکھ کر ختم پڑھانے کا فیصلہ کیا۔'' جمشید نے سڑک بند کر کے ٹینٹ لگانے کی وجہ پوچھی تو دلاور نے تفصیل بتائی۔

☆......☆

رمضان کے آباؤ اجداد کا پیشہ چوری چکاری تھا۔ بیٹوں کی پیدائش پر خوشی کے شادیانے بجائے جاتے۔ پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانے کا خواب دیکھنے کے بجائے نامی گرامی چور، ڈاکو اور بدمعاش بنانے کے خواب دیکھے جاتے۔

''ہم میں جو کمیاں رہ گئی ہیں۔ ہمارے بیٹے ظلم و ستم کی آگ سے معزز، پرسکون معاشرے کو جلا کر پوری کریں گے۔'' والدین اظہار خیال کرتے۔ تربیت ایسے کی جاتی کہ بچپن میں ہی دکان سے چیزیں چراتے، گھروں سے چیزیں اٹھا لیتے، مسجد سے جوتے چرا لیتے، چھری لگا کر چیزیں بیچنے والوں سے روز چیزیں چھیننے کا درس دیا جاتا۔ یہ لوگ جب جوانی کی حدود میں قدم رکھتے تو علاقے کے نامی گرامی چور اور بدمعاش بن چکے ہوتے۔

☆......☆

بابا جی کے بیٹے بشیر شاہ عرف باشے شاہ اسکول جانے سے گھبراتے تھے۔ بچپن سے ہی اس میں کبوتر بازی اور کتوں کی لڑائی کا شوق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ بوبلی کتوں کی لڑائی پر تو جان چھڑکتے تھے۔ بابا جی باشے شاہ کی غیر سنجیدہ حرکات اور فضول شوق سے سخت پریشان تھے۔ جب کہ باشے شاہ کبوتروں کی پرواز پر جوا لگاتے، کتوں کی لڑائی پر سٹہ ہوتا۔ ایک غیر مسلم کبوتر باز دوست کی محبت میں رہتے ہوئے شراب نوشی بھی کرنے لگے۔ باشے شاہ کی آوارہ سرگرمیوں پر بند باندھنے کے لیے بابا جی نے آستانے میں اپنے ساتھ بٹھانا شروع کر دیا۔ مریدوں کو دم درود کرنے کے لیے

آداب والقاب سکھاتے۔ بدھ، جمعرات اور اتوار کو مریدوں کا میلہ لگا ہوتا۔ دم درود، تعویذ گنڈے کے بدلے پچاس روپے سے لے کر ہزار روپے تک نظر و نیاز کی صورت میں ملتے۔

پیسوں کی بارش ہوتے دیکھ کر باشے شاہ کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ کہاں سارا دن کبوتر بازی کے لیے دھوپ میں جلنا اور کہاں بیٹھے بٹھائے صرف روپے اکٹھے کرنا۔ یہ کام بہت سہل اور منافع بخش تھا۔ تو باشے شاہ اپنی تمام خوبیاں، کمالات اور صفات مریدوں کی تکالیف دور کرنے پر صرف کرنے لگے۔ تو بابا جی کی غیر موجودگی میں بھی باشے شاہ سے تعویذ لینا باعث فخر اور زیادہ شفایافتہ خیال کرتے تھے۔ مرد و زن کا تانتا بندھا ہوتا۔ بانجھی ناریوں کو کچھ زیادہ ہی مسائل ہوتے۔ باشے شاہ تنہائی میں کنواری لڑکیوں کو دم درود کرنے کے بہانے دل پشوری بھی کرنے لگے۔

نوجوان طبقہ زیادہ ایک دوسرے سے دوستی کرنے اور مخالفوں کی دوستی ختم کروانے کے تعویذ لیتے، خواتین مخالفت میں حدود کو بھی پار کر جاتیں، مخالف کو نیچا دکھانے کے لیے تعویذ کے بدلے پیسے کے علاوہ عزت تک داؤ پر لگا دیتیں۔ اس میدان میں باشے شاہ ابھی اناڑی تھا۔ اس کو خاطر خواہ کامیابی نہ ملی۔ ایک دفعہ تعویذ لینے والا ناکام ہونے کی صورت میں دوبارہ ادھر منہ نہ کرتا اور اکثر لوگ ناکام ہوتے کیونکہ باشے شاہ کے پاس اس بارے میں کوئی خاص تعویذ یا علم نہ تھا جس کے بل بوتے پر نوجوان طبقے کی خواہشات پوری ہوتیں۔ اس پریشانی سے باشے شاہ نے اپنے غیر مسلم دوست کو آگاہ کیا اور مسئلے کے حل کے بارے میں مشورہ طلب کیا۔ کافی سوچ بچار کے بعد دوست نے اپنے دادا سے کالا جادو سیکھنے کے لیے باشے شاہ کو تیار کیا۔

"کالا جادو تمام مسائل کا حل ہے۔ صرف چھوٹی سی شرط ہے تم کو ہر وقت پلید رہنا پڑے گا۔ پلیدی کی حالت میں جو بھی تعویذ لکھو گے وہ



پتھر پر لکیر ثابت ہوگا۔''

''میرے دادا کے پاس ہر وقت تعویذ لینے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے روپے اکٹھے کر رہا ہے۔ آج تک کسی شخص نے تعویذ کی شکایت نہیں کی۔'' یہ سنتے ہی باشے شاہ شاگرد بننے کے لیے تیار ہوگیا۔

شاگرد بنتے ہی محنت سے علم سیکھا اور جلد ہی متعلقہ علوم پر عبور حاصل کرلیا۔ غیر [illegible] سے تعویذ لینے والوں سے واقفیت بنائی۔ استاد سے فراغت پاتے ہی باشے شاہ کا آستانہ جائز ناجائز کام کروانے والوں کا مرکز بن گیا۔

نوجوان لڑکے، لڑکیوں کے من کی مرادیں پوری ہونے لگیں۔ باشے شاہ کے تعویذوں کی گونج دور دور تک سنائی دینے لگی۔

☆......☆

رمضان اور اس کے گروکی وارداتوں میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ بھیڑ، بکری سے لے کر گائے، بھینس، اونٹ تک غائب ہونے لگے۔ نقب زنی کی وارداتوں میں گھر لوٹے جانے لگے۔ لوگوں کا جینا حرام ہوگیا۔ تنگ آکر لوگوں نے ٹھیکری پہرا دینا شروع کردیا۔ گاؤں کے ہر گھر میں لوگ باری باری جاگ کر رکھوالی کرتے۔ چوروں کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھی جانے لگی۔

ایک رات رمضان ساتھیوں کے ہمراہ آدھی رات کے وقت گاؤں کے چوک سے بکریاں گاڑی میں ڈال رہا تھا کہ پہرے دار وہاں آنکلے۔ چوروں کو للکارا بندوق کا فائر کرکے ہاتھ اوپر اٹھانے کا حکم دیا۔ قریب آتے ہی چوروں پر لاتوں، مکوں اور جوتوں کی بارش کردی۔ مار مار کر بھرکس نکال دیا۔ نمبردار کو اٹھا کر تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ تھانے فون کرکے پولیس بلوائی گئی اور چور ان کے حوالے کیے۔ وہاں خوب چھترول ہوئی۔ بڑی مشکل سے مک مکا کرکے واپس آئے۔

وارداتیں تو وہ کررہے تھے مگر اکثر پکڑے جاتے۔ مار کھاتے، لوگوں کے سامنے بے عزت ہوتے، تھانے جاکر الگ خوار ہوتے۔ رشوت کی مد میں بہت کچھ دے کر جان چھڑاتے اب تو چوری کرنا ان کے لیے ناممکن ہوتا جارہا تھا۔ لہٰذا صورت حال کو دیکھتے ہوئے ان لوگوں نے کئی بار برے کاموں اور چوری ڈکیتی کرنے سے توبہ کا ارادہ کیا۔ لیکن یہ سوچ کر رہ جاتے کہ اگر سیدھے راستے پر آگئے تو کھائیں گے کہاں سے؟ عیاشیوں کے لیے وافر مقدار میں پیسہ کہاں سے آئے گا۔ دوست احباب سے مشورہ کیا اور آخر کار مسیحا تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

''باشے شاہ کے کالے جادو والے تعویذوں کا مشورہ رمضان کے کانوں میں گونجا تو ایک مرید خاص کو ساتھ لے کر آستانہ پر پہنچ گیا۔ لوٹ مار کر کے آدھے مال کا حصہ لے کر باشے شاہ نے رمضان کے ساتھ معاہدہ کیا۔ تعویذ کیا تھے گویا ہتھیلی پر سرسوں آگئی تھی۔ گلے میں لٹکاتے ہی وہ نگاہوں سے اوجھل ہوجاتے جس چیز کے اوپر تعویذ رکھ دیتے نگاہوں سے غائب ہوجاتی۔ بھری محفل میں گلی بازار میں، گھر میں تعویذ ڈالے داخل ہوتے۔ کسی کو کچھ دکھائی نہ دیتا۔ جو چیز چرانا مقصود ہوتی اس کے اوپر تعویذ رکھ دیتے۔ سوائے ان کے وہ چیز کسی کو دکھائی نہ دیتی۔ اب تو چوری یوں کرتے جیسے کہیں پر اپنی رکھی ہوئی چیز جاکر اٹھائی ہے۔ کمروں کے اندر اٹیچی کیس اور سوٹ کیس، لاکرز میں رکھے زیورات، روپے پیسے خود بخود سامنے آجاتے۔ موٹر سائیکل پر تعویذ رکھتے ہی نگاہوں سے غائب ہوجاتی۔ جس جانور کے اوپر رکھتے۔ مرغی اور کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرکے آگے چل پڑتا۔ زمین کی تہہ اور لاکروں میں رکھے قیمتی زیورات اور روپے خود بخود بیگوں میں بند ہوکر کندھوں پر لٹک جاتے۔ غرض جس چیز کی خواہش کرتے لمحوں میں ان کے سامنے ہوتی۔

رمضان کے گروہ کے ساتھ ساتھ باشے شاہ کی بھی پانچوں کی بجائے ساری کی ساری انگلیاں گھی سے تر تھیں۔ آستانے میں رمضان اور دیگر خاص

مہمانوں کو سونے کے برتنوں میں مشروب اور کھانا وغیرہ پیش کیا جاتا۔ باشے شاہ کے تعویذوں اور دولت کے چرچے دور دور تک ہو رہے تھے۔ جو بھی سنتا بلا سوچے سمجھے آستانے کی طرف دوڑا چلا آتا۔

☆......☆

"سلطان باشے شاہ کے خاص مریدین میں سے تھا۔ اس کی زبانی جھوٹے سچے واقعات سن کر بہت سے لوگوں نے آستانے کا رخ کر لیا تھا۔ سلطان کے تین بیٹے تھے۔ جوان ہوتے ہی شادی کی جیل میں نظر بند کر دیا۔ بیوی کچھ عرصہ قبل اللہ کو پیاری ہو گئی تھی بیٹے شادی کے بندھن میں بندھتے ہی بیویوں کو لے کر محنت مزدوری کے لیے لاہور روانہ ہو گئے۔ سب سے چھوٹے بیٹے نے فرماں برداری کا حق ادا کیا۔ باپ کے کھانے اور کپڑے وغیرہ دھونے کے لیے بیوی کو گھر میں باپ سلطان کے پاس چھوڑا اور خود بھائیوں کے ساتھ لاہور مزدوری کرنے لگا۔ اب جب سلطان باشے شاہ کے آستانے پر جاتا تو بہو شمیم کو بھی ساتھ لے جاتا۔

شمیم ہزاروں میں نہیں سیکڑوں میں ایک تھی۔ باشے شاہ نے جونہی اسے دیکھا خوشی سے نہال ہو گیا۔ سلطان کے ساتھ وہ بھی مریدنی خاص کے فرائض سرانجام دینے لگی۔ باشے شاہ کی تنہائی کی ساتھی بن گئی۔ اب تو باشے شاہ کی سیج کی زینت بننے لگی۔ بدلے میں شاہ جی نے اس پر دل کھول کر نذرانوں کی بارش کر دی۔ غریب مزدور کی بیوی گلے میں سونے کی چین، سونے کی بالیاں، خوب صورت نتھ، بہترین کپڑے اور ولایتی پرفیوم استعمال کرنے سے آسمان سے اتری حور لگتی تھی۔ بے پناہ نوازشات کے بدلے سسر نے بھی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ لوگوں کی بہو، بیٹیوں کی طرح اپنی بہو بھی، مال مفت سمجھ کر باشے شاہ کے حوالے کرنے لگا۔

پھر وہ وقت آ گیا کہ شمیم دن کو باشے شاہ کی سیج کی زینت بنتی اور رات اپنے سسر سلطان کے جذبات کی تسکین کرتی۔

☆......☆

دو ماہ کی تنخواہ ہاتھ آتے ہی حنیف نے شام ہی لاہور سے گھر روانگی کا قصد کیا۔ شمیم اور باپ سے جدا ہوئے دو ماہ ہو چکے تھے۔ وہ راتوں رات گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

آدھی رات کے وقت جب گاؤں پہنچا تو ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ دروازے پر بار بار دستک دینے سے جب کوئی باہر نہ نکلا تو دیوار پر چڑھ کر اندر کود گیا۔ صحن سے گزر کر کمرے کے دروازے کو دھکا دیا تو وہ کھلتا چلا گیا۔

جونہی اندر داخل ہوا چارپائی کا منظر دیکھتے ہی اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ دروازے کے پاس لکڑی کاٹنے والا کلہاڑا پڑا تھا۔ اسے اٹھایا اور پے در پے چارپائی پر وار کرنے لگا۔ پہلے وار سے ہی سلطان کا سر کٹ گیا۔ جب کہ شمیم بھاگ کر قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگی اور زیادتی کا سارا ملبہ سلطان پر ڈال دیا۔ فوراً کدال اور کسی کا اہتمام کر کے دونوں میاں بیوی نے گڑھا کھودا اور لاش اس میں دبا دی۔ صبح یہ مشہوری کر دی گئی کہ سلطان بیٹوں کے پاس لاہور چلا گیا ہے۔ جب کہ بھائیوں کو رات والے معاملے سے آگاہ کیا اور واقعہ ٹھپ کرنے کا کہا۔ بات آئی گئی ہو گئی اور ایک لمبا عرصہ گزر جانے کے بعد اچانک بھائیوں نے اس کی رسم قل خوانی کا اہتمام کیا۔ ختم وغیرہ پڑھا کر حق فرزندی ادا کیا اور شام تک دعا کروا کر اس کار خیر سے فارغ ہو گئے۔

☆......☆

رمضان کا چھوٹا بھائی اختر کنوارا پھر رہا تھا۔ معاشرے کے راندے ہوئے لوگ تھے، کون ان سے رشتے داری کرتا۔ ہر شخص ان کے شر سے خوفزدہ تھا۔ سلام دعا بھی ڈر کر کر لیتے تھے۔ رشتے داری جیسا بندھن باندھنے کی جرأت کون کرتا۔ شادی کے بارے میں اختر نے والدین سے بات کی اور برادری سے ہی ایک لڑکی پسند کر لی۔ جب کہ دوسری طرف رمضان کا دماغ بے شمار پیسے آنے کی وجہ سے آسمانوں پر پرواز کر رہا تھا۔ کتنی ہی لڑکیوں سے دوستی کر رکھی تھی۔ کچھ سے شادی کا وعدہ بھی کر رکھا تھا۔

جس لڑکی کو اختر نے پسند کیا وہی رمضان کی محبوبہ تھی۔ جب اس کے بڑوں کے پاس رشتے کی بات چلی تو اس نے اختر کی بجائے رمضان کی حامی بھری۔ بھائی کی پسند اور مخالفت کے باوجود رمضان کی بات فائنل ہوگئی۔ عین شادی والے دن جب بارات دلہن کے گاؤں روانہ ہوئی۔ اختر نے دریا میں کود کر خودکشی کرلی۔ کچھ عرصہ گزرا تھا۔ اس سے چھوٹے بھائی نے پسند کی شادی نہ ہونے پر زہریلی دوا پی لی۔ بڑے بھائی کو کینسر ہوگیا جو جان لیوا ثابت ہوا۔

مسلسل اموات نے رمضان کے خاندان کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کردیا۔ اب تو رمضان کو ایک ایک کرکے اپنے جرم یاد آنے لگے۔ چوری، ڈکیتی، اغواء، زنا، شراب، لوگوں کو مارنا، بہو بیٹیوں کی عزتوں سے کھیلنا، کون سا جرم تھا جو اس نے نہیں کیا تھا اور اس نہج پر پہنچانے والا صرف باشے شاہ تھا۔ جس کے تعویذوں سے وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوکر ظلم و ستم کی طغیانی کا رخ ہنستی بستی آبادی کی طرف موڑ دیتا تھا۔

جب اللہ تعالیٰ کی پکڑ کا وقت آیا اس نے انصاف کی ڈوری کو حرکت دی تو باشے شاہ کے تعویذ بھی رب تعالیٰ کے قہر کو نہ روک سکے۔

☆......☆

بابا فدا حسین شیرازی ولی کامل انسان تھے۔ خدمت خلق کا بجتا نقارہ، دکھی دلوں کا سہارا، مجبور و مایوس لوگوں کی آس امید کا محور، ناکام حسرتوں کے ترجمان، ہر آنے والے کی امیدوں کا مرکز روتے چہروں کو ہنسانے والے، مشکل میں ہر خاص و عام کے کام آنے والے تعویذ اور دم کا فریضہ درود تبلیغ سمجھ کر سرانجام دے رہے تھے۔ ان کی ایک خواہش ہوتی تھی کہ کوئی بھی آنے والا ان کے در سے خالی نہ لوٹے۔ اپنی جان اور اولاد کو قربان کی بھینٹ چڑھا کر لوگوں کے مایوس چہروں کو خوشیوں سے گلزار کرتے تھے۔ فی سبیل اللہ خدمت خلق کر رہے تھے۔ لنگر و کھانا ہر وقت آستانے پر موجود ہوتا۔ ہر آنے والے کا مسئلہ پوچھنے اور حل کرنے سے قبل لنگر سے تواضع کرتے۔ پھر اس کی داد رسی کرتے۔ ایسے فقیر منش لوگوں کے آستانوں اور درباروں پر ہر وقت رب کی رحمت کا نزول ہوتا رہتا ہے۔ ان کی زبان سے نکلنے والا ہر حرف تاثیر رکھتا ہے۔ دلوں کے اندر اتھل پتھل برپا کردیتا ہے۔

باشے شاہ کی لالچ اور جھوٹ پر مبنی کرامات سے متنفر ہوکر ایک دن رمضان خاندان کے ہمراہ بابا فدا حسین شیرازی کے آستانے پر آیا۔ بابا جی کے قدموں میں گر کر تمام سابقہ گناہوں کی معافی مانگی۔ توبہ کی اور آئندہ بابا جی کے فرمان کے مطابق عین اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کا وعدہ کیا۔ رمضان کا باشے شاہ کا ساتھ چھوڑنا تھا کہ اس کی آمدنی کے سیلاب کے آگے بند باندھ دیا گیا۔ اس بات کا باشے شاہ کو سخت شاک لگا۔ کئی دوست احباب مرید خاص بھیج کر اسے گھناؤنی سرگرمیاں جاری رکھنے کو کہا مگر رمضان رب کے قہر سے نبرد آزما ہوچکا تھا۔ اس کی ناراضگی سے اپنا گھر برباد کرچکا تھا۔ مزید کسی بھی انتقام کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ سو تمام آنے والے احباب کو صاف جواب دے دیا۔

''میں تمام گناہوں سے توبہ کرچکا ہوں۔ برائی کے راستے کو ہمیشہ کے لیے ترک کرکے پکا اور سچا مسلمان بن چکا ہوں۔ اب مجھ میں مزید گناہ کرنے کی سکت نہیں۔ باشے شاہ سے کہو مجھے معاف کرکے کوئی اور عقیدت مند تلاش کرے اور اس کی زندگی گناہوں کی گدڑی میں لپیٹے۔ میں اب اس کے جھانسے میں نہیں آنے والا۔'' رمضان نے آنے والوں کو جواب دیا۔ اتنا سخت جواب سن کر باشے شاہ کا طیش آسمان کو چھونے لگا اور پھر رمضان سے انتہائی بھیانک انتقام لینے کا منصوبہ بنایا۔

☆......☆

شمیم باشے شاہ کی مریدنی خاص تھی۔ آج بھی حسن کا منہ بولتا ثبوت، دونوں ایک دوسرے کی اداؤں پر جان چھڑکتے تھے۔ دن رات کی تنہائی کے ساتھی۔

''شمیم اگر تم طلاق لے لو تو میں تم سے شادی کرلوں گا۔ اب تیرے بن رہنا محال لگتا ہے۔'' حال

دل باشے شاہ نے شمیم کو سنایا۔

''شاہ جی! خاوند مجھے طلاق نہیں دے گا۔ ہمارا خاندان دیگر کسی بھی قوم میں رشتہ نہیں کرتا اور ویسے بھی آپ کی مریدنی ہر وقت آپ کے پاس ہوتی ہوں۔ شادی کے بغیر بھی تو ہم آپ کے پاس ہیں۔'' شمیم نے جواب دیا۔

''شمیم اگر ہم تمہارے خاوند کو ٹھکانے لگا کر الزام رمضان پر لگا دیں تو کیسا رہے گا۔ ہم دونوں بھی ایک ہو جائیں گے اور رمضان سے گستاخی کا انتقام بھی لے لوں گا۔'' باشے شاہ نے منصوبہ شمیم کے گوش گزار کیا۔

تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ شمیم کا خاوند قتل ہو گیا۔ منصوبے کے مطابق قتل کے الزام میں رمضان گرفتار ہو گیا۔ کچھ عرصہ کیس چلنے کے بعد باشے شاہ رمضان کو موت کی سزا دلانے میں کامیاب ہو گیا۔ جس دن سزا کا فیصلہ محفوظ کیا گیا وکیل نے گھر والوں کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ تفصیلی فیصلہ دو دن بعد سنایا جانا تھا لیکن وکیل نے تصدیق کر دی کہ رمضان کو موت کی سزا دی گئی ہے۔''

اتنا سننا تھا کہ گھر میں کہرام برپا ہو گیا۔ بیوی بچوں، ماں، بہن، باپ، بھائیوں اور دیگر رشتے داروں کا رو رو کر برا حال تھا۔ کسی نے مشورہ دیا بابا جی فدا حسین سے ملو، ہو سکتا ہے کوئی معافی کی سبیل نکل آئے۔

وہ لوگ بابا جی کے آستانے پر آئے تمام حالات بیان کیے اور مدد کے طلب گار ہوئے۔ بابا جی نے رمضان کی بیوی اور بچوں کے سروں پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا اور بولے۔

''رونے دھونے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ رمضان نے میرے سامنے سابقہ گناہوں کی معافی مانگی اور سچے دل سے توبہ کی تھی۔ مجھے یقین ہے اس کے بعد اس نے توبہ نہیں توڑی۔ وہ بے قصور ہے اسے سازش سے پھنسایا گیا ہے۔ دشمنوں کو منہ کی کھانی پڑے گی۔ تم حوصلہ نہ ہارو۔ وہ بے قصور ہے اور جس کا قصور نہ ہو اس کو دنیا کی کوئی طاقت سزا نہیں دے سکتی۔ جب فیصلہ سننے جاؤ تو پھولوں کے ہار اور مٹھائی لے کر جانا۔ اس نے باعزت بری ہونا ہے۔'' بابا جی نے گھر والوں کو تسلی تشفی دی۔

''فیصلے والے دن جب عدالت میں فیصلہ سنانے کے لیے فائل کھول کر پڑھا جانے لگا تو فائل میں موجود تمام کاغذات کورے تھے۔ کسی بھی کاغذ پر کچھ بھی نہیں لکھا تھا۔ تمام فائل سفید کاغذوں کا دستہ تھی۔ سب کورے کاغذ دیکھ کر جج صاحب سخت حیران تھے۔ سزا کیا سناتے باعزت بری کیا۔ باعزت بری ہوتے ہی رمضان سیدھا بابا جی کے آستانے پر آیا۔ رب کا شکر ادا کیا بابا جی کے قدموں میں گر کر ایک بار پھر رو رو کر سابقہ گناہوں کی معافی مانگی۔ توبہ کی اور پکا سچا مسلمان بن کر زندگی گزارنے کا عہد کیا۔

☆☆☆

چلغوزہ...... پہاڑی میوہ

چلغوزہ پہاڑوں میں اگنے والا حیرت انگیز میوہ ہے۔ دنیا کا بہترین قسم کا چلغوزہ کوہِ سلمان پر اور ہندوکش کے پہاڑی سلسلے کے علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ کوہِ سلمان کے پہاڑی سلسلے ژوب کی جانب سے گزرتے ہوئے کوہِ سلمان کے اس مقام پر جہاں دنیا کا بہترین چلغوزہ اور ایشیا کے بہترین قسم کی مونگ پھلی کے جنگلات کا سلسلہ پھیلا نظر آتا ہے۔ یہ علاقہ کوہِ سلمان پر اور ژوب کے قریب واقع ہے۔ کوہِ سلمان کا یہ سلسلہ ہندوکش کے پہاڑی سلسلے سے بلوچستان کے مقام تک جاتا ہے۔ یہ جنگلات بڑی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ یہاں چلغوزے کی ایک کثیر پیداوار ہے جس کی نہ صرف پاکستان میں بلکہ دنیا کے کئی ممالک میں بڑی مانگ ہے جن میں دبئی مسقط، جدہ، لندن اور اسرائیل وغیرہ شامل ہیں۔ کوہِ سلمان پر پائے جانے والے چلغوزے دنیا کے بہترین چلغوزے ہیں۔

حسنِ انتخاب: افشاں چوہدری، لندن

پھوپی جان



نفیسہ فضل

ایک بھتیجی کی زبانی، اُس پھوپی کی کہانی، جسے سفلی نے چٹ کر دیا

یہ اس وقت کی بات ہے جب میری عمر کوئی چودہ پندرہ برس ہو گی۔ میری پھوپی بیاہ کر راولپنڈی چلی گئی تھیں۔ وہ ہماری اکلوتی پھوپی تھیں۔ بڑی پھوپی تو کافی عرصہ پہلے ہی اللہ کو پیاری ہوگئی تھیں۔ یہ پھوپی چھوٹی ہونے کے باعث بھائیوں اور ابا کی بہت لاڈلی تھیں. ب بیاہ کر گئیں تو واپس دو سال تک شوہر نے آنے ہی نہ دیا۔ انجان شہر...... زندگی میں پہلی بار گھر والوں سے جدا ہوئی تھیں۔ وہاں کسی کو بھی نہیں جانتی تھیں ہاں دادا جان کے بھائی بنے ہوئے تھے جن کے توسط سے ان کی شادی ہوئی تھی ان کے گھر آنا جانا تھا۔ دادی جان تو کافی سالوں پہلے وفات پا چکی تھیں۔ ہمارے معاشی حالات کافی ابتر تھے۔ ورنہ کوئی بھی جا کر انہیں لے آتا۔ میرے والد صاحب ٹی بی جیسے مہلک مرض میں مبتلا تھے۔ چچا جان کے خود چھوٹے چھوٹے بچے تھے، ان کی گزر بسر بمشکل ہوتی تھی۔ ان دنوں ٹی بی لاعلاج مرض تھا۔ اب تو اس کا علاج ہو جاتا ہے۔ جب ابا جان کا انتقال ہوا تب بھی پھوپی نہ آئیں۔ پڑھی لکھی تو تھیں نہیں، کسی سے رو رو کے خط لکھواتی تھیں۔ پھوپا نے کہا اب جانے کا کیا فائدہ؟ دادا جان بیٹے کے غم میں ہارٹ پیشنٹ بن گئے۔ ہر وقت روتے تھے پھر ایک دن آفس جاتے ہوئے راستے میں ان کو دل کا دورہ پڑ گیا۔ کوئی بندہ رکشا میں گھر چھوڑ گیا۔ میری نانی گھر پر تھیں۔ بھاگ کر قریبی کلینک سے ڈاکٹر کو بلا لائیں۔ ڈاکٹر نے دیکھتے ہی کہا۔ ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ انہیں جناح اسپتال لے جاؤ۔ ان دنوں ٹیلی فون بھی کسی کسی کے گھر ہوتے تھے۔ لہٰذا چچا جان کو اطلاع کرائی۔ چچا چچی حیدرآباد شادی میں گئے ہوئے تھے۔ کسی میں اتنا شعور نہیں تھا کہ دادا جان کو اسپتال لے کر جاتے۔

رات دادا جان کو درد ہوتا تو کورامین کے قطرے پلا دیتے۔ صبح نو بجے چچا جان اور چچی جان آئے تو انہیں جناح اسپتال لے کر گئے جہاں انہوں نے ایک دن اور ایک رات بہت تکلیف میں گزاری۔ صبح جب امی اور نانی اسپتال پہنچے تو دادا جان اس فانی دنیا کو چھوڑ چکے تھے۔ چچا جان ساتھ والے بیڈ پر لیٹے تھے۔ ڈاکٹر نے انہیں نیند کا انجکشن دیا تھا کیونکہ صدمہ ان سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ پھوپی جان کو بھی اطلاع کر دی گئی تھی۔ تیسرے دن



پھوپی جان اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ آئیں۔ چھوٹا چھ ماہ کا بڑا بیٹا ڈھائی سال کا تھا۔ رورو کر ان کا برا حال تھا۔ غشی پر غشی پڑ رہی تھی۔ سوکھ کر کانٹا ہو چکی تھیں۔ سب ان کو دیکھ کر حیران پریشان تھے۔

میری گول مٹول خوب صورت آنکھوں والی پھوپی جنہیں پیار سے سب موگرا کہتے تھے، پہچانی نہیں جا رہی تھیں۔ سب حیران تھے کہ انہیں کیا ہوا؟ چار چھ دن بعد جب امی اور چچی جان نے پوچھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ نانی اماں نے پیار کیا۔ امی اور چچی جان نے دلاسا دیا تب انہیں قرار آیا۔ پھر جو کہانی انہوں نے سنائی تو سب حیران رہ گئے۔ اتنے سوبر و متین شخصیت کے مالک پھوپا جان کتنے ظالم ہیں۔

پھوپی جان نے بتایا کہ کچھ دن تو خالق صاحب میرے ساتھ ٹھیک رہے پھر ان کے تیور بدلنے لگے۔ جب گھر سے باہر جاتے تو دروازے کو تالا لگا کر جاتے۔ اکثر ان کی نائٹ ڈیوٹی ہوتی۔ ایوننگ ہوتی تو رات دس گیارہ بجے آتے تھے۔ میں اندر سے کنڈی لگا لیتی تھی۔ ڈر لگتا تھا سخت سردی ہوتی تھی کہ دیواروں پر کہرا جم جاتا تھا۔ ان کی عادت تھی کہ دروازے پر ٹھوکر مارتے تھے۔

میری اکثر آنکھ نہ کھلتی تو اندر آ کر مارتے کہ دیر کیوں لگائی۔ بھائی جان کے انتقال کا سن کر میں کتنا تڑپی کہ میں جاؤں گی میری جان سے پیارے بھائی دنیا میں نہیں رہے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ جنہوں نے میری شادی کرائی تھی وہ انڈیا میں ہمارے گھر کے برابر میں رہتے تھے۔ ان کی بیوی نے امی کو بہن بنایا ہوا تھا۔ ان کا نام فاطمہ تھا۔ وہ

سکھ سے مسلمان ہوئی تھیں۔ بڑی بھابی بولیں ہاں مجھے معلوم ہے مگر چھوٹی بھابی کو معلوم نہ تھا۔

ہاں تو ان کی دو بیٹیاں تھیں، چھوٹی تو اللہ لوک تھی اور بڑی مجھ سے دو سال چھوٹی، موٹی اور کالا رنگ، نہ تعلیم نہ کوئی ڈھنگ۔ ایک دن خالہ فاطمہ مجھ سے کہنے لگیں۔ ''نصرت اپنے بھتیجے سے کنیز کی شادی کرا دے۔'' اس کا کا نام کنیز تھا۔

میری تو جان ہی چلی گئی یہ سن کر۔ میں نے کہا۔ ''یہ ہی رہ گئی ہے اس کے لیے ہم تو بہت پیاری سی لڑکی لائیں گے۔''

بس یہ سننا تھا کہ خالہ فاطمہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''تجھے نہیں پتا تو نے کس سے ٹکر لی ہے۔'' خالہ فاطمہ نے غصے سے کہا۔

اس کے بعد میں تو ان کے گھر نہیں گئی مگر خالق صاحب روز جانے لگے۔ میں اعتراض کرتی تو وہ مجھے پیٹ کے رکھ دیتے۔ اسی طرح وہ میرے میاں کے کان میرے خلاف بھرنے لگیں۔ وہ تو پہلے ہی سخت مزاج تھے۔

مجھ سے کسی نہ کسی بہانے لڑتے۔ حالانکہ وہ ایسے بالکل نہ تھے بلکہ ہمیشہ ہی میری صفائی سلیقے اور کھانوں کی بہت تعریف کرتے اور کہتے کہ میری بیوی بہت سگھڑ اور چلن والی ہے۔ 60 روپے تنخواہ میں اچھا گھر چلاتی ہے۔ مگر نہ جانے انہیں کیا ہو جاتا تھا۔

پھوپی جان نے بتایا کہ ایک دن ہم کھانا کھا رہے تھے۔ پلیٹ میں کچھ گرنے کی آواز آئی۔ خالق صاحب نے کسی اندیشے کے تحت شوربے میں انگلی ڈالی تو دو نئی کیلیں نکلیں۔ ہم نے فوراً ہی وہ سالن پھینک دیا کہ بند گھر میں یہ کیلیں کیسے آئیں۔ دونوں بچے سوئے ہوئے تھے۔

ایک مرتبہ خالہ فاطمہ اپنی بیٹیوں کے ہمراہ ہمارے گھر آئیں۔ خوب کھانے وغیرہ پکے، رات کو ہمارے گھر رک گئیں۔ دیر تک وہ لوگ گپیں لگاتے اور لڈو کھیلتے رہے جب کہ میں اپنے بیڈ پر کروٹیں بدلتی رہی۔

پھوپی جان کو آئے ہوئے دس روز گزر گئے تھے۔ ہم سب چچا جان کے گھر میں صحن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ سب باتیں کر رہے تھے کہ اچانک سے پھوپی جان کا رنگ سفید پڑنے لگا اور وہ لیٹ گئیں۔

بولیں۔ ''سردی لگ رہی ہے۔ راشدہ چادر لاؤ۔ جیسے ہی میں چادر لائی چیخنے لگیں۔

''چل حرام زادی، ابا جی کی دھوتی لا کے دے۔'' سب حیران ہو گئے کہ یہ تو کبھی تُو کر کے نہیں بولیں مگر...... آنکھیں ان کی ابلنے لگیں اتنے میں میرے خالہ زاد بھائی جہانگیر آ گئے۔ انہوں نے کہا میں ابھی آتا ہوں وہ اس وقت بمشکل بیس اکیس سال کے ہوں گے۔

وہ کسی عامل کے پاس کالا علم سیکھنے جاتے تھے۔ وہ سائیکل لے کر چلے گئے۔ واپسی پر وہ عامل ان کے ساتھ آ گیا۔ اس نے آتے ہی سب کو ہٹا دیا اور پھوپی کے گرد حصار باندھ کر کچھ پڑھنے لگا۔ تب ہی پھوپی جان بھی بولنے لگیں جیسے نیند میں بولتے ہیں۔

''وہ فاطمہ قبر کھود رہی ہے۔ قبر کے پاس کالا بکرا کھڑا ہے۔ اب وہ قبر میں کچھ دبا رہی ہے۔''

جب عامل پڑھ چکا تو پھوپی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ تب عامل نے بتایا کہ اس عورت نے بھینٹ دی تھی مگر یہاں سے فوری طور پر روک ہو گئی ہے۔ بروقت پتا چلنے سے وہ عورت ناکام ہو گئی ہے۔ کیونکہ ہم نے اس کا حملہ روک دیا، ورنہ آج یہ بی بی زندہ نہ ہوتی۔''

دو بیٹیوں کی ماں ہونے پر بھی اسے کسی کی بیٹی پر رحم نہیں آیا۔ اب پھوپی کو تو اپنے گھر جانا تھا کب تک وہ یہاں رہتیں۔ مولانا صاحب نے کچھ تعویذات دیئے اور فیصلہ کیا کہ ایک ماہ کے لیے میری امی ان کے ساتھ جائیں گی۔

پھوپی جان کو بخار اور کھانسی رہنے لگی تھی۔ ایک ماہ میں وہ مزید کمزور ہو گئیں۔ چچی جان انہیں سول اسپتال لے گئیں جہاں ان کے ایکسرے و

دیگر ٹیسٹ ہونے پر پتا چلا کہ وہ ٹی بی جیسے مہلک مرض میں مبتلا ہو چکی ہیں۔ خاوند کی سختی، باپ بھائیوں کا غم پھر اپنوں سے دوری اوپر سے سفلی عمل نے ان کو بھری جوانی میں ہی اس مرض میں مبتلا کر دیا تھا۔

☆......☆

ادھر راولپنڈی پامر لائن میں پھوپا جان اپنے کمرے میں سوئے ہوئے تھے کہ ایک آواز سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ گھوں گھوں کی آواز تھی جیسے ہی پھوپا کمرے سے صحن میں آئے تو کوئی چیز صحن میں آ کر کیاری میں گری۔ پھوپا جان بھاگ کر لالٹین اٹھا لائے۔ دیکھا تو مٹی کی ہانڈی تھی جو گر کر ٹوٹ چکی تھی۔ اس میں کپڑے کی گڑیا تھی۔ کالے ماش کی دال، ہڈیاں اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔

پھوپا جان نے اس پر پیشاب کر دیا اپنی طرف سے اس کا اثر زائل کرنے کے لیے اور مطمئن ہو کر سو گئے مگر جب صبح سو کر اٹھے تو سارے جسم پر آبلے پڑ چکے تھے۔ وہ فوری طور پر امام مسجد کے پاس گئے۔ انہیں رات کا واقعہ کہہ سنایا۔ امام صاحب بولے۔ ''اللہ کا شکر ادا کرو کہ جان بچ گئی۔ یہ ہانڈی کسی کی جان لینے کے لیے بھیجی جاتی ہے۔ یہ سفلی عمل ہے۔''

پھر انہوں نے پانی دم کر کے نہانے کو دیا اور کہا۔ ''اس سے غسل کرو اور دھیان رکھنا کہ پانی کیاری میں جائے، یہ کلام الٰہی پڑھا ہوا پانی ہے۔ انشاء اللہ ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

☆......☆

میری امی، پھوپی کے ساتھ پنڈی چلی گئی تھیں۔ پھوپی جان بہت باہمت خاتون تھیں۔ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو سنبھالنا، گھر کا سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں۔ کروشیے کا کام تو اتنی نفاست سے کرتیں کہ لوگ ان کے ہاتھ کے بنے ہوئے بنیان، بیڈ کورز، تکیہ کے غلاف دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔

امی تو پھوپی کے ہاں چلی گئی تھیں کہ مہینا بھر رہ کر کچھ تو ان کا ہاتھ بٹائیں گی اور پھوپا جان کی عیادت بھی کر لیں گی۔

ایک دن امی جان نے دال چاول پکائے، سب کھانا کھا رہے تھے کہ دال میں نہ جانے کہاں سے مچھلی کے کانٹے آ گئے۔ پھوپا جان بھی بہت پریشان ہوئے۔ وہ امام صاحب کے پاس گئے انہیں بتایا تو وہ سوچ میں پڑ گئے، پھر فرمانے لگے۔

''خالق میاں! میں آپ کو ایک بی بی کا پتا بتاتا ہوں جو کہ راجہ بازار میں رہتی ہے۔ آپ ان کے پاس اپنی بیوی کو لے جائیں۔ بہت اچھی خاتون ہیں۔''

پھوپا جان، پھوپی اور امی کو لے کر ان کے پاس گئے۔ وہ بی بی سفید لباس میں بہت ہی باوقار نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے جیسے ہی پھوپی جان کی طرف دیکھا مسکرا کر اپنے پاس بلا لیا۔ حالانکہ وہاں کافی خواتین تھیں پھر وہ کہنے لگیں۔

''بیٹا مارنے والے سے بچانے والا بہت بڑا ہے۔ تم ایک صابر اور بہت ہمت والی بچی ہو۔ تم پر کئی مرتبہ حملہ ہوا ہے مگر ہر بار اللہ کی رحمت نے تمہیں بچا لیا ہے۔ میں وعدہ تو نہیں کرتی مگر انشاء اللہ کوشش کرتی ہوں۔''

انہوں نے ایک عورت کو کہا۔ ''ٹب میں پانی لاؤ۔'' پھر پھوپی کو سامنے بٹھا کر کافی دیر پڑھائی کرتی رہیں۔ سب لوگوں کی نظروں کے سامنے ایک مچھلی ٹب میں آ گری۔ مچھلی زندہ تھی تمام لوگ انگشت بدنداں تھے۔

امی اور پھوپی لرز رہی تھیں۔ بہر حال انہوں نے کچھ تعویذات دیے کہ نہانا ہے اور دم کا پانی پینا ہے۔ اسی بیماری کی حالت میں پھوپی جان کے گھر بیٹی پیدا ہوئی جو بہت پیاری تھی۔ پھوپی اور پھوپا اسے پیار سے بے بی کہتے تھے۔ اس کا نام رفعت تھا۔ سب لوگ پھوپی جان کی تعریف کرتے کہ تمہاری ہمت کو سلام ہے اپنی ہر ذمہ داری بخوبی نبھا رہی ہو۔ ورنہ آج کل کی عورتیں تو بس اللہ ہی اللہ......!

☆......☆

اسی طرح بیمار رہتے اور سنبھلتے ڈھائی برس بیت گئے تھے۔ میری شادی لاہور میں ہوئی تھی۔ وہ دو تین دن کے لیے میرے پاس لاہور آئی تھیں۔ وہاں بھی ان کی حالت بگڑ گئی تھی۔ پھر سنا کہ اکثر و بیشتر ان کے کمرے اور باتھ روم میں خون کے چھینٹے آتے ہیں۔ اب پھوپی جان اکثر خوفزدہ ہو جاتی تھیں۔ پھوپا جان بھی پہلے سے رل گئے تھے۔ بیوی بچوں کو سنبھالتے، بے بی سے تو بہت ہی پیار کرتے تھے۔

پھر پھوپی جان کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ جب کہ ان کا ڈاکٹری اور روحانی علاج چل رہا تھا۔ ان بی بی کو جنہیں سب آپا جی کہتے تھے ان کے پاس لے کر گئے تو انہوں نے کہا ہر بار اس پر نیا حملہ ہوتا ہے اور یہ اب بیماری کی شکل اختیار کر گیا ہے جو کہ اب بہت مشکل ہے۔

پھر پھوپی کو کئی دوسرے مولویوں کو دکھایا۔

پھوپی کے ایک کزن پنڈی میں بھی رہتے تھے۔ کبھی کبھی وہ خیریت لینے آجاتے تھے۔ ایک دن وہ آئے ان دنوں گرمیوں کے دن تھے۔ پھوپی جان کچن میں تھیں جب وہ آئیں تب تک وہ سو چکے تھے کھانا تیار تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھیں کہ بھائی جان فیض گھبرا کر اٹھ گئے اور بولے۔

''بی بی ادھر آؤ، یہ جو بریکٹ پر جھالریں ہیں انہیں ادھیڑو۔''

پھوپی جان بولیں۔ ''بھائی جان! ابھی تین روز پہلے ہی میں نے سی کر لگائی ہیں۔''

وہ بولے۔ ''بی بی! ابھی میرے پیر و مرشد جماعت علی شاہ صاحب نے مجھے خواب میں ڈانٹا ہے اور کہا ہے کہ فیض محمد تم بے خبر سو رہے ہو اٹھو ان سامنے والی جھالروں کو کھولو۔''

پھوپی جان نے فٹافٹ جھالر ادھیڑا تو اس میں سے تین تعویذ نکلے۔ پھوپا جان بھی گھر میں تھے۔ چھٹی کا دن تھا۔ یہ دیکھ کر سب پریشان ہو گئے۔ خاص کر پھوپی جان جنہوں نے اپنے ہاتھ سے تین دن پہلے ہی یہ جھالریں تھیں۔ انہیں اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا کہ اب میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ تب ہی انہیں ڈاکٹرز نے جواب دے دیا تھا کہ ان کے دونوں پھیپھڑے گل چکے ہیں۔

اس وفا کی باہمت دیوی نے اپنے ہاتھ سے اپنے شوہر اور بچوں کے لیے تکیے بنائے۔ شوہر کو گاؤ تکیہ پسند تھا۔ وہ بنایا۔ انہوں نے منع کیا اور کہا۔

''نصرت تم کافی بیمار ہو نہ بناؤ۔'' تو بولیں۔

''میری موت پر سب آئیں گے تو کیا میرا گندا گھر دیکھیں گے؟''

پھر ایک دن اطلاع ملی کہ نصرت کی حالت بہت خراب ہے۔ لاہور سے میں اور کراچی سے امی بھی پہنچ گئیں۔ یقین مانیں ان کا ڈیڑھ کمرے کا گھر ایسے چمچما رہا تھا کہ سوئی بھی گرے تو اٹھا لو، کچن صاف ستھرا، کھانا تیار تھا۔ محلے کی عورتیں یاسین شریف پڑھ رہی تھیں۔ پھوپی لمبی لمبی بے سدھ لیٹی تھیں کچھ دیر بعد اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ دو تین دن ان کی ایسی ہی حالت رہی۔ جب اٹھتیں تو کہتیں کہ مجھے زہر لا دو مجھے بہت تکلیف ہے۔''

ایک دن مجھے پاس بلا کر بولیں۔ ''راشدہ! مجھے افیون ہی منگوا کر دے دو، میں تیل میں ملا کر کھا لوں گی تو مر جاؤں گی۔ میں کسی سے تیرا نام نہیں لوں گی۔''

میں رو پڑی۔ میری پیاری پھوپی کتنی اذیت میں تھیں۔

پھر پھوپو بولیں۔ ''مجھے اپنی بے بی کی فکر ہے۔ شاہد حامد تو لڑکے ہیں۔'' اس وقت شاہد نو سال اور حامد سات سال کا تھا اور رفعت تین سال کی تھی۔

پھر میرے قریب ہو کر بولیں۔ ''بے بی کو تم لے لینا۔ اپنے طاہر سے اس کی شادی کر دینا۔''

میں گردن ہلا کر رہ گئی۔ میری عمر بھی زیادہ نہ تھی۔ اتنا شعور نہ تھا۔ روز صبح پھوپی جان کی حالت بگڑ جاتی، سانس دھونکنی کی طرح چلتا۔ سب بیٹھ کر یاسین شریف سناتے منہ سے خرخر کی آوازیں نکلتیں۔

امی کہتیں کہ بچوں کو جلدی سے کھانا کھلا دو۔ میری سمجھ میں نہ آیا امی ایسا کیوں کہہ رہی ہیں۔ تب امی نے بتایا تو میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی مگر کچھ دیر میں ہی ان کی حالت سدھر گئی۔ جب تین دن ایسا ہی ہوتا رہا تو نہ جانے میرے منہ سے کیسے نکل گیا۔

''امی جان ان کی مٹی یہاں کی نہیں ہے۔ انہیں لاہور یا کراچی لے جائیں۔'' اور شاید امی کو میری بات سمجھ میں آ گئی۔ انہوں نے اسی وقت پی سی او سے چچا جان کو فون کیا اور میں اسی دن لاہور آ گئی۔

لاہور میں پھوپی جان کے ماموں ہمارے گھر کے قریب ہی رہتے تھے۔ میں نے ساری کیفیت انہیں بتائی وہ اسی وقت اپنی بیوی زرینہ کے ساتھ پنڈی چلے آئے۔ ممانی زرینہ، پھوپی نصرت کی دوپٹہ بدل بہن تھیں۔

دونوں کا آپس میں بہت پیار تھا۔ تیسرے دن شام کو یہ لوگ بذریعہ ایمبولینس انہیں لاہور ماموں ظہیر کے گھر لے آئے۔ میں اور میرے میاں انہیں ملنے گئے، میرا گھر قریب ہی تھا۔

ماموں ظہیر کے سالے تھے ریاض احمد۔ ان کا کوئی جاننے والا بنگالی بابا تھا۔ سفلی کا ماہر لاہور میں بدھو کا آوا قبرستان میں رہتا تھا۔ ٹیکسی میں اسے جا کر لے آئے۔ چچا جان بھی ساتھ تھے۔ وہ بائی ایئر پنڈی پہنچے تھے۔ میری بے خبری میں کی ہوئی بات نے گویا ہلچل مچادی تھی۔

بابا نے آ کر پھوپی کو دیکھا اور بولا۔

''اب تو بہت دیر ہو چکی۔ معیاد ختم ہو چکی۔'' یہ سن کر سب رو پڑے اور بابا کی خوشامد کرنے لگے۔

''بابا کچھ کرو۔''

اس پر وہ بولا۔ ''مجھے فوراً جانا ہوگا۔ آج کی رات باقی ہے کوشش کرتا ہوں۔''

وہ فوراً ہی واپس چلا گیا۔ صبح پھوپی جان اٹھیں ان کا چہرہ ہشاش بشاش تھا۔ امی اور چچا جان نے نماز پڑھ کر یاسین شریف پڑھ کر دم کیا وہ ممانی زرینہ سے باتیں کر رہی تھیں۔ صبح دس بجے ماموں ظہیر اپنی بیٹی پارو کے بال کٹوانے جا رہے تھے۔ تب ہی سامنے سے بابا آتا نظر آیا قریب آنے پر حال پوچھا۔ ماموں بولے۔

''ٹھیک ہے ابھی ان کے بھائی موسمی کا جوس پلا رہے ہیں۔''

وہ بولا۔ ''آؤ گھر چلو۔ رات پڑھائی کے دوران میری جھونپڑی گر گئی۔ اب وہاں کچھ نہیں ہے۔''

ماموں ظہیر اندر داخل ہوئے تو کہرام مچا ہوا تھا۔ امی نے بتایا۔ ''چچا جان نے جوس کا چمچ منہ میں ڈالا تو مسکرائیں بڑی بڑی آنکھیں لگتا تھا کہ کٹورے میں گلاب تیر رہے ہیں۔ دوسرا چمچ منہ میں ڈالا تو آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو نکل کر گالوں پر ڈھلک آئے۔ ایک ہچکی لی اور آنکھیں بند کر لیں۔''

ان کی موت پر آنسوؤں کو بھی آنسو آ گئے۔ میری پیاری پھوپی بھری جوانی میں چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر دنیا سے چلی گئیں۔ پھوپا کو خبر کر دی تھی۔ صرف ایک رات ہی وہ لاہور میں زندہ رہیں۔ پھوپا بھی بچوں کو ساتھ لے آئے۔ شام کو بے بی کو کاندھے سے لگائے پھوپی کا آخری دیدار کر رہے تھے۔

بچوں کی پرورش چچا جان اور چچی سلمی نے کی تھی۔ شاہد آج ایک بزنس مین ہے اور انگلینڈ میں سیٹل ہے۔ حامد اپنی دنیا میں مگن ہے کسی سے نہیں ملتا اور رفعت ایک بچی کی ماں اور میری بہو ہے۔ قدرت نے میرے سوچے بغیر اسے میری جھولی میں ڈال دیا حالانکہ میں تو یہ بات بھول گئی تھی کہ تم بے بی کو لے جانا، طاہر سے شادی کر دینا......!

سب قارئین کرام سے التماس ہے کہ میری پھوپی کے لیے دعائے مغفرت ضرور کریں اللہ پاک انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆

نویں سچ بیانی

شانو

ثمینہ فیاض



اُس دوشیزہ کی کہانی، جس پر محبت نے اپنا آسیب ڈال دیا تھا محبت اُس کی بلی لے کر ٹلی

شانو آم کے پیڑ سے کیریاں توڑ رہی تھی۔ گرمی کے موسم میں جب درخت پر کیریاں آنے لگتیں تو دوپہر کے وقت وہ امی اور دادی کے سو جانے کے بعد چپکے سے چھت پر چلی جاتی جہاں سے آسانی سے گھر کے دالان میں لگے آم کے پیڑ کی کئی شاخیں چھت پر جھکتی تھیں اور ان میں لگی کچی کچی سبز کیریاں اس کے دل کو بہت بھاتی تھیں ۔امی اس کی حرکت سے خوب واقف تھیں سچ ہی تو ہے ماؤں کو بچوں کے دل کی ہر اک بات خود ہی معلوم ہو جایا کرتی ہے۔

''ارے پھر چڑھی بیٹھی ہے یہ چھت پہ کتنی بار سمجھایا ہے اکیلی لڑکیوں کو بھری دوپہر میں چھت پہ نہیں جانا چاہیے سایہ ہو جاتا ہے۔'' اماں اسے ہر پل آسیب سے ڈراتیں پر وہ بھی شانو تھی اک ڈھیٹ مجال ہے جو اس کے کان پر جوں بھی رینگ جائے۔

وہ جلدی سے نیچے اتر آئی۔

''امی یہ دو تین لینے گئی تھی بس۔ ابھی تو گئی تھی پتا نہیں آپ کو کیسے معلوم ہو جاتا ہے ۔شانو نے منہ بنایا۔

ماں ہوں تمھاری رگ رگ سے واقف ہوں کس وقت کیا کرتی ہو اور کیا نہیں ۔امی نے بھی قدرے درشتی سے کہا۔

''تمھیں کتنی بار منع کر چکی ہوں چھت پر دوپہر میں اکیلے نہ جایا کرو۔'' انہوں نے ایک بار پھر نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

'' اف امی! عصر مغرب کے وقت جانے کو دادی منع کرتی ہیں دوپہر میں آپ منع کرتی ہیں صبح میں میں کالج جاتی ہوں تو میں جاؤں کب۔'' وہ بھی اپنا مسئلہ لے کر بیٹھ گئی۔

''تو جانا ضروری ہے کیا۔ بات تو اس کی ٹھیک تھی امی نے اس کی اس بات پر مسکراتے ہوئے کہا

اچھا! مطلب میں اب کیری کھانا بھی چھوڑ دوں۔ ٹھیک ہے پھر میں اب کیریاں کھاؤں گی ہی نہیں۔'' وہ منہ بنا کر بیٹھ گئی۔

''ٹھیک ہے اب تم تو ناراض ہو گئی ہو تو یہ جو کیریاں توڑ کر لائی ہو یہ میں اور تمھاری دادی کھا لیتے ہیں اس پر نمک اور چاٹ مسالا لگا کر چیخ اک چٹخارہ لیتے ہوئے انہوں نے کہا تو شانو جلدی سے ان کے ہاتھ سے کیریاں لینے لگی۔ اب یہ تو چھوڑ



دیں اور دادی، امی اور شانو تینوں کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆......☆

شانو ابھی فرسٹ ائر میں ہی آئی تھی۔ اپنے گھر کی اکلوتی اولاد تھی اسی لیے اس کے کچھ زیادہ ہی نخرے اٹھائے جاتے۔ سب کی لاڈلی تھی۔ وہ کئی دن سے نوٹ کر رہی تھی اک لڑکا اس کا پیچھا کرتا تھا۔ وہ بھی وین میں موجود اور کسی لڑکی کے پیچھے ہوگا لیکن اب وہ اس کے گھر تک آنے لگا وہ بہت ڈر گئی تھی اس لیے یہ بات کسی سے بھی نہیں کی۔ یہاں تک کہ امی سے بھی نہیں...... اس عمر میں بچیاں ڈر ہی تو جاتی ہیں۔

ہر روز وہ وین کے ساتھ ساتھ موٹر سائکل چلاتا رہتا کالج سے گھر تک وہ گاڑی کے کبھی آگے تو کبھی پیچھے گھومتا رہتا۔ شانو کا گھر کالج سے کافی دور تھا اسی لیے سب سے آخر میں آتا وہ کوفت میں مبتلا رہتی مگر کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ ایک روز تو حد ہی ہوگئی۔ اس نے شانو کو اک کاغذ پر خط لکھ کر کیری میں لپیٹا اور سوزوکی وین میں چونکہ وہ اکیلی رہ گئی تھی پھینک دیا وہ بہت گھبرائی مگر پھر ڈرتے ڈرتے اٹھا لیا کہیں وین والے انکل نے اٹھا لیا تو کیا سوچیں گے۔

''میں تمہارا نام بھی نہیں جانتا مگر جب سے تمہیں دیکھا ہے تم کو پسند کرنے لگا ہوں میرا نام جمشید ہے تم مجھے جمی کہہ سکتی ہو۔ تمھارے منہ سے جمی ہی اچھا لگے گا کیونکہ سب مجھے پیار سے جمی کہتے ہیں۔ میں تمھارا آج دوپہر چھت پر انتظار کروں گا اپنی چھت پر ضرور آنا۔''

وہ گھر آئی تو بہت گھبرائی ہوئی تھی چہرے پر ہوائیاں تھیں۔ وین سے اترتے ہی دروازے کو اتنی زور زور سے پیٹ رہی تھی۔ امی اسے دیکھتے ہی پریشان ہوگئیں۔

''خیر تو ہے اتنی حواس باختہ کیوں ہو رہی ہو۔'' اس کی صورت دیکھتے ہوئے امی نے پوچھا۔

''کچھ نہیں ...... کچھ بھی نہیں۔ وہ گرمی بہت ہو رہی ہے نا کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔'' اس نے بہانا بنایا۔

''اچھا چلو اندر چلو۔ واقعی لو چل رہی ہے۔'' امی نے بھی اس کی بات کی تائید کی۔

''شانو تم جا کر نہا لو فریش ہو جاؤ میں کھانا نکالتی ہوں۔'' امی اس کے اس طرح بیٹھ جانے پر دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

اب جا کر تو اسے سکون کی سانس آئی تھی ورنہ تو گھر سے باہر اس کا ڈر کی وجہ سے دم ہی نکلا جا رہا تھا۔ وہ اٹھی اور فرج سے ٹھنڈا پانی نکال کر غٹا غٹ پی گئی۔

''ارے ارے کیا کر رہی ہو؟'' دادی نے اک ہانک لگائی۔

''اتنی گرمی سے آئی ہو فوراً پانی پی رہی ہو اور وہ بھی فرج کا گرم ٹھنڈا ہو جائے گا۔ طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔''

''اچھا دادی تھوڑا سا ہی پیا ہے۔'' یہ کہتی وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ساری دوپہر وہ بے چین رہی مگر چھت پر نہیں گئی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، کس سے کہے اس کے ہاتھ پاؤں اب بھی اس واقعے کو سوچ سوچ کر پھولے جا رہے تھے یہ کیا ہو گیا۔

اگلے دن وہ کالج نہیں جانا چاہتی تھی مگر آج پریکٹیکل تھا اس لیے جانا ضروری تھا۔ وہ آیت الکرسی پڑھتی خود پر دم کرتی گھر سے نکل کر وین میں بیٹھ گئی سامنے ہی جمی کھڑا مسکرا رہا تھا اس کی تو جان ہی نکل گئی اب کیا ہوگا؟

وہ حسب معمول موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے وین کے چکر لگانے لگا اور شانو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں چلی جائے۔

کالج سے بھی ڈرتے ڈرتے نکلی لیکن توقع کے عین مطابق وہ کالج کے سامنے لگے اس برگد کے درخت کے سائے میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ نظر چراتی ہوئی وین میں بیٹھ گئی جیسے اس نے دیکھا ہی نہ ہو۔ جیسے جیسے لڑکیاں اپنے اپنے گھر اترتی جاتیں اس کے دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔ اب کیا ہوگا میں اکیلی رہ جاؤں گی اگر اس نے پھر کوئی خط پھینک دیا تو کیا ہوگا۔ جمی اپنی بائیک کے اگلے پہیے کو اٹھا تا بلیاں کھاتا ہوا میں لہرا لہرا کر اسے متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب کہ اسے شدید کوفت ہو رہی تھی ایک ایک کر کے سب ہی لڑکیاں وین سے اتر گئیں۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں پڑھتی رہی۔ آخری لڑکی کے وین سے اترنے اور اس تنہائی میں اسے اپنے گھر تک کا راستہ جو تقریباً دس منٹ کا تھا دس سال سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ جمی نے کیری میں لپٹا ایک اور خط اس کی وین میں اچھال دیا تھا۔ اور شانو کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کیا مصیبت ہے؟ اٹھاتی ہوں تو مشکل نہ اٹھاؤں گی تو وین والے انکل کیا سوچیں گے؟ ان کی وین میں کیسی لڑکیاں جاتی ہیں؟ چار و نا چار اسے خط اٹھانا ہی پڑا جمی ایک ادا سے مسکراتا بائیک کا ہارن دیتا۔ اسے اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا مگر وہ پلٹ کر نہیں دیکھ رہی تھی۔ اسے لگا وہ پلٹی تو پتھر کی ہو جائے گی۔ وین کے رکتے ہی جمی چلا گیا تھا شاید وین والے انکل کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا تو وہ

بھی دروازہ کھول کو اس کے ساتھ ہی نیچے اتر آئے تھے۔ اس کا سانس بحال ہوا تو اتر کر گھر کا دروازہ بجایا مگر وین والے انکل وہیں کھڑے تھے۔ اس کا دم نکلا جا رہا تھا یہ جا کیوں نہیں رہے؟ مگر دروازہ کھلنے پر جب انہوں نے فیس کا تقاضہ کیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ وہ جلدی سے دادی کو سلام کرتی فوراً اپنے کمرے میں چلی گئی۔ خط جیب سے نکالا اور پھاڑ دینا چاہتی تھی مگر تجسس ہوا کہ پڑھ کر تو دیکھوں کیا ہے کانپتے لرزتے ہاتھوں سے اس نے کاغذ کھولا تو لکھا تھا

میری پیاری شانو!

تم چھت پر کیوں نہیں آئیں۔ میں سارا دن تمہارا انتظار کرتا رہا۔ شانو ایسے تو نا کرو یار! میں مرجاؤں گا آج ضرور آنا دیکھو میں جانتا ہوں تم روز کیریاں توڑنے آتی ہو پر کل میں اتنی تیز دھوپ میں تمہارا انتظار ہی کرتا رہ گیا اور تم نہیں آئیں آج ضرور ضرور آنا پلیز تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔

تمہارا اور صرف تمہارا جمی

اس نے غصے سے خط پھاڑ دیا اف میرے اللہ! اسے میرا نام بھی پتا چل گیا اور مر ہی جائے تو اچھا ہے میری جان تو چھوٹے گی۔

کیا مصیبت ہے وہ غصے سے لال پیلی ہوتے ہوئے کپڑے بدل کر بیٹھ گئی۔ ٹینشن سے کھانا بھی نہ کھایا جا رہا تھا حالانکہ کالج سے نکلتے ہوئے اسے زوردار بھوک لگ رہی تھی۔

اگلے دن اس نے یہ ساری کہانی اپنی اک کالج کی دوست کو جو ان کے ہی محلے میں رہتی تھی اور شانو کی بچپن کی سہیلی بھی تھی اسے بتائی۔ اس کی سہیلی نے بھی اسے یہی مشورہ دیا کہ کوئی ضرورت نہیں تمہیں اوپر جانے کی کب تک لکھے گا خط تمہیں ڈرنے کی بھی ضرورت نہیں تمہارے ساتھ وین والے انکل ہوتے ہیں اور پھر ہم سب بھی ہوتیں ہیں وہ کچھ نہیں کرسکتا۔

یہ سلسلہ یوں ہی کئی دن چلتا رہا جمی نے کئی بار خط پھینکے مگر شانو نے کسی خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ کچی عمر کی بچیاں بہت حساس ہوتی ہیں وہ اپنی سوچوں کو اک خاص دائرے میں رکھتی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ احساس ان کے دل میں حساس جذبات کی آبیاری کرنے کو کافی ہوتا ہے کہ کوئی انہیں پسند کرتا ہے۔ شانو بھی اسی دور سے گزر رہی تھی تجسس اور کسی کے پسند کرنے کا احساس اس کے دل میں بغاوت پیدا کر رہا تھا۔

اک دن ہمت کر کے وہ چھت پر چلی گئی۔ جمی اس کا منتظر تھا اپنے گھر کی چھت پر لٹک کر شانو کو دیکھنے کے خواہش میں اس کا پیر منڈیر سے سلپ ہو گیا اور اچانک وہ لمحے بھر میں اپنے گھر کی ٹنکی پر جو ۳ منزلہ عمارت پر بنی ہوئی تھی گرا تو اس کا سر پھٹ گیا اور وہ لمحے بھر میں ختم ہو گیا۔ شانو حقا بقا یہ منظر دیکھتی رہ گئی اسے اک بہت زوردار شاک لگا تھا اور وہ بری طرح چیخ رہی تھی۔ جمی کا گھر شانو کر گھر سے ۴ گلی چھوڑ کر تھا لیکن دونوں کی چھتوں سے اک دوسرے کا گھر صاف نظر آتا تھا شانو کے دماغ پر اثر ہو گیا۔ وہ جیسے چیختے چیختے سکتے میں چلی گئی۔ دادی اور اماں یہ سمجھیں کہ اس پر کسی آسیب کا اثر ہو گیا ہے کسی نے کہا کہ اس درخت کو ہی کٹوا دو یہ درخت کٹے گا تو شانو کا آسیب بھی چلا جائے گا۔ درخت کے کٹتے ہی اسے اک اور صدمہ لگا وہ پھر چیخنے لگی وہ مر گیا۔ وہ مر گیا سب اک بار پھر اسے کسی آسیب کے زیر اثر سمجھے اور پھر اک سلسلہ چل پڑا دادی کبھی کسی پیر صاحب کے پاس لے کر جاتیں تو امی کبھی کچھ تو کبھی کچھ پڑھ پڑھ کر دم کرتی رہتیں لیکن کسی کے دماغ میں کسی نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھانے کا خیال بھی نہ آیا اور اک دن اسی تناؤ کا شکار شانو نے گلے میں رسی ڈال کر خودکشی کر لی۔

یہ کہانی ہم تک شانو کی اسی سہیلی کے ذریعے پہنچی جو اس کے محلے میں رہتی تھی اور اس کے راز سے واقف تھی۔

☆☆☆

بھوک

ریحانہ آفتاب

بھوک کی کوکھ سے جنمی وہ سچائی جو آپ کو بھی چونکنے پر مجبور کردے گی



ساجدہ دروازہ کھول کر سائیڈ پر ہو گئی تھی۔ کھلے دروازے سے اندر داخل ہوتے احمد کو اس نے حسرت ویاس سے دیکھا۔ ہاتھوں میں رنگ کے خالی ڈبے اور ان میں موجود سوکھے برش کو تھکے وجود کے ساتھ احمد نے ساجدہ کی طرف بڑھایا۔ ایک تھکی سانس ساجدہ کے سینے سے خارج ہوئی۔ دن بھر کی آس کانچ کی طرح ٹوٹ کر بکھر گئی تھی۔ کھانستے کھانستے احمد صحن میں پڑی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ڈبے منڈیر پر رکھ کر ساجدہ پانی کا گلاس لے آئی۔

''آج بھی دیہاڑی نہیں لگی؟'' ساجدہ کے سوال پر احمد نے پانی کا گلاس گھونٹ بھر کر رکھ دیا۔

''نہیں۔'' مختصر جواب کے بعد کھانسی کا شدید حملہ ہوا۔ وہ کچھ بولنے کے قابل نہ رہا۔ ساجدہ بیٹھ کر سہلانے لگی۔ خون کی الٹیوں کو آنسو بہاتی نظروں سے دیکھ کر اپنے دوپٹے سے اس کا منہ صاف کرنے لگی۔

اوپر تلے کی پانچ بیٹیاں اور آٹھ ماہ کا بیٹا۔ اس لالچ میں خاموش بیٹھے تھے کہ اگر انہوں نے شور کیا تو شور کرنے والے کو روٹی نہیں ملے گی۔

سب باپ کی آمد پر دم سادھے بیٹھی ساجدہ کا انتظار کر رہی تھیں کہ ابھی وہ کھانا لے کر آئے گی۔ باپ کے کھانسنے کی آواز آنے لگی تو سب دروازے سے جھانک کر صحن میں دیکھنے لگیں۔

''تمہاری بیماری تو بڑھتی جا رہی ہے۔ دوا کا بندوبست کرو۔'' ساجدہ فکرمندی سے کہہ رہی تھی۔

''مر جانے دے مجھے، لعنت ایسی زندگی پر جو اپنے معصوم بچوں کا پیٹ نہ پال سکوں۔'' احمد بہت نڈھال ہو گیا تھا۔

''اماں!'' ان میں سے ایک نے ہمت کر کے ساجدہ کو آواز لگائی۔ ساجدہ کی خواہش ہوئی اس کے کان سن ہو جائیں۔ آنکھیں اندھی ہو جائیں۔ وہ معصوم کلیوں کے مرجھائے چہرے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

''اماں تم نے صبح سے کہا ہوا ہے جو شور کرے گا اسے روٹی نہیں دوں گی۔ ہم سب نے تمہیں تنگ نہیں کیا۔ ابا روٹی لایا ہے تو ہمیں دے دو۔'' سب سے بڑی بیٹی نے اتنے دلسوز انداز میں کہا کہ ساجدہ دوپٹا منہ پر ڈالے سسکیاں بھرنے لگی۔ احمد کی آنکھوں سے بھی پانی بہنے لگا۔ بچیاں سہم کر دروازے سے ہٹ گئیں۔

اگلی صبح احمد پھر ہمت کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی حالت دیکھ کر ساجدہ نے منع بھی کیا مگر وہ گھر کی چھت کو گھورتے بچوں کی سسکیاں نہیں سن سکتا تھا۔ پڑوسن سے تھوڑا سا آٹا مانگ کر اس نے تین روٹی بنائی تھی۔ رات بھوک سے بچیاں جس طرح نیند میں رو رہی تھیں یہ دیکھ کر اس کا کلیجہ منہ کو آ گیا

تھا۔ چائے کے ساتھ ایک روٹی اس نے احمد کے آگے رکھی مگر وہ "بچوں کو کھلا دینا" کہہ کر مزدوری پر چلا گیا۔

بچیاں بھی اٹھ کر دروازے سے لگی کھڑی تھیں۔ ساجدہ نے مسکرا کر انہیں اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ سب مرغی کے چوزوں کی طرح آ کر اس سے لپٹ گئیں۔ بچیوں کو پیار کرتی وہ انہیں سراہ رہی تھی۔ اللہ نے اسے بنت صابر اولاد دی تھی۔ چائے کے ساتھ سوکھی روٹی کھاتے گو کہ تین روٹی میں پانچ بچیوں کا پیٹ نہیں بھرا تھا مگر ان کو سکون مل گیا تھا۔ بچیاں تیار ہو کر سرکاری اسکول کو سدھاریں تو گھر کے کام سے جلدی جلدی فارغ ہو کر چھوٹے بیٹے کو اٹھائے وہ ساتھ والی زینب کے گھر آ گئی۔ وہ بھی کام پر جانے کو تیار بیٹھی تھی۔

زینب بنگلے میں ماسی تھی۔ ساجدہ نے اسے کہہ رکھا تھا کہ وہ اپنی مالکن سے اس کے لیے بات کرے۔ احمد بھلے غریب تھا مگر اس نے کبھی ساجدہ کو گھر سے باہر کام کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ساجدہ نے احمد کو اپنے کام کرنے کی خواہش سے لاعلم رکھا تھا۔ احمد کے لوٹ آنے سے پہلے وہ لوٹ آتی اور مہینہ ملنے پر اسے آرام سے سمجھا دیتی کہ بھوک سے بڑی کوئی بلا نہیں ہے۔

☆☆☆

زینب اسے لے کر عالیشان بنگلے میں داخل ہو گئی تھی۔ بڑے دروازے سے داخل ہوتے ہی قیمتی چیزوں کا رعب و دبدبہ اسے خود میں سمٹنے پر مجبور کر گیا۔ مختلف راستوں سے زینب اسے ڈائننگ ہال میں لے آئی جہاں طرح دار حسین بنی سنوری نازک اندام سی مالکن ناشتا کرتی اپنے اسمارٹ فون کو بھی یوز کرتی جا رہی تھی۔

"بیگم جی! یہ ساجدہ ہے۔ آپ نے ڈسٹنگ کے لیے ملازمہ کا کہا تھا۔" زینب نے اس نازک پری کو طلب کیا۔ گلرڈ بالوں کی لٹ کو چہرے سے پیچھے کرتے مالکن نے ساجدہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ساجدہ گود میں ہمکتے بیٹے کو سنبھالتے۔ گلہ تر کر رہی تھی۔ ایسا عالیشان بنگلہ، اتنے ٹھاٹ باٹ اس نے صرف فلموں، ڈراموں میں دیکھے تھے۔

"تم نے کام سمجھا دیا تھا؟" وہ زینب سے استفسار کر رہی تھیں۔

"جی سمجھا دیا ہے اسے دیوار پر لگے فوٹو فریموں کی



ڈسٹنگ کرنی ہے۔" زینب نے جلدی سے گوش گزار کیا۔ مالکوں کے موڈ کا بھروسا جو نہیں ہوتا۔

"اور تنخواہ!" بھنویں اچکا کر زینب سے ہی سوال جواب کر رہی تھیں۔

"جی دو ہزار۔ اسے منظور ہے جی۔" زینب جلدی سے بولی۔

"ٹھیک ہے لیکن یہ اس بچے کے ساتھ کیسے کام کرے گی؟" مالکن کی نظریں بچے پر تھیں۔

"جی میں اسے گھر چھوڑ آؤں گی۔" ساجدہ نے اس کی نظروں کی ناگواری بھانپ لی تھی۔

"ٹھیک ہے، کل سے ایک بجے آجانا۔ وسیم سے کہو فریش جوس کمرے میں بھیجے۔" مالکن ٹشو سے ہاتھ صاف کرتی زینب کو حکم صادر کرتی ہال سے ٹک ٹک کرتی نکل گئی۔ ساجدہ کے ساتھ زینب نے بھی کھل کے سانس لیا۔

"زینب کتنی پریوں سی ہیں مالکن۔" ساجدہ اس کے حسن کے سحر میں مبتلا ہوئی۔

"پیسہ بہت ہے بیگم کے پاس پھر میاں بھی کروڑ پتی ہے۔ پیسہ تیرے میرے پاس ہوتا تو ہم بھی پری لگتیں۔" زینب مالکن کے جھوٹے برتن اٹھاتی اور اس میں بچا ہوا ابلا انڈا نگلتے ہوئے بولی۔

"ایسا حسن کس کام کا جب میاں کو قابو میں نہ رکھ سکے۔" زینب کا انداز استہزائیہ تھا۔

"مطلب؟" ساجدہ حیران ہوئی۔ اسے زینب کی مبہم بات سمجھ نہیں آئی۔ "کوئی مطلب نہیں۔ تو ٹھیک سے دیواروں کو دیکھ لے۔ یہاں ہزاروں کی تعداد میں فریم ہیں بیگم کو ہر تصویر فریم کروا کے دیوار پر سجانے کا شوق ہے۔ یہاں تک کہ بچوں کی اسکول پینٹنگ بھی فریم کروا کے لگا رکھی ہیں۔ ہونہہ بڑے لوگوں کے بڑے چونچلے۔" زینب کے لہجے میں حد درجہ کڑواہٹ تھی۔

"تیری بڑی مہربانی جو تو نے یہ کام دلوا دیا۔" ساجدہ شکر گزار تھی۔

"کوئی گل نہیں، تو بہن جیسی ہے اپنی لیکن چھوٹے کو تو کس کے پاس چھوڑ کر آئے گی۔" زینب کو روتے بچے کا خیال آ گیا۔

"بچیاں بارہ بجے اسکول سے آجائیں گی۔ بڑی اسے سنبھال لے گی۔" ساجدہ سب سوچ کر آئی تھی۔ شکر تھا مالکن نے خود ایک بجے کا ٹائم دیا تھا۔ اگر جلدی بلاتیں تو چھوٹے کا مسئلہ ہو جاتا۔

☆☆☆

شام ڈھلے احمد گھر میں داخل ہوا تو اس کی چال میں خوشی تھی۔ پانچ سو کی دیہاڑی لگی تھی۔ وہ بچیوں کے لیے روٹی سالن کے ساتھ ٹافیاں بھی لایا تھا۔ سب باپ سے چمٹی ہوئی تھیں۔ ساجدہ نے مسکراتے ہوئے ان لمحوں کو آنکھوں میں قید کر لیا۔

"کیا ضرورت تھی باہر سے کھانا لانے کی، آلو اور آٹا لے آتے میں گھر میں پکا لیتی۔ دو پیسے بچ جاتے۔" ساجدہ کے ہاتھ میں احمد نے بچے ہوئے دو لال نوٹ دیئے تو وہ بول پڑی۔ ایک وقت کا کھانا تین سو کا آیا تھا۔ کل کے خیال سے وہ ہولنے لگی۔

"نہ بول کچھ، چھ دن بعد میری بچیوں کو ڈھنگ کا کھانا نصیب ہوا ہے۔ کل ان کے نصیب سے اور آجائے گا۔" احمد آسودہ تھا۔ بچیاں بوٹی کے لیے لڑ رہی تھیں ساجدہ نے سب کے الگ الگ حصے بنا دیے۔

☆......☆

ساجدہ کام پر جانے لگی۔ زینب نے ٹھیک کہا تھا۔ پانچ ہزار کے قریب فریم تھے۔ ڈھونڈے سے بھی کوئی دیوار خالی نہیں ملی تھی۔ مالکن نے اپنے آباؤ اجداد کی فوٹوز بھی رکھی ہوئی تھیں۔ بچپن سے جوانی تک ہر تصویر میں وہ ساجدہ کو پہلے سے زیادہ کم عمر لگی تھیں۔ گھر میں گنتی کے دو لوگ تھے مگر نوکروں کی فوج تھی۔ مالکن کی بیوٹیشن بھی صبح آتی اور رات کو جاتی تھی۔ مالکن کی فٹنس انسٹرکٹر بھی تھی جو اپنی نگرانی میں ڈائیٹ کھانا تیار کرواتی تھی۔ مالکن کو یوگا اور ایروبکس کرواتی تھی۔ ساجدہ کو رج کے مالکن کی قسمت پر رشک آ رہا تھا۔ مالک ان دنوں ملک سے باہر تھا۔ اسے اس نے صرف تصویروں میں دیکھا تھا۔ ایک بیٹا تھا جو بورڈنگ میں پڑھ رہا تھا۔ وہ لاؤنج کی تصویریں صاف کر رہی تھی۔ جب ماڈرن لباس میں بنا دوپٹے کے ٹک ٹک کرتی مالکن لاؤنج میں داخل ہوئی۔ ڈرائیور پیچھے مختلف شاپنگ بیگز اٹھائے آ رہا تھا۔

"میرے روم میں رکھو اور اے سی آن کر دینا۔ میں آ رہی ہوں کمرے میں۔" ڈرائیور کو ہدایت کرتی وہ لاؤنج میں براجمان ہو گئیں۔ دو منٹ کمرے کی درجہ حرارت بھی گوارا نہ تھی۔

"سنو کیا نام ہے تمہارا۔ خیر جو بھی ہے۔ پروین سے کہو اورنج جوس لے کر آئے۔" ساجدہ کو مخاطب کر کے حکم صادر کیا۔ ساجدہ اپنا نام اپنے لبوں تک لائی۔ سر ہلا کر کچن میں چلی گئی۔ پروین کو پیغام دے کر واپس اپنے کام پر آئی تو مالکن فون پر لگی ہوئی تھیں۔

"بس یار بہت ڈپریشن ہو رہی تھی۔ شاپنگ پر دو روز نہ جاؤں تو نیند نہیں آتی۔ میں نے جو ڈریس لیا ہے نا دیکھو گی تو داد دیے بغیر نہ رہ سکو گی۔ اس ویک میرا موڈ دبئی سے شاپنگ کا ہے۔ فیشن شو بھی ہے۔ وہ بھی اٹینڈ کروں گی۔" مالکن بول رہی تھیں اور ساجدہ آنکھیں پھاڑے اس کی گفتگو سن رہی تھی۔

"تم سے جوس کا کہا تھا۔" مالکن نے اس کی توجہ توت کرلی تھی قدرے ترش لہجے میں بولیں۔

"جج.........جی.........میں نے پیغام دے دیا ہے۔" ساجدہ گڑبڑا گئی۔

"جاؤ دیکھو کہاں مرگئی پروین۔ ذرا دیر ہوئی تو تم دونوں فارغ۔" ساجدہ الٹے پاؤں بھاگی۔

☆......☆

احمد کو بغیر بتائے یہ سلسلہ چل رہا تھا۔ احمد کی طبیعت دن بہ دن بگڑ رہی تھی۔ اس نے ہمت کر کے مالکن سے ایڈوانس رقم کی بات کی تھی۔

"زینب یہ تم کس قسم کی ملازمہ کو میرے سر منڈھ گئی ہو۔ ابھی پندرہ دن ہوئے ہیں کام کرتے اور یہ پیسوں کا مطالبہ کر رہی ہے۔ تمہیں پتا ہے مجھے اس طرح کی حرکت پسند نہیں۔ میں فکس ڈیٹ پر تنخواہ دیتی ہوں۔ تم نے اسے بتایا نہیں تھا۔" اسے جواب دینے کی بجائے مالکن نے زینب کو آواز دے کر بلایا۔ وہ گرتی پڑتی آئی تو اسے گھورنے لگیں۔

"معافی مانگتی ہوں جی۔ زینب کی غلطی نہیں ہے۔" ساجدہ کو احساس ہوتا کہ اس کی وجہ سے زینب کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا تو وہ کبھی بھی نہ کہتی۔ احمد کل سے بستر سے لگ گیا تھا اور بچیوں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ آج بھی وہ احمد سے جھوٹ بول کر گھر سے نکلی تھی۔ مالکن تنک تنک کرتی چلی گئی۔ ساجدہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"مالک اگر ہوتے تو میں تیرا کوئی بندوبست کروا دیتی مگر جانے وہ کب آئیں۔ تو ابھی سو روپے رکھ لے اس سے زیادہ میں تیری مدد نہیں کر سکتی۔ آئندہ مالکن سے بات کرنے سے پہلے مجھ سے کر لینا۔"

زینب اس کے حالات سے واقف تھی۔ اس پر ترس آگیا۔ ساجدہ آنکھوں کو خشک کرتی سر ہلانے لگی۔

☆☆☆

ڈرتے ڈرتے اس نے احمد کو اپنی نوکری کے بارے میں بتا دیا۔ اس نے ایک خاموش نظر ساجدہ پر ڈال کر چھت پر نظریں جمالیں۔

"تو نے ٹھیک کہا۔ میرے بعد بچوں کو تو نے ہی پالنا ہے۔ یہ ٹی بی مجھے قبر تک لے کر جائے گی۔" احمد اپنا مذاق اڑاتا بولا۔ ساجدہ تڑپ کر اسے بدفعالیں نکالنے سے روکتی رہی۔ اگلی رات احمد کی آخری رات تھی۔ کھانستے کھانستے جانے کس پل اس کا دم نکل گیا۔

ساجدہ نے صبح اٹھایا تو وہ اٹھا ہی نہیں۔ ساجدہ اور بچیوں کی زندگی کھلے آسمان تلے آگئی۔ اس کے پاس تو کفن دفن کے پیسے بھی نہ تھے۔ محلے والوں نے ہی اس کا انتظام کیا۔ تین دن پڑوسیوں کے گھر سے کھانا آیا۔ بچیوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ چوتھے دن پھر بھوک نے سر اٹھایا تو ساجدہ عدت سے اٹھ کر کام پر چلی گئی۔ مالکن نے اسے دیکھ کر افسوس کا اظہار کیا اور ہزار کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ چند دن سکون سے گزر گئے۔

مالک آچکا تھا۔ وہ بھی مالکن کی طرح شہزادہ تھا۔ ساجدہ اللہ کی بنائی زمین اور اس کی تخلیق کیے بندوں کے نصیب میں اتنا تضاد دیکھ کر سوچتی تھی۔ لوگوں کے پاس اتنا پیسہ آتا کہاں سے ہے اور آتا ہے تو کیا اسلام نے غریبوں کے لیے انہیں تلقین نہیں کیا۔ امیروں کو خیرات، عید، بقر عید کا انتظام ہوتا ہے۔ شاپنگ، جیولری، جوتوں، گھر کی زیبائش کے لیے روز ہزاروں خرچ کرتے ہیں۔ غریب رمضانوں میں فطرے زکوۃ کے لیے بھکاری بنے ہوتے ہیں۔

عید قربان پر چند چھیچھڑوں کی ہوس میں ہر در کھٹکھٹاتے ہیں اور انہیں دھتکار دیا جاتا ہے۔ کیا فطرہ نہ زکوۃ یا گوشت کا حق غریبوں کے لیے صرف عید پر ہے۔ باقی پورا سال کیا انہیں بھوک نہیں لگتی؟

بیگم ڈائمنڈ کا نیا سیٹ صراحی دار گردن میں پہنے صاحب سے داد لے رہی تھیں اور آنسو ساجدہ کے دل پر گر رہے تھے۔

چھوٹے کی طبیعت کئی دنوں سے خراب تھی۔ وہ دن گن گن کر گزار رہی تھی۔ تنخواہ ملنے میں ابھی دو دن باقی تھے۔ مالکن نے جو ہزار روپے دیئے تھے وہ بچا بچا کر بھی خرچ ہو گئے تھے۔ گھر کا کرایہ بھی سر پر آ گیا تھا۔

دو ہزار میں وہ بچوں کے پیٹ کا ایندھن بھرتی، کرایہ دیتی یا دوا دلاتی۔ اس نے زینب سے دو تین گھروں کا اور کام دلوانے کا کہا تھا۔ اسے اپنے بچوں کے لیے ماسی بننا تھا مگر کہیں کوئی جگہ نہیں تھی۔ احمد نے اسے زمانے سے بچا کے رکھا تھا مگر نصیب نہ بدل سکا۔ چھوٹا رات بھر سانس ٹھیک طرح سے نہ لے پانے کے باعث روتا رہا۔ صبح وہ نڈھال سے بچے کو تھپکی دے کر سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بچیاں اسکول سے آ گئی تھیں۔ اس کا دل کام پر جانے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر مزید چھٹی مالکن کو چراغ پا کر دیتی۔ دو سوکھی روٹی اور ایک پیالی چائے پانچ بچیوں کے آگے رکھ کر وہ واپس بیٹے کے پاس آ گئی۔

''اماں!'' تیسرے نمبر کی بیٹی اس تک آئی۔

''پیٹ نہیں بھرا۔'' اندر کو دھنسے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے اس نے رونی صورت بنا کر کہا۔

''کل میں اپنی بیٹی کو پیٹ بھر کر کھانا کھلاؤں گی۔ ٹھیک ہے اب جاؤ شاباش، اسکول کا کام کرو۔'' ضبط کر کے اس نے بیٹی کے میلے بالوں پر پیار کیا۔ صابن شیمپو جیسی عیاشی وہ افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔

☆☆☆

زینب کو ڈھونڈتی وہ اوپر آئی تو زینب ایک کمرے سے نکلتی نظر آئی۔ اسے اچانک سامنے دیکھ کر زینب کا رنگ ایک پل کو بدلا اگلے پل وہ نارمل ہو گئی۔

''خیریت تو یہاں! تجھے اس طرف کس نے آنے کو کہا۔'' زینب گڑبڑا گئی۔

''تجھے ڈھونڈتی آئی ہوں۔ کئی ایک بار تجھے اس کمرے میں آتے دیکھا تھا۔'' ساجدہ کو اس کے ڈرنے کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔

''اچھا دیکھ لیا ہے تو کسی کو بتانا مت۔'' زینب نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے اسے تنبیہ کی۔

''تیرے پاس کچھ پیسے ہوں گے۔ مجھے چھوٹے کی دوا لینی ہے۔'' ساجدہ کسی قصے میں الجھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے سر پر اپنے سو مسائل تھے۔

''پیسے تو نہیں ہیں میرے پاس۔'' زینب کے جواب پر ساجدہ کا چہرہ بجھ گیا۔

''میرا بچہ مر جائے گا زینب، وہ بھی احمد کے پاس چلا جائے گا۔ یا اللہ میں کہاں جاؤں۔'' نڈھال ہو کر ساجدہ گرل سے ٹیک لگا کر روہانسی ہو کر رو پڑی۔ زینب اس کے قریب آ کر اس کا کندھا سہلانے لگی۔ دفعتاً بند دروازے کو دیکھتے اسے ایک خیال کوندا۔

''پہلے میں بھی تیری طرح کلستی رہتی تھی لیکن جب سے ضمیر کی طرف سے آنکھ بند کی ہے تب سے میرے حال کچھ بہتر ہیں۔ صاحب میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ جب جتنے روپے کہتی ہوں دے دیتے ہیں۔''

ساجدہ چپ کر کے زینت کی کہانی سن رہی تھی۔ اس نے زینت کے منہ سے کئی بار صاحب کی تعریف سنی تھی۔

''اچھا پھر مجھے بھی مدد دلوا دے۔'' سجدہ کی آس بندھی۔

''لیکن اس کے لیے تجھے صاحب کو خوش کرنا ہوگا۔'' زینب نے اٹک اٹک کر کہا۔

''خوش مطلب!'' ساجدہ ناسمجھی سے زینب کو دیکھنے لگی جو نظریں چرا رہی تھی اور جب اس کے انداز سے مدعا سمجھ آیا تو وہ ساری جان سے کانپ گئی۔ ''زینب!''

''بھوک بہت بری بلا ہے ساجدہ، ضمیر، عزت، غیرت سب کو نگل جاتی ہے۔ ہم غریبوں کو پیٹ کی بھوک لے ڈوبتی ہے تو امیر کو جسم کی۔''

زینب کا لہجہ بہت دکھی تھی۔ ساجدہ ساکت تھی۔

''آج صاحب کا موڈ ہے۔ یہ ان کا خاص کمرہ ہے۔ جس کا بیگم کو بھی علم نہیں۔ آج مجھے اجازت نہیں ہے۔ صاحب ناراض ہوئے تھے۔ باتوں باتوں میں تیرا بھی پوچھا۔ اگر تو چاہے تو......'' زینب بات ادھوری چھوڑ کر سارا مفہوم سمجھا کر چلی گئی اور ساجدہ کو جیسے پل صراط پر تنہا چھوڑ گئی۔ ساجدہ نے دھندلائی آنکھوں سے بند دروازے کو دیکھا۔ اس کی نظروں کے سامنے بھوک سے بلکتی بچیاں آ گئیں۔ اب اسے جلدی طے کرنا تھا کہ بچیوں کے پیٹ کی بھوک اہم ہے یا نہیں اور...... کچھ دیر بعد اس کے قدم خود بخود اس بند دروازے کی جانب اٹھ رہے تھے۔

☆☆☆

گیارہویں سچ بیانی



ٹھوکر

ثمینہ طاہر بٹ

اُس دوشیزہ کی کتھائے خاص' جو اگر حالات کا شکار ہو جاتی تو کہیں کی نہ رہتی

کہتے ہیں کہ انسان کے نصیب میں جو لکھا ہوتا ہے، وہ اُسے ہر حال میں مل کر ہی رہتا ہے، اور اگر کوئی چیز قسمت میں نہ ہو تو لاکھ کوشش کے باوجود اُس کا حصول ممکن نہیں ہوتا۔

" زینب بنتِ محمد قاسم! آپ کو بعوض پچیس ہزار روپیہ (25000) حق مہر موجل سکہ رائج الوقت، اصغر شاہ ولد شاہنواز شاہ کے نکاح میں دیا جاتا ہے، کیا آپکو قبول ہے؟؟" ہال میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی، اور اس خاموشی میں مولانا صاحب کی آواز گونج رہی تھی۔ زینب

سرخ عروسی لباس میں ملبوس سر جھکائے بیٹھی تھی۔ مولانا صاحب نے جواب نہ پاکر ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا تھا مگر جواب اب بھی ندارد۔ اُسکی طویل خاموشی نے سارے ہال میں ایک بار پھر سراسیمگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ قاسم صاحب جو پہلے ہی زرد چہرہ لیے نڈھال سے ایک طرف بیٹھے تھے، اُن کی آنکھوں سے بیساختہ اشک بہنے لگے تھے اور یہ ہی حال اُن کی بیگم سلمیٰ کا بھی ہو رہا تھا۔ وہ دونوں تو ابھی "گذرے وقت" کی تباہ کاریوں اور خوف سے ہی پوری طرح باہر نہیں نکل پائے تھے کہ زینب کی طرف سے اختیار کی جانے والی پراسرار خاموشی نے انہیں دہلا کر رکھ دیا تھا۔

''زینب بیٹا! میں آپ سے پھر پوچھ رہا ہوں، آپ کو یہ نکاح قبول ہے؟'' مولانا صاحب نے چند لمحے انتظار کے بعد اُس کے جھکے سر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''نہیں!! نہیں مجھے یہ نکاح قبول نہیں ہے۔ سنا آپ نے سنا۔ آپ سب نے مجھے اِس آدمی کے ساتھ نکاح قبول نہیں ہے!" جھکے سر کے ساتھ بہت مضبوط اور ٹھوس انداز میں کہتے ہوئے اُس نے جیسے دھماکہ کر ڈالا تھا۔ اُسکے منہ سے نکلنے والے انکار نے "جلتی پر تیل کا" کام کیا تھا۔ بڑی مشکل سے بند ہونے والی چہ میگوئیاں ایک بار پھر شروع ہو چکی تھیں۔ محمد قاسم اور سلمیٰ قاسم پر جیسے یومِ حساب آج ہی آ گیا تھا۔ لوگوں کی انگارے برساتی زبانیں، رشتہ داروں کی آگ لگاتی نگاہیں ابھی پوری طرح تھم بھی نہ پائیں تھیں کہ قدرت کے ساتھ ساتھ زینب بنتِ قاسم نے انہیں ایکبار پھر آگ اُگلنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

محمد قاسم کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ چھوٹی سی کریانے کی دکان کے مالک تھے جو اُنکے علاقے میں خوب اچھی چلتی تھی۔ بیٹے جیسی نعمت سے قدرت نے انہیں نوازا نہیں تھا، مگر انہوں نے اپنی تینوں بیٹیوں کو ہی رب کی رحمت سمجھتے ہوئے انہیں ناز و نعم سے پالا تھا، بغیر کسی گلے شکوے کے۔ سلمیٰ، اُن کی شریکِ حیات ایک سلیقہ شعار، سمجھدار اور سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ کم آمدن میں بھی اچھے طریقے سے گھر چلانے کے علاوہ انہوں نے اپنی تینوں بیٹیوں عفت، رفعت اور زینب کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی تھی۔ انہیں مقدور بھر پڑھایا بھی تھا اور اُن کی شادیوں کے لیے بھی کچھ نہ کچھ جمع جوڑ کرتی رہتی تھیں، یہی وجہ تھی کہ جیسے جیسے اُن کے مناسب رشتے آتے گئے ویسے ویسے وہ دونوں بڑی بیٹیوں کے فرائض سے بااحسن فارغ ہوتے چلے گئے۔ عفت اور رفعت کی شادیاں اُنہوں نے اپنے جیسے ہی متوسط خاندانوں میں کی تھیں اور وہ دونوں اپنے اپنے گھر میں بہت خوش تھیں۔

زینب اُن کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی تھی، خوش اخلاق، ملنسار اور بیحد حساس۔ وہ شروع سے ہی ماں سے زیادہ باپ کے نزدیک تھی۔ اس کے بابا اُس کے آئیڈیل تھے۔ محبت تو وہ اپنی امی اور آپیوں سے بھی بہت کرتی تھی مگر بابا بابا میں تو اُسکی جیسے جان تھی۔ جس طرح اُس کے بابا اُس کی ہر خوشی ہر خواہش پوری کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے، اسی طرح وہ بھی اپنے بابا کے لیے، اُن کی خوشی، اُن کی خواہش، اُن کی عزت کی لیے اپنی جان بھی دے سکتی تھی۔ شاہنواز شاہ، محمد قاسم کے پرانے ملنے والے تھے، لیکن یہ دوستی گھر سے باہر تک ہی محدود تھی۔ شاہنواز شاہ اپنے حلقہ احباب میں بہت خوش اخلاق اور کھلے ہاتھ سے خرچ کرنے والے مشہور تھے۔ دوستوں کی مدد کے لیے جیسے ہر لحہ تیار ہوں، بہت سوشل، بہت متحرک انسان۔ رفعت کی شادی کے موقع پر محمد قاسم نے اپنے چند اور دوستوں کے ساتھ اُنہیں بھی مدعو کیا تھا اور یہیں سے ان دونوں خاندانوں کا میل ملاپ شروع ہوا۔ شاہنواز شاہ کی دو بیٹیاں اور تین بیٹے تھے۔ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو وہ بھی بیاہ چکے تھے جبکہ اصغر شاہ اور حمیرا کی ذمہ داری ابھی اُن کے کاندھوں پر موجود تھی۔ اُن کی بیگم بہت تیز مزاج اور لالچی قسم کی خاتون تھیں جو اپنا مفاد ہمیشہ سب سے اوپر رکھتیں اور باقی سب کچھ بعد میں۔ سلمیٰ قاسم کو اُن سے ملکر ہمیشہ ہی ایک عجیب سا احساس ہوتا تھا کیا؟؟ یہ وہ خود بھی سمجھ نہ پاتی تھیں، مگر کچھ تھا ایسا ضرور جو اُنہیں ہمیشہ پن کی طرح چبھتا تھا۔

زینب نے جیسے ہی بی اے کے پیپرز دیئے، محمد قاسم نے شاہنواز شاہ کے بے حد اصرار اور چاہت کے پیشِ نظر زینب کا رشتہ اصغر شاہ کے ساتھ طے کر دیا۔

"یہ آپ نے کیا کر دیا عفت کے بابا! آپ ان لوگوں کو ہاں کرنے سے پہلے ایک بار تو مجھ سے بھی مشورہ کر لیتے؟؟ ایک بار تو میری بچی کی رضا پوچھ لیتے؟؟ عفت کے بابا، کیا میری اولاد پر میرا اتنا بھی حق نہیں تھا کہ آپ اُس کے نصیب کا فیصلہ کرتے ہوئے مجھے بھی اعتماد میں لے لیتے؟؟" جب

سے قاسم نے سلمٰی کو زینب اور اصغر کے رشتے کے حوالے سے بتایا تھا، وہ اُن سے خفا خفا سی نظر آ رہی تھیں اور پھر اُن کے استفسار پر وہ زیادہ دیر تک اُن سے اپنے دل کی بات چھپا نہیں سکیں اور اُن سے گلہ کر ہی بیٹھیں۔

"ارے!! یہ کیا کہہ رہی ہیں بیگم آپ؟؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا کہ میں آپ سے مشورہ کیے بغیر کوئی فیصلہ کر لوں۔ آپ جانتی تو ہیں کہ شاہنواز بھائی اور سکینہ بھابی کتنے عرصے سے اپنی زینب کا ہاتھ مانگ رہے تھے، رفعت کی شادی کے بعد سے طلب گار ہیں وہ ہماری بٹیا کے۔ پہلے تو چلو اس کی تعلیم والا معاملہ تھا، مگر اب خیر سے وہ بھی مکمل ہوا۔ اب تو کوئی اور جواز رہ نہیں گیا تھا اُن شریف لوگوں کو لٹکانے کا، اس لیے میں نے بھی ہامی بھر لی۔ ویسے بھی بیگم، وہ اتنی چاہت سے، اتنے اصرار سے ہماری بچی کا ہاتھ مانگ رہے تھے تو مجھے اچھا نہیں لگا کہ اب بھی اگر ہم سوچنے کے لیے مزید وقت مانگیں۔ تو میرے نزدیک تو یہ کھلم کھلا کفرانِ نعمت ہی ہوگا۔!

" انہوں نے سلمٰی کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے رسان سے سمجھایا تو وہ بھی سر ہلا کر رہ گئیں کہ کہہ تو وہ بھی ایک طرح سے ٹھیک ہی رہے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارے معاملات طے ہوتے چلے گئے۔ دونوں خاندان چونکہ پہلے ہی ایک دوسرے کو جانتے تھے، اس لیے مزید کسی قسم کی چھان پھٹک اور پوچھ گچھ کے بغیر فوراً ہی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی۔ جس دن تاریخ رکھی گئی، اُسی دن زینب کے سر پر شگنوں کی چنری ڈال کر اُس کی اُنگلی میں اصغر شاہ کے نام کا چھلا پہنا دیا گیا۔ آس پڑوس اور خاندان برادری میں مٹھائی بانٹ کر اس رشتے اور شادی کی جیسے سب کو اطلاع دے دی گئی۔ جس دن سے یہ نیا رشتہ استوار ہوا تھا زینب کی سسرالیوں کے ہر دوسرے روز چکر لگنے لگے تھے۔ حالانکہ شادی میں کون سے سال چھ مہینے پڑے تھے ابھی، بس گنتی کے چند ہفتے ہی تو تھے شادی کے درمیان، لیکن ان لوگوں کی بیتابیاں، والہانہ پن اور محبتوں کے عظیم الشان مظاہرے سلمٰی کے ساتھ ساتھ زینب کو بھی عجیب سے احساس سے دوچار کر رہے تھے، مگر پھر وہ اسے ان کی محبت اور چاہت سمجھ کر نظر انداز کر گئیں۔ "نہیں نہیں مجھے یہ نکاح قبول نہیں سنا آپ نے سنا آپ سب نے مجھے اس آدمی کے ساتھ نکاح قبول نہیں ہے۔ مجھے اس خاندان کا ساتھ قبول نہیں ہے نہیں ہے قبول۔!!!" "یہ کیا کہہ رہی ہو زینب!! ہوش میں تو ہو تم؟؟ کیا بک رہی ہو؟؟" عفت آپی نے آگے بڑھ کر جیسے اُسے جھنجھوڑ ڈالا تھا، مگر وہ اپنے ہوش میں تھی ہی کہاں، جو اُسے عفت آپی کے الفاظ سمجھ میں آتے۔ اُسکے کانوں میں تو صرف اُسکے بابا کی سسکیاں، اُس کی امی کے واسطے اور منتیں ہی گونج رہی تھیں۔ پھر اُسے کسی اور کی آواز بھلا آتی بھی تو کیسے؟؟ "ہاں ہاں!! ٹھیک کہہ رہی ہوں، نہیں کرنی مجھے شادی اِس لالچی خاندان میں۔ کیا قصور ہے میرے بابا کا؟؟ تین تین بیٹیوں کا باپ ہونا جرم ہے انکا یا شریف، عزت دار ہونا گناہ بن گیا ان کا؟؟ یا پھر ان لوگوں کے جھوٹے خلوص اور چاہت پر بھروسہ کرنے کی غلطی سرزد ہو گئی میرے والدین سے؟؟؟ کیا کمی چھوڑی تھی ہمارے والدین نے ہماری تربیت میں، پڑھایا لکھایا، جگر کا خون پلا کر جوان کیا۔ اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر اِن لوگوں کا گھر بھرنے کے لیے اپنی حیثیت سے بڑھ کر سامان اکٹھا کیا۔ اپنی ضرورتوں کو پس پشت ڈال کر اِن لوگوں کی فرمائشیں پوری کرنے کی کوشش کرتے رہے، مگر صلہ کیا دیا اِن بے حس لوگوں نے؟؟ بھری محفل، بھری برادری میں میرے شریف، غریب بابا کو ذلیل کر کے رکھ دیا گیا کس کے لیے؟؟ ایک موٹر سائیکل کے لیے؟؟ ساس کے سونے کے کنگن اور نندوں جیٹھانیوں کے جھمکے بالیوں کے لیے؟؟؟؟" عفت کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے زینب ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی تھی اور پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتی ہوئی بولتی چلی گئی۔ ہال میں بھنبھناتی آوازیں یکلخت سناٹے میں تبدیل ہو گئی تھیں اور سب لوگ منہ کھولے آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھے جا رہے تھے جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔ "ارے!! کوئی تو پوچھے اِن سے! کیا انہیں اللہ سے ڈر نہیں لگتا؟؟ کیا انہیں اللہ کا خوف نہیں ہے؟؟ کسی مجبور انسان کی، کسی مجبور باپ کی عزت اس طرح بھرے بازار میں اُتارتے ہوئے لوگ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ عزت اور ذلت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے، وہ چاہے تو ایک پل میں عزت داروں کو بے عزت کر دے، اور اگر چاہے تو بے عزتوں کو عزت کی خلعت سے نواز دے۔ یہ لوگ خود کو خدا سمجھ بیٹھتے ہیں کہ جب جسے چاہیں گے ذلیل و رسوا کر دیں گے اور انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں!! آپ سب بھی تو بیٹیوں والے ہیں؟؟ مولانا صاحب، آپ کی بھی تو کوئی بیٹی ہوگی ناں، تو آپ سب لوگ بھی خاموش تماشائی

نے میرے امی، بابا کی ذلت کا تماشا دیکھتے رہے، کیوں؟؟ آخر کیوں؟؟ یہ یہ شاہنواز شاہ صاحب، کتنی جلدی انہوں نے اپنے چہرے سے خوش اخلاقی اور امارت کا نقاب اُتار پھینکا، کیوں؟؟ اور یہ یہ جناب عزت مآب اصغر شاہنواز شاہ صاحب، جہیز اور مال و دولت کے لالچ میں اتنے اندھے ہو گئے کہ جب اِن کے والدین نے کہا "بارات واپس جائے گی" تو یہ فٹ سے اُٹھ کھڑے ہوئے، اور جیسے ہی شوکت بھائی، عباس بھائی اور الطاف انکل نے اِن کے سب مطالبات پورے کر دیے، انہیں آرڈر ملا "بیٹھ جاؤ، دلہن جہیز سمیت لے کر جائیں گے" تو یہ کاٹھ کے اُلو کی طرح بیٹھ گئے۔ ایسے روبوٹ کہ جس کا ریموٹ کسی اور کے ہاتھ میں ہو۔ شادی کرنے سے بہتر ہے کہ میں کنواری رہ کر اپنے والدین کی خدمت کروں؛ اُن کی دعائیں لوں نہ کہ ان لالچی لوگوں کے لالچ کا پیٹ بھرنے کے لیے نکاح نامے پر سائین کر کے اپنے بابا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قرضے کے بوجھ تلے دبا دوں۔ اپنے ساتھ ساتھ ان کی دنیا اور آخرت بھی برباد کر دوں۔ نہیں کرنی ہے مجھے شادی آپ لوگ بارات واپس لے جاسکتے ہیں۔!!

"زینب کا صدمے اور دکھ سے برا حال تھا اس لیے وہ بنا کچھ سوچے سمجھے مسلسل روتے ہوئے اونچا اونچا بولتی چلی گئی۔ اُس کی حالت اور اُس پر اس کی کچی کھری باتوں نے ہال میں سناٹا طاری کر دیا تھا۔ باراتیوں سمیت تمام مہمانوں کی نگاہیں ہی نہیں گردنیں بھی شرم سے جھکی جا رہی تھیں۔ قاسم صاحب اور سلمٰی پر غشی سی طاری ہوئی جا رہی تھی۔ ہال میں موجود سب بیٹیوں کے والدین خود کو قاسم صاحب کی جگہ پر رکھ کر سوچ رہے تھے شائد، اسی لیے کئی لوگوں کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ عفت اور رفعت کھڑے آنسو بہا رہی تھیں۔ آن کی آن میں ہی سارا ماحول تبدیل ہو کر رہ گیا تھا۔ شاہنواز شاہ اور سکینہ بیگم کو تو جیسے لینے کے دینے ہی پڑ گئے تھے، انہیں سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ اس بگڑی صورت حال پر قابو کیسے پائیں۔ بارات تو اپنے مقررہ وقت پر ہی آ گئی، اور سب معاملات خوش اسلوبی سے جاری تھے کہ عین نکاح کے وقت سکینہ بیگم اور ان کی بیٹیوں کی طرف سے جہیز دیکھنے کی عجیب و غریب فرمائش داغ دی گئی۔ اس نازک وقت میں ان کی طرف سے ایسی کسی بات کی توقع کسی کو بھی نہ تھی، اس لیے وہ سب پریشان ہو گئے۔ ظاہر ہے فنکشن شادی ہال میں ارینج کیا گیا تھا اور جہیز کا سامان سارا گھر میں تھا۔ اب ایسی حالت میں سکینہ بیگم کی فرمائش بھلا کیسے پوری کی جاسکتی تھی۔ سلمٰی، عفت، رفعت نے انہیں لاکھ اپنی مجبوری بتانے، انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھیں۔ سلمٰی کی کوئی بات وہ سننے، سمجھنے کو تیار ہی نہیں تھیں۔ جب سلمٰی اور ان کی بیٹیوں کی مدد کو اُن کی کچھ رشتہ دار خواتین آ گئیں تو سکینہ بیگم نے اسے بھی اپنی بے عزتی کے مترادف سمجھا اور پھر ایک کے بعد ایک اُن کی طرف سے مطالبات کی فہرست پیش کی جانے لگی۔ اُن کے مطالبات کی لمبی لسٹ میں پہناونیوں میں اعلیٰ ترین ملبوسات کے ساتھ ساتھ سونے کے زیورات کی ڈیمانڈ بھی شامل تھی۔

قاسم صاحب عین وقت پر شاہنواز اور سکینہ کے اس طرح رنگ بدلنے پر حق دق ہی رہ گئے تھے۔ "شاہنواز بھائی!! یہ بھابی، کس طرح کی باتیں کر رہی ہیں، آپ انہیں سمجھائیں، کچھ تو میری عزت کا خیال!!

"دیکھو قاسم یار؛ برا مت ماننا، یہ عورتوں کے معاملات ہیں اور انہیں ہی حل کرنے دو، تم فکر مت کرو ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا!" "یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ شاہنواز انکل! آنٹی بھری محفل میں ہمیں ذلیل کر رہی ہیں اور آپ اسے عورتوں کا مسئلہ کہہ رہے ہیں؟؟ یعنی کہ حد ہی ہو گئی!!" عباس (رفعت کے شوہر) نے شاہنواز شاہ کی بات کا جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا تو شاہ صاحب کے ماتھے پر بھی بیشمار بل نظر آنے لگے، اور پھر بات بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھ گئی کہ ان لوگوں نے اپنے مطالبات پورے نہ ہونے کی صورت بارات واپس لے جانے کا ہی اعلان کر دیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر وہ سب حقیقتاً ہول کر رہ گئے اور پھر چاروناچار ان کے ناجائز مطالبات مان لیے گئے، اور اس میں عباس، شوکت کے علاوہ قاسم کے بچپن کے دوست الطاف نے نمایاں کردار ادا کیا۔ جیسے ہی سارا معاملا بقول شاہنواز شاہ حل ہوا، ایک بار پھر نکاح کی رسم کا آغاز کیا گیا مگر، زینب نے پل بھر ہی سارا پانسہ ہی پلٹ کر رکھ دیا کیونکہ اس کی ہمت اب جواب دے گئی تھی۔ اب وہ مزید اپنے امی بابا کی انسلٹ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

"ہاں ہاں جا رہے ہیں واپس! ہمیں بھی نہیں بیاہنا اپنے بیزبان بیٹے کو اتنی بدزبان، جھگڑالو اور بدتمیز لڑکی کے

ساتھ۔ ارے ہمیں کوئی اپنی نسل خراب کرنی ہے ایسی بے ہدایتی کو اپنی بہو بنا!!"

"بس!! بہت ہو گیا! خبردار..... خبردار جو اب آپ نے کوئی فضول بات کی تو۔ ہماری بیٹی ہمارا غرور ہے، مان ہے ہمارا، بہن ہماری اور اب ہم اپنی بیٹی، اپنی بہن کے بارے میں مزید کوئی غلط بات برداشت نہیں کریں گے اور نہ ہی کسی کو اپنے بابا اور امی کی بے عزتی کرنے دیں گے۔ بہت برداشت کر لی آپ لوگوں کی بکواس؛ اب اور نہیں۔ اب آپ کے حق میں یہی بہتر ہے کے اپنے باراتیوں کو اکٹھا کریں اور چلتے پھرتے نظر آئیں یہاں سے۔ ہماری بچی کا اللہ مالک ہے، اگر بارات واپس جانے سے ہماری بے عزتی ہو گی تو خالی ہاتھ واپس جانے سے ذلت آپ کی بھی ہو گی، لوگ انگلیاں آپکی طرف بھی اٹھائیں گے، اگر ہم زمانے کو جواب دیں گے تو دنیا آپ سے بھی جواب طلب کرے گی۔ جائیں اور جا کر لوگوں کو اپنا یہ مکروہ لالچی چہرہ دکھائیں تا کہ لوگوں کو بھی پتا چلے کہ آج کی لڑکیاں اپنے حق، اپنی عزت کے لیے آپ جیسے لوگوں کے سامنے ڈٹ جانے کی ہمت بھی رکھتی ہیں اور اپنے والدین کی عزت کے لیے آپ جیسوں کا راستہ روک بھی سکتی ہیں۔!!" زینب کے انکار اور اس کی کھری باتوں نے سکینہ بیگم کو آگ بگولہ کر ڈالا اسی لیے وہ بکتی جھکتی اصغر شاہ کا بازو کھینچتے ہوئے اُٹھی تھیں مگر، عباس اور شوکت نے آگے بڑھ کر انہیں مزید بولنے سے اس طرح روکا کہ پھر کوئی کچھ بول ہی نہ سکا۔

"زینب بنتِ محمد قاسم!! آپ کو بعوض دو لاکھ روپیہ حق مہر موجل سعد احمد ولد الطاف احمد کے نکاح میں دیا جاتا ہے، آپ کو قبول ہے؟؟" "قبول ہے!!" اصغر شاہ کی بارات واپس چلے جانے کے بعد قاسم صاحب بے حد نڈھال ہو چکے تھے جبکہ سلمیٰ تو بے ہوش ہی ہو گئی تھیں۔ عفت اور رفعت کا بھی رو رو کر برا حال ہو رہا تھا۔ سارا ماحول یکدم تبدیل ہو کر رہ گیا تھا۔ کافی مہمان واپسی کی راہ لے چکے تھے اور جو قریبی عزیز بچے تھے وہ زینب کی "بیوقوفی" پر دبی زبان میں تبصرے کرتے اُس کی قسمت پر مستقل خرابی اور بربادی کا لیبل لگانے میں مصروف تھے، اور اسی وقت الطاف احمد نے اپنی بیگم اور بیٹے کی ایما پر آگے بڑھ کے بات سنبھال لی۔

"میں تمہارا احسان کیسے اُتار پاؤں گا یار، ایک ہی دن میں تم نے دوسری بار میری اس طرح مدد کی، میری عزت رکھنے کے لیے تم اس حد تک جا رہے ہو، میں۔۔!" قاسم صاحب نے بے ساختہ روتے ہوئے اُن کے سامنے ہاتھ ہی جوڑ دیے تھے۔

"ارے یار! احسان کیسا؟؟ یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم، میری محبت کو احسان کا نام مت دو یار۔" الطاف احمد نے اُن کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا اور انہیں گلے سے لگا کر بھینچ لیا۔

"تو اور کیا! اس میں احسان کی کیا بات ہے بھائی جان؛ یہ تو اُلٹا آپ کا احسان ہو گا ہم پر، میں سچ کہہ رہی ہوں بھابی، زینب بیٹی تو ہمیں شروع سے ہی بہت پسند ہے۔ میں تو جب بھی اپنی اکلوتی بہو کا تصور کرتی تو زینب ہی چھم سے میری نگاہوں کے سامنے آ جاتی تھی۔ یہ تو ہم سے ہی دیر ہو گئی جو ہم اپنے دل کی بات آپ تک نہ پہنچا سکے، ہم سعد کی جاب کا انتظار کرتے رہے اور جیسے ہی اسے نوکری ملی ہم نے آپ کی طرف آنے کا پروگرام بنایا ہی تھا کہ آپ نے اس کی بات طے ہو جانے کی خبر سنا دی۔ ہم تو دل ہی مسوس کر رہ گئے تھے، مگر ہمیں کہاں خبر تھی کہ ہم بجھے دل کے ساتھ یہاں آئیں گے اور اپنے دل کی مراد، اپنے گھر کی رونق اپنے آنگن کی چاندنی ساتھ لیے خوشی خوشی واپس جائیں گے۔ بس؛ اب آپ زیادہ نہ سوچیں اور ہماری امانت ہمیں سونپ دیں!

" مسز الطاف نے بڑی محبت سے سلمیٰ کو گلے لگاتے ہوئے اتنے مان، اتنی چاہت سے کہا تو وہ سجدہ شکر بجا لاتے ہوئے ان کی بات مان گئے۔ اور پھر وہیں اُسی جگہ سعد اور زینب کا نکاح پڑھا دیا گیا۔

"اور ویسے بھی بابا، کہتے ہیں ناں کہ جو جس کا نصیب ہوتا ہے وہ اُسے ضرور ملتا ہے۔ چاہے دو پہاڑوں کے بیچ ہی کیوں نہ ہو۔ اور جو نصیب میں نہ ہو، وہ کبھی نہیں ملتا چاہے اس کے دو ہونٹوں کے درمیاں ہی کیوں نہ ہو، تو واقعی مان گئے کہ زینب سعد کا ہی نصیب تھی، اصغر شاہ کا نہیں۔ لہٰذا وہ اُسے مل کر ہی رہی۔!

" عباس بھائی نے نکاح کے بعد سعد سے گلے ملتے ہوئے شرارت بھرے انداز میں کہا تو سب بے اختیار ہنسنے لگے۔ اور وہ ہی مہمان جو تھوڑی دیر پہلے تک زینب کے "نصیب" پر افسوس کر رہے تھے، اب اُسے رشک بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دلی دعاؤں سے نواز رہے تھے۔

☆☆☆

کشتیاں سب جلا ڈالیں

سیمیں غزالہ نیہاں

اس بیوی کی کہانی، جس نے اپنے شوہر اور بچوں کو دوبارہ پانے کے لیے حلالہ کیا تھا مگر......



کچھ لوگ جلد بازی اور غصے میں ذرا سی بات کو بنیاد بنا کر اپنی بیوی...... شریک حیات...... دکھ سکھ کی ساتھی کو یکدم تین طلاق دے دیتے ہیں۔ اس بات کا پتا بزرگوں اور متعلقین کو اس وقت چلتا ہے جب طلاق موثر ہو چکی ہوتی ہے اس کے بعد جب غصہ ٹھنڈا ہوتا ہے اور اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو سر پیٹ کے رہ جاتے ہیں۔ اس کے بعد فتویٰ تلاش کرتے پھرتے ہیں جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ اسلام میں اکٹھے تین طلاق دینے کا حکم نہیں ہے۔ اس لیے طلاق موثر نہیں ہوئی۔ یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام میں طلاق کا لفظ ہونٹوں سے ادا ہوتے ہی قائم ہو جاتی ہے۔ اس میں نیت کا دخل چاہے نہ بھی ہو۔ سوال یہ بھی ہے کہ آخر اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کی ہی کیوں؟

اس لیے مذہب اسلام میں غصہ حرام ہے۔ کیونکہ غصے میں انسان اپنا ہوش و حواس کھو دیتا ہے اور جو چیز ہوش سے بیگانہ کر دے وہ حرام ہے۔ اللہ نے جائز کاموں میں سب سے ناپسندیدہ فعل طلاق دینا قرار دیا ہے۔ زریں اور زبیر کے ساتھ بھی یہ ہی ہوا۔ غصے میں ہوش و حواس کھو دینے کی وجہ سے زبیر نے اپنی محبت کرنے والی بیوی کو یکدم تین طلاق دے دیں۔ خود

زریں بھی زبیر سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔ دونوں کا جب غصہ اترا تو پتا چلا کہ ایک لفظ نے دونوں کے درمیان مضبوط رشتہ ختم کر دیا ہے۔ ریشم کی وہ خوب صورت ڈوری ٹوٹ چکی تھی جس نے ان دونوں کو ایک خوب صورت رشتے میں باندھا ہوا تھا۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کو معلوم تھا کہ دوبارہ اس رشتے کو استوار کرنے کی کتنی سخت شرط ہے۔ گھر کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ میاں بیوی اور بچے جو ازدواجی زندگی کا خوب صورت بندھن ہے وہ ٹوٹ چکا تھا۔

عورت وہ مظلوم ہستی ہے جو ہمیشہ ناکردہ گناہوں کی سزاوار ہوتی ہے۔ ہمارا معاشرہ ایسا ہے کہ مظلوم کو ظالم سمجھا جاتا ہے۔ دوسروں کی غلطی اور گناہوں کو بھی اس پر ڈال کے اس کو خوب بدنام کیا جاتا ہے۔ اس لیے عورتیں بدنامی سے بچنے کے لیے جہنم میں رہنا بھی خوشی سے قبول کر لیتی ہیں۔ عورت اپنی سب کشتیاں جلا کر کسی کا گھر آباد کرتی ہے۔

اپنی خواہشات...... اپنی تمنائیں...... اپنی خوشیاں...... اپنی آرزوئیں اپنے جذبات حتیٰ کہ اپنی جان کی قربانی دے کر بھی۔ اپنا گھر آباد رکھنا چاہتی ہے۔ وہ گھر

جو اس کا اپنا گھر کبھی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے لیے کبھی نہیں جیتی دوسروں کے لیے مرتی ہے۔

☆......☆

ماں باپ کے مرنے کے بعد زریں کو خالاؤں اور ماموؤں نے ہتھیلی کا چھالا بنا کر پالا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی جنبش سے اس کی خواہشات کو سمجھ لیا جاتا تھا اور اس کے زبان کھولنے سے پہلے ہی اس کی خواہش پوری کر دی جاتی تھی۔ یہ سوچے بغیر کہ آخر وہ ایک لڑکی ہے اور ہر لڑکی کو ایک نہ ایک دن میکے کی دہلیز چھوڑ کر سسرال جانا پڑتا ہے۔ وہاں کیسے حالات کا سامنا کرنا پڑے ہر کوئی نہیں جانتا۔ اس لیے لڑکیوں کی تربیت ایسی ہونی چاہیے کہ وہ ہر قسم کے حالات سے سمجھوتا کر سکیں۔

☆......☆



زرین کی بدقسمتی اس وقت سامنے آگئی جب وہ شعور کی منزل پر بھی نہ پہنچی تھی کہ اس کی والدہ کا اچانک انتقال ہوگیا۔ باپ نے قبر کی مٹی سوکھنے سے پہلے ہی دوسری شادی کرلی۔ سوتیلی ماں کا سلوک برا نہیں تو اچھا بھی نہیں تھا۔ اس نے ان بچوں پر ظلم تو نہیں کیا مگر ذمہ داری بھی نہیں اٹھائی۔ زرین اور اس کا بھائی دو ہی تو تھے اور اتنے چھوٹے بھی نہیں تھے کہ سوتیلی ماں کو ان کی ذمہ داری اٹھانی پڑتی۔ وہ اپنا سب کام خود کرلیتے تھے۔ البتہ ان کو تھوڑی بہت مدد کی ضرورت تھی۔ باپ تو سوتیلی ماں گھر میں لا کر بھول ہی گیا کہ بچوں کی کیا خواہشات ہیں، کون سی ضروریات ہیں۔ وہ اتنا غافل تھا سمجھتا تھا کہ دوسری ماں سب کچھ کرلے گی۔

ایسے حالات دیکھ کر خالاؤں اور ماموؤں نے ان بچوں کی ذمہ داری اٹھالی۔ ان کو اس کے باپ کے گھر سے نکال کے اپنے باپ یعنی نانا کے گھر لے آئے۔ نانی تو پہلے ہی نہیں تھیں۔ ممانی نے بھی ذمہ داری نہیں لی۔ ہاں گھر میں رہنے پر اعتراض بھی نہیں کیا۔ اتفاق سے نانا کے سامنے والا فلیٹ بک رہا تھا تو زرین کی چھوٹی خالہ نے وہ فلیٹ خرید لیا اور یوں زرین اور عمران کی ذمہ داری خالہ نے اٹھالی۔ نانا کافی پیسے والے تھے۔ خرچ وہی اٹھا رہے تھے۔ زرین کے باپ نے شروع میں تو تھوڑا بہت خرچ دیا۔ پھر اس سے بھی بیگانہ ہوگئے۔

وقت کا کام تو گزرنا ہی ہے سو وقت تیزی سے گزرنے لگا۔ زرین ماں باپ کی محبت سے تو محروم ہوگئی مگر خالہ ماموں اور نانا کی بے انتہا محبت پاکر خود سر بھی ہوگئی۔ وہ سب کی توجہ چاہتی تھی۔ ذرا سی محبت میں کمی ہوتی تو آسمان سر پر اٹھالیتی یا اس کے ساتھ نفسیاتی مسئلہ پیدا ہونے لگا تھا۔ ننھیال والوں کے بے جا لاڈ اور ماں باپ کے محبت کی محرومی نے اسے نفسیاتی بنا ڈالا تھا۔

☆......☆

ننھیال والوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ اس کی شادی کردی جائے اور پھر جلد ہی زرین کی شادی زبیر سے کردی گئی۔ زبیر نے اس کو بہت محبت دی، زرین بھی اس کو ٹوٹ کر چاہنے لگی۔ اسے زبیر بہت پسند آیا تھا۔ اس کی محبت میں وہ دیوانی ہوگئی۔ اتنی محبت تو کوئی بھی بیوی اپنے شوہر سے نہ کرتی ہوگی۔ وہ تو گویا عاشق ہوگئی تھی لیکن ذرا سی عدم توجہی پر وہ اس سے ناراض ہو جاتی۔ لڑتی چیختی چلاتی۔ بالآخر زبیر اسے منا ہی لیتا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ تین بچوں کی ماں بن گئی ایک بیٹی اور دو بیٹے۔ وہ اپنے بچوں سے بھی دیوانگی کی حد تک محبت کرنے لگی۔ اپنی ماں کی محبت سے محرومی کے احساس نے اس کے دل میں اپنے بچوں کی محبت زیادہ ہی ڈال دی۔ مشترکہ فیملی تھی۔ جیٹھ یا دیور کے بچوں اور اس کے بچوں میں بھی لڑائی ہوجاتی تو وہ اپنے بچوں کا ساتھ دیتی اور ان کو خوب برا بھلا کہتی۔

یہ دیکھ کر اس کے سسرال والوں نے اس کے خلاف محاذ بنالیا اور زبیر سے شکایتیں کرنے لگے۔ زبیر باز پرس کرتا تو زرین اس سے بھی لڑتی۔ گھر کا ماحول خراب ہوگیا۔ ایسے میں زبیر نے عقلمندی سے کام لیا اور الگ گھر لینے کا فیصلہ کیا مگر یہ فیصلہ اس کے گھر والوں کو پسند نہیں آیا۔ الزام زرین پر آیا اور پھر زبیر نے ایک دن تنگ آکر زرین پر ہاتھ اٹھالیا۔ ایک دفعہ کیا ہاتھ اٹھا پھر تو معمول ہی بن گیا۔ گھر والے شکایت کرتے اور وہ بغیر تصدیق کیے زرین پر ٹوٹ پڑتا۔

ہر مرد کا اپنی بیوی پر ہی بس چلتا ہے۔ وہ اپنی پریشانیوں اور مصیبتوں کو بیوی پر تشدد کر کے ریلیز کرتا ہے۔ آئے دن کے جھگڑے اور ہنگامے سے آخر زبیر کے منہ سے وہ الفاظ نکلوا ہی دیئے جس سے جھگڑا تو کیا رشتہ ہی ختم ہوگیا۔ گھر والوں نے زرین کو دھکے دے کر نکال دیا۔ بچے بھی چھین لیے اور زرین برباد ہو کر پھر اپنے نانا کے گھر آگئی۔

☆......☆

غصہ اترا اور اپنی اپنی غلطیوں کا احساس ہوا تو پتا چلا کہ بہت کچھ غلط ہوگیا ہے۔ زبیر بھی زرین کے بغیر پریشان تھا اور زرین بھی زبیر کے بغیر زندہ رہنا نہیں چاہتی تھی لیکن اب کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ زبیر فتویٰ لینے مختلف علماء کے پاس چکر لگاتا اور زرین بھی ایسے مسائل پر معلومات کرتی پھرتی۔ مگر سب کا مشترکہ

جواب یہ ہی تھا۔ ”حلالہ کیے بغیر اب دوبارہ رشتہ استوار نہیں ہو سکتا۔“

یہ سزا زریں کے لیے بہت بڑا عذاب تھا۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی تو زبیر بھی یہ سوچ کر کانپ جاتا۔

دونوں ایک دوسرے کے لیے رو رہے تھے تو بچے الگ پریشان تھے۔ بچوں کو ماں اور باپ دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کو ماں باپ کی آپس کی چپقلش سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ تو بس دونوں کو اکٹھا دیکھنا چاہتے ہیں۔ آخر کار بچوں کی خاطر زبیر اور زریں دونوں یہ سزا جھیلنے کے لیے تیار ہو گئے۔

حلالہ کی شرائط پوری کی گئی اور زریں اور زبیر پھر ایک ہو گئے۔ اس دوران زریں کو کافی سمجھ آ گئی تھی۔ جب اس نے اپنا گھر دوبارہ بسانے کے لیے اتنی بڑی سزا جھیل لی تھی تو عقل تو آنا ہی تھا۔

مگر اب اس کے لیے وہ گھر پہلے سے بھی سخت جہنم ثابت ہوا۔ اب وہاں اس کے خلاف محاذ بنا لیا گیا۔ اسے دن رات اس بات کا طعنہ ملنے لگا کہ کتنی بے غیرت ہے بار بار شوہر بدلتی ہے۔ شریف عورت تو دوسرے مرد کا تصور بھی نہیں کر سکتی اور یہ بے غیرت چھ مہینے دوسرے مرد کے پاس رہ کر پھر آ گئی۔

اور زبیر جو زریں سے بے انتہا محبت کرتا تھا اب اس کے دل سے زریں اتر گئی۔ اب نہ اسے اس سے محبت رہی نہ اس کی ضرورتوں کا خیال بلکہ اب وہ اس سے بالکل لاتعلق ہو گیا۔

زریں جو اپنے گھر اور بچوں کے لیے زبیر کی تمام غلطیوں کو بھلا کر پل صراط پر چل کر اس کے پاس دوبارہ آئی تھی۔ اپنی حیثیت گنوا بیٹھی تھی۔ اس کی نظروں میں وہ دو کوڑی کی بھی نہیں رہی تھی۔ حالانکہ اس پل صراط سے گزرنے کے لیے زبیر نے ہی اس کو مجبور کیا تھا اور جب وہ اس کی محبت گھر اور بچوں کی خاطر خاردار رستے پر ننگے پاؤں آبلہ پا چل کر آ گئی تو اس گھر میں نہ اس کو عزت ملی اور نہ ازدواجی خوشی۔

زبیر نے تو اپنی غلطیوں کی سزا بھی اسے ہی دے دی۔ اس کا وجود محض اس کے گھر والوں کی خدمت اور بچوں کے کام کے لیے مخصوص ہو گیا۔ وہ زبیر کی توجہ اور

غزل

کبھی کبھی تو بہت یاد آنے لگتے ہو
کہ روٹھتے ہو کبھی اور منانے لگتے ہو

گلہ تو یہ ہے، تم آتے نہیں کبھی لیکن
جب آتے ہو تو فوراً ہی جانے لگتے ہو

یہ بات جونؔ تمہاری مذاق ہے کہ نہیں
کہ جو بھی ہو، اسے تم آزمانے لگتے ہو

تمہاری شاعری کیا ہے، بھلا، بھلا کیا ہے؟
تم اپنے دل کی اداسی کو گانے لگتے ہو

سرودِ آتشِ زریں صحنِ خاموشی
وہ داغ ہے جسے ہر شب جلانے لگتے ہو

سنا ہے کہکشاؤں میں روز و شب ہی نہیں
تو پھر تم اپنی زباں کیوں جلانے لگتے ہو؟

شاعر: جونؔ ایلیا

ازدواجی خوشیوں کو ترس گئی۔ اس کو تسلی کے دو میٹھے بول بولنے والا شوہر بھی لاتعلق ہو گیا۔ اس کو تو روٹی بھی بھیک کی طرح ملنے لگی تھی۔

اس کا وجود اچھوت کی طرح ہو گیا جس سے سب دور دور رہتے ہیں۔ شوہر نزدیک ہو کے بھی دور ہو گیا اب وہ عمر قید جھیل رہی ہے جو موت پر ہی ختم ہو گی۔ بچے بھی ماں سے دور اور ددھیال والوں سے قریب ہو گئے۔ اب اسے اپنی غلطیوں کا سخت افسوس ہے۔ اس نے زبیر کے کہنے پر اور اپنی پہلی محبت کو پانے کی خاطر دوسرے شوہر سے لڑ جھگڑ کر رشتے توڑ کر آئی مگر اسے کچھ حاصل نہ ہوا۔ اب کرے تو کیا۔ سب کشتیاں تو جلا کر آئی تھی۔ یہ ہے اس ایک عورت کی کہانی...... جس کے قدموں تلے بھی جنت ہے۔

☆☆☆

ناول

کاوش صدیقی

خانقاہ

قسط نمبر: 01

خانقاہوں' آستانوں' درباروں' مزاروں سے جڑی ایک مردِ درویش کی داستانِ عجب
تصوف اور محبت کی پراسرار دنیا کی کہانی

خط اس کے ہاتھوں میں لرز رہا تھا اس کا سارا بدن ہچکیوں کے جھولے جھول رہا تھا۔ ان آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ جن آنکھوں میں میرے عکس کے دیپ جلتے تھے۔ وہ پھول سے رخسار، جو میرے قرب کے احساس کے ساتھ گلِ



انار ہو جاتے تھے۔ سپید پڑ گئے تھے۔ چہرے کی شگفتگی نچڑے ہوئے لیتھے کی طرح ہو گئی تھی۔ پپڑیاں جمے ہوئے ہونٹ جن کی گلابیت سیاہ ہو رہی تھی۔ وہ سرو قد سراپا جو آپ اپنی بہار پر کھڑا جھومتا تھا۔ خوف، اندیشے، اور رسوائی کے احساس سے خمیدہ ہوا جا رہا تھا۔

میری محبت، میرا عشق، میرا جنون، میرے حواس جب بھی کسی روپ میں مجسم ہوئے تو اس کی عبارت روحی کے وجود میں ڈھل گئی۔ میرا ماضی، میرا انتظار، میری کامیابی اور میری مایوسی میرے سامنے تھی۔

''اب۔۔۔اب میں کیا کروں؟'' اس نے بڑی مشکل سے جملہ ادا کیا اور میری طرف دیکھا۔

کمرے میں کوئی نہیں تھا صرف ہم تھے۔ مگر کیا ہم ہوتے ہیں؟ ہمارا ہونا تو کسی احساس کا باعث ہوتا ہے۔ جب احساس ہی مفقود ہو جائے تو پھر اجسام کا تعارف، حوالہ کیسے بن سکتا ہے؟ مگر اس باوجود ہم تھے گریہء مسلسل کی صورت!

''میں نے تو کہا تھا کہ انہیں جلا دو۔'' میں نے خط کی طرف دیکھا۔

''کیسے جلا دوں۔۔؟'' اس کے بدن میں خاکستر چنگاری بھڑک اٹھی۔ پہلی بار کی طرح بارہ برس پہلے والے دن کی مانند۔

''کہاں رکھ سکو گی؟'' میں نے بہت آہستگی، بہت شکستگی سے کہا۔ جیسے فلیش بیک آج کے منظر پر حاوی ہونے لگا ہو۔

زعفران کی خوشبو، چڑیا کی چہک، مردہ احساسات کی بو بھی چھپ سکی ہے۔؟

''یہ تو میری زندگانی ہیں۔ تمہیں کیا معلوم جب عورت کے اندر کے جذبات جاگتے ہیں۔ اس کے اندر کی کھڑکیاں کھلنے لگتی ہیں۔ جذبوں کی دھوپ اندر جگہ بنانے لگتی ہے۔ تو وہ لمحات، وہ معاملات، وہ واردات ہی تو آئندہ زندگی کا دیباچہ بن جاتی ہے۔ جس پر ساری حیاتی کی بُنت ہوتی ہے۔

''تو پھر اب پچھتاؤ۔!'' بارہ برس جیسے حال میں بدل گئے۔

''تم اتنے بے مروت تو نہ تھے۔'' اس نے اپنی سپید انگلیاں چٹخائیں اور بے رحمی سے انہیں ایک دوسرے میں پھنسا کر موڑنے لگی۔ یہ اس کے ڈپریشن کی انتہا تھی۔

''نا محبت، نا پیسہ، نا تعلق، نا محبت کی حدت رہی پھر کاہے کی مروت؟''

''زندگی نے تمہیں بے رحم بنا دیا ہے۔'' وہ بولی۔ ''تمہارے متعلق سب یہی کہتے ہیں۔''

''جب کوئی تعلق کوئی واسطہ دل کو چھوتا ہی نہ ہو تو پھر راہ و رسم بڑھانے کا فائدہ۔؟ جب سارا وجود پتھر کا ڈھیر بن جائے ہر کوئی اپنی غرض کی چھینی سے اپنے مطلب کے خدوخال تراشنا چاہے تو پھر کیا کرے، بے مروتی، بے رخی، بے اعتنائی ہی سب سے بڑی پناہ گاہ ہوتی ہے۔

''لیکن میں تو تمہاری ہوں۔'' وہ سسک کر بولی۔

''جھوٹ مت بولو۔'' میں بھڑک اٹھا۔ ''اس وقت ہماری محبت افلاطونی تھی۔ زندگی کے جمالیاتی پہلو آٹے کے کنستر سے زندگی کا جواز طلب کرتے تھے۔ زندگی کے پہیئے چلانے کے لئے محبت اور جذبات نہیں۔ کرولا اور پراڈو کے ٹائر ضروری تھے۔ اور احساسات تو سورج مکھی کے پھول تھے۔ صبح ہوتی، سورج کے عشق میں جلتے جلتے اس کو تکتے تکتے شام کو اپنی چمک روپہلی پتیوں کو مایوسی کی پیلاہٹ میں چھپا کر مرجھا جاتے۔ اور پھر ان کا سارا حسن، طاقت، تابانی، بے رحم آئل فلٹر کشید کر لیتے۔ یہ تھا تمہارا محبت اور تلخ حقائق کا تجزیہ۔۔۔ اور اب۔۔۔۔!

''جو کہنا چاہو کہو۔!'' وہ سر جھکا کے بولی۔

''تمہیں اختیار ہے۔ لیکن کیا یہ بھی سچ نہیں کہ تم آج بھی پہلے سے زیادہ پریشان ہو۔!''

مجھے ہنسی آ گئی۔ اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر میری طرف بڑی حیرت سے دیکھا۔

''لفظوں کو بے وجہ مروت کا زہر کیوں پلا رہی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''صاف صاف کہو نا کہ تم اب بھی پھٹیچر، تباہ حال اور معاشرے کی روتی، بلکتی، بے بس مخلوق میں شامل ہو، جن کا مایوسی اور نامرادی کا برزخ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ المعروف ناکام

،احمق، آدرشی لوگ۔۔!'' وہ چپ رہی۔ پھر بولی ''لیکن اب کیا ہوگا۔؟''

''مخملیں قالین والے بڑے گھروں میں خوشحالی اور سکون کے درمیان اس کا حل ڈھونڈ لو۔''

''کاش ایسا ہو سکتا۔'' وہ یاسیت زدہ لہجے میں بولی۔ ''اور تم میرے فیصلے کی توجیہات کو سمجھ سکتے۔ میں نے محبت تو تم سے کی۔ لیکن قربانی اپنی بزدلی، کم ہمتی کی وجہ سے نہ دے پائی اور شائد اب بتانے کا فائدہ بھی نہ ہو۔''

''میں ماضی کی ڈگڈگی نہیں بجانا چاہتا۔'' میرا لہجہ بڑا بے مروت تھا۔

''شائد میں غلط تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ میں اپنی پہلی محبت سے کوئی بھیک لے سکوں گی۔!''

''ماضی کے مزارِ محبت پر چراغ جلانے سے اب کیا حاصل۔؟'' میں نے اس کو غور سے دیکھ کر پوچھا۔ ''تم تو بڑے طمطراق سے چلی گئی تھیں۔ مگر میں نے تو اس محبت کو مزار نہیں بنایا۔ مزار بناتا تو دربار سجاتا، پھر میلہ لگتا، عشق کا ڈنکا بجتا۔ پھر تو میرے پردے میں بولتا، تیرے پردے میں میں بولتا، کیا ملتا؟ لنگر، روٹی، میٹھے چاول، بتاشے، بھنے ہوئے چنے، تازہ پھول جو گاہک کے انتظار میں باسی ہوتے یا مزار کی رونق بنتے اور مرجھا کر نابود ہو جاتے۔ ہر صورت میں عشق کا، پھر یا میری کامیابی کا سہرا تیرے ہی سر بجتا۔''

دفعتاً میں بے قابو ہو گیا۔ میں نے گلاس اٹھا کر سامنے دیوار پر دے مارا۔

''دفعان ہو جاؤ ڈرامے باز، سود خور، مردار گدھ دفعان ہو جا۔۔۔!''

گلاس بڑی زور سے دیوار پر پڑا اور کرچیوں کی صورت ہمارے درمیان پھیل گیا۔

اس نے میری طرف دیکھا۔ پھر اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے خط کو دیکھا اور اس خط کو بڑی زور سے مٹھی میں بھینچ لیا اور بھاری بھاری قدموں سے باہر نکل گئی۔ چلتے ہوئے اسے احساس بھی نہ ہوا کہ وہ ننگے پاؤں کانچ کے ٹکڑوں سے گزرتی ہوئی گئی ہے، اور اپنے پیچھے اپنے پیروں سے رستے ہوئے ننھے ننھے لہو کے قطرے چھوڑ گئی ہے۔

باہر کسی نے پردہ اٹھایا کمرے میں روشنی داخل ہونے لگی۔ کانچ کے ٹکڑے روشنی کو منعکس کرنے لگے اور درمیان میں پھیلے ہوئے لہو کی بوندوں کو جلا بخشنے لگے۔

☆☆☆

حسبِ معمول عشاق کی محفل جمی تھی۔ طوطئ شکر مقال کی چہک سب سے دل آویز تھی، اور عشاق کا ہجوم انہیں گھیرے ہوئے تھا۔ میں جا کر خاموشی سے پچھلی صف میں بیٹھ گیا۔ میں یہاں عقیدتاً نہیں عادتاً آتا تھا۔ مجھے ان خرافات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کسی کا بچہ نہیں ہو رہا ہو تو وہ دعا کے لئے بھاگا چلا آ رہا ہے۔ کسی کو پولیس تنگ کر رہی ہے تو وہ تحفظ کی درخواست لئے چلا آ رہا ہے۔ کسی کو کینسر ہے تو وہ شفاء کے لئے لوٹیں لگا رہا ہے۔ عجیب گورکھ دھندا بنایا ہوا تھا لوگوں نے۔ بہت ماننے والے تھے ان کے۔ کوئی کہتا تھا کہ ملک کا ہر بڑا آدمی ان کا مرید ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ بڑے بڑے سیٹھ ان کی مرضی کے بغیر دم نہیں مارتے۔ اسٹاک ایکسچینج کے بروکر ان کی جنبش ابرو کے منتظر رہتے ہیں۔ گویا قادری سرکار اپنی ایک متبادل اسٹیٹ چلا رہے ہیں۔

مجھے سوچتے ہوئے ہنسی آ گئی۔

میرے برابر بیٹھے ہوئے عقیدت مند نے غصے سے مجھے دیکھا اور زیرِ لب مجھے بولا۔ ''کیا پاگل ہو؟ جو آپ ہی آپ ہنس رہے ہو؟''

میں نے زبان نکال کر اسے چڑائی، وہ بڑی طرح بھنا گیا۔ آہستہ سے بولا۔ ''باہر نکل پھر بتاتا ہوں''

''ابے یہاں پہلوانی کرنے آیا ہے کیا۔؟'' تیسرا جو گردن گھسیڑے ہم دونوں کو چونچیں لڑاتا دیکھ رہا تھا غصے سے بولا۔

''تو دیکھ نہیں رہا یہ کیا کر رہا ہے؟'' وہ بولا

''تو چپ کرا گلا پاگل ہے۔ تو بھی پاگل بنے گا کیا۔؟'' اس نے فیصلہ صادر کیا۔

اس کی بات سن کر بے ساختہ مجھے ہنسی آ گئی۔ چند لمحوں میں۔ صرف چند لمحوں میں، ذرا سے رویئے کو دیکھ کر ہم کتنی

جلدی فیصلے صادر کر دیتے ہیں۔

وہ دونوں پھر اُن کی طرف متوجہ ہو گئے۔

وہ بڑے دھیمے، دلنشیں انداز میں کہہ رہے تھے۔

''جب طلب عادت بن جائے تو شوق ختم ہو جاتا ہے۔ جب شوق ختم ہو جائے تو جستجو مرجاتی ہے۔ اور اگر جستجو مرجائے تو طلب بھیک کے سوا کچھ نہیں رہتی۔ اور بھیک اپنے ظرف کے مطابق حاصل ہوتی ہے۔ نہ مقامات ملتے ہیں۔ نہ سفر طے ہوتا ہے، فقط وقت کا زیاں ہوتا ہے۔''

''سبحان اللہ۔۔۔'' مریدوں کا ایک شور اٹھا۔

''طلب کے لئے، مقامات کے لئے اور سب سے بڑھ کر مرشد کی توجہ کے لئے مسلسل شوق، مسلسل جستجو چاہئے۔'' ایک مرید نے بے ساختہ کہا۔

''کسی طرف سے احترام آمیز لہجے میں کہا گیا۔'' سرکار اجازت ہو تو اپنی تشنگی مٹالوں۔!''

قادری سرکار نے سر کے اشارے سے اجازت دی۔

''سرکار شوق کی انتہا کیا ہے۔؟''

''عشق۔۔۔!''

''اور سرکار عشق کی انتہا کیا ہے۔؟''

فرمایا ''حیرت۔۔۔!''

پھر حیرت کی تشریح فرماتے ہوئے ارشاد کیا ''حیرت وہ مقام ہے۔ جہاں ایسا تحیر ہے کہ سوائے باری تعالیٰ کے وجود کے کسی اور وجود کو ثبات نہیں ہے۔ حیرت ہر شے کو فنا کر دیتی ہے اور فقط ذات باری کا ادراک رہ جاتا ہے، اور ذات باری تعالیٰ ہی حیرت کی انتہا ہے!''

''سبحان اللہ۔۔۔ سبحان اللہ۔۔۔!'' چاروں طرف سے نعرہ ہائے تحسین بلند ہونے لگے۔ قادری سرکار اٹھے، ایک مرید نے جھٹ جوتیاں آگے کیں اور بہت سج سج کر انہیں پہنانے لگا۔

میں مریدوں میں بیٹھا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ان کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ مسکرائے اور زیر لب بولے۔

وہ بہت دور تھے کم از کم ہمارے درمیان پچاس افراد کا فاصلہ ہوگا۔ مریدوں کا شور تھا۔ مختلف آوازیں تھیں۔ مگر مجھے یوں لگا جیسے انہوں نے زیر لب میرے کان میں کہا ہو۔ ''محبت گزیدہ میرے پاس آؤ۔۔۔!''

پتا نہیں مجھے کیا ہوا۔ میں بجلی کی سی تیزی سے اٹھا۔ اور دروازے سے باہر کی طرف دوڑنے لگا۔

☆☆☆

دوڑتے دوڑتے میں افسر درزی کے تھڑے پر آکر بیٹھ گیا۔ میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ میں منہ کھولے سانس لے رہا تھا۔ زبان، حلق سب بری طرح خشک ہو رہے تھے۔ کسی نے مجھے پانی کا پیالہ پکڑایا۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر غٹا غٹ پینا شروع کر دیا۔ چند ہی لمحوں میں پیالہ خالی ہو گیا۔ پانی پی کر ذرا سانس ٹھکانے آئی تو میں نے اردگرد دیکھا اور پھر بری طرح چونک گیا۔

یہ افسر درزی کا تھڑا نہیں تھا۔ کسی جگہ کی اوپر جاتی ہوئی سیڑھیاں تھیں۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا، میں کسی پہاڑی کے دامن میں اوپر جاتی ہوئی سیڑھیوں کے نچلے حصے پہ بیٹھا تھا۔ میرے سامنے ایک ملنگ تھا جو مجھے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے۔؟'' میں نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔

''کیا بات ہے۔؟'' اس ملنگ نے، جو مجھے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ بڑی نرمی سے پوچھا۔

''پتا نہیں۔!'' دفعتاً بے بسی نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ کم مائیگی، بے چارگی، نامرادی جیسے بے شمار سیاہی مائل کالے، بھورے رنگ میرے اوپر چھا گئے اور میں بلک بلک کر رونے لگا۔
''کیا ہو رہا ہے۔؟'' کسی نے میرے شانے پر شفقت آمیز تھپکی دی۔ ''رو لو۔! رونے سے کثافت ڈھل جاتی ہے۔ زنگ چھٹنے لگتا ہے۔'' ملنگ نے نہایت محبت آمیز لہجے میں کہا۔
دفعتاً میں نے سر اٹھایا تو میرا دماغ حیرت کے جھٹکے سے شل ہو گیا۔
وہ ملنگ نہیں قادری سرکار تھے۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح ایک دل آویز من موہنی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جیسے مخاطب کو اپنے دائرے میں قید کر رہی ہو۔
اگلے ہی لمحے میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

''تم یہ میرا چھوٹا سا کام کر دو۔!'' میں نے بڑی لجاجت سے کہا۔
''یہ چھوٹا سا کام ہے۔؟'' قدیر چیخا ''جب بھی آتا ہے کوئی نا کوئی پنگا کھڑا کر کے آتا ہے۔ احمق کا پٹھا۔''
میں چپ چاپ اس کی شکل دیکھتا رہا۔ بولا کچھ نہیں۔
''تو خود ہی بتا اتنی جلدی سب کچھ ہو سکتا ہے۔!'' میرے اوپر وہ اپنے جملوں کا ردعمل نہ دیکھ کر دھیما پڑ گیا۔
''ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔؟'' میں نے آہستگی سے کہا۔ ''ایک لمحے میں زندگی مل سکتی ہے۔، موت آ سکتی ہے۔ دکھ، سکھ کی خبر آ سکتی ہے۔ زلزلہ آ سکتا ہے۔ کیا نہیں ہو سکتا۔؟''
''کاش میں احمق کا پٹھا تجھ جیسے احمق کے پٹھے کا دوست نہ ہوتا۔'' وہ اتنی بے چارگی سے بولا کہ بے ساختہ مجھے ہنسی آ گئی۔
''یہ کیا ڈرامہ ہے۔؟'' قدیر نے میری ہنسی کی پرواہ کئے بغیر میرے ہاتھ سے کاغذات کا پلندہ چھین لیا۔
''یہ خطوط ہیں۔'' میں نے کہا۔
''کس نے، کس احمق کے پٹھے کو لکھے ہیں۔'' ''احمق کا پٹھا قدیر کا تکیہ کلام تھا۔
''مجھ احمق کے پٹھے نے تیری اماں کو لکھے ہیں۔'' میں نے چیخ کر کہا۔
قدیر نے ہاتھ میں پکڑا ہوا چائے کا کپ میرے سر کا نشانہ لیکر پھینکا۔ میں اپنے جملے کے شعوری ردعمل کے لئے تیار تھا۔ میں نے جھکائی دی اور کپ سیدھا ہوا میں اڑتا ہوا قدیر کے ابا کے ماتھے سے جا ٹکرایا۔ جو دروازے سے اندر داخل ہو رہے تھے۔
''پاجی، گدھے کے بچے باپ کو پھوڑ دیا۔'' یہ قدیر کے ابا کا تکیہ کلام تھا۔
قدیر ہڑبڑا کے دوڑا ''ابا۔۔۔ ابا میں نے آپ کو نہیں مارا تھا۔ یہ احمق کا پٹھا جھکائی دے کر بچ گیا۔''
''تو تنزیل کو مار رہا تھا پاجی۔۔۔ گدھے کے بچے۔۔۔'' وہ کراہتے ہوئے دفتر کی سیٹھی پر ڈھیر ہو گئے۔
میں اس تمام عرصے میں خاموشی سے تماشا دیکھتا رہا۔
قدیر نے جلدی سے جیب سے رومال نکالا اور منہ کی بھاپ سے گرم کر کے ان کے ماتھے کو سینکنے لگا۔
دوسرے ہی لمحے زوردار تھپڑ قدیر کے منہ پر پڑا اور ساتھ ہی قدیر کے ابا گرجے۔ ''پاجی، گدھے کے بچے سگریٹیں پی پی کر باپ کو سینک رہا ہے۔''
''ابا آپ تو بس۔۔۔!'' قدیر کے گالوں پر ابا کی پانچوں انگلیاں چھپ گئی تھیں۔ دراصل تھوڑی دیر پہلے وہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا اور پھر ابا کی سینکائی کرنے لگا۔ تو اس کو یاد ہی نہ رہا کہ اس کے منہ میں سگریٹ کی باس بھری ہوئی ہے۔
اس سے پہلے کہ مزید کوئی اور واقعہ رونما ہوتا قدیر کی اماں نے دروازے سے سر نکالا۔ ''ارے میں کہتی ہوں صبح سے یہاں پڑے کیا کر رہے ہو۔ قدیر کے ابا اندر آ جاؤ چائے تیار ہے۔!''
''اس پاجی کے جوتے کھانے آیا تھا۔'' قدیر کے ابا نے دانت کچ کچا کر قدیر کو دیکھا اور اپنا ماتھا سہلاتے، پیر پٹختے

ہوئے اندر چلے گئے۔
قدیر کے ابا کے اندر جاتے ہی اندر دبی ہوئی ہنسی نے گویا حلق کا راستہ پکڑ لیا اور ہم دونوں قہقہے مار کر ہنسنے لگے۔ ہنستے ہنستے ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے، پیٹ دُکھنے لگا، پسلیاں توبہ توبہ کرنے لگیں، کھل کر ہنسنا بھی بدن کے کتنے حصے متاثر کرتا ہے۔ یہ ہمیں آج پتا چل رہا تھا۔
''یہ سب تیری وجہ سے ہو رہا ہے۔'' قدیر پیٹ پکڑ کے کراہایا۔
''ہر چیز کسی نہ کسی سبب سے مشروط ہے۔!'' میں نے فلسفانہ کہا۔
''فلسفہ مت جھاڑ۔!'' قدیر بھنا کر بولا۔ ''یہ بتا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔؟'' اس نے کاغذوں کا پلندا ہاتھ میں پکڑ کر لہرایا۔
''وہ روحی آئی تھی۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔
''کیا۔۔۔؟'' مارے حیرت کے قدیر کا منہ کھلا رہ گیا۔ ''وہ آئی تھی۔۔۔اتنے برسوں کے بعد۔۔۔!''
''ہاں۔۔۔!'' میں نے کہا۔
''کیوں۔؟''
''بہت پریشان تھی۔ میرے خط اس کے میاں نے دیکھ لئے تھے۔ اس کی ازدواجی زندگی شدید بھونچال سے دوچار ہے۔''
''جہنم میں جائے!'' قدیر نے بے اعتنائی سے کہا۔ ''اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ بہت بڑی آدمی بننا چاہتی تھی نا، وہ۔۔۔ بن گئی۔؟ اُن کے گھر چلی گئی جن کے باتھ روم دو۔ دو مرلے کے ہوتے ہیں۔ اور دل ننھے، چھچھورے۔۔۔!''
قدیر میرے ماضی کا گواہ تھا۔ روحی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ہم سب ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ وہ ہماری محبت کا راز دار تھا۔ ایک ایک لمحے کا شاہد تھا۔
ان دنوں جب روحی میرا جنون تھی، جذبہ تھی، احساس تھی۔ پھر ایک پارٹی میں اس کو ارسلان نے دیکھ لیا۔ جو کروڑ پتی باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور جس کے گاڑیوں کے شوروم ملک بھر کے تمام بڑے شہروں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے روحی کے گھر اپنے والدین کو بھیجا اور پھر وہی ہوا جو کہ صدیوں سے ہوتا آیا ہے۔ کم مائیگی، بے چارگی، افلاطونی محبت، روپے کی گرمی، وسائل کی حدت، امارت کے اصولوں سے ہار گئی۔
مگر ملکیت میں شراکت کہاں ہوتی ہے اور پھر وہ عورت، جس کو اپنی سطح سے نیچے اتر کر اٹھایا جائے۔
یہی مرحلہ روحی کی زندگی میں آ گیا تھا۔
''تو سچ کہتا ہے لیکن۔'' میں نے ایک گہری سانس لیکر کہا ''میں بے مروت نہیں ہوں۔!''
''پھر کیا کرے گا۔؟'' قدیر نے پوچھا۔
''ان کو فی الفور چھاپ دے۔۔۔'' میں نے کاغذات کے پلندے کی جانب اشارہ کیا۔ ''یہ خطوط ہیں جو راز بک شیلف میں سجا ہو، وہ اپنا سحر کھو دیتا ہے۔''
قدیر ایک پرنٹنگ پریس چلاتا تھا، کمپوزنگ، ڈیزائننگ، بائنڈنگ اس کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اگر مسئلہ تھا تو صرف وقت۔!
''لیکن یہ چار دن میں کیسے چھپے گا۔؟''
''ہمت کرے انساں تو کیا ہو نہیں سکتا۔!'' میں نے ہنس کر کہا۔
پتا نہیں میری ہنسی میں کیا تھا کہ قدیر نے مجھے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو آپ کے اندر تک اُتر جاتے ہیں، آپ کی ہر کیفیت کے نکتہ رس بن جاتے ہیں۔ نہ آپ ان سے کچھ چھپا سکتے ہیں، بتانے کی تو شائد انہیں ضرورت ہی نہیں ہوتی، قدیر ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھا، میرا دوست۔۔۔!

☆☆☆

پتا نہیں! قدیر نے کیا جادو دکھایا۔ کتاب مکمل ہو کر میرے ہاتھ میں تھی۔ پانچ دن میں اس نے کتاب چھاپ دی

تھی۔نام بھی کتاب کا اُس نے خود ہی رکھا تھا۔"سندیسے جو کھو گئے" روحی کے خطوط کے ساتھ ساتھ اس میں دیگر لڑکیوں کے نام کے خطوط بھی شامل تھے۔اب روحی کے خطوط ایک راز کی بجائے ایک کتاب کی صورت سامنے آگئے تھے، بلکہ یہی نہیں قدیر نے چار پانچ سکہ بند ادیبوں کے قلمی تاثرات بھی اِن میں شامل کر دیئے تھے۔

وہ کتاب مجھے دیتے ہوئے بولا۔"یار مجھے تو معلوم ہی نہیں کہ تو اتنا اچھا رائٹر ہے۔؟"

"یار یہ تو مجھے بھی نہیں پتا تھا۔" میں نے فراغ دلی سے اعتراف کیا۔

"لیکن جن لوگوں سے رائے تو نے لکھوائی ہے۔وہ تو بڑے مشہور معروف ادیب ہیں۔اتنی جلدی انہوں نے کیسے پڑھ لی۔؟" میں واقعتاً حیرت زدہ تھا۔

"ابے سب ہم سے کتابیں چھپواتے ہیں۔سال سال بھر کا ادھار کرتے ہیں میں نے سب کو بلوایا، چائے پلائی، ایک ایک خط پکڑایا اور کہا کہ پڑھ کر رائے لکھ دیں۔انہوں نے لکھ دی۔!" قدیر ہنسا۔

"ایک خط پڑھ کر پوری کتاب پر رائے دے دی!" میں بے حد حیران ہوا۔

"ابے دیگ کے چند ہی چاول چکھے جاتے ہیں یا پوری دیگ کھائی جاتی ہے۔؟" قدیر نے کہا۔"احمق کے پٹھے پہلے تعلقات کی بنیاد پر بانس پر چڑھا دیتے ہیں۔اگر وہ با صلاحیت ہو اور ان سے آگے نکل جائے تو پھر خود ہی اس کے پیچھے لٹھ لیکر پڑ جاتے ہیں۔ادب شدب کچھ نہیں، سب کاروبار و مصلحت۔" قدیر نے چند جملوں میں ادب کا نقشہ کھینچ دیا۔

پھر میری طرف جھک کر بولا۔"ایک بات بتا!"

"بول۔؟"

"روحی کو تو میں جانتا ہوں۔۔۔پر دیگر لڑکیاں کون ہیں۔کب تیری زندگی میں آئیں۔مجھے کیوں نہیں پتا چلا۔؟"

"روحی کے سوا کوئی نہیں۔" میں نے کہا۔"باقی سب لڑکیاں تو تخیل کی پیداوار ہیں۔روحی کی ازدواجی زندگی بچانے کیلیئے جھوٹ گھڑنا اور لکھنا پڑا تو کیا ہوا۔میں اس کو کچھ نہ دے سکا تو کم از کم اس کی ازدواجی زندگی تو بچالوں۔اس کے تین بہت ہی پیارے پیارے بچے ہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

قدیر نے اپنی انگلیوں سے میرے آنسو پونچھے، جو نہ جانے کب بہہ نکلے تھے۔

آنسو۔۔۔جذبے۔۔۔انتقام اور محبت کس میں ہمارا اختیار کہاں ہوتا ہے۔؟

"یار تو اس کو بہت پیار کرتا ہے آج بھی۔!"

"محبت بھولنے کے لئے نہیں ہوتی۔دھیمے، دھیمے جلنے کے لئے ہوتی ہے۔اس کی آنچ تا زندگی ساتھ دیتی ہے۔بشرطیکہ آپ کے اندر سچائی ہو۔روحی تو مجھ پر نازل ہوئی تھی صحیفہ محبت کی طرح۔!"

قدیر کچھ نہ بولا۔بس چپ رہا۔

ہم دونوں کے درمیان خاموشی رقص کرتی رہی اور ہم دونوں چپ کی مار سہتے رہے۔

☆☆☆

"تمہاری کتاب آئی تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔!" میں اپنے کمرے سے باہر نکلا۔دالان میں اماں بیٹھی سروتے سے چھالیا کاٹ رہی تھیں۔مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ بولیں۔

"اماں قدیر نے چھاپ دی۔!" میں نظریں چراتے ہوئے تخت کے ایک کونے پر ٹک گیا۔آدھے صحن میں دھوپ اتر چکی تھی۔اماں کے پاندان کی تھالی میں پانوں کے ساتھ ساتھ بہت ساری بیلے کی کلیاں رکھی ہوئی تھیں۔یہ موی کا شوق تھا۔وہ صبح ہی صبح سارے پھول توڑ کر کچھ میرے سرہانے اور کچھ اماں کے پاندان میں رکھ دیتی تھی۔

"اچھی کتاب ہے۔!" اماں نے تبصرہ کیا۔

میں نے کن انکھیوں سے ان کی طرف دیکھا۔ان کی آنکھوں اور تاثرات میں طنز کا کوئی شائبہ تک نہیں تھا۔

''جو دوسروں کی عزت سنبھالتے ہیں وہ بڑا مرتبہ پاتے ہیں۔'' اماں دھیمے سے بولیں۔

''جی۔۔۔؟'' میں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

''تمہیں معلوم نہیں ان ۱۲ برسوں میں تم نے کیا حاصل کیا۔؟'' انہوں نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

میں کچھ نہیں بولا۔ بس ایک ٹک ان کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ بولیں'' جب انسان دھیرے دھیرے کسی جذبے کے تحت سلگتا ہے۔ تو پھر اس کی روح میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ لفظوں کا ذخیرہ تو تعلیم و معاشرہ ہمارے اندر بھر دیتا ہے۔ مگر ان کو برتنے کا سلیقہ ہمارا اپنا، اپنا ہوتا ہے۔ اور اسی سلیقے سے پہچان بنتی ہے، تمہیں اندازہ نہیں کہ تم لکھ سکتے ہو۔!''

''اماں۔۔۔!'' میں تخت پر پھیل کر، اماں کی گود میں سر رکھ کے لیٹ گیا۔ اماں بہت نرم مزاج تھیں۔ مگر تربیت کے معاملے میں بہت سخت تھیں، غصہ بہت آتا تھا۔ کھری سیّدانی تھیں۔ جلال کا، جمال کا پیکر!

انہوں نے سروتا ایک طرف رکھا اور میرا سر سہلانے لگیں۔

'' مجھے اچھا لگا کہ میرا بیٹا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ جو دوسروں کو آسانی دیتے ہیں اللہ انہیں آسانی دیتا ہے۔ محبت کو برداشت کرنا ہی اصل مردانگی ہے۔ یہ بہت بوجھ ہوتی ہے، بہت وزنی۔۔۔!''

اماں کی انگلیوں کا لمس، لہجے کا رس، انداز کے گداز سے پتا نہیں کیوں میرے اندر اتھل پتھل مچ گئی اور اندر کا سارا غبار باہر نکلنے لگا۔

یہ مائیں خدا کی طرح اندر تک اُتری ہوئی ہوتی ہیں۔ سب کچھ جانتی ہیں۔ مگر چپ رہتی ہیں۔ آہستگی سے زندگی میں حصہ بنی رہتی ہیں اور طاقت دیتی رہتی ہیں، آگے بڑھنے کی، حالات کو فتح کرنے کی، مسلسل مہمیز دیتی رہتی ہیں۔

☆☆☆

''زندگی مسلسل آگے بڑھنے کا نام ہے۔!'' وہ کہہ رہے تھے۔

مریدین، عقیدت مند، نہایت احترام سے ان کے ارشادات سے مستفید ہو رہے تھے۔

''بعض اوقات ہمیں احساس ہوتا ہے کہ شاید ہم بے تکی زندگی گزار رہے ہیں۔ صبح شام کچھ نہیں ہو رہا۔ سب کچھ ضائع ہو رہا ہے۔ مگر یہی بظاہر زیاں بہت کار آمد ہوتا ہے۔ یاد رکھیے۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ ہمیں اپنی بہت سی صلاحیتوں کا علم نہیں ہوتا۔ اوٹ پٹانگ زندگی، گزرا وقت، کسی حادثے کے باعث، کار آمد ہو جاتا ہے۔ اس کی پوشیدہ صلاحیتیں منظر عام پر آ جاتی ہیں۔

اگر آپ غور کریں تو آدمی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو بڑے عروج والے، بڑے نام والے ہوتے ہیں۔ مگر انڈے کی طرح حادثے کی ضرب سے ٹوٹتے ہی بہہ جاتے ہیں اور خالی خول رہ جاتا ہے۔ دوسرے وہ جو بہت لش پش ہوتے ہیں۔ معتبری کا جھنڈا، نسب کا حصار انہیں بلند تر کرتا رہتا ہے، مگر پیاز کے چھلکے کی مانند جب ان پر اُفتاد آ پڑتی ہے تو پرت اُترتے، اُترتے کچھ نہیں بچتا، بے روح، بے فکر کھوکھلا۔ ماجرا سامنے آتا ہے اور ہاتھ میں صرف بُو رہ جاتی ہے۔ تیسرے وہ ہوتے ہیں جو سیپ کی طرح، صدف کی طرح، پانیوں میں لہروں سے لڑتے بھڑتے رہتے ہیں، اور سخت سیپ کا خول توڑ کر دیکھو تو اندر سے نہایت آب دار موتی نکلتا ہے۔ بھرپور۔ روح کے ساتھ۔ ہتھیلی پر رکھو، تو ہتھیلی بج جاتی ہے۔

اور دوستو۔! آدمی تو تیسری ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ سچے، مہنگے، مگر انہیں ڈھونڈنا پڑتا ہے۔''

وہ گہری سانس لیکر خاموش ہو گئے۔

''سبحان اللہ۔۔۔ واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ حضور نے کمال کر دیا۔ سرکار کی مثالیں، سبحان اللہ۔۔۔'' مریدوں کے جملے، نعرۂ ہائے تحسین، عقیدت بے ساختہ باہر آ رہی تھی۔

مجھے پہلی بار احساس ہوا قادری سرکار دوسروں سے بہت مختلف ہیں۔ ان کے اندر کچھ تھا۔۔۔ لیکن مجھے ادراک

نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں وہاں کیوں آتا تھا؟

میں انہیں محویت سے دیکھنے لگا۔

دفعتاً ان کی نگاہیں میری طرف مرتکز ہو گئیں۔ پھر جیسے سناٹا سا طاری ہو گیا۔

اچانک شور ہونے لگا۔ ہٹو بچو کی آوازوں نے ماحول بدل دیا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ پولیس کمانڈوز خانقاہ کے بیرونی دروازے کو گھیر رہے تھے۔

☆☆☆

دیکھتے ہی دیکھتے تیس چالیس کمانڈوز نے صحن کو بھر دیا ان میں سے کسی نے درشت لہجے میں عقیدت مندوں اور مریدین کو پیچھے ہو جانے کا اشارہ کیا۔ کچھ مصلحت پسند عقیدت مندوں نے باہر کا رُخ کر لیا۔ جبکہ اکثریت نے دیواروں سے چپک کر وہیں رہنے کو ترجیح دی، بعض مریدوں نے احتجاج شروع کر دیا۔ مگر قادری سرکار نے اشارے سے چپ رہنے کا حکم دیا، سرگوشیاں، آوازیں یک لخت اس طرح تھم گئیں کہ جیسے کسی نے اچانک پرشور ڈیک کا والیم آف کر دیا ہو۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔

چند ہی لمحوں میں ایک سرو قد آدمی دو گھوڑے بوسکی کا کرتا، کڑکڑاتا ہوا گھیر دار شلوار، سیاہ واسکٹ زیب تن کئے ہوئے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوا۔

اس پر نظر پڑتے ہی کئی آوازیں تحیر آمیز لہجوں کے ساتھ بلند ہونے لگیں "ارے یہ۔۔۔ یہ تو شاہ صاحب ہیں! یہ کیسے آ گئے؟ ان کا یہاں کیا کام۔۔۔؟؟"

شاہ ہارون گیلانی بہت اہم منسٹری کے وزیر تھے۔ مرکزی حکومت میں ان کے خاندان کے کئی نامور لوگ شامل تھے۔ ان کی سیاسی وسعت کا یہ عالم تھا کہ لوگ یہ معلوم نہیں کر پاتے تھے کہ یہ اپوزیشن میں زیادہ ہیں یا حکومت میں۔۔۔ بڑے قصے کے وزیر تھے۔ ان کے جلال کے قصے زبان زد عام تھے۔

شاہ ہارون گیلانی لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے قادری سرکار کے آگے جا ٹھہرے۔

قادری سرکار ایک نرم تحمل مسکراہٹ کے ساتھ انہیں دیکھتے رہے، چند لمحے دونوں دیکھتے رہے ایک دوسرے کی آنکھوں میں، پھر میں نے دیکھا کہ قادری سرکار کے سامنے شاہ ہارون گیلانی کی نگاہیں جھک گئیں۔

"کیسے ہیں آپ سرکار۔!" شاہ ہارون گیلانی نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"الحمدللہ۔!" قادری سرکار نے مسکرا کے کہا۔ "تشریف رکھئے۔۔۔!" انہوں نے سامنے پڑے ہوئے مونڈھے کی جانب اشارہ کیا، جو ان کے ایک نادیدہ اشارے پر کسی مرید نے بڑی پھرتی سے لا کر یہاں رکھ دیا تھا۔

"کچھ گفت و شنید کے لئے حاضر ہوا تھا۔!" شاہ ہارون گیلانی نے کہا اور اپنے اردگرد دیکھا۔

"ہماری تو صرف شنید ہوگی!" قادری سرکار نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں سرکار۔!" دفعتاً جیسے شاہ ہارون گیلانی کے کروفر کا ملمع اتر گیا۔ رعونت کا چھلکا ترخ گیا اور اندر سے غرض بہنے لگی۔

"میں تو صرف دعا کے لئے حاضر ہوا ہوں۔" شاہ ہارون گیلانی نے کہا۔ "علاقے میں ضمنی الیکشن ہو رہے ہیں۔ ہمارے مخالف بھی آہستہ آہستہ طاقت پکڑ رہے ہیں۔ لوگ ان کے ساتھ ہو رہے ہیں۔!" شاہ ہارون گیلانی نے بڑے تحمل سے درخواست گذاری، مگر اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ان لوگوں کو انسان نہیں بلی، کتے سمجھ رہا تھا۔ جو اس کی راہ میں آ کر راہ کھوٹی کر رہے تھے۔

"وہ طاقت نہیں پکڑ رہے۔" قادری سرکار نے بڑی رسانیت سے کہا۔ "وہ خلا کو بھر رہے ہیں جو تم لوگوں کی حماقت اور ناعاقبت اندیشی سے پیدا ہو رہا ہے۔"

"کیا مطلب سرکار میں سمجھا نہیں۔!" شاہ ہارون گیلانی نے بے اختیار کہا۔

''تم لوگوں سے صرف ووٹ کا، غرض کا، رشتہ رکھتے ہو۔ ان کی پیداوار، ان کی صلاحیتیں، سب رہن رکھ لیتے ہو، مگر ان کے حقوق، ان کے حالات پر توجہ نہیں دیتے۔ یاد رکھو! معاشرے کے کچلے ہوئے، پسے ہوئے لوگ اگر اکٹھا ہو جائیں، تو پھر انقلاب کو کوئی نہیں روک سکتا۔

''سرکار یہ تو کتابی باتیں ہیں۔'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا اور دھیمے سے ہنسا۔ اس کی ہنسی میں رعونت اور صدیوں کا طمطراق تھا۔

''یہ کتابی باتیں نہیں حقائق ہیں۔ ذرا سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی دعوت پر غور کرو، واحدانیت اور مساوات پر سب سے پہلے ایمان لانے والے، دعوت پر لبیک کہنے والے امراء تھے یا عام، مزدور، غلام۔'' قادری سرکار نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایک طرف تم ضمنی الیکشن میں جیتنا چاہتے ہو، دعا کے لئے آئے ہو۔ دوسری طرف تمہارے گماشتے لڑکیوں کو اٹھا لیتے ہیں۔ اجتماعی آبروریزی کرتے ہیں۔ بدترین ظلم کرتے ہیں۔ بارہ سالہ طالب علم کو خدمت نہ کرنے پر شکاری کتوں سے نچواتے ہیں۔ دوڑاتے ہیں اور ان کی چیخیں یہاں، ہمارے کانوں میں گونجتی ہیں۔!'' قادری سرکار کا لہجہ برہم ہونے لگا۔

''پرسوں جس لڑکی کی تمہارے منیجر طارق نے اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ اجتماعی آبروریزی کی، جانتے ہو وہ کون تھی۔۔۔؟''

شاہ ہارون گیلانی کا منہ حیرت کی شدت سے کھل گیا۔ چہرے پر پسینے کے قطرے رونما ہو گئے۔ سوالیہ نگاہیں قادری سرکار کے ہونٹوں پر تھم گئیں۔

''وہ بچی، ہمارے مرید کی نہیں، ہماری بیٹی تھی۔ ہماری بیٹی ہے۔!''

ایک لمحے کیلئے تو مجھے لگا کہ جیسے حیرت، صدمے اور خوف سے شاہ ہارون گیلانی کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔

''جب تک پیر، اپنے مریدوں کو، اپنی اولاد، اپنی آل، اپنا کنبہ نہیں سمجھتے وہ پیر نہیں بن سکتے۔ تم کیا خدمت کرو گے ہماری؟ تم ایک باپ کے آگے اس کی بیٹی کی آبروریزی کے مقدمے میں مجرم بن کر آئے ہو۔ شاہ ہارون گیلانی۔!'' قادری سرکار کے لہجے میں نجانے کیا تھا کہ شاہ ہارون گیلانی ہی نہیں، ہم سب کانپ گئے۔ میرے لئے نرم دل، شفیق، مہربان نگاہوں والے، میٹھی بجل مسکراہٹ لئے قادری سرکار کا یہ روپ اتنا انوکھا، اتنا نیا تھا کہ شائد مجھے حیرت بھی نہیں ہو رہی تھی۔

''سرکار۔!'' شاہ ہارون گیلانی آہستگی سے بولا۔

قادری سرکار چپ رہے۔

''سرکار۔'' شاہ ہارون گیلانی اٹھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ''مجھے معاف کر دیجئے۔!''

''حجاج بن یوسف نے صرف سندھ سے ایک بیٹی کی پکار پر لشکر اسلام کو بھیج دیا تھا۔'' قادری سرکار کا لہجہ انتہائی پر تاسف تھا ''اور اس آج اس مملکت اسلامیہ کے کونے، کونے سے بیٹیوں کی، مظلوموں کی، چیخیں بلند ہو رہی ہیں اور تم لوگ خدا کے عذاب سے بے خبر ہو۔ جو بہت جلد سب کو اپنی گرفت میں لینے والا ہے۔ اللہ سریع الحساب۔!''

شاہ ہارون گیلانی اٹھا۔ سر کے اشارے سے اجازت طلب کی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

قادری سرکار نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

مجھے یوں لگا کہ جیسے وہ بہت تھک گئے ہوں۔ اچانک دو آنسو، ان کی آنکھوں کے گوشوں سے نکلے اور نیچے ڈھلک گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس لمحے وہ کس وجہ سے آبدیدہ ہوئے ہیں۔ مظلوم کی کراہ سے، حاکموں کی مجرمانہ لاپرواہی سے یا اس عذاب کے خوف سے جو معاشرے میں انصاف اور مساوات نہ ہونے کے باعث ہمیں گرفت میں لینے والا ہے۔

☆☆☆

''میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔!'' انجان نمبر سے آواز آئی۔ نمبر اجنبی تھا، مگر بولنے والی میری تنہائیوں کی رفیق، میرے خوابوں کی رانی، میرے خیالوں کی بنت تھی۔ جس کے ریشمی تصور سے دل و دماغ تقویت پاتے تھے۔

روحی کی آواز، میں لاکھوں آوازوں کے شور میں شناخت کر سکتا تھا۔

''کیوں۔؟'' مجھے اپنی ہی آواز اجنبی لگی اور میری نظر دیوار گیر ریڈیم ڈائل والی گھڑی پر پڑی۔ رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔

''تمہارا شکریہ ادا کرنا تھا۔'' وہ دھیمے سے بولی۔
''شکریے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا مجھے اس لمحے خود اپنی آواز، اپنا لہجہ، اپنا تاثر پرایا لگا۔
''تم نے میری ازدواجی زندگی تباہ ہونے سے بچا کر مجھے دوبارہ زندگی دی ہے۔!'' اس کی آواز گیلی ہوگئی آنسوؤں نے اس کا حلق بھر دیا تھا۔
جس کا گلوگیر ہونا بھی مجھے برداشت نہ تھا۔ اب رو رہی تھی اور مجھے سارے جذبے پرائے پرائے سے لگ رہے تھے۔
''میں تم سے ملنا نہیں چاہتا۔۔۔!'' میں نے سکون سے کہا اور اس کا جواب سنے بغیر سوچ آف کر دیا۔
پتا نہیں کیوں میری نیند اڑ گئی تھی۔ کچھ عجیب سی بے چینی مجھ پر طاری ہونے لگی تھی۔
''کیا یہ روحی کے بچھڑنے کی کسک ہے۔؟'' میں نے اپنے آپ سے پوچھا ''کیا اس کی یاد، اس کی آرزو ابھی بھی میرے اندر موجود ہے۔؟'' سوال در سوال اٹھ رہے تھے۔
میں نے روحی کو تصور کی نگاہوں سے دیکھا اور چونک گیا۔ آج روحی کا تصور لمحے کے ہزارویں حصے کی طرح روشن نہیں تھا۔ وہ جو آنکھیں بند کرتے ہی، تنہا ہوتے ہی، میرے وجود پر ریشم کی طرح پھیل جاتی تھی۔
وہ ریشمی روحی آج نہیں تھی۔ ''آج کیوں میرے دل میں اس کی شدت نہیں؟'' میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ اور روحی کے سراپے کو جاننے کی کوشش کی۔
مگر یہ کوشش بھی سعیٔ لاحاصل رہی۔
میں نے شعوری طور پر دوبارہ کوشش کی، روحی کی ستواں ناک، غزالی آنکھیں، دراز خم دار پلکیں، صبیح رخساروں، نازک صراحی دار گردن، رس سے بھرے گلابی تراشے لبوں کا، سرو قامتی، میدے اور گلاب سے گندھی رنگت کا، لمبے، اخروٹی بالوں کا، مگر سوائے دھندلے سے خاکے کے کچھ نہ بنا۔
''یہ کیا ہوا۔؟'' دفعتاً مجھے یوں لگا جیسے میں اندر سے خالی ہو گیا ہوں۔ مگر اس خالی پن کا احساس دکھ سے عاری تھا۔
پھر اچانک جیسے روحی کا ہیولیٰ روشن ہونے لگا۔ اس کے چہرے کا خدوخال واضح ہونے لگے۔
''تم آ گئیں۔!'' میں نے گہری سانس بھر کے کہا۔
''ہاں میں آ گئی۔''
''ہاں، ہم آ گئے۔!'' اچانک جیسے دو آوازیں ایک جیسی ٹیون سے جنم لینے لگیں۔
میں نے دیکھا، روحی کا روشن ہیولیٰ، قادری سرکار کے روشن ہیولے میں مدغم ہو رہا تھا اور چند ہی لمحوں میں قادری سرکار کا ہیولیٰ اپنی پوری تابانی سے روشن ہو گیا۔
''روحی کہاں گئی۔!'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔
''خود ہی تو دست بردار ہوئے ہو، تسلیم و رضا کا پیکر بن کر۔!'' وہ بولے۔
''میں کب دست بردار ہوا۔؟''
''جب اس کی ازدواجی زندگی بچانے کے لئے کتاب لکھی۔ اس کے بچوں کا احساس کیا۔ دوری کو تسلیم کیا، تو پھر ترک کی منزل میں داخل ہو گئے!۔''
''ترک کی منزل۔!'' میری حیرت دیدنی تھی۔ ''یہ کیا ہوتی ہے۔؟''
''ہمارے پاس آؤ محبت گزیدہ۔'' انہوں نے میرے ہاتھوں پر تھپکی دی، جو شدت سے آپس میں بندھے ہوئے تھے۔ اپنی ہی انگلیوں کی رسیوں سے!
مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ ائیر کنڈیشنڈ کی شوں شوں کی، ہلکی ہلکی آواز کے سوا اگر کوئی آواز تھی، تو وہ میرے بے تحاشا دھڑکتے دل کی تھی۔ جو یوں چل رہا تھا، اچھل رہا تھا، کنپٹیوں میں یوں پٹخنیاں کھا رہا تھا کہ جیسے

پھاڑ کر باہر آجائے گا۔
مجھے کچھ ہوش نہ رہا تھا اور میں ہوش وخرد سے لاپرواہ، بے ہوش ہو چکا تھا۔

☆☆☆

قادری سرکار کون تھے، کہاں سے آئے تھے، ان کا کیا حدود اربعہ تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔ شہر کے ایک معروف حصے میں بنی حویلی ان کا مسکن تھی۔ خوبصورت، پرشکوہ حویلی۔ کوئی کہتا تھا کہ ان کو کلیم میں ملی ہے۔ کسی کا خیال تھا بٹوارے سے پہلے ان کے والد کسی ریاست میں دیوان کے عہدے پر فائز تھے اور تقسیم کے وقت پاکستان آکر یہاں رچ بس گئے تھے۔
قادری سرکار اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، گفتگو کے فن سے آشنا، تحقیق کے آدمی بات سادہ اور آسان طریقے سے یوں کرتے کہ مخاطب کے دل میں اتر جاتی۔ روزمرہ کی زندگی سے ایسی تشبیہات اور استعارے لیتے کہ سامنے کی، برتی ہوئی چیز میں، ایک نیا پن معلوم ہونے لگتا اور یوں لگتا کہ آج سے پہلے یہ بات اس طرح کیوں نہ سمجھائی گئی، بتائی گئی۔ ان کے مداح، بے شمار عقیدتمندوں اور مریدین کا دن رات تانتا بندھا رہتا۔
خود سوائے اشد ضرورت کے باہر نہ نکلتے۔ مگر خوشی غمی میں سب کی شریک ہوتے، مگر عموماً یہ ہوتا کہ شادی کرتے ہی جوڑا دعاؤں کے لئے حاضر ہو جاتا۔ کسی کے ہاں بچہ ہوتا تو قادری سرکار کے ہاں حاضری دیکر نام رکھوایا جاتا۔ کوئی نئی ملازمت پر جاتا، بیرون ملک روانگی ہوتی، ان کے پاس حاضر ہو کر دعائیں لیکر جاتا۔ لوگ کہتے تھے کہ نجانے کیا معاملہ ہے، کبھی کسی سے ان کو مانگتے نہ دیکھا، شائد انہیں دستِ غیب حاصل تھا۔ یہ ان کے مریدین، عقیدت مندوں کی رائے تھی۔
ایک اور، رائے یہ تھی کہ انہیں تسخیر خلق کا علم آتا تھا۔ جو بھی آپ کے پاس آتا ہے گرویدہ ہو جاتا ہے، ان کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ غرض یہ کہ جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔
اگر کبھی قادری سرکار سے ان باتوں کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ مسکرا دیتے۔
ایک مرتبہ ایک مرید نے باصرار سوال کیا۔ ''سرکار کیا واقعی تسخیر کا علم ہوتا ہے۔؟''
آپ نے فرمایا'' کیوں نہیں ہوتا۔۔۔؟ اگر تسخیر کا علم نہیں ہوتا، تو اللہ تعالیٰ انسانوں کے لئے چاند، ستاروں کو، مظاہر فطرت کو کیوں مسخر فرماتا۔''
''میرا مطلب ہے کہ انسانوں والا علم تسخیر۔!'' مرید نے گڑبڑاتے ہوئے عرض کی۔
قادری سرکار کہا۔ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی حدیث پاک ہے کہ لوگوں سے ان کے فہم کے مطابق گفتگو کرو، جب تمہاری بات سادہ، آسان، دوسرے کے مسئلے کے حل کے عین مطابق ہوگی۔ اس کی شعوری سطح کو متاثر کرے گی تو وہ نہ صرف تمہاری بات کو سمجھے گا بلکہ مانے گا بھی۔!''
وہ ذرا ٹھہرے اور مرید کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔ ''کچھ سمجھ میں آرہا ہے!''
وہ بے ساختہ بولا۔ ''حضور سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی یہ حدیث پاک آج پہلی بار میرے دل میں نقش ہو گئی ہے۔ آج سے پہلے یہ حدیث شریف سنی تھی لیکن سمجھ میں آج آئی ہے۔''
قادری سرکار نے مسکرا کے کہا۔ ''یہی انسانوں والا علم تسخیر ہے۔!'' تو ایسے تھے قادری سرکار۔!

☆☆☆

جب مجھے ہوش آیا تو میرے سرہانے اماں بیٹھی تھیں اور تسبیح پڑھ پڑھ کر مجھ پر پھونک رہی تھیں۔ مومی میری ہتھیلیاں سہلا رہی تھی، مجھے آنکھیں کھولتا دیکھ کر مومی جلدی سے بولی۔ ''اللہ کا شکر ہے کہ آپ کو ہوش آگیا ہے۔!''
''مجھے۔۔۔ مجھے کیا ہوا تھا۔۔۔؟'' مجھے بولتے ہوئے بے حد نقاہت ہو رہی تھی۔
''کچھ نہیں رات کسی وقت بخار بہت تیز چڑھ گیا تھا۔'' اماں نے میری پیشانی پر ہاتھ پھیرا ''اب تو بخار کم ہے۔!''
اتنے میں قدیر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں دو تین پلاسٹک کے شاپرز تھے۔

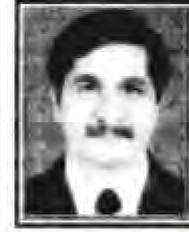
مجھے آنکھیں کھولے دیکھ کر وہ ہنسا۔
''آ گیا۔۔۔؟''اس نے بمشکل اماں اور موی کو دیکھ کر زبان دبا کر اپنا جملہ روکا اور جلدی سے بات بدل کر بولا۔''
آ گیا ہمارے پٹھے کو ہوش!''
''اللہ کا شکر ہے۔''اماں مجھے محبت پاش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔''میں ذرا شکرانے کے نفل پڑھ لوں۔!''اماں کی عادت تھی۔ جب کوئی مسئلہ آتا، پریشانی ہوتی، اماں فوراً شکرانے کے نفل مان لیتیں اور آج تک میں نے اپنے ہوش میں نہیں دیکھا کہ کبھی اماں کے نفل پورے نہ ہوئے ہوں۔
اماں کو اللہ میں پر اس قدر اعتماد تھا کہ جیسے اللہ میاں نے ان سے ہر بات پوری کرنے کا وعدہ کر رکھا ہو۔
مجھے یاد ہے کہ ایک بار میرے پرچے اچھے نہیں ہوئے تھے، بس ٹھیک ہی تھے۔ مگر اماں نے فوراً چالیس نفل مان لئے۔
میں نے پوچھا۔''اماں کیا میں واقعی گریڈ لے لوں گا۔؟''
''ہاں اللہ میاں ضرور دیں گے۔!''وہ پر یقین لہجے میں بولیں۔
''اماں آپ کو اتنا یقین کیسے ہے۔؟''
''اگر تو مجھ سے کوئی فرمائش کرے گا تو میں پوری کروں گی یا نہیں۔؟''اماں نے پوچھا۔
''بالکل۔''میرا لہجہ پر یقین تھا۔
''تو بیٹا جی۔! اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ یقین، اعتبار اور بھروسے کا مستحق ہے۔''اماں نے چند جملوں میں اللہ سے اپنے تعلق کی وضاحت کر دی۔''تو پھر کیا ہوا۔؟''قدیر دھپ سے میرے بیڈ پر بیٹھا، پورا بیڈ ہل کر رہ گیا۔
میں چند لمحوں میں ماضی سے حال میں آ گیا۔
اماں کمرے سے باہر جا چکی تھیں۔ موی میرا سر سہلا رہی تھی۔
اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، قدیر نے کہا۔''موی یہ شاپرز اندر لے جاؤ اور میرے لئے گرما گرم فٹافٹ چائے لے آؤ۔''اس نے شاپرز کی طرف اشارہ کیا۔
''بھائی آپ کیلئے بھی چائے لاؤں۔؟''موی نے بہت پیار سے میرے رخسار کو چھوا۔
''ہاں۔!''میں نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔ موی شاپرز اٹھا کر باہر نکل گئی۔
''مجھے کیا ہوا تھا۔؟''
'عالم بے ہوشی میں تھا، احمق کے پٹھے!۔''موی کے جاتے ہی قدیر نے اپنا روائتی انداز اختیار کر لیا۔
''صبح ہو گئی۔!''میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔
''ہاں جی۔!''وہ منہ چڑانے کے انداز میں بولا''تیسری صبح۔!''
''کیا؟''مارے حیرت کے میں کہنیوں کے بل اٹھ گیا۔
''اور کیا؟''وہ بولا۔''ڈاکٹر نے کہا کہ کوئی صدمہ، کوئی شاک پہنچا ہے۔''قدیر نے بتایا۔''اماں نے ہمیں ہاسپٹل نہیں جانے دیا، بولیں''ٹھیک ہو جائے گا!''پھر میری طرف دیکھ کر بولا''اماں کو کچھ معلوم ہے۔؟''
''یار کچھ بھی تو نہیں ہوا۔''
''پھر تو بے ہوش کیوں رہا؟ احمق کے پٹھے''قدیر نے دانت نکوسے۔''ہم سے چھپا رہا ہے۔؟''
''قسم سے۔!''میں نے ایمانداری سے کہا۔''کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔''
قدیر غور سے مجھے دیکھنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ میں جھوٹ نہیں بولتا، ہمارے درمیان خاموشی رہی۔ میں مسلسل سوچتا رہا کہ کیا ہوا تھا، میرے ساتھ؟ مگر مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ میرا ذہن سادہ تھا کسی سلیٹ کی مانند۔
تھوڑی دیر میں موی چائے لے آئی۔ چائے کے ساتھ ڈبل روٹی، مکھن، ابلے ہوئے انڈے اور بسکٹ تھے۔

''بھائی چائے کے ساتھ کچھ کھا بھی لیں۔۔!'' وہ بولی۔
قدیر نے کہا۔ ''فکر نہ کرو میں اس کو حلق تک بھر دوں گا۔''
مومی ہنسی اور ہم دونوں کو دیکھتی ہوئی باہر چلی گئی۔ مومی میری اکلوتی بہن تھی۔ ہمارے گھر کی رونق، روشنی اور زندگی بھی۔
قدیر کے ساتھ ناشتا ختم کیا ہی تھا کہ اماں اندر آ گئیں۔ انہوں نے بڑے پیار سے مجھ پر دم کیا اور بولیں۔ ''تمہارے سرہانے دوا رکھی ہے کھالو۔۔۔!''
قدیر نے اٹھ کر گولیوں کے پتے اٹھائے اور دو، دو گولیاں مختلف پتوں سے نکالیں، مجھے دیں اور میں نے گلاس بھر پانی کے ساتھ انہیں نگل لیا۔ اس کے بعد میں لیٹ گیا۔ پتا نہیں کیوں اعصاب بے جان سے ہونے لگے تھے۔ ؟، قدیر اور اماں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ مجھے تھوڑی دیر تک تو ان کی آوازیں سنائی دیتی رہیں پھر میں سو گیا۔
میری آنکھ کھلی تو کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ مجھے پیاس لگ رہی تھی۔ میں نے سرہانے سے جگ اٹھا کر گلاس میں پانی ڈالا اور دھیمے دھیمے گھونٹ لینے لگا۔ کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور مومی نے اندر جھانکا اور مجھے بے دار دیکھ کر اندر آ گئی۔
''اب کیسی طبیعت ہے۔۔؟'' اس نے پوچھا اور خالی گلاس میرے ہاتھ سے لیکر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔
''ٹھیک ہوں۔۔!تم کیسی ہو۔۔؟'' میں نے پیار سے اس کا ہاتھ تھاما۔
میرے ہاتھ تھامنے کی دیر تھی کہ جیسے بند ٹوٹ گیا اور وہ مجھ سے لپٹ کر بے تحاشا رونے لگی۔
میں اس کے سر کو تھپکی دیتا رہا۔ ہم دونوں بھائیوں پر وہ جان چھڑکتی تھی۔ لیکن ہم دونوں کے درمیان جو دوستی، جو تعلق، جو پیار تھا، اس کو شائد لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی بہنیں خدا کی رحمت کی طرح نازل ہوتی ہیں، خالص اور مصفاء روشنی کی طرح جو آپ کو اُجال دے۔۔!
وہ اپنی سسکیوں کے درمیان یہی پوچھتی رہی۔ ''کیا ہو گیا ہے آپ کو۔۔؟''
''تم جیسی پیاری بہن کی موجودگی میں مجھے کیا ہو سکتا ہے۔۔؟''
'' بھائی کوئی تو بات ایسی ضرور ہے جو کہ یا تو آپ مجھے بتا نہیں رہے یا پھر شائد آپ کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہی۔۔!'' مومی نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
میں نے ایک گہری سانس لی۔ مومی کو غور سے دیکھا اور کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن سچ تو یہ ہے کہ خود مجھے بھی سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ میں کس کیفیت سے گزر رہا ہوں۔ بس یوں لگتا ہے کہ جیسے مجھے کہیں دھکیلا جا رہا ہے۔ کسی طرف بھیجنے کی تیاری ہے۔ لیکن کون کر رہا ہے، کہاں بھیجنا چاہتا ہے؟ مجھے کچھ نہیں معلوم۔۔!'' احساسِ بے بسی سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
کوئی سمت واضح نہیں، زندگی کس رخ کو اختیار کر رہی ہے، راستے کہاں جائیں گے۔ اور پھر کیا میں اپنے آپ کو کھو رہا تھا۔؟ کیا میں پاگل ہو رہا ہوں۔۔؟ اچانک ایک سوال بجلی کے کوندے کی طرح میرے دماغ میں لپکا۔
''نہیں بھائی!'' مومی نے مداخلت کی۔ ''آپ کو کچھ نہیں ہو رہا۔''
میں نے مومی کی طرف دیکھا۔
اس نے میرے خیال کو پڑھ لیا تھا۔ ''آپ صرف الجھ گئے ہیں'' اس نے رسانیت سے کہا۔ چند دنوں میں اس کیفیت سے نکل آئیں گے۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔''
بعض اوقات خیالات، تاثر کی تحریر کی صورت، چہرے کی اسکرین پر روشن ہو جاتے ہیں اور پھر ہم سے نزدیک، ہمیں سمجھنے والے اس تحریر کو با آسانی پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر قدرت ہمارے ساتھ ایسے لوگوں کو نتھی نہ کرے تو پھر ہم اپنے ہی آسیب کا شکار ہو کر فنا ہو جائیں۔

تصوف اور محبت کی اِس پُراسرار دنیا کے حیرت ناک واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیے

سفر وسیلۂ ظفر... مگر اس سفر میں بھلا کون منزل تک پہنچا'
کون راہزن ہوا اور کون رہبر حضرت انسان کے نئے نئے قصے

بھرم



ممتاز احمد

لاری اڈے میں شانی کی دکان کے اوپر رہائش تھی مگر اُس کمرے میں ایک جہان آباد تھا'
اور اک دن' اِک پری چہرہ نے اُس طلسم کو بھسم کر ڈالا

میرے والد صاحب کی لاری اڈے میں اسپیئر پارٹس کی دکان تھی جس میں ویگنوں اور بسوں کے مختلف پارٹس فلٹر، جالیاں، نٹ بولٹ، بیرنگ وغیرہ فروخت کیے جاتے تھے۔ دکان اچھی چل رہی تھی۔ جس کی وجہ سے گزر بسر آسانی سے ہو رہی تھی۔ میں اس وقت بی۔اے کا طالبعلم تھا جب والد صاحب کا ہارٹ اٹیک کے نتیجے میں انتقال ہو گیا۔ چونکہ میں بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اس لیے گھر کی کفایت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ گئی اور مجھے مجبوراً تعلیم کو خیر آباد کہنا پڑا۔

ابو کی وفات کے دس روز بعد میں نے دکان پر بیٹھنا شروع کیا۔ میں صبح سویرے دکان کھولتا اور رات گئے دکان بند کر کے گھر لوٹتا۔ مجھے دکانداری اور کاروبار کی کوئی سوجھ بوجھ نہیں تھی مگر جب ذمہ داری سر پر پڑے تو پھر خود بخود ہی سارے کام کرنا آ جاتے ہیں۔ اس ضمن میں اردگرد کے دوسرے دکانداروں نے میرے ساتھ بہت تعاون کیا۔ کاروبار کے اسرار و رموز سمجھائے۔ شروع شروع میں مجھے دکان پر بیٹھنا اچھا نہیں لگتا تھا مگر میرا جلد ہی دل لگ گیا۔ لاری اڈہ بہت ہی بارونق جگہ ہوتی ہے جہاں سارا دن ویگنوں، بسوں کی آمدورفت جاری رہتی ہے۔ علاوہ ازیں مختلف علاقوں سے آنے جانے والے مسافروں کی کثیر تعداد بھی رونق میں اضافہ کرتی ہے۔ آہستہ آہستہ مجھے تمام اسپیئر پارٹس کے نام ازبر ہو گئے۔ لاری اڈے میں واقع ایک کارنر میں ایک چھوٹی سی دکان تھی جس میں موبل آئل، گریس اور صفائی کرنے والے کپڑے فروخت ہوتے تھے۔ یہ دکان شانی نام کا ایک بندہ جس کی عمر لگ بھگ تیس بتیس سال تھی وہ چلاتا تھا۔ اس کا اصل نام تو شاید کسی کو معلوم نہیں تھا مگر شانی کے نام سے ہی وہ مشہور تھا، اسی دکان کی چھت پر ایک چھوٹا سا کمرہ ہوا تھا جس کے ساتھ ایک اٹیچ باتھ بھی تھا، اس کمرے میں دو سے تین آدمی باآسانی سو سکتے تھے، کمرہ میں جانے اور اترنے کے لیے دکان کی پچھلی جانب ایک لوہے کی سیڑھی بنی ہوئی تھی شانی دور دراز کے کسی گاؤں سے آیا تھا اور دکان کے ساتھ وہ کمرہ بھی اس نے کرائے پر لیا ہوا تھا دکان بند کرنے کے بعد اوپر اسی کمرے میں

سوتا تھا دوسرے لفظوں میں وہی کمرہ اس کی رہائش تھی۔ اس نے فرش پر ایک قالین بچھا کر ڈبل بیڈ والا فوم کا گدا ڈالا ہوا تھا۔ لحاف، کھیس کمبل وغیرہ کے ساتھ دوسرا ضروریات زندگی کا سامان بھی رکھا تھا۔ وہ مہینے کے بعد ایک دن کے لیے اپنے گاؤں جاتا اور اگلے دن لوٹ آتا۔ ابھی تک وہ غیر شادی شدہ تھا۔ اس کی سلام دعا سب دکانداروں کے ساتھ تھی مگر اس کا میل جول اتنا زیادہ کسی کے ساتھ نہ تھا۔ مجھ تک یہ ساری معلومات ایک دکاندار کی وساطت سے پہنچی تھیں اب ان تمام باتوں میں کوئی ایسی خاص بات نہ تھی کہ میں اس کی ذات میں دلچسپی لیتا۔ کچھ دنوں کے بعد میری بھی اس سے علیک سلیک ہوگئی پھر وہ اکثر میرے پاس آجاتا ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ واپس اپنی دکان پر چلا جاتا۔ اس کی دکان میری دکان سے تھوڑے فاصلے پر تھی وہ میرے پاس جب بیٹھا ہوتا تو اس کی نظر اپنی دکان پر ہوتی جونہی کوئی گاہک آتا تو وہ فوراً اٹھ کر چلا جاتا۔

جب ہماری علیک سلیک بڑھی تو اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ دور کے گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اس کے گھر میں بہت غربت ہے۔ ماں باپ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اس کی تین بہنیں ہیں جن کی شادی کرنی ہے اور یہ ذمہ داری اس نے نبھانی ہے۔ وہ پچھلے ڈیڑھ سال سے یہیں پر ہے اور دکانداری کر رہا ہے۔''

مجھے بھی اپنی دکان پر آتے چار پانچ ماہ ہو گئے تھے۔ میں نے ایک خاص بات نوٹ کی وہ یہ کہ شانی کی دکان اتنی نہیں چلتی تھی، بس اکا دکا گاہک ہی آتے تھے مگر اس کے باوجود وہ مطمئن رہتا ہر روز بڑھیا جوڑا پہنتا، گولڈ لیف کے سگریٹ پیتا، اس کا کھانا پینا بھی بہت اچھا تھا۔ ایک دن اس نے مجھے پاس دوپہر کے کھانے کے لیے بلایا تو میں چلا گیا کیوں کہ اس نے بڑے خلوص سے لنچ کی دعوت دی تھی۔ پہلی بار وہ مجھے اپنی دکان کے اوپر بنے



کمرے میں لے کر گیا جہاں اس کی رہائش تھی۔ میں کمرے کی سجاوٹ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ انتہائی صاف ستھرا کمرہ تھا کھڑکی پر بہترین کپڑے کا پردہ لٹک رہا تھا۔ قیمتی قالین کے اوپر فوم کا گدا اور تکیے۔ ایک کونے میں ٹی وی رکھا تھا اسی طرح صاف ستھرا باتھ روم جس میں شیمپو، صابن، پرفیوم اور تولیہ وغیرہ موجود تھا جبکہ شانی خالصتاً دیہاتی آدمی تھا۔

میں اس کے ذوق اور نفاست کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ کمرے میں ایک چھوٹا سا فریج بھی پڑا تھا اس میں کولڈ ڈرنک اور ٹھنڈے پانی کی بوتلیں موجود تھیں اس نے مجھے بہت شاندار لنچ کروایا۔

شانی سے اب میری دوستی ہو گئی تھی۔ میں نے شانی سے پوچھا۔ ''یار! آج لنچ کس خوشی میں کروایا ہے؟'' وہ ہنس کر کہنے لگا۔ ''یار فہیم! ہماری دوستی کا پہلا لنچ کروایا ہے۔ مطلب تمہارے ساتھ دوستی کی خوشی میں۔

اب آہستہ آہستہ میری اس سے بے تکلفی بڑھنے لگی۔ ایک دن میں نے شانی سے پوچھا۔

''تمہاری دکان تو اتنی چلتی نہیں ہے مگر تم بڑے ٹھاٹ باٹ سے رہتے ہو اس کا کیا راز ہے؟'' تو اس نے ہنس کر میری بات کو ٹال دیا۔ میں جب بھی اس سے پوچھتا تو وہ گول مول بات کرتا، اب میرا اصرار بڑھنے لگا۔

ایک دن وہ میرے پاس میری دکان پر بیٹھا تھا میں بھی فارغ تھا اس وقت کوئی گاہک نہ تھا تو میں نے کہا۔ ''شانی! تم نے مجھے دوست تو بنا لیا ہے مگر تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔''

وہ حیرانگی سے بولا۔ ''کیوں یار فہیم کیا ہوا؟''

میں نے ناراض ہونے والے انداز سے کہا۔ ''اتنے دنوں سے ایک بات پوچھ رہا ہوں مگر تم بتاتے ہی نہیں ہو۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔''

میری بات سن کر وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر کہنے لگا۔ ''اچھا بتاتا ہوں مگر میرے ساتھ پہلے وعدہ کرو کہ یہ بات اپنے تک رکھو گے اور کبھی کسی کو نہیں بتاؤ گے۔''

میں نے اس کے ساتھ پکا وعدہ کر لیا۔ پھر اس نے جو کچھ مجھے بتایا میں سن کر حیران پریشان رہ گیا بلکہ یوں کہہ لیں میرے تو ہوش اڑ گئے۔

☆......☆

ارسہ شہزادی نے ایک لوئر مڈل کلاس گھرانے میں آنکھ کھولی۔ جہاں ضروریات زندگی بڑی مشکل سے پوری ہوتی تھیں۔ چھوٹا سا گھر تھا۔ آسائش نام کی کوئی چیز نہیں تھی تین ٹائم کی دال روٹی چل رہی تھی۔ ارسہ سرکاری اسکول میں پڑھ رہی تھی۔ جب اس نے سن شعور میں قدم رکھا تو اس وقت تک اس نے خوب رنگ روپ نکالا۔ گورا رنگ، لمبا قد، دلکش اور پرکشش نین نقش، متناسب سڈول جسم۔ اس کی کلاس فیلوز اسے یہ کہا کرتی تھیں کہ ارسہ تم سچ مچ اپنے نام کی طرح شہزادی ہو۔'' تو وہ گھر آ کر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتی رہتی۔ وہ اپنے حسن پر بہت نازاں رہنے لگی۔ جب بھی سہانے سپنوں میں کھوتی تو اس کی ماں کی ایک ہی جھڑک اسے فوراً حقیقت کی دنیا میں لے آتی۔

میٹرک کے بعد اس نے سرکاری کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس کی پڑھائی پر کسی کو اعتراض اس لیے نہیں تھا کہ کوئی بھاری فیس ادا نہیں کرنی پڑتی تھی۔ ایک قسم کی تعلیم مفت تھی۔ ارسہ کو تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا یا نہیں یہ الگ بات ہے مگر وہ گھر کے گھٹن زدہ ماحول سے دور رہنے کے لیے بلا ناغہ کالج جاتی اگرچہ پیریڈز خالی بھی ہوتے مگر وہ گھر آنے کی بجائے کالج میں ہی گھومتی پھرتی رہتی۔ سب سے آخر میں وہ کالج سے نکلتی۔ کالج گھر کے قریب تھا تو وہ پیدل ہی آ جاتی تھی۔ کالج کی لڑکیوں نے بھی اس کے حسن کو بہت پذیرائی بخشی اور اسے ارسہ کی بجائے صرف شہزادی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کی دو کلاس فیلوز تانیہ اور سحرش اس کی گہری سہلیاں بن گئیں۔ جب آخری دو یا تین پیریڈ خالی ہوتے تو تانیہ اور سحرش اسے ساتھ لے کر قریبی بڑے بازار میں چلی جاتیں جہاں وہ ونڈو شاپنگ کرتیں۔ تانیہ اور سحرش کی دوستیاں کچھ دکاندار

لڑکوں سے ملتی رہتی تھیں۔ جب یہ تینوں لڑکیاں ان کی دکانوں میں جاتیں تو ان کی خوب آؤ بھگت کی جاتی اور چھوٹی موٹی چیزیں بھی مفت مل جاتیں۔ ارسہ ان دونوں کی نسبت زیادہ خوبصورت تھی۔ ان کی صحبت کا اثر بہت جلد ارسہ پر بھی ہو گیا۔ ان کی دیکھا دیکھی ارسہ نے بھی دوستیاں شروع کر دیں اور کئی دکانداروں سے اس کا آنکھ مٹکا شروع ہو گیا۔ ہر مرد اور لڑکا ارسہ کی تعریفیں کرتا۔ اسے باور کروایا جاتا کہ وہ واقعی ایک حسن کی دیوی شہزادی ہے۔ جسے سن کر وہ ہواؤں میں اڑنے لگی۔

ارسہ نے بی اے کرنے تک نہ صرف خوب دوستیاں کیں بلکہ مال بھی بٹورا۔ وہ مفت چیزیں لینے کی عادی ہو گئی اور اسے یہ سب اچھا لگتا تھا۔ ارسہ کو اور اک ہو چکا تھا کہ وہ واقعی ایک شہزادی ہے تو اس کی شادی بھی انتہائی خوبصورت، وجیہہ اور بھرپور شخصیت کے مالک کسی شہزادے سے ہی ہونی چاہیے۔ اس نے بہت کم نمبروں کے ساتھ بی اے کیا تو آگے پڑھنے کو اس کا دل نہیں کیا۔ اس کا گھر میں بالکل بھی دل نہیں لگتا تھا تو وہ مختلف حیلوں بہانوں سے گھر سے باہر نکل جاتی اور بے مقصد ادھر ادھر گھومتی رہتی۔ اکثر اپنے دوست لڑکوں کے ساتھ کیفے ٹیریاز، ہوٹلوں میں جانے لگی جہاں آئسکریم، فروٹ چاٹ، دہی بھلے اور چٹ پٹے کھانے مفت میں مل جاتے جس کے صلے میں ان لڑکوں کو بوس و کنار، گلے ملنا اور ایک آدھ غیر اخلاقی حرکتیں کرنے کو مل جاتیں۔

اسی روش پر چلتے ایک سال اور بیت گیا۔ کچھ وقت گزرا تو اچانک دلدار نامی اٹھائیس سالہ لڑکے کا رشتہ ارسہ کے لیے آ گیا۔ رشتہ ہر لحاظ سے موزوں تھا، فوراً قبول کر لیا گیا۔

دلدار کے گھر والوں کو شادی کی جلدی تھی مگر ارسہ کے گھر والوں نے شادی کی تیاری کے لیے وقت مانگا تو لڑکے والوں نے کسی قسم کا جہیز لینے سے انکار کر دیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ وہ صرف تین کپڑوں میں ارسہ کو بیاہ کر لے جائیں گے بلکہ عروسی جوڑا بھی وہی بھیجیں گے۔ ارسہ کے گھر والوں کو اور کیا چاہیے تھا۔ غریب لوگ تھے بیٹی بنا کسی خرچے اور جہیز کے جا رہی تھی چنانچہ انہوں نے فوراً شادی کی تاریخ دے دی اور پھر ارسہ بیاہ کر اپنے سسرال آ گئی۔

دلدار خوبصورت اور وجیہہ مرد نہیں تھا واجبی سی شکل، رنگ ہلکا سانولا تھا مگر ہر آسائش میسر تھی۔ دلدار پیسے والا تھا۔ گھر میں بہت خوشحالی تھی ضروریات زندگی کی ہر چیز ہر آسائش میسر تھی۔ دلدار نے جب ارسہ کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا کیونکہ ارسہ پر بہت روپ چڑھا تھا وہ پہلے دن سے ہی ارسہ پر دل و جان سے فدا ہو گیا۔ وہ صرف نام کا ہی دلدار نہیں تھا بلکہ اس نے ارسہ کی خوب دلداریاں اور ناز برداریاں کیں اور اس کو سچ مچ کی شہزادی بنا دیا، اس کی ہر فرمائش اور خواہش کو پورا کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اصل میں دلدار کی قسمت کا چکر تھا یا کیا وجہ تھی دلدار کو پچھلے پانچ سال سے کہیں سے بھی رشتہ نہیں مل رہا تھا اگر کہیں بات پکی ہوتی تو جلد ہی رشتہ ٹوٹ جاتا تو ایک لحاظ سے وہ تھوڑا احساسِ کمتری کا شکار بھی ہو گیا تھا حالانکہ دلدار کا بہت وسیع کاروبار تھا روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی بلکہ دولت کی ریل پیل تھی چنانچہ جیسے ہی ارسہ کے والدین نے ہاں کی تو فوراً دلدار کے گھر والوں نے شادی کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

ارسہ کی ساس بہت اچھی تھی۔ دو نندیں اور دو دیور تھے۔ مجموعی طور پر وہ بھی اچھے تھے وہ سب ہی اپنی بھابی کا ہر طرح سے خیال رکھتے۔ ارسہ کے سسر وفات پا چکے تھے۔ جب ارسہ کو ہر طرف سے سکھ چین سکون اور خوشحالی ملی تو وہ واقعی شہزادیوں کی طرح رہنے لگی۔ ایک ادائے خاص اور تفاخر سے چلتی دیوروں اور نندوں پر خوب حکم چلاتی۔ اس کی ہر بات پوری کی جاتی باقی دلدار تو جورو کا غلام تھا ہی اسے ایک دم سے حسین و جمیل خوبصورت بیوی جو مل گئی تھی۔

زندگی بڑے آرام سے گزر رہی تھی۔ شادی کے

پہلے دس سالوں میں ارسہ نے دو بیٹیوں اور دو بیٹوں کو جنم دیا۔ ایک دیور اور ایک نند کی شادی بھی ہوگئی تھی۔ بہت کم دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ اگر کوئی بھوکے غریب گھر کی لڑکی کی شادی امیر گھرانے میں ہوجائے تو وہ شکرگزاری احسان مندی اور حسن سلوک سے رہتی ہے۔ سسرال والوں کی قدر کرتی ہے مگر اکثریت ایسی لڑکیوں کی بھی ہے جو بھوکے ننگے گھر سے بیاہ کر دولت مند سسرال میں آتیں ہیں تو اپنی اوقات سے بہت باہر نکل جاتی ہیں۔ اپنے ماضی کی غربت کو بھول جاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کھے (راکھ) اڑاتی ہیں تو ارسہ بھی اب کچھ ایسا ہی کررہی تھی۔ اتنا پیار کرنے والا شوہر، خیال رکھنے والی ساس دیور نند تھی تو اس کو چاہیے تھا سب کی قدر کرتی رشتوں کا احترام کرتی اور اپنے حسن کردار، حسن عمل اور شکرگزاری سے رہتی مگر اس کے بہت پر پرزے نکل آئے تھے۔ ہر وقت اکڑ اور غرور میں رہتی۔ ساس، دیور، نند سے بدتمیزی بھی کرتی البتہ دیورانی اس کو ایک کی چار سناتی تھی اس لیے وہ اس سے دور رہتی۔ دلدار اپنے کاروباری معاملات میں کافی مصروف رہتا مگر اس کے باوجود وہ ہمیشہ وقت پر گھر آتا۔ ارسہ کو ٹائم دیتا پیار جتلاتا۔

ارسہ کو ہر طرح کی آزادی حاصل تھی۔ اس نے دلدار کو کاٹھ کا الو بنایا ہوا تھا اس سے خوب پیسے بٹورتی بلکہ کئی بار اس کی کھونٹی سے لٹکی قمیض سے چپکے سے پیسے بھی نکال لیتی تھی مگر دلدار نے کبھی پروا نہیں کی بس وہ چاہتا تھا اس کی شہزادی خوش رہے۔ ارسہ بیڈروم میں خوب نخرے دکھاتی اور ہر معاملے میں من مانی کرتی۔ ارسہ شادی سے پانچ چھ سال پہلے غیر مردوں سے ملتی رہی تھی اس لیے اسے مفت چیزیں لینے کا خوب چسکا پڑا ہوا تھا۔ قسمت کی دیوی اس پر اچانک مہربان ہوگئی تھی تو اب اس کا فرض تھا وہ اپنے پچھلے اطوار اور بداعمالیوں سے توبہ کرتی کیونکہ روپیہ پیسہ دنیا کی ہر آسائش اُسے حاصل تھی مگر کہتے ہیں کہ جو عادتیں کچی عمر میں پڑ جائیں پھر وہ بڑھاپے تک ساتھ چلتی ہیں یہی کچھ ارسہ کے ساتھ ہوا۔ وہ اپنی سابقہ روش پر پھر لوٹ رہی تھی۔ اب اس کا معمول بن گیا دلدار کو صبح سویرے ناشتا کروا کر رخصت کرتی اور خود لمبی تان کر سوجاتی۔ گیارہ بجے اٹھتی اور بن ٹھن کر گھر سے باہر نکل جاتی۔ وہ بچوں کی بھی کوئی خاص کیئر نہ کرتی تھی۔ بچے ہر وقت دادی کے پاس رہتے۔ والدار نے اس کی فرمائش پر اسے ایک سوزوکی کار خرید کردی ہوئی تھی۔ ارسہ نے ڈرائیونگ سیکھ لی تھی اب وہ اپنی مرضی سے جب چاہتی گھر سے نکل جاتی۔ ارسہ کی عمر اس وقت پچیس یا چھبیس سال کی تھی چار بچے پیدا کرنے کے بعد وہ اور نکھر گئی تھی۔ آنٹی کی بجائے لڑکی لگتی۔ اس نے مختلف دکانداروں سے دوستیاں شروع کردیں۔ اپنے سابقہ معمول کے مطابق ان سے مفت چیزیں جن میں سوٹ، پرفیوم، میک اپ کا سامان اور ہینڈ بیگ وغیرہ ہوتے حالانکہ اس کا پرس نوٹوں سے بھرا ہوتا تھا مگر اس کی سوچ یہ تھی کہ ان کا اپنا ہی مزہ ہے ایک دکاندار نے اسے موبائل فون گفٹ کیا اور اسی وقت دکان کے نیچے گودام میں بھرپور قیمت بھی ارسہ شہزادی سے وصول کرلی مگر اسے کوئی ندامت اور شرمندگی نہ ہوئی وہ تو بس مفت کا موبائل لے کر بہت خوش تھی۔

آہستہ آہستہ اس کی دوستیوں کا دائرہ بڑھنے لگا جن کا نتیجہ یہ نکلا اسے ناجائز تعلقات استوار کرنے میں اب کوئی جھجک نہ ہوتی۔ ہر مرد اس کے حسن کے قصیدے پڑھتا۔ دل کھول کر تعریفیں کرتا تو شہزادی صاحبہ دل کھول کر اپنے حسن کی خیرات بانٹتی۔

انہی دنوں ارسہ کی دوستی اظہر نامی ایک مرد سے ہوئی۔ اظہر مردانہ وجاہت کا ایک نمونہ تھا گورا چٹا رنگ، لمبا قد، مضبوط باڈی وہ ایک ٹھکیدار تھا۔ شکل سے بظاہر شریف نظر آتا تھا مگر ایک نمبر کا چھٹا ہوا ناجائز منافع خور انتہائی چالاک اور عیار شخص تھا۔ عورتوں کا شکاری اور رسیا تھا۔ ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں دونوں کی سرسری ملاقات اور تعارف ہوا اور بہت جلد دوستی ہوگئی۔ اظہر کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنے

شکار پر فوراً ہی جھپٹتا تھا اور فوراً ہی دو تین دن میں اپنا مقصد حاصل کر کے نیا شکار تلاش کر لیتا۔ پچھلے ایک مہینے سے اسے کوئی شکار نہ ملا تھا اچانک اسے جوان، خوبصورت اور بھرپور عورت ارسہ کی شکل میں نظر آئی تو فوراً دوستی کر لی۔

ارسہ بھی کسی ایک شاخ پر بیٹھنے والی چڑیا نہیں تھی، وہ بھی اسی قماش کی عورت تھی۔ اظہر نے اسے شاندار پر تکلف لنچ کروایا۔ دو دن کے بعد عیدالاضحیٰ تھی عید سے ایک دن پہلے خاص ملاقات کا پروگرام فائنل ہو گیا۔ اظہر نے کہا کہ وہ ارسہ کو سونے کا لاکٹ عید کے تحفے کے طور پر دے گا، زیور تو ارسہ کی کمزوری تھی۔

☆......☆

شانی نے اپنے ٹھاٹ باٹ کی وجہ یہ بتائی کی دکان تو اس کی برائے نام چلتی ہے مگر زیادہ پیسہ وہ اوپر کی کمائی سے کماتا ہے۔

''اوپر کی کمائی؟ یار شانی وہ کیسے۔'' تو اس پر اس نے انتہائی رازدارنہ انداز سے بتایا کہ بہت سارے جوڑے مرد، عورت، لڑکا لڑکی جن کے آپس میں تعلقات ہوتے ہیں تو ان کو ''محبت'' کے لیے جگہ کی ضرورت ہوتی اور محفوظ جگہ بہت مشکل سے ملتی ہے تو وہ اس قبیح فعل کی انجام دہی کے لیے مجھ سے رابطہ کرتے ہیں تو میں ایک گھنٹے کے عوض ایک ہزار روپیہ وصول کر کے انہیں اپنا رہائش والا کمرہ دیتا ہوں جہاں وہ سکون سے اپنا مقصد حاصل کر لیتے ہیں، مزید برآں جسم فروش عورتیں بھی اپنے گاہک گھیر کر لے آتی ہیں تو انہیں بھی پرسکون اور محفوظ جگہ مل جاتی ہے۔ مجموعی طور پر دن میں پانچ سے چھ جوڑے آ جاتے ہیں اسی طرح کبھی کبھار کچھ لوگ رات بھر کے لیے بھی میرا کمرہ حاصل کرتے ہیں جس کے عوض وہ دو ہزار سے تین ہزار ان سے وصول کرتا ہے اور خود نیچے دکان میں سو جاتا ہے۔ چونکہ یہ لاری اڈہ ہے یہاں دن رات مسافر آتے جاتے رہتے ہیں تو کسی کو کوئی شک بھی نہیں ہوتا۔ بونس کے طور پر شانی بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیتا ہے۔ شانی انتہائی خفیہ یہ کام کر رہا تھا کہ آج تک کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔ شانی کا طریقہ کار یہ تھا وہ مرد عورت کو اوپر اپنے کمرے میں بھیج دیتا اور باہر سے دروازے کو تالا لگا کر نیچے اپنی دکان پر بیٹھ جاتا جب وہ فارغ ہو جاتے تو شانی کو میسج یا کال کر دیتے وہ تالا کھول دیتا اور وہ جوڑا چپکے سے سیڑھیاں اتر کر چلا جاتا۔ شانی تالا اس لیے لگاتا تاکہ کمرے کو تالا لگا دیکھ کر کوئی اوپر نہ جائے پیسے وہ ان کو کمرے میں بھیجنے سے پہلے وصول کر لیتا تھا۔ کمرہ ویل ڈیکوریٹڈ تھا اور اٹیچ باتھ میں نہانے کی سہولت بھی تھی۔ بہت محفوظ بھی تھا اور رازداری بھی تھی تو اس وجہ سے یہ سلسلہ چل رہا تھا۔

شانی کے منہ سے یہ ساری معلومات سن کر میں سخت حیران رہ گیا۔ شانی نے بتایا۔ وہ مہینے کا ڈیڑھ لاکھ روپیہ کما رہا ہے۔ میں نے شانی سے کہا۔

''یار تم میرے دوست ہو تو اس ناتے تمہارے بھلے کے لیے تم سے کہہ رہا ہوں کی پلیز یہ دھندا چھوڑ دو، جو گناہ کبیرہ تمہارے کمرے میں ہوتے ہیں وہ تمہارے نامہ اعمال میں بھی لکھے جا رہے ہیں۔ دوسرا تمہاری یہ کمائی سو فیصد حرام ہے۔ کیوں اپنا نامہ اعمال سیاہ کر رہے ہو۔ خدارا دوزخ کا ایندھن نہ بنو چند روپوں کے لیے اپنی آخرت برباد نہ کرو۔'' اس پر وہ کہنے لگا۔

''کیا دوسرے لوگ ٹھیک چل رہے ہیں؟ ہر کوئی حرام کما رہا ہے یہاں ایماندار، دیانت دار نیک اور پارسا وہی ہے جس کا داؤ نہیں چلتا۔'' میں نے کہا۔

''تم دوسروں کی بات کو چھوڑو جس نے جو کرنا ہے وہ بھرنا ہے تم اپنی فکر کرو اپنے اعمال کا حساب تم نے ہی دینا ہے، اور سب سے اہم بات ایسا نہ ہو تم کسی بہت بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ۔'' میں نے اسے بہت سمجھایا مگر میری کسی بات کا اس پر اثر نہ ہوا، اس نے مجھے تاکید کی کہ برائے مہربانی میرا یہ راز فاش نہ کرنا۔ میں نے کہا تمہارا یہ راز ہمیشہ میرے سینے میں دفن رہے گا۔ اس کی فکر نہ کرو ہاں

اگر ہو سکے تو میری باتوں پر غور ضرور کرنا۔''
اس نے ہنستے ہوئے ٹالنے والے انداز سے کہا۔''اوکے مائی ڈیئر۔'' اس نے فوراً موضوع بدل دیا اور دوسری باتیں شروع کر دیں۔ اس کی باتیں سن کر میں ششدر رہ گیا۔ میں وقتاً فوقتاً اسے سمجھاتا تھا کہ شاید اس پر اثر ہو جائے مگر وہ اپنی دھن میں مگن اس ناجائز اور حرام طریقے سے پیسہ کما رہا تھا، وہ مجھے جب بھی ملتا تو میں اسے سمجھانا شروع کر دیتا اسی وجہ سے وہ مجھ سے ملنے میں کترانے لگا۔ اب وہ بہت کم میرے پاس آتا تھا اگر کبھی آتا بھی تو بس تھوڑی دیر کے لیے اور جلدی چلا جاتا۔ بہرحال ایک دوست کی حیثیت سے سمجھانا میرا فرض تھا۔

☆......☆

اظہر کی شانی سے بہت اچھی دعا سلام تھی۔ وہ اپنا مذموم مقصد ہمیشہ شانی کے کمرے میں ہی پورا کرتا تو اکثر و بیشتر کسی لڑکی یا عورت کے ساتھ آتا رہتا تھا۔ اظہر ہمیشہ سے پیشہ ور عورتوں سے دور رہا۔ وہ صرف کالج، یونیورسٹی گرلز اور گھریلو عورتوں کے ساتھ تعلقات استوار رکھتا اور ایسی لڑکیاں اسے مل جاتی تھیں، پچھلے ایک مہینے سے کچھ ضروری کاموں میں بے انتہا مصروف رہا، دوسرا اتفاق سے اس دوران اسے کوئی ایسی لڑکی یا عورت نہ مل سکی تھی۔ آج وہ کچھ چیزیں خریدنے کے لیے شہر کے سب سے مشہور اور مہنگے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں گیا تو وہاں ارسہ کی چال ڈھال دیکھ کر اس کی رال ٹپک پڑی۔ وہ ایک انتہائی تجربہ کار شخص تھا۔ اس نے ارسہ کے بارے میں اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ بھی آزاد پنچھی ہے اور اگلے پانچ سے دس منٹ میں نہ صرف عینک سلیکٹ کر لی بلکہ لنچ کے لیے آمادہ بھی کر لیا۔ اگلے آدھے گھنٹے میں وہ ایک ریستوران میں لنچ کر رہے تھے۔ عید سے ایک دن پہلے کا پروگرام اس لیے فائنل کیا کیونکہ اس وقت بہت جلدی میں تھا اور اس نے ابھی اپنے کسی کام کے سلسلے میں دوسرے شہر جانا تھا۔ وہ قربت کے پرلطف لمحات بڑے سکون سے گزارنا تو اس کا یہی ارادہ تھا کہ وہ اپنا کام نمٹا کر کل رات تک واپس آجائے گا اور اگلے دن ارسہ سے خاص ملاقات کرے گا۔ چنانچہ پروگرام ڈن ہو گیا۔

اس نے لنچ کے بل کی پے منٹ کی ارسہ کا موبائل نمبر لیا اور چلا گیا۔ ارسہ بھی گھر آگئی۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں وہ کئی بار ارسہ شہزادی سے کال پر خوب باتیں بھی کر چکا تھا۔ دل کھول کر اس کے حسن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے اسے سوئیٹ اینڈ لولی پرنسس (شہزادی) کا خطاب دیا تو شہزادی ہواؤں میں اڑنے لگی۔

عید سے ایک دن پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ارسہ شہزادی حسب معمول فل میک اپ کر کے اور تیار ہو کر جانے لگی تو اس کی ساس نے بتایا کہ اس کے سب سے چھوٹے بیٹے کی طبیعت کافی خراب ہے اور بیمار ہے اسے ڈاکٹر سے چیک کروا کر دوا لے آؤ۔'' ارسہ نے بے پروائی سے کہا۔

''اس ٹائم تو کوئی ڈاکٹر نہیں ملے گا شام کو وہ کسی پرائیوٹ اسپتال سے چیک کروا لے گی۔'' اسی دوران کسی بات پر دیورانی کے ساتھ جھگڑا بھی ہو گیا۔ ادھر اظہر اسی ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں پہنچ چکا تھا اور بڑی شدت سے ارسہ کا منتظر تھا۔ وہ بار بار کال کر رہا تھا یہاں دیورانی سے تو تکار شروع ہو گئی تھی۔ دیورانی نے صرف اتنا کہا تھا کہ بچہ بہت بیمار ہے پہلے اسے چیک کرواؤ پھر سیر سپاٹے کے لیے جانا تو اسی بات پر لڑائی شروع ہو گئی اور بکتی جھکتی گھر سے نکل آئی۔ ارسہ نے کار اسی ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے آگے کھڑی کی اور اندر چلی گئی۔ وہاں سے اظہر اور ارسہ ایک آٹو رکشہ میں بیٹھ کر سیدھے لاری اڈے پہنچے۔ اظہر کی شانی سے بات ہو چکی تھی وہ ان کا منتظر تھا۔ اس نے حسب معمول انہیں کمرے میں بھیج کر باہر سے دروازے کو تالا لگا دیا۔ اظہر اور ارسہ کمرے میں بیٹھ کر پہلے باتیں کرتے رہے پھر اظہر نے سونے کا لاکٹ ارسہ کو دیا جسے لے کر وہ خوشی سے پھولے نہیں سمائی۔ اظہر نے اپنی پاکٹ سے چھوٹی سی شراب کی بوتل نکالی اور پیگ پیا اس نے

مجبور کر کے ایک پیک ارسہ کو بھی پلا دیا کہ آج وہ آتشہ مزہ دوبالا کرو۔ دونوں نے اپنے اپنے موبائل فون بند کر دیے تاکہ کسی قسم کی ڈسٹربنس نہ ہو۔

شانی انہیں کمرے میں بھیج کر اپنی دکان پر تھوڑی دیر بیٹھا رہا کچھ دیر کے لیے فہیم کی دکان پر آ گیا اور سگریٹ پینے لگا اسے کوئی کام یاد آ گیا تو وہ لاری اڈے سے باہر سامنے والی دکان پر جا رہا تھا تو ایک اے سی کوچ تیز رفتاری سے لاری اڈے میں داخل ہو رہی تھی جیسے ہی گاڑی نے ٹرن لیا تو اپنے خیالوں میں مگن جاتے ہوئے شانی سے ٹکرا گئی۔ جیسے ہی شانی کو گاڑی کی ٹکر لگی وہ سڑک پر گر گیا۔ ڈرائیور نے فوری بریک لگائی تو گاڑی رک گئی شانی کو بظاہر تو کوئی چوٹ نہ لگی مگر جیسے ہی سڑک پر گرا سر میں چوٹ لگی تو وہ درد سے لوٹ پوٹ ہونے لگا اور چند منٹ کے بعد بے ہوش ہو گیا۔ فوراً ہی شانی کو اٹھا کر ایک بینچ پر لٹا دیا گیا۔ اسے پانی پلانے کی کوشش کی گئی مگر بے ہوشی کی وجہ سے پانی اس کے حلق سے نہ اترا۔ اسی وقت ریسکیو 1122 پر کال کی گئی اگلے پانچ منٹ میں ایمبولینس پہنچ گئی۔ ریسکیو کے عملہ نے چیک اپ کیا تو انہیں پتا چل گیا کہ سر میں چوٹ لگی ہے تو انہوں نے اسے فوراً ایمبولینس میں ڈالا اور سول اسپتال کے ایمرجنسی میں پہنچا دیا جہاں اسے ضروری طبی امداد دی جانے لگی۔ آج لاری اڈے پر بہت رش تھا کیونکہ صبح عید تھی تو آنے جانے والے مسافروں کا تانتا بندھا ہوا تھا اس لیے کسی نے بھی کوئی خاص غور نہیں کیا کہ زخمی ہونے والا کون تھا بس چند ایک بندے ہی جان سکے تھے کہ وہ شانی تھا۔ ریسکیو 1122 والوں کا اتنا ہی کام ہوتا ہے کہ کال موصول ہونے پر وہ پانچ سے چھ منٹ میں جائے حادثہ پر پہنچ جاتے ہیں اور معمولی نوعیت کے زخمی کو وہیں پر طبی امداد اور مرہم پٹی کر دیتے ہیں زیادہ زخمی اور سیریس مریض کو فوراً سرکاری اسپتال کی ایمرجنسی میں پہنچا دیتے ہیں۔ یہ بہت بڑی خدمت خلق اور بہترین سروس ہے۔ شانی کے حادثے کے تین چار گھنٹے کے بعد فہیم کو پتا چلا کہ وہ زخمی ہو کر اسپتال پہنچ چکا ہے چونکہ وہ شانی کا دوست تھا تو فہیم نے سب سے پہلے اس کی دکان بند کر کے شٹر کو تالا لگایا پھر اپنی دکان بند کی اور سول اسپتال پہنچ گیا جہاں وہ بے ہوش پڑا ہوا تھا۔

☆......☆

ارسہ نے زندگی میں پہلی بار شراب پی تھی تو ہلکے ہلکے سرور کے ساتھ اس کا سر چکرانا شروع ہو گیا جبکہ اظہر پرانا پاپی اور کھلاڑی تھا۔ وہ ایک ٹائم میں دو سے تین پیک آسانی سے برداشت کر جاتا تھا اس نے ارسہ کے جسم سے سونے کے لاکٹ کی قیمت جی بھر کے وصول کی۔ اظہر نے ایک پیک اور پیا جبکہ ارسہ سے ایک پیک برداشت نہیں ہو رہا تھا اس پر گہرا خمار تھا تو وہ گہری نیند سو گئی تھوڑی دیر کے بعد اظہر کو بھی نیند آنے لگی یہ شاید تیسرے پیک کا اثر تھا تو وہ بھی سو گیا۔ شام کے چھ بجے تک وہ سوتے رہے چھ ساڑھے چھ بجے اظہر کی آنکھ کھلی تو اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا تو گھپ اندھیرا تھا۔ سردیوں کے چھوٹے دن ہوتے ہیں، سوا پانچ بجے سورج غروب ہو جاتا ہے۔ اظہر نے فوراً اپنا موبائل آن کیا اور بار بار شانی کو کال کرنے لگا مگر شانی کا موبائل بند جا رہا تھا وجہ یہ تھی جیسے ہی بس کی ٹکر سے سڑک پر گرا تھا تو اسے اٹھاتے ہوئے کسی جیب کترے نے کمال ہوشیاری سے اس کی پاکٹ سے اس کا پرس اور موبائل نکال لیا تھا اور سم نکال کر پھینک دی تھی۔

اظہر نے ارسہ کو جھنجوڑ کر جگایا جاگنے پر صورت حال جان کر اس کے اوسان خطا ہو گئے اور گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ وہ دوپہر ایک بجے کی گھر سے نکلی ہوئی تھی اب رات کے سات بج رہے تھے۔ اگلی صبح عید تھی تو اس وجہ سے پورا لاری اڈا ویران پڑا تھا۔ اظہر نے زور زور سے دروازہ بجانا شروع کر دیا مگر وہاں اردگرد کوئی ہوتا تو آواز سنتا اس نے کھڑکی کھولی کہ شاید باہر جانے کا کوئی راستہ مل جائے مگر بہت مضبوط گرل لگی ہوئی تھی۔ ارسہ بہت پریشان ہو گئی اور آنے والے وقت کے تصور اور خوف سے لرز رہی تھی۔ شراب پینے اور موجودہ حال کو دیکھتے ہوئے اس کا سر چکرانے لگا بہت تنگی محسوس ہو رہی تھی اس کا گلا خشک

ہو رہا تھا ایسے لگ رہا تھا جیسے گلے میں کانٹے بھر دیے گئے ہوں۔ اسے بہت پیاس لگ رہی تھی۔ آج اتفاق سے فریج میں نہ تو کوئی کولڈ ڈرنک تھی اور نہ ہی پانی سب بوتلیں خالی پڑی تھیں۔ پانی والی ٹنکی خالی ہونے کی وجہ سے باتھ روم کی کسی ٹونٹی سے پانی نہیں آرہا تھا۔ اظہر نے پریشانی میں سگریٹ پینا شروع کر دیے۔ دھوئیں سے ارسہ کا دم گھٹنے لگا اسے ابکائیاں آنے لگی اس کے پیٹ میں سخت مروڑ اٹھنے لگے۔ وہ بار بار باتھ روم میں رفع حاجت کے لیے جانے لگی۔ اسے ڈائریا ہو گیا تھا۔ اظہر نے اپنے تین چار دوستوں کو فون کیے مگر وہ عید منانے اپنے اپنے آبائی شہروں میں گئے ہوئے تھے۔ پھر اس نے اپنے ایک کارندے کو فون کیا اور ساری صورتحال بتائی کہ فوراً لاری اڈے پر پہنچو اور ساتھ ہتھوڑا پلاس وغیرہ لے کر آؤ جس سے تالا توڑا جا سکے چنانچہ وہ آدھے گھنٹے کے بعد پہنچ گئے۔ اس دوران ارسہ باتھ روم جاتی رہی بالآخر اس کے جسم کا پانی ختم ہو گیا اور وہ نڈھال ہو کر کمرے میں گر گئی باتھ روم میں پانی نہ ہونے کی وجہ سے بدبو اور سخت تعفن اٹھ رہا تھا سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ ارسہ بے ہوش ہو گئی تھی اس کی نبض ڈوب رہی تھی ہتھوڑے کی ضربیں لگنے سے تالا ٹوٹ گیا اور دروازہ کھل گیا اظہر نے فوراً کمرے سے نکلا۔ باہر جانے سے قبل اس نے ایک نظر ارسہ پر ڈالی جس کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا۔ اظہر کو ایسے لگا جیسے ادھ کھلی آنکھوں سے وہ اسے کہہ رہی ہو بڑے سنگدل۔ ظالم اور بے وفا ہو۔ مجھے اسے حالت میں چھوڑ کے جا رہے ہو؟ اظہر نے ارسہ کو اسی حالت میں چھوڑا اور وہاں سے نکلنے میں عافیت جانی۔

☆......☆

دوپہر ایک بجے کی گھر سے نکلی ارسہ اب تک واپس نہ لوٹی تھی۔ اس کے سب سے چھوٹے بیٹے کی طبیعت بہت خراب تھی جب حالت زیادہ بگڑ گئی تو ارسہ کی دیورانی اور دیور اسے اسپتال لے گئے جہاں اسے داخل کر لیا گیا اور علاج شروع ہو گیا۔ ولدار بھی آ چکا تھا۔ ارسہ کا موبائل مسلسل بند جا رہا تھا۔ شام ہونے کو آئی تھی مگر ارسہ نہ تو گھر لوٹی اور نہ ہی اس کی کوئی کال آئی۔ ادھر ارسہ کی پراسرار گمشدگی سے سب پریشان تھے۔ اس کا بیٹا اسپتال میں موت و حیات کی کشمکش میں تھا۔ ولدار اور اس کے بھائیوں نے ارسہ کی تلاش شروع کر دی۔ رات گئے تک ارسہ تو نہ ملی البتہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے کھڑی اس کی کار مل گئی۔ سب کی تشویش اب بڑھ گئی تھی تو صلاح مشورے کے بعد پولیس اسٹیشن میں رپورٹ درج کروا دی گئی۔ پولیس نے اپنی تفتیش کا آغاز اسی ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے کیا جہاں ارسہ کی گاڑی کھڑی تھی ابتدائی پوچھ گچھ اور معلومات کے بعد صرف اتنا پتا چل سکا تھا کہ سوا ایک بجے کے قریب ارسہ آئی تھی ایک دو چھوٹی موٹی چیزیں خریدی تھیں پھر وہ ایک آدمی کے ساتھ باہر چلی گئی تھی، وہ کہاں گئے یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ اظہر کا حلیہ پولیس والوں نے نوٹ کر لیا چونکہ ارسہ کا موبائل بند جا رہا تھا تو اس وجہ سے اس کی لوکیشن کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ عید کی وجہ سے موبائل فون کمپنی کا دفتر بھی بند تھا اس لیے کالز کا ریکارڈ بھی نہیں مل رہا تھا۔ ولدار اور اس کا پورا گھرانہ سخت پریشان تھے ایک تو ارسہ غائب تھی دوسرا اس کا بیٹا بہت سیریس حالت میں اسپتال میں تھا۔ پولیس نے اپنے طور پر شہر کے تمام اسپتالوں میں چیک کیا، کئی جگہیں دیکھیں مگر ارسہ کا سراغ نہ ملا انہی پریشانیوں میں عید کے تینوں دن گزر گئے۔ چوتھے دن کی صبح ولدار کا بیٹا زندگی کی بازی ہار گیا تو روتے پیٹتے اس کی لاش گھر لے آئے۔

☆......☆

جیسے ہی عید کی چھٹیاں ختم ہوئیں لاری اڈے کی رونق بحال ہو گئی۔ شانی کی دکان اور کمرے کے اردگرد بہت تیز بدبو پھیلی ہوئی تھی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ بدبو کہاں سے آ رہی ہے۔ لوگ بدبو کی وجہ تلاش کر رہے تھے تو ان کی نظر شانی کے کمرے کے کھلے ہوئے کمرے پر پڑی بدبو کے بھبکے وہیں سے اٹھ رہے تھے۔ انہوں نے اوپر جا کر جو منظر دیکھا تو سب کی گھگی بندھ گئی۔ ایک جوان عورت کی لاش جو پھول چکی تھی اس سے بدبو اٹھ رہی تھی۔ کمرے میں جا بجا گندگی پڑی ہوئی تھی۔ لوگ خوفزدہ ہو گئے اور فوراً

پولیس کو اطلاع دی گئی۔ پولیس نے لاش کو قبضے میں لیا اور کمرے کی تلاشی کے دوران شراب کی خالی بوتل۔ ارسہ کا پرس اور موبائل بھی تحویل میں لے لیا۔ ارسہ کی تصویر پولیس کے پاس تھی جس کی وجہ سے لاش کی شناخت ہوگئی۔ وہاں اس قدر بدبو تھی کہ ایک منٹ بھی کھڑا ہونا دشوار تھا۔ دلدار کو بلایا گیا تو اس نے بھی ارسہ کی لاش کو شناخت کرلیا۔ لاش کو فوری طور پر سول اسپتال کے مردہ خانے بھیج دیا گیا جہاں پوسٹ مارٹم کے بعد لاش ورثاء کے حوالے کردی گئی۔ جب دلدار کے گھر سے دو جنازے اکٹھے اٹھائے گئے تو کہرام مچ گیا ارسہ کی لاش بہت خراب ہوگئی تھی جس کی وجہ سے بہت جلد اس کی تدفین کردی گئی۔ اب پولیس نے اس گتھی کو سلجھانا تھا تو اس نے اپنی باقاعدہ تفتیش کا آغاز کردیا۔ ارسہ کا موبائل پولیس کے قبضے میں تھا انہوں نے تمام کالز چیک کیں اور بالخصوص آخری کال جو کہ اظہر کی تھی کا نمبر نوٹ کرکے اس کا مکمل بائیوڈیٹا متعلقہ موبائل کمپنی سے نکلوالیا۔

☆......☆

میں شانی کو اپنا دوست مان چکا تھا۔ تو میری غیرت نے گوارہ نہ کیا کہ اسے اسپتال میں بے یارو مددگار چھوڑوں۔ اس کا اس شہر میں کوئی رشتے دار اور جاننے والا نہ تھا۔ اس کے گھر والوں کا کوئی اتا پتا کسی کے پاس نہ تھا چنانچہ میں اسپتال کے چکر لگاتا رہا اور جو انجکشن ڈرپس ڈاکٹر بولتے، میں وہ میڈیکل اسٹور سے لے آتا۔ عید کے تیسرے دن شانی کو ہوش آگیا اسے وارڈ میں شفٹ کردیا گیا۔ اگلی صبح تک وہ کافی حد تک ٹھیک ہوگیا اور ہلکی پھلکی غذا کھانے کے قابل ہوگیا۔ میں گھر سے اس کے لیے دلیہ، چائے وغیرہ بنوا کر لے گیا تھا جب شانی مکمل طور پر ہوش وحواس میں آگیا تو وہ اپنی پاکٹس کو ٹٹولنے لگا اس نے بتایا کہ موبائل اور پیسوں والا پرس غائب ہے وہ بہت پریشان ہوگیا تھا۔ خاص طور پر جب اسے پتا چلا کہ وہ مسلسل چار دن اور راتیں بے ہوش رہا ہے تو وہ بہت بے چین اور گھبراہٹ کا شکار ہوگیا۔ میں اسے تسلیاں دیتا رہا۔

''یار ...

تمہاری جان بچ گئی ہے۔ کوئی ٹانگ بازو نہیں ٹوٹا اور کوئی گہری چوٹ بھی نہیں آئی۔'' تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر نے چیک کیا کچھ دوائیاں لکھ کردیں اور شانی کو اسپتال سے چھٹی دے دی۔ کچھ دن آرام کرنے کو کہا میں شانی کو جیسے ہی وارڈ سے لے کر باہر آیا اسی وقت پولیس آگئی اور انہوں نے شانی کو حراست میں لے لیا۔ اظہر کو وہ پہلے ہی گرفتار کرچکے تھے۔ پولیس اسٹیشن جاکر شانی نے سب کچھ صاف صاف بتادیا تھا۔ چونکہ اس کے کمرے سے عورت کی لاش برآمد ہوئی تھی تو پولیس اسے چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ لہٰذا اسے حوالات میں بند کردیا گیا۔ پولیس کے علم میں سارے حالات آچکے تھے ارسہ اپنی مرضی سے اظہر کے ساتھ گئی تھی۔ اس کی موت کسی تشدد وغیرہ سے نہ ہوئی تھی بلکہ ڈائریا کی وجہ سے وہ جاں بحق ہوئی تھی ہاں اگر اظہر فوری طور پر اسے اسپتال پہنچادیتا تو شاید اس کی جان بچ جاتی۔ اظہر کا یہی جرم تھا اس نے اسے شراب پلائی، زنا کیا جس میں ارسہ کی رضامندی شامل تھی مگر اس کو بے یارو مددگار چھوڑ کر بھاگ جانا یہ بہت بڑا جرم تھا۔ اگر لوگوں کو اس سارے معاملے کے درست حالات معلوم ہوجاتے تو یہ دلدار اس کے گھرانے اور بچوں کی بدنامی ہوتی چنانچہ دلدار نے اظہر کے خلاف اغواء اور جنسی تشدد کے ذریعے ارسہ کی موت کا پرچہ کٹوادیا چونکہ شانی کا کمرہ استعمال ہوا تھا تو اسے بھی اعانت جرم کے الزام میں نامزد کیا گیا۔ اصل بات کسی کو بھی معلوم نہ ہوسکی خاص طور پر دلدار کے کسی رشتے دار کو۔ اس کی وجہ یہ تھی کی دلدار کو اپنی بیوی ارسہ شہزادی سے بہت پیار تھا۔ اس نے ارسہ کو ٹوٹ کر چاہا تھا شادی کے پہلے دن سے لے کر آخر تک دلداریاں کی تھیں۔ بے حد پیار دیا، ہر جائز ناجائز خواہش پوری کی، اسے آزادی دی ہر طرح سے خیال رکھا اور شہزادی بنا کر رکھا مگر ارسہ بدنصیب نکلی اس نے دلدار کے پیار اور چاہت کی قدر نہ کی غلط راہوں پر چل نکلی۔ اپنی عادتوں کی بدولت ذلالت کی گہرائیوں میں گرگئی مگر آفرین ہے دلدار پر اس نے اپنا پیار نبھایا اور اس کا بھرم رکھ لیا تھا۔

سفر نامہ

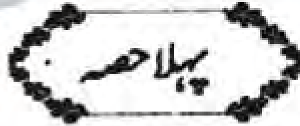


برف کے شہر



قمر علی عباسی

پاکستان کی برف پوش وادیوں کی سیر کراتا ایک منفرد سفرنامہ، قمر علی عباسی کے قلم کا جادو



پہلا حصہ

ذرا بلندیوں تک

ہم نے کافی کا آخری گھونٹ پیا، اُس لمحے نگہت نے آ کر کہا۔

”جناب گاڑی آگئی ہے۔“

”گاڑی آگئی ہے؟“ ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

”جی جناب۔“

”کیا آج جہاز روانہ ہو سکے گا؟“

”جی یہی اطلاع ہے۔“

نگہت نے مسکرا کر کہا۔ ”اس پرواز اور موسم کا کوئی اعتبار نہیں، ہو سکتا ہے جب تک آپ جہاز میں سوار ہوں یہ منسوخ ہو جائے، اکثر آدھے راستے سے بھی واپسی ہوئی ہے۔“

ہم نے بیگ اٹھایا۔

”اللہ آپ کو حفاظت سے منزل تک پہنچائے۔“ نگہت نے الوداع کہا۔

ہم لاؤنج سے نکل کر گاڑی میں سوار ہوئے۔

ہم اسکردو جانا چاہتے تھے۔ تین دن سے اسلام آباد کے ہوائی اڈے آتے، بورڈنگ کارڈ لیتے اور فرسٹ کلاس کے مسافر ہونے کی وجہ سے شالیمار لاؤنج میں آ بیٹھتے۔ سینڈوچز کھاتے، گرم کافی پیتے۔ پرواز خراب موسم کی وجہ سے روانہ نہ ہوتی۔

پہلے دن لاؤنج میں تین مسافر تھے پھر دو رہ گئے اور تیسرے دن ہم اکیلے تھے۔ اس عرصے میں شالیمار لاؤنج کی میزبان یاسمین نگہت اور عائشہ سے جان پہچان ہوگئی تھی۔

جنوری کی آخری تاریخیں تھیں۔ اس موسم میں اسکردو جانے والے کم ہوتے ہیں۔ پروازیں بھی شاذ و نادر ہی جاتی ہیں۔ ان دنوں ہم ریڈیو پاکستان کے شعبہ مطبوعات میں مدیر اعلیٰ تھے جہاں سے آہنگ، پاکستان کالنگ اور کتابیں شائع ہوتی تھیں۔ ہم نے منصوبہ بنایا ریڈیو پاکستان کے تمام اسٹیشنوں کے ”آہنگ“ کے لیے خصوصی شمارے شائع کیے جائیں۔ اس سلسلے میں ”آہنگ“ کے ایڈیٹر معین الدین کو ملتان اور ایبٹ آباد بھیجا دوسرے ایڈیٹر رحمان شریف کو حیدرآباد اور خیرپور بھجوایا۔ خود اسکردو گلگت کا پروگرام بنایا۔

احباب نے سنا تو سردی سے ڈرایا، راستے سے خوف دلایا جب ہم نہ مانے تو ہر ایک نے حسب توفیق ہمیں موٹے کوٹ اور جیسٹر لا کر دیے، ساتھ ہدایات بھی تھیں۔ ان سب کا خیال تھا ہم اسکردو نہیں سیاچن جا رہے ہیں۔ ہم نے سب کو سمجھایا جہاں جا رہے ہیں وہاں وہ چیز ملتی ہوگی جو سردی دور کرنے میں کام آئے گی لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہے اور زبردستی دو ایک کوٹ ساتھ کر دیے جنہیں ہم نے اسلام آباد کے ہوٹل میں امانتاً رکھوا دیا تھا۔

اسکردو کے بعد ہمیں گلگت جانا تھا وہاں بھی ریڈیو اسٹیشن جا کر تصویریں، مضامین اور ضروری معلومات جمع کرنی تھیں۔ سچ پوچھیں تو یہ موسم اسکردو گلگت کے سفر کے لیے قطعی موزوں نہیں تھا لیکن ہم اس بات سے خوف زدہ نہیں تھے کہ سردی میں اکڑ جائیں گے یا راستوں میں جم جائیں گے۔ اسلام آباد سے اسکردو کا سفر ایک گھنٹے کا ہے مگر اس کے لیے جہاز کی پرواز شرط ہے۔

ہم جہاز کی سیڑھیوں تک پہنچ گئے۔ موسم نہیں بدلا۔ اسکردو 737 جیٹ طیارہ جاتا ہے ہم اندر پہنچے، ایئر ہوسٹس نے نشست تک راہ نمائی کی۔ فرسٹ کلاس میں چند سیٹیں تھیں سب سے آگے کی طرف ایک صاحب بیٹھے تھے، ہمیں دیکھا تو اٹھ گئے۔ یہ سیکورٹی گارڈ تھے۔ ہم سمجھے یہ ہماری حفاظت کے لیے جہاز میں مقرر کیے گئے ہیں بعد میں معلوم ہوا یہ جہاز کے ہر مسافر کے لیے تعینات کیے گئے ہیں۔

ہم کھڑکی کی طرف والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ایئر ہوسٹس نے کہا۔ ”جناب سیٹ بیلٹ باندھ لیجیے۔“

”کیا پرواز روانہ ہوگی؟“ ہم نے پوچھا۔

خیال تھا اتنی دیر میں موسم بدل جانا چاہیے۔

”جی۔“ ایئر ہوسٹس کا جواب تھا۔

”کیا ہم اسکردو پہنچ جائیں گے؟“ ہم نے اپنے ہی جملے کی وضاحت کی۔ ”ہمارا مطلب ہے وہاں پہنچتے پہنچتے موسم تو نہیں بدل جائے گا؟“

”جناب اس کا کیا بھروسہ کبھی بھی فضا بادلوں سے ڈھک سکتی ہے لیکن دعا کیجیے ہم سب خیریت سے پہنچ جائیں۔“ ہم نے سوچا اسکردو کی پرواز صرف خدا سے دعا پر جاتی ہے۔

جہاز رن وے پر دوڑنے لگا اور لمحوں میں فضا میں اُٹھ گیا۔

ذرا دیر کھڑکی سے شہر نظر آتا رہا، جہاز بلند ہوتا گیا پھر چاروں طرف بادل آ گئے۔ سفید روئی کی طرح جنہوں نے جہاز کو اپنی گود میں لے لیا، کتنے ہی ایسے شریر بادل تھے جو کھڑکی سے ٹکرا رہے تھے شاید اندر آنا چاہتے ہوں۔ دُھند اچانک غائب ہوگئی اوپر نیلا آسمان تھا۔ نیچے دیکھا تو ایک ایسا منظر جس نے لمحوں کے لیے سانس روک دیا ایسا تو ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ کیا ہے......

برف ہر طرف اونچا نیچا پھیلتا سکڑتا نیلے چوٹیاں وادیاں چٹانیں برف سے ڈھکی تھیں۔ یہ سب برف تھی ایسے ایسے نمونے جو انسان نہیں بنا سکتا۔ یہ کون ہے جس نے برف سے حسین منظر بنائے۔ آنکھوں کو ٹھنڈ پہنچانے والے دل میں خوشیاں بھرنے والے یہ ہمارا رب ہے جو رنگوں سے تصویریں بناتا ہے اور آج اس نے برف کے اونچے نیچے منظر تخلیق کیے تھے۔ یہ صناعی ہے وہی کر سکتا ہے کہ وہ خالق ہے۔ تخلیق اسی کا کام ہے۔ زندگی میں کبھی ایسے منظر ہم نے پہلے نہیں دیکھے تھے۔ یہ برف یہ پہاڑ یہ وادیاں اس مالک نے ہمیں دکھائیں جو مہربان ہے۔

جہاز کی کھڑکی سے ہمارے دل کی کھڑکی تک ایک اُجالا پھیل گیا۔ یہ وہ ہے جو سب سے بڑا ہے۔ ایئر ہوسٹس جانے کب کافی کی ٹرے رکھ گئی تھی۔ کب اس نے آکر کافی دوبارہ رکھی ہمیں کچھ خبر نہ تھی، ہم تو وہاں ہزاروں فٹ نیچے برف کے منظر میں گم تھے۔

جہاز رواں تھا۔ آسمان روشن تھا اور موسم کے بدلنے کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ اچانک ہم نے دیکھا دور برف پوش پہاڑیوں کے درمیان ایک گیند تھی، جگہ خالی تھی۔ یہ کیا ہے؟ ہم نے سوچا اسی وقت ایئر ہوسٹس کی آواز جہاز میں بلند ہوئی۔ ”خواتین و حضرات اب سے تھوڑی دیر بعد ہم اسکردو کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں براہ کرم اپنے حفاظتی بند باندھ لیجیے۔“

ایئر ہوسٹس ہمارے نزدیک آئی۔ ہم نے کہا۔

”آج تو موسم اچھا رہا۔“

”جی جناب، ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ آج ایک مہینے بعد پرواز اسکردو کے ہوائی اڈے پر اترے گی۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



ہوائی اڈے سے نکل کر ہم حیران ہو گئے۔ سامنے ریڈیو پاکستان کی جیپ کھڑی تھی۔ دو آدمیوں نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔

''میں غلام عباس ہوں۔ ریڈیو پاکستان اسکردو کا پروگرام منیجر۔''

دوسرے نے کہا۔

''میرا نام محمد ایوب ہے میں ریڈیو پاکستان کا ایڈمن آفیسر ہوں۔''

''آپ لوگ ایئرپورٹ آئے۔ اس بات پر تعجب ہے کیوں کہ ہمیں تو چار دن پہلے آنا تھا۔''

ہم نے جملہ مکمل نہیں کیا۔

''جناب سات دن کے بعد یہ پہلی پرواز آئی ہے۔ ہمیں یقین تھا آپ اسی میں آئیں گے۔''

ہم جیپ میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیور سے ملاقات ہوئی۔ اس نے ہمیں حیرت سے دیکھا، ہم سمجھ گئے یہ سوچ رہا تھا کہ کراچی سے آنے والے مہمان نے صرف ایک گرم کوٹ پہنا ہوا ہے اور اسکردو ایک جما ہوا شہر ہے۔

غلام عباس نے جیپ کی پچھلی نشست سے کہا۔

''ابھی ریڈیو اسٹیشن چلتے ہیں اس کے بعد آپ کو ایک موٹا چیسٹر دلوا دیں گے۔''

''ہمیں زیادہ سردی نہیں لگتی۔''

غلام عباس نے اصرار کیا۔ ''ہم چاہتے ہیں آپ جب تک اسکردو میں رہیں سردی آپ سے دور رہے۔''

ہم کیا کہتے اب تو سب کچھ میزبان کی مرضی پر تھا۔

جیپ جس راستے پر جا رہی تھی اس کے دونوں طرف برف کے پہاڑ تھے۔ ذرا دیر میں بازار آ گیا۔ دکانوں کی چھتوں پر اور سڑک کے دونوں طرف برف کے ڈھیر تھے۔ دکان تک پہنچنے کے لیے برف کے درمیان چھوٹا راستہ بنایا ہوا تھا۔ ہم نے زندگی میں اتنا برف نہیں دیکھا تھا۔ اسکردو ایسا محسوس ہوتا تھا برف کا شہر ہو۔

جیپ ہر طرف سے بند تھی۔ باہر سورج نکلا ہوا تھا اس کی روشنی برف پر پڑ رہی تھی اور اُجالا زیادہ پھیل رہا تھا۔ جیپ بازار سے نکل کر ایک سڑک پر آ گئی جس کے دونوں طرف درخت تھے جو اب برف کے ستون لگ رہے تھے۔ جیپ بائیں طرف مڑ کر ایک گیٹ میں داخل ہوئی اور برف کے درمیان عمارت کے دروازے پر رک گئی۔ یہ ریڈیو پاکستان اسکردو کی عمارت تھی۔

ڈرائیور نے اتر کر جیپ کا دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوئے ایک عجیب سی مہک محسوس کی اور ہلکی سی گرمی۔

غلام عباس ہمیں دائیں طرف کے ایک بڑے کمرے میں لے گئے جہاں ایک سمت دو صوفے رکھے تھے اور سامنے بڑی میز اور کرسی تھی۔ یہ اسٹیشن ڈائریکٹر کا کمرہ تھا۔ ہمیں اس صوفے پر بٹھایا گیا جس کے سامنے آتش دان تھا۔ اس میں لکڑیاں سلگ رہی تھیں ان کا دھواں اوپر اٹھ کر چمنی سے باہر جا رہا تھا ایک آدھ لکڑی جل بھی رہی تھی۔ کمرے میں ہلکی گرمی کے ساتھ ایک مہک تھی تب احساس ہوا یہ دھوئیں کی خوشبو ہے۔

ہمارے لیے فوراً قہوہ لایا گیا۔ خوب صورت چینی کے پیالوں میں سبز چائے تھی، ساتھ میں نیبو کے چھوٹے کٹے ہوئے ٹکڑے تھے۔ ایک پلیٹ میں اخروٹ، چلغوزے اور بادام رکھے تھے۔

اسکردو میں قہوہ پینے کا بہت رواج ہے جو زیادہ تر بغیر دودھ کی کم پتی والی چائے ہوتی ہے اس کی وجہ سے دودھ کی بچت ہو جاتی ہے جو برفباری کے موسم میں مہنگا ہو جاتا ہے۔

قہوے کے ساتھ ریڈیو اسکردو کی باتیں شروع ہوئیں اس عرصے میں دو پروڈیوسرز بھی آ گئے ایک انجینئر کو بھی بلا لیا گیا شاید یہ دکھانے کہ اس موسم میں کراچی سے ایک شخص آیا ہے۔

ان سب کو حیرت اور خوشی تھی کیوں کہ دور دراز سے سفر کرنے والے اکثر محض منصوبے بناتے رہتے ہیں اور بات جب برف پوش وادیوں کی ہو تو یہ منصوبے ملتوی ہوتے رہتے ہیں۔

جب کسی عمارت میں آگ لگتی ہے اور لوگ گھبرا کر باہر نکل رہے ہوتے ہیں تو فائر مین اندر جا رہے ہوتے ہیں آگ بجھانے۔ اسکردو سے جب اکثر لوگ گرم علاقوں میں منتقل ہو جاتے ہیں ہم جان بوجھ کر کئی دنوں کی کوشش کے بعد برف کے شہر پہنچ گئے تھے۔

ریڈیو پاکستان کے ہمارے ایک کرم فرما عبدالحمید اعظمی نے جو ان دنوں کنٹرولر تھے ہمارے اسکردو گلگت جانے کا پروگرام سنا تو ٹیلی فون کیا اور کہا۔ ”سنا ہے تم جنوری کے آخری ہفتے میں اسکردو گلگت جا رہے ہو؟“

ہم نے کہا۔ ”جی!“

وہ بولے۔ ”پھر ایک لطیفہ سن لو۔“

ایک صاحب بازار میں دوسرے سے ملے اور کہنے لگے۔ ”خبر ہے عبدالقدوس مر گئے۔“ سننے والے نے حیرت سے پوچھا۔

”ارے کل صبح تو وہ مجھے ملے تھے بھلے چنگے تھے کیا ہوا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”وہ اونٹ پر بیٹھ گئے تھے۔“

لیکن اونٹ پر بیٹھنے سے کوئی مرتا ہے؟

خبر دینے والے شخص نے کہا۔ ”دراصل ان کے ہاتھ میں لوہے کی لمبی راڈ تھی۔“

”مگر پھر بھی وہ مرے کیسے؟“

”ارے بھئی کیا بتائیں وہ اونٹ پر بیٹھ کر پہاڑ پر چڑھ گئے۔“

”پھر پھر۔“ پہلے نے جلدی سے پوچھا۔

”جب وہ اونٹ پر بیٹھ کر پہاڑ پر پہنچے تو آسمان پر بادل تھے، بجلی کڑک رہی تھی انہوں نے لوہے کی راڈ کو بادلوں میں گھمانا شروع کیا۔ بس بجلی ان پر گر گئی۔“

اس کے بعد عبدالحمید اعظمی نے کہا۔ ”تمہارا خدا حافظ۔“

اسکردو کی برف دیکھ کر ہمیں یہ احساس ہو رہا تھا کہ اگر ہم عبدالقدوس ہیں تو کہیں ہاتھ میں لوہے کی راڈ تو نہیں۔

ہمارے لیے ریڈیو پاکستان اسکردو کے پروگراموں کے کئی تصویریں اور مضامین تیار تھے اشتہارات کے بارے میں بھی بات چیت چل رہی تھی۔ امید تھی دو ایک دن میں وہ بھی مل جائیں گے۔

ہم نے عمارت کی ایک تصویر بنوانے کے لیے بھی کہا۔ ان دنوں اسکردو ریڈیو کے ڈائریکٹر اے ایف انور چھٹی پر تھے۔ پروگرام منیجر غلام عباس ایک مستعد کارکن تھے۔ تیزی سے کام کرتے تھے۔ یوں لگتا تھا وہی سب کچھ کرتے ہیں۔

دوپہر ہو چکی تھی اس لیے کھانا وہیں منگوا لیا گیا۔ یہ سبزی پلاؤ تھا اس کے ساتھ کئی قسم کے اچار اور دوسرے لوازمات گفتگو بھی جاری رہی۔ اسکردو کے حالات، ریڈیو پاکستان کو مالی مشکلات، ہیڈ کوارٹرز کی جانب سے بے التفاتی، اسکرپٹ رائٹرز اور فنکاروں کی قلت اور موسم کی سختی کی وجہ سے پریشانی۔

کھانے کے بعد ایڈمن آفیسر نے ہم سے پوچھا۔

”آپ گڑ کی چائے پئیں گے؟“

گڑ کی چائے پیئے ہمیں ایک عرصہ گزر گیا تھا ہم نے فوراً حامی بھر لی۔

ذرا دیر میں چائے آ گئی جس میں دو مزے تھے ایک تو ہلکا سا دھواں اور گڑھواں کا سوندھا پن۔

دو چار گھونٹ کے بعد اس کا ذائقہ لطف دینے لگا۔

غلام عباس نے کہا۔ ”اس موسم میں تمام ریسٹ ہاؤس بند کر دیئے جاتے ہیں۔ سیاح بہت کم آتے ہیں اس لیے ہوٹل بھی تقریباً سب بند ہیں۔ صرف ایک دو کھلے ہیں کیوں کہ اس وقت صرف وہی آتے ہیں جنہیں کوہ پیمائی کا شوق ہے پہاڑوں پر ٹریکنگ کرتے ہیں۔ ایک ہوٹل بازار کے بیچوں بیچ ہے اس میں آپ کے ٹھہرنے کا انتظام کر دیا ہے کل آپ کو شنگریلا لے چلیں گے۔“

سردیوں میں رات جلدی آ جاتی ہے۔ ہم چار بجے ریڈیو پاکستان کی عمارت سے نکلے تو اندھیرا ہو چکا تھا اب آسمان پر بادل تھے اور فضا بے حد سرد۔

غلام عباس ہمیں لے کر ہوٹل آئے۔ ایک بڑی عمارت تھی۔ نیچے دائیں طرف استقبالیہ تھا جس میں آتش دان روشن تھا، ہمارا بیگ اور ہم پہلی منزل پر گئے۔ اس وقت بجلی کہیں نہیں تھی۔ اس لیے راستہ ٹارچ سے دکھایا، زینے کے بعد ایک پتلی سی گیلری اور تین چار کمروں کے بعد ایک دروازہ کھولا گیا۔ یہ بڑا کمرہ تھا سامان لانے والے نے لالٹین روشن کی اس کی بتی اونچی کی تو کمرہ نظر آنے لگا۔ یہاں آتش دان نہیں تھا گیس کا چولہا رکھا تھا جسے جلایا گیا۔ یہ دراصل عام تیل کا چولہا تھا جس پر کھانا پکایا جاتا ہے جب یہ جل جائے تو خاصی گرمی پیدا کرتا ہے۔

غلام عباس نے کہا۔ ”آپ ہاتھ منہ دھو کر آرام

کریں۔ میں چلتا ہوں۔''

کمرہ کسی طرح بھی گرم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ گرم پانی سے ہاتھ منہ دھویا تو محسوس کیا۔ اللہ تعالیٰ نے گرمی کو سردی کے مقابلے میں کیسی راحت بنایا ہے۔

کمرہ اب نیم گرم ہو گیا تھا۔ ہم بستر پر لیٹے تو وہ ایک برف کی چادر تھا۔ ہم نے وہ موٹا لحاف اوڑھا جو بستر پر رکھا تھا وہ بھی ٹھنڈا تھا۔ ذرا دیر میں اسے ہم پر ترس آ گیا۔ وہ گرم محسوس ہونے لگا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا ہم برف کے شہر میں خواب دیکھنے لگے۔ اس دھوپ کے جس میں تمازت ہوتی ہے۔

زمین پر جنت

اسکردو میں ایک روشن دن پھیلا ہوا تھا۔ ہم ریڈیو اسٹیشن پہنچے تو غلام عباس نے کہا۔

''آج موسم غیر معمولی طور سے خوش گوار ہے۔ آپ شنگریلا دیکھ آئیں۔ یہ ایک جھیل ہے اور اس کے کنارے فرنچ اسٹائل کا ریزوٹ بنا ہے۔ یہ اچھی جگہ ہے۔''

جیپ میں سوار ہوئے ڈرائیور کے ساتھ محمد امین تھے یہ ایک اسمارٹ نوجوان تھے۔ ریڈیو پر پروگرام کرتے تھے۔

جیپ ایک لمبی سڑک پر آ گئی جس کے سیدھی طرف دریا بہہ رہا تھا اور بائیں جانب درخت تھے ہم بار بار دریا کی طرف دیکھتے وہ انتہائی سست رفتاری سے بہہ رہا تھا۔

محمد امین نے بتایا یہ دراصل بڑی حد تک جما ہوا ہے اس لیے سست ہے۔ یہاں کئی بڑی جھیلیں ہیں ان میں سے شنگریلا بھی ہے۔ اس کا اصلی نام کچورا جھیل ہے۔ 1920ء میں اس علاقے میں ایک ہوائی جہاز دریا کے کنارے آ گرا۔ خوش قسمتی سے جہاز او. مسافر سب محفوظ رہے۔ یہ پناہ اور غذا کے لیے اِدھر اُدھر پھیل گئے تب انہیں ایک بدھ منک ملا جس نے ان مسافروں کو کھانے کے لیے بہت سے پھل دیئے خاطر مدارات کی، جھیل کے کنارے ایک ایسا خوشگوار ماحول تھا۔ وہ سکون تھا کہ مسافر یہاں ٹھہر گئے۔ بدھ منک نے کہا۔ ''یہ شنگریلا ہے۔'' تبتی زبان میں جنت کو شنگریلا کہا جاتا ہے۔

برطانیہ کے ایک مصنف ملٹن نے اپنے ناول ''ہورائزن'' میں یہ کہانی لکھی ہے اور جو مشہور ہو گئی۔

ناول میں یہ بھی لکھا ہے کہ مسافر کو ملنے والا بدھ منک اپنی عمر ہزاروں سال بتاتا تھا لیکن وہ ایک صحت مند تندرست شخص تھا اور ایسا تو صرف جنت ہی میں ممکن ہے۔

یہ کہانی سنا کر محمد امین نے ہماری طرف دیکھا اور پھر کہا۔

''آپ نے اسکردو آنے کے لیے موسم اچھا پسند کیا۔''

ہم نے ہنس کر کہا۔ ''جنت میں آنے کے لیے موسم انسان کے اختیار میں کب ہوتا ہے؟''

وہ بھی شاید سمجھ گیا۔ بولا۔

''میرا مطلب ہے اب تو سب کچھ برف میں ڈھکا ہے۔''

''ہم تصور کر لیں گے۔''

محمد امین نے یقیناً یہ سوچا ہوگا کہ پھر کراچی میں بیٹھ کر ہی سب کچھ تصور کر لیتے ناحق ہی جان جوکھم میں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی؟

محمد امین اس وقت تک خاموش رہے جب تک شنگریلا ریزوٹ کا گیٹ نہیں آ گیا۔ شاید وہ ہمارے تصور میں خلل نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔

بڑا گیٹ بند تھا۔ دونوں طرف موسم کی مناسبت سے برف ہی برف تھی جس کا سلسلہ ریڈیو اسٹیشن سے شروع ہو کر یہاں تک آ رہا تھا۔ گیٹ کے برابر دیوار تھی جو برف کی وجہ سے نظر نہیں آ رہی تھی۔

محمد امین نے کہا میں ابھی گیٹ کھلواتا ہوں۔ برفباری کے موسم میں ریزوٹ بند ہوتا ہے وہ غالباً پہاڑ چڑھنے کے عادی تھے برف کے ٹیلے پر چڑھ کر دوسری طرف کود گئے۔ ذرا دیر میں ایک شخص کو ساتھ لائے جس نے بڑے گیٹ میں بنے ایک چھوٹے دروازے کو کھولا، محمد امین بولے۔

''ذرا جھک کر آ جائیے، سر بچایئے۔''

ہم نے سر جھکایا اور اندر داخل ہو گئے۔ ہر طرف برف کے ڈھیر تھے، درمیان میں کچھ کم تھے اسی پر ہمیں چلا کر وہ آگے لے گئے۔ ذرا سا کھلا میدان آیا بائیں طرف لوہے کی سرخ ریلنگ تھی جس کا اوپری حصہ برف سے جھانک رہا تھا کہنے لگے وہ سامنے دیکھئے جھیل ہے۔

اکثر جب عید کا چاند دیکھنے کا موقع آتا اور ہم سے کہا جاتا۔ ''وہ دیکھئے عید کا چاند۔''

ہم کہتے۔ ”کہاں؟“
بتایا جاتا۔ ”مسجد کے مینار کے برابر۔“
ہم پھر پوچھتے۔ ”مینار کے برابر یا اوپر؟“
بتانے والا کہتا۔ ”میری انگلی کی سیدھ میں۔“
ہم انگلی دیکھنے لگتے اور پھر اس خیال سے کہ بتانے والا یہ نہ سمجھے کہ ہمیں دور کا نظر نہیں آتا اور سوائے چاند چہرے کے کچھ اور دیکھنا پسند نہیں کرتے اس لیے خوش ہو کر کہتے۔ ”ہاں ہاں وہ سامنے بالکل صاف ہے۔“
حالانکہ اس وقت تک ہلال غائب ہو چکا ہوتا۔
اس دن بھی یہی ہوا۔ ہم نے جھیل دیکھ لی اس کا اندازہ اس بات سے ہوا کہ ایک جگہ سرخ رنگ کی کشتی برف میں دھنسی ہوئی تھی یہ جھیل ہی ہو سکتی ہے۔
محمد امین کہہ رہے تھے موسم بہار میں اس جھیل کا رنگ گہرا نیلا ہوتا ہے، جس میں کشتی بانی کی جاتی ہے یہ جو آپ چاروں طرف برف سے جھانکتے کمرے دیکھ رہے ہیں، یہ شنگریلا ریزوٹ ہیں اسے 1983ء میں بریگیڈیئر اسلم خان نے بنوایا تھا جو اس علاقے میں آرمی اسکاؤنٹ کے چیف تھے۔ اس میں ساٹھ کمرے ہیں ہر سہولت کے ساتھ۔
ہم نے دیکھا شنگریلا کے کمرے چائنیز انداز میں بنائے گئے تھے جن کی چھتیں سرخ رنگ کی تھیں اور ان کے کونے مڑے ہوئے تھے جو انتہائی دیدہ زیب نظر آتی تھیں۔ اس کے علاوہ چاروں طرف سرخ چھتوں والے کمرے تھے جن کے آگے یقیناً گھاس ہو گی اور آس پاس سرو کے خوب صورت درخت۔
ایک اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ یہاں ایک خوب صورت ریسٹورنٹ بھی ہے جو دراصل ایک جہاز ہے جو خاص طور سے یہاں لایا گیا ہے۔ یہ اپنی اڑان کی مدت پوری کر چکا تھا۔ سیاحوں کی یہاں خوب خاطر مدارات ہوتی ہے۔
یہ سارا منظر اب برف برف تھا اور اس انتظار میں تھا کہ آسمان سے بادل جائیں دھوپ برف کو پانی پانی کر دے اور سبز گھاس زمین کو زمرد کر دے، درخت پتوں سے بھر جائیں اور پرندے چہچہانے لگیں تب انہیں دیکھنے والے آئیں گے اور خوش ہوں گے۔

ہم نے محمد امین سے کہا۔ جنت میں بھی یہی منظر ہوگا۔
محمد امین یہ سن کر خوش ہوئے اور کہا۔ ”آیئے! اب آپ کو یہاں کا چڑیا گھر دکھاتے ہیں۔“
وہ ہمیں ایک عمارت کی طرف لے گئے۔ وہ صرف ایک ”گھر“ تھا۔
یہاں سے ”چڑیاں“ موسم بہار کے لیے کہیں اور لے جائی گئی تھیں۔ دو چار لمبے لمبے سینگوں والے بکرے نظر آئے جو ہمیں دیکھ کر زمین پر پیر مارنے لگے۔
محمد امین نے کہا۔ ”یہ مارخور ہیں۔ یہاں کا خاص جانور۔“
ہم لوگ جب واپس آنے لگے تو وہ کہنے لگے۔
”اس ریزوٹ کا کرایہ بہت زیادہ ہے۔“
ہم نے کہا۔ ”جنت میں قیام کے لیے ادائیگی بھی بہت زیادہ ہوگی۔“
ایک طرف ایک بورڈ لگا تھا جس پر لکھا تھا۔
1۔ ریسٹورنٹ میں بکنگ کے لیے ایجنٹ سے رابطہ کرنا ہوگا۔
2۔ خاص دنوں اور چھٹیوں میں کرایہ مختلف ہوگا۔
3۔ ہر ریزوٹ میں دو کمرے ہیں۔ اضافی بستر درخواست پر مل سکتا ہے۔
4۔ ہوٹل انتظامیہ جب چاہے کرائے میں تبدیلی کر سکتی ہے۔
5۔ جو لوگ گروپ میں آرہے ہیں ان کے لیے شرائط الگ ہیں۔
6۔ ہوٹل کے قواعد وضوابط پر عمل ضروری ہے۔
آخر میں ایک سہولت بھی دی تھی یعنی کریڈٹ کارڈ سے بھی ادائیگی کی جا سکتی تھی۔
محمد امین کا تاثر ہوٹل کی انتظامیہ کے بارے میں کچھ اچھا نہیں تھا۔ ہم نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ کیوں کہ ہمارا قیام قراقرم ہوٹل میں تھا اور چند قدم کے بعد چھوٹے گیٹ سے گزر کر اس جیپ میں سوار ہونا تھا جو ہمیں واپس اسکردو لے جائے گی۔

دال نہیں گلتی

ایک مقولہ ہے۔ ”دال نہیں گلتی۔“
ہم نے اس پر کبھی غور نہیں کیا۔ اول تو دال کم کھاتے

ہیں پوری کوشش ہوتی ہے کہ گوشت کھایا جائے، ایک زمانے میں ہر قسم کا گوشت کھا لیتے تھے اب زیادہ تر چکن پر زور ہے۔

ہم سمجھتے تھے۔ ''دال نہیں گلتی'' کا مطلب ہے بات نہیں بنتی لیکن جب اسکردو گئے تو یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ دال واقعی نہیں گلتی۔

جب ہم محمد امین کے ساتھ شنگریلا جا رہے تھے تو انہوں نے کہا۔ ''دوپہر کو کیا کھائیں گے؟''

ہم نے پوچھا۔ ''کیا ملے گا؟''

کہنے لگا۔ ''مٹن کڑھائی بنوالیں۔''

وہ اصرار کرنے لگے کہ ابھی آرڈر دے لیتے ہیں۔

ہم سمجھے اسکردو میں کھانے کی بکنگ کئی گھنٹے پہلے ہوتی ہے اس لیے چپ ہو گئے۔

جب شنگریلا سے واپس آئے اور گرم گرم نان کے ساتھ بھاپ اڑاتی مٹن کڑھائی آئی تو جی خوش ہو گیا ایک بوٹی کو اٹھایا اسے توڑنے کی کوشش کی۔ وہ گلی نہیں تھی۔ دوسری بوٹی کا بھی یہی حال تھا تیسری چوتھی کا بھی۔ ہم نے مسالے سے کھانا شروع کر دیا۔ کڑھائی میں مسالہ زیادہ تھا۔ دیکھا محمد امین بھی بوٹی نہیں چھو رہے تھے ہم نے سمجھا مہمان کی تواضع کی وجہ سے بوٹیاں نہیں کھا رہے مگر جب ہم نے نہیں کھایا تو بھی وہ کچھ بولے نہیں۔ ہم مزے دار مسالے سے گرم نان کھاتے رہے اور بوٹی کو ڈر کے مارے اس لیے منہ میں نہیں رکھا کہ اس علاقے میں نہ جانے کوئی دندان ساز ہے بھی کہ نہیں۔ ایک آدھ بوٹی کچھ گلی ہوئی تھی اسے بھی کڑھائی میں رہنے دیا۔ تعجب یہ ہوا کہ محمد امین نے بھی گوشت کھانے کے لیے نہیں کہا اس لیے چپ چاپ مسالے سے نان کھایا۔

رات کو ہمارے اعزاز میں ایڈمن آفیسر کے گھر دعوت تھی۔ ان کا گھر پہلی منزل پر تھا اور سیڑھیوں سے اوپر جانا تھا۔ اسکردو میں سورج ڈوبتے ہی گہرا اندھیرا چھا جاتا تھا۔ بجلی کبھی کبھار آتی تھی وہ بھی نہ ہونے کے برابر اس لیے ٹارچ کی روشنی میں آہستہ آہستہ زینہ چڑھ کر اوپر پہنچے۔ لالٹین کی روشنی میں ہمارے سامنے کھانا چن دیا گیا۔

ایک طرف چکن کے ٹکڑے رکھے تھے، انہیں آگ پر سینکا گیا تھا۔ میزبان کی فرمائش تھی ہم اسی سے کھانے کا آغاز کریں ہم نے ایک ٹکڑا اٹھا کر ہاتھ سے توڑنا چاہا، میزبان نے کہا۔

''تکلف مت کیجیے۔ سیدھا منہ میں لے جائیے۔''

ہاتھ سے چھو کر اندازہ ہوا تھا۔ گوشت سخت ہے، تکلفاً اٹھا کر منہ سے لگایا، دانتوں سے کاٹا اور احساس ہوا کہ گوشت گلا نہیں ہے۔ یہ دوسرا موقع تھا جب یہ تجربہ ہوا، ہو سکتا ہے یہاں کے لوگ سخت گوشت پسند کرتے ہوں، ہمارے سامنے آلو مٹر، دال اور بریانی رکھی تھی نان بھی تھے ہم نے اپنے ہاتھ سے بوٹی ایک طرف رکھ دی اور آلو مٹر پلیٹ میں ڈالے روٹی کے ایک ٹکڑے سے ڈرتے ڈرتے کھا کر دیکھا وہ خاصے گلے ہوئے تھے۔ میزبان کے اصرار پر بریانی بھی لی وہ بھی مناسب تھی۔ میزبان بار بار اصرار کرتے چکن لیں اور ہم بوٹی اٹھا کر اس طرف رکھ دیتے جس طرف میز پر زیادہ اندھیرا تھا۔

کھانا دیر تک چلتا رہا۔ ہم موسم کی بات کرتے رہے۔ وہ سب اس کے عادی تھے برف جیسے ان کی زندگی کا ضروری حصہ تھا۔ کھانے کے بعد الائچی کی خوشبو والا قہوہ پیا گیا۔

غلام عباس کا خیال تھا آج ہوا رکی ہوئی ہے۔ برفباری ہوگی۔ ہم ڈر رہے تھے اور ان سب کے لیے یہ روزمرہ کا معمول تھا۔

دوسرے دن، ہم نے غلام عباس سے پوچھا۔ ''ایک بات بتائیں یہاں گوشت گلا کر کھانے کا رواج نہیں۔''

وہ ہنسنے لگے اور کہا۔ ''رواج تو ہے لیکن گوشت مشکل سے گلتا ہے بلکہ بعض دالیں بھی بہت دیر سے بلکہ بعض دفعہ تو گلتی ہی نہیں۔''

''وہ کیوں؟'' ہم نے حیرت سے پوچھا۔

''کیونکہ ہم سمندر سے 2438 کی بلندی پر ہیں۔ کھانا جس پانی سے پکاتے ہیں اس میں معدنیات زیادہ ہوتی ہیں اس لیے گوشت نہیں گلتا۔''

ہم نے کہا۔ ''یوں کہیں کہ اسکردو میں اچھے اچھوں کی دال نہیں گلتی۔''

غلام عباس ہنسنے لگے اور ہم نے فیصلہ کر لیا جب تک اسکردو میں رہیں گے گوشت نہیں کھائیں گے اس طرح کم سے کم ایک چکن تو حلال ہونے سے بچی رہے گی۔

مارخور

فارسی زبان میں سانپ کو مار کہتے ہیں۔ خور کے معنی ہیں کھانا۔ گلگت بلتستان میں پہاڑی بکرا مارخور کہلاتا ہے۔ اسکردو کے شنگریلا ریزوٹ میں ہم نے مارخور دیکھا۔ قوی، توانا لمبے سینگوں والا۔ سانپ اسے دور سے دیکھ کر ہی ڈر جاتا ہوگا۔ نزدیک آنے کا خطرہ کیوں مول لے گا، بکرے گھاس پتے کھاتے ہیں۔ جانور گوشت کا شوق زیادہ نہیں رکھتے۔

جہاں تک ہماری معلومات ہیں۔ پہاڑی بکرا جسے فارسی زبان میں مارخور کہتے ہیں ازبکستان، تاجکستان اور کشمیر کے پہاڑوں میں پائے جاتے ہیں پھر ایران نے اس کا نام کیسے رکھا؟

ایک پیش امام دکان سے گوشت لے کر باہر نکلے ایک کوا ان کے ہاتھ سے گوشت چھین کر لے اڑا۔ امام صاحب نے چیخ کر کہا۔

"کوے گوشت واپس کردے۔ ورنہ ابھی مسجد جا کر مائیکروفون پر اعلان کردوں گا۔" "کوا حلال ہے۔"

ایران میں کوئی شکاری پہاڑی بکرا پکڑنے میں ناکام رہا ہوگا۔ اس نے جل کر مارخور کہا ہوگا۔ اس وقت پہاڑی بکرا بھی خوش ہوا ہوگا۔ جان بچی اس کو معلوم نہیں تھا وہ اسی نام سے پکارا جائے گا۔ اس نام میں شک وشبہ ہے جو لوگ کھلے عام مار کھاتے ہیں انہیں بھی مارخور نہیں کہتے۔ ہم بینکاک سے پتایا بیچ جا رہے تھے۔ راستے میں جگہ جگہ دکانیں تھیں۔ یہاں سانپ پنجروں میں رکھتے ہوتے ہیں۔ گاہک پسند کرتے ہیں، دکاندار مول تول کے بعد پنجرے سے نکال کر سر دم کاٹ کر کھال اتارتا اور کڑھائی میں تل دیتا ہے۔

سنگاپور کی ایک مارکیٹ میں چوہے، چھپکلیاں، کاکروچ، مینڈک، سانپ فروخت ہوتے ہیں۔ گاہک زیادہ تر سانپ خریدتے ہیں، کھانے کے لیے۔ وہاں کسی کو مارخور نہیں کہا جاتا۔

ہمارے علاقے میں سانپ کا ذکر سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی مادہ کو ناگن کہتے ہیں۔ شاعر اپنے محبوب کی زلفوں کو ناگن کہتے ہیں۔ بعض تو محبوب ہی کو ناگن کے نام سے پکارتے ہیں۔ جب مسلمانوں نے ہندوستان پر حملے شروع کیے تو برہمنوں نے لڑکیوں کو بچپن سے تھوڑا تھوڑا زہر دے کر پرورش کی، جب وہ جوان ہوئیں تو ان کے خون میں زہر شامل ہوگیا۔ لڑکیاں مسلمان سپاہیوں کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے جاتیں۔ صبح وہ مردہ پائے جاتے۔ انہیں ناگن کہا جاتا ہے۔

ہندو سانپ کو بھگوان کا درجہ دیتے ہیں۔ سانپ ناگ راجہ اور مادہ ناگ رانی کہلاتے ہیں۔ بڑے مندروں میں ان کے بت ہوتے ہیں۔ اس کی عبادت کو ناگ پنچ منی کہتے ہیں۔ ہندو مارخور کو خونی نظروں سے دیکھتے ہوں گے۔ جس نے ان کے بھگوان کو کھایا۔ جو ہندو بکرے کا گوشت کھانا چاہتے ہیں وہ بھی مارخور سے دور رہتے ہوں گے۔

مارخور پہاڑی بکرا ہے جو سیاہ اور ہلکے بھورے رنگ کا ہوتا ہے۔ پہاڑوں کی ڈھلوانوں اور وادیوں میں پایا جاتا ہے۔ سردیوں میں دبلا اور گرمیوں میں موٹا ہوتا ہے۔ اس کے سینگ کی لمبائی 64 انچ تک ہوسکتی ہے۔ مادہ 135 سے 170 دن میں ایک یا دو بچے پیدا کرتی ہے۔ مارخور اپنی اگلی ٹانگوں کو درخت کے تنے پر رکھ کر شاخوں سے پتے کھاتے ہیں۔ ان کے جسم سے عجیب سی مہک آتی ہے جس کی وجہ سے دوسرے بکرے بھیڑیں اس سے دور رہتے ہیں۔

برصغیر میں مختلف قسم کے "خور" پائے جاتے ہیں۔

منافع خور، رشوت خور، زرخور، زن خور، زمین خور، عوام خور، بسیار خور ایک مثل مشہور ہے ایک "داڑھ چلے سو بلا ٹلے"۔

اس لیے سب کھا رہے ہیں خوب کھا رہے ہیں۔ اپنی بساط، مقدور، اوقات، حیثیت سے بڑھ کر داڑھ چلا رہے ہیں۔

ہر محلے گلی کوچے میں کھانے کی دکانیں ہیں۔ مغرب میں فاسٹ فوڈ ملتا ہے۔ لوگ پیٹ بھر لیتے ہیں۔ مشرق میں فاسٹ فوڈ کھا کر کھانا کھاتے ہیں۔ سالگرہ، شادی، ولیمہ، فاتحہ خوانی میں کھانے پر زور زیادہ ہوتا ہے۔ کھا کر ڈکار لینے کا دستور نہیں۔ سمجھدار کہتے ہیں ابھی تو کھا رہے ہیں۔ پیٹ بھرے گا جب ڈکار لیں گے ہمارے یہاں ہر

جگہ رش ہوتا ہے۔ کھانے کے ہوٹل اور اسپتال میں۔

مارخور ان حالات میں ڈر کے مارے پہاڑوں سے نہیں اترتا، ویسے بھی اس کی تعداد تیزی سے کم ہورہی ہے۔ انتظامیہ کے قوانین کے باوجود جہاں موقع ملتا ہے شکاری مارخور کو مار گراتے ہیں۔

اس کے سینگ سے دوا تیار کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے یہ سانپ کے کاٹے کا علاج ہے۔

مارخور کس سے کہے اگر سینگ سے واقعی علاج ہوسکتا ہے تو سینگ کاٹ لو، ذبح کرنے کی کیا ضرورت ہے لیکن ایک بار مارخور ہاتھ آجائے تو دعوت کا اہتمام ہوتا ہے سینگ تو بونس ہے۔

غلام عباس نے ہمیں مارخور کے سینگ کا ایک چھوٹا ٹکڑا دیا۔ ہم نے سوچا اس کا کیا کریں گے، جاتے وقت ہوٹل میں چھوڑ دیں گے پھر خیال آیا ہم بھی تو سانپوں کے درمیان رہتے ہیں جانے کون مار آستین ہو۔ جسے دودھ پلاتے ہیں وہی ڈس لے، کسی ناگن نے کاٹ لیا، سنپولیے نے پھنکاریں ماردیں۔ مارخور کا سینگ حفاظت سے رکھ لیا۔ کام آہی جائے گا۔

یاک

جب تک ہم اسکردو نہیں گئے تھے خیال تھا یاک برفانی گدھا ہے کیونکہ ہم نے اس کی جو تصویر دیکھی وہ بوجھ لادے جارہا ہے۔ بعض وقت لوگ سواری کررہے ہیں لیکن معلوم ہوا وہ تو دور دور تک گدھا نہیں ہے۔ خاصا شریف جانور ہے اس کے بارے میں اکثر یہ سنا کہ پہلے یہ گائے تھا۔ کسی بات پر ناراض ہوکر پہاڑوں میں چلا گیا وہاں کے موسم، برفباری اور جڑی بوٹیاں کھانے کی وجہ سے ''یاک'' بن گیا۔ ہم نے غلام عباس کے گھر میں انہیں دیکھا، وہ ایک بڑے پہاڑی بکرے کی طرح لگتا ہے۔ سب کچھ وہی ہے ذرا پاؤں چھوٹے ہیں خیر ہم کب درزی ہیں کہ اس کے لیے پتلون بنانے میں چھوٹے بڑے کا فرق محسوس کریں۔ یہ دودھ دیتا ہے اس کے ساتھ بڑی زیادتی یہ ہے کہ مادہ دودھ دیتی ہے لیکن اسے بھی ''یاک'' ہی کہتے ہیں حالانکہ کتنے ہی جانور دودھ دینے والے الگ نام رکھتے ہیں اونٹ بھی جب دودھ دیتا ہے اونٹنی کہلاتا ہے؟ نہ جانے یاک جب دودھ دیتا ہے اسے ''یاکی'' کیوں نہیں کہتے؟ وہ سیدھا سادہ جانور بس سر جھکائے مالک کا وفادار رہتا ہے۔ اس کی لمبائی سات فٹ تک ہوتی ہے اور وزن پانچ سو کلو سے زیادہ ہوتا ہے جنگلی اس سے بھی زیادہ وزنی ہوتے ہیں۔ ان کا رنگ کالا یا براؤن ہوتا ہے سینگ بڑے ہوتے ہیں لیکن کسی کو مارتے نہیں۔ جسم پر بڑے بڑے بال ہوتے ہیں جو سرد موسم میں اس کے لیے جیکٹ کا کام کرتے ہیں پہاڑوں میں سفید رنگ کے یاک بھی ملتے ہیں۔ ان کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ ڈائٹنگ نہ کرنے کے باوجود چارہ بہت کم کھاتے ہیں۔ دودھ بہت دیتے ہیں جس سے مکھن پنیر نکالا جاتا ہے۔ اس کی چربی سے چراغ بھی جلائے جاتے ہیں۔ اس کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے قربانی کے لیے بھی یہ کام آتے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مویشی منڈی میں فروخت ہونے کے لیے یہ نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ اسکردو اور گلگت کے میلوں میں اسے لایا جاتا ہے ہمیں اس وقت تعجب ہوا جب بتایا کہ یاک سے پولو بھی کھیلتے ہیں۔ ہم نے تو نہیں دیکھی نہ جانے یہ بھاری بھرکم جانور ایک چھوٹی سی گیند کے پیچھے کیسے بھاگتا ہو۔

تبت، منگولیا اور روس میں یہ کثرت سے پائے جاتے ہیں اور دشوار گزار راستوں میں انہیں بار برداری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

ہمیں بتایا گیا کہ جنگلی یاک کی تعداد کم ہورہی ہے اور اس کے تحفظ کے لیے اقدامات کیے جارہے ہیں۔ یاک اپنی حفاظت خود کرتا ہے۔ پہاڑوں، برفانی وادیوں میں رہتا ہوگا جو اس علاقے کے لوگوں کو غم نہیں۔

ٹریکنگ۔ کوہ پیمائی

ہماری پوسٹنگ ریڈیو پاکستان کوئٹہ میں تھی، ایک دن ''زیارت'' کی سیر کا پروگرام بنا۔ ہم اپنے دوست محمود حسین کے ساتھ زیارت پہنچے۔ ایک ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا۔

بہار کا موسم تھا ہر طرف سبزہ و گل تھے۔ پوری وادی میں جونیپر کی مہک تھی۔ قائداعظم کی رہائش گاہ دیکھی۔

بابا خرواری کی قبر پر گئے ایک صبح پروگرام تھا سینڈ یمن تنگی جائیں گے۔ یہ آبشار ہے وہاں تک لے جانے کے لیے ایک مقامی گائیڈ آ گیا۔ وہ ہمیں لے کر چلا سبزے سے بھرے میدانوں کے درمیان سے اونچے پہاڑ کی طرف پہنچا اور کہا۔ ''آئیے۔'' وہ پہاڑ چڑھنے لگا ہم اس کے پیچھے چل دیے۔ خیال تھا ذرا اوپر جا کر کوئی آبشار ہوگا پانی بے تحاشا گر رہا ہوگا اور ہم اس منظر سے لطف اندوز ہوں گے۔ گائیڈ اوپر چڑھتا رہا ہم اس کے نقش قدم پر چلتے رہے وہ پگڈنڈی پر جا رہا تھا جو بے حد پتلی تھی اس کے دونوں طرف جھاڑیاں اور چھوٹے پودے تھے وہ خاصا اوپر چلا گیا۔ ہم نے ایک لمحے کو مڑ کر دیکھا زمین بہت نیچے تھی اور اب واپس جانا ممکن نہ تھا اوپر سر اٹھا کر دیکھا تو گائیڈ غائب۔ اب کوئی راستہ نہیں تھا اس لیے ہم اور محمود اوپر چڑھتے رہے اور گائیڈ پر غصہ کرتے گئے۔ آخر پہاڑ کی چوٹی آ گئی دیکھا تو ہمارا گائیڈ اس چوٹی کے پیچھے جاتی پگڈنڈی پر تھا۔ وہیں سے اشارہ کر کے بولا۔ ''آئیں۔''

اب یہ ممکن نہیں تھا کہ ہم وہیں رک جاتے اترنا تو تھا اس لیے سنبھل سنبھل کر قدم رکھنے لگے۔ گائیڈ کسی چڑیا کے بچے کی طرح اڑتا جا رہا تھا۔ اسے لاکھ آوازیں دے کر کہتے۔ ''رک جاؤ، ٹھہر جاؤ۔'' وہ ایک ہی جواب دیتا۔ ''آ جائیں صاحب آ جائیں۔''

پہاڑ پر چڑھنے سے زیادہ اترنا مشکل ہوتا ہے اس میں بار بار قدموں کو بریک لگانے پڑتے ہیں۔ ہم اس میں اناڑی تھے۔ دو ایک بار پھسلے سنبھلے اور جتنا برا کہہ سکتے تھے گائیڈ کو کہا اور آخر نیچے پہنچ گئے وہاں ایک میدان تھا گھاس سے ڈھکا۔ ہمارا سانس پھولا ہوا تھا۔ پیر تھک چکے تھے اور گائیڈ غائب تھا۔ ہم ایک پتھر پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگے۔ سامنے ایک پہاڑ تھا۔ وہاں وہ نمودار ہوا اور زور زور سے ہاتھ ہلا کر اپنی طرف بلانے لگا۔ ہم آبشار بھول چکے تھے اور اب صرف غصہ اتارنے کے لیے اس کی طرف جانا چاہتے تھے۔

ایک بار پھر ہمت جمع کر کے چل پڑے وہاں پہنچے تو دیکھا اوپر سے پانی کی ایک پتلی سی دھار نیچے گر رہی ہے اور نیچے آ کر ایک جگہ جمع ہو کر دوسری طرف نکل رہی ہے۔

گائیڈ نے اس طرف اشارہ کر کے کہا۔

''یہ سینڈ یمن تنگی ہے۔''

یہ تھا وہ آبشار جسے دیکھنے کے لیے پورا پہاڑ سر کر کے آئے تھے اور اب ڈر یہ تھا کہ واپسی بھی اسی راستے سے ہوگی لیکن جب گائیڈ پر غصہ کرنے لگے تو اس نے کہا اس بار میں دوسرے راستے سے لے جاؤں گا جو جنگل سے ہو کر جاتا ہے۔ بس ذرا لمبا ہے۔

یہ ہماری زندگی میں پہلی بار اور آخری ''ہل ٹریکنگ'' تھی جو زبردستی کرائی گئی تھی۔

اسکردو کوہ قراقرم کے پہاڑوں میں واقع ہے جو کوہ پیمائی کرنا چاہتے ہیں وہ اسکردو آتے ہیں اور دیوسائی کی وادی سے ابتدا کرتے ہیں جو شہر سے 23 میل دور ہے، اسکردو کوہ پیمائی کا صدر دروازہ ہے۔ یہاں قراقرم کی سب سے اونچی چوٹی ''کے ٹو'' واقع ہے جس کی اونچائی 8,047 میٹر ہے۔ یہ دنیا کی دوسری بلند ترین پہاڑی چوٹی ہے۔ یہ برف سے ڈھکے پہاڑ ایک زمانے سے اپنے دامن میں آباد شہر اسکردو کو دیکھ رہے ہیں جہاں بلتی، کشمیری، تبتی اور پاکستان کے ہر علاقے کے لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں۔ یہاں سے جموں 183 میل دور ہے لیکن پاکستان اس فاصلے کو کبھی طے نہیں کر سکا بلتستان کی پانچ وادیاں ہیں شیگار، اسکردو، روندو، کپلو اور کھرمنگ۔ یہاں تین بازار ہیں نیا بازار، پرانا بازار اور کاظمی بازار اور ایک یادگار چوک پہلے بھی یادگار تھی اور ہمارے جانے کے بعد اور یادگار بن گئی۔ ان بازاروں میں سیکڑوں دکانیں ہیں جہاں سوویئز، فوٹو، کوہ پیمائی کا سامان، مقامی بنائی ہوئی اون کی بے شمار اشیاء ملتی ہیں۔

ہم نے اظہر جیمس اینڈ اسٹون کی دکان بھی دیکھی جہاں مقامی طور سے پائے جانے والے پتھر ملتے ہیں۔ یہ ہمیں دیکھنے میں اچھے لگے۔ گرم قہوہ پی کر جسم میں حدت بڑھائی۔ موسم کوئی رنگ اختیار کرے کسی رنگ کا مزاج دکھائے لیکن انسان نے کب ہار مانی ہے۔ کاروبار کا پہیہ چلتا رہتا ہے۔ بازار میں اسکردو کی وادیوں میں پیدا ہونے والے کتنے ہی پھل تھے جنہیں بہار کے موسم میں خشک کر لیا گیا تھا اور اب برفباری کے زمانے میں فروخت ہو رہے تھے۔ یہ دکانیں ہر روز کھلتی ہیں اس یقین کے ساتھ کہ اللہ جو سب کا پالنے والا ہے وہ بھوکا

اٹھتا تو ہے بھوکا سلاتا نہیں۔ اس لیے ہر موسم میں کوئی نہ کوئی خریدار نظر آتا ہے۔

اسکردو میں پہاڑ جمے تھے، شہر برف برف تھا پھر بھی زندگی رواں دواں تھی۔ ہواؤں کے جھکڑ، بارش کے طوفان، برفیلی ہوائیں انسانی ہمت کے ساتھ ہار جاتے ہیں۔ اسکردو کی سڑکیں، فٹ پاتھ برف سے بھرے تھے، دکانداروں نے اپنے سامنے سے برف ہٹا کر راستہ بنا دیا تھا۔ لوگ خریداری میں مصروف تھے، ریسٹورنٹ کھلے تھے۔

اسکردو میں دنیا بھر سے سیاح آتے ہیں، وادیوں میں جاتے ہیں، پہاڑوں پر چڑھتے ہیں، دریا پار کرتے ہیں، یہ سرپھرے مہم جو پہاڑوں کی بلندیوں کو چھوتے ہیں، جان ہتھیلی پر رکھ کر برف پر قدم رکھتے اوپر چڑھتے ہیں۔

ہم جیپ میں محمد امین کے ساتھ بازار سے گزر رہے تھے، اچانک انہوں نے پوچھا۔ ''آپ نے کبھی ہل ٹریکنگ کی ہے؟''

''کیوں؟'' ہم نے ذرا حیرت سے پوچھا۔

وہ بولے۔ ''جو یہاں آتا ہے وہ ہل ٹریکنگ ضرور کرتا ہے۔''

ہم نے سڑک پر دونوں طرف برف کے اونچے اونچے پہاڑ دیکھے اور کہا۔ ''دراصل ٹریکنگ اپریل سے اکتوبر تک ہوتی ہے اس موسم میں آئیں گے تو نانگا پربت پر ٹریکنگ کریں گے۔''

محمد امین نے ہماری طرف غیر یقینی نظروں سے دیکھا اور بولے آئیے آپ کو اپنے ایک دوست سے ملواتے ہیں وہ یہاں ٹریکنگ کے سامان کے سب سے بڑے تاجر ہیں۔''

ذرا سا آگے جا کر جیپ برف کے ایک ڈھیر کی سائیڈ میں روک دی گئی جہاں سے ایک پتلا سا راستہ دکان کے دروازے تک جاتا تھا۔ راستہ تو وہیں رک گیا لیکن ہم دروازہ کھول کر دکان کے اندر چلے گئے۔ ایک صاحب نے بڑھ کر استقبال کیا۔ محمد امین نے تعارف کروایا۔ وہ مکرم خان تھے۔ مل کر بے حد خوش ہوئے۔ اسکردو ایک اچھا شہر ہے وہاں کے لوگ تپاک سے ملتے ہیں، جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔

ہمیں ایک کرسی پر بٹھایا گیا اور فوراً قہوے کا بندوبست ہوا۔ ہم نے دکان میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں، رنگ برنگ طرح طرح کے سامان سے بھرے تھے، ہمارے علاقے میں تو ٹریکنگ کے لیے بس ایک نیلا پیلا ٹریک سوٹ ہوتا ہے مگر یہاں اتنا زیادہ اقسام کا سامان تھا جو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

سر سے پاؤں تک ان گنت چیزیں، سر کی بھاری ٹوپی اس پر لگا ٹارچ، آنکھوں پر مخصوص چشمہ، چہرے کے لیے سن بلاک، جسم پر موٹا خاصا قسم کا لباس، ہاتھوں کے لیے بھاری دستانے، پیروں کے لیے خصوصی موزے جوتے سب کے دو دو جوڑے اس کے علاوہ دستی ٹارچ، بہت سے بیٹری سیل، کھانے کی ضروری اشیاء، منرل پانی، برف کاٹنے کی کلہاڑی، فرسٹ ایڈ کا سامان، ضروری دوائیں، سونے کے لیے بیگ، دو مضبوط لمبی لکڑیاں، ہمیں ایسا لگا جیسے چاند پر جانے کی تیاری میں بھی اتنا سامان درکار نہیں ہوگا۔

ہم نے مکرم خان سے پوچھا اتنا سامان کمر پر لاد کر چلنا کیسے ممکن ہوگا؟ وہ کہنے لگے۔ ''صاحب شوق ہمت پیدا کرتا ہے۔ دنیا میں کیا کیا شوق ہیں، کیا کیا کھیل ہیں، پہاڑوں پر ٹریکنگ کرنے والے دریاؤں کو عبور کرتے پہاڑوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ جہاں برف کے درمیان کھلا حصہ ہوتا ہے وہ چھلانگ مار کر عبور کرتے ہیں۔''

ہم نے پوچھا۔ ''وہ واپس آتے ہیں؟''

مکرم خان مسکراتے ہوئے بولے۔

''تقریباً سو فیصدی پہاڑ کی چوٹیاں طے کر کے واپس آجاتے ہیں۔''

ہمیں یقین نہیں آیا لیکن اظہار نہیں کیا کیوں کہ اول تو ہم اپنے شہر سے سیکڑوں میل دور تھے۔ واپسی کا کوئی دن یقین کے ساتھ مقرر نہیں تھا اس کے علاوہ مکرم خان خاصے مضبوط جسم کے مالک تھے یوں بھی ہم سفر کے دوران کسی بات کی مخالفت نہیں کرتے۔ خاموش رہے۔ مکرم خان بتا رہے تھے قراقرم، ہندوکش، ہمالیہ کے اونچے ترین پہاڑ ہیں۔ انہیں سر کرنے دنیا بھر سے شوقین آتے ہیں، ہم نے پوچھا وہ ٹریکنگ کا سامان یہاں سے لیتے ہیں؟

انہوں نے بتایا کہ اکثر اپنے ساتھ لاتے ہیں، جاتے وقت یا تو مقامی باشندوں کو دے جاتے ہیں یا پھر کہتے ہیں کہ اگلی بار آئیں گے تو استعمال کریں گے۔ ان میں سے کتنے ہی ہیں جو واپس نہیں آتے۔ ان کا سامان بازار میں

فروخت ہو جاتا ہے۔ ہم بھی باہر سے ٹریکنگ کا سامان منگواتے ہیں۔ کوئی اسکردو آکر پروگرام بنائے تو اسے ٹریکنگ کا تمام سامان مل جاتا ہے۔ ہم نے پوچھا ایک بار کی ٹریکنگ کے لیے سب سامان کتنے کا مل جاتا ہے؟

مکرم خان نے ہنس کر کہا۔ ہم آپ کو تمام سامان تحفے میں دیں گے۔ ٹریکنگ کرلیں تو واپس کردیں۔ ہم نے کہا اگلی بار اپریل کے بعد آئیں گے اور آپ سے سامان لے کر سب سے اونچی چوٹی سر کریں گے۔ محمد امین اور مکرم خان ہنسنے لگے جیسے انہیں یقین ہو کہ قراقرم سلسلے کی اونچی چوٹیاں بھی ہمارے اس پلان پر ان کے ساتھ ضرور ہنس رہی ہوں گی۔

اسکردو اہم جگہ ہے یہاں قراقرم، کوہ ہندوکش کے پہاڑی سلسلے ہیں۔ دنیا کی بلند ترین چوٹیاں ہیں، نامی گرامی گلیشیئر موجود ہیں انسان ان سب کو فتح کرنا چاہتا ہے۔ بہتے ہوئے شند دریا، پھسلتی ہوئی برف کی چٹانیں، برف کے گرتے تودے راستہ روکنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ ماؤنٹ ایورسٹ کی سب سے بلند چوٹی کو انسان نے اپنے قدموں سے فتح کرلیا۔ اللہ نے اسے ہر چیز پر قدرت دی ہے۔

اسکردو کی معیشت میں ٹریکنگ ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔ دنیا بھر کے جو لوگ یہاں آتے ہیں وہ اپنے ساتھ زبان، روایت، کھانے بھی لاتے ہیں۔ اسکردو کے کتنے ہی مقامی باشندے ان کے ساتھ ٹریکنگ پر جاتے ہیں جب وہ لوٹ کر آتے ہیں تو ان کے کھانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ یوں دنیا بھر کے مختلف ملکوں کے مختلف کھانے پکانا سیکھ لیتے ہیں اور جو لوگ باہر سے آتے ہیں انہیں کسی حد تک زبان اور کھانے کی پریشانی نہیں ہوتی۔

ہم نے مکرم خان کی دکان سے نکلنے سے پہلے وعدہ کیا تھا کہ موسم بہار میں ٹریکنگ کے لیے آئیں گے۔ وہاں ابھی تک نہیں گئے کیوں کہ موسم بہار تو کہا تھا لیکن سن نہیں بتایا تھا۔

دریائے سندھ سے شکایت

دریائے سندھ سے ہمیں شکایت ہے اچھا خاصا تبت کی جھیل مانسرور سے نکلا، لداخ میں گھس گیا، وہاں سے بل کھاتا ہوا اسکردو آ گیا اب کوئی پوچھے ارے بھائی سیدھا سادہ پہاڑوں میں ہوتا ہوا اسکردو آ جاتا تو کیا بگڑتا؟

پانی پر ہندوستان سے تنازعہ نہ ہوتا لیکن وہ بھی کیا کرے؟ جھیل مانسرور کے بارے میں ہندو مذاہب کو ماننے والے کہتے ہیں کہ اسے برہما نے اپنے ذہن میں سوچا تھا اس جھیل کے نام کے سنسکرت میں معنی ہیں ''ذہن اور جھیل'' اس لیے وہ بے حد اہم ہے۔

ہندو مذہب والے یہاں یاترا کو آتے ہیں اس کے پانی میں نہاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں ان کے سارے گناہ دھل گئے۔

بدھ مت والے اس جھیل کو بدھا کا تصور بتاتے ہیں اس لیے یہ جھیل بدھ مذہب والوں کے لیے بھی اہم ہے وہاں چٹانوں پر کئی جگہ گوتم بدھ کے مجسمے اور بدھ مندر ہیں۔

جین مذہب والوں کا خیال ہے کہ لارڈ رشی بھادی واجی نے اس جگہ بیٹھ کر نروان حاصل کیا تھا اور یہ ان کی بنائی ہوئی ہے، جھیل مانسرور ایک مقدس اور متبرک پانیوں کا مجموعہ ہے۔ جسے مذہبی اہمیت حاصل ہے اس لیے اس جگہ سیاح نہیں آسکتے۔ اس جھیل سے دریائے سندھ نکلتا ہے اور آگے جاکر دریائے ستلج اور بیاس بھی مارے عقیدت کے اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔

ہندو مذہب والے دریائے سندھ میں نہانا باعثِ ثواب سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے اگر اس میں نہانے کے بعد سو بار بھی جنم لیں تو سارے گناہ دور ہو جائیں گے۔ پاکستان کے علاقے میں یہ جب داخل ہوتا ہے تو نہ کوئی اس میں نہانا باعثِ نجات سمجھتا ہے اور نہ کوئی اس کی عبادت کرتا ہے۔ کیا خبر دریا اس طرف آکر پچھتایا ہی ہو۔ لداخ سے مڑ کر ہندوستان چلا جاتا بڑی قدر و منزلت ہوتی اب تو یہ جھگڑے کی جڑ بنا ہوا ہے۔ اسکردو سے بہتا ہوا گلگت کے علاقے چیلاس کے پاس جاتا ہے وہاں اس میں دریائے ہنزہ اور گلگت مل جاتے ہیں۔ دراصل اس دریا کی اوقات اسکردو میں داخل ہوتے ہی صرف دریائے سندھ رہ جاتی ہے حالانکہ اگر یہ چاہتا تو جب اس نے بہنے کے لیے علاقے بدلے تو ملک بھی بدل لیتا لیکن شاید اس کی تقدیر میں بے انتہا عقیدت احترام تقدس اور پوجا کے بعد عام دریا بننا تھا اس لیے اوپر سے گرا اور نیچے

آ گیا۔ ہم نے دریائے سندھ اسکردو سے گلگت کے راستے میں دور تک اپنے ساتھ دیکھا پھر بچھڑ گیا۔

یہاں رہ جائیں

''آہنگ'' کے اسکردو خصوصی شمارے کے لیے گفتگو کرتے ہوئے غلام عباس نے کہا۔

''آپ اسکردو میں اپنی پوسٹنگ چاہتے تھے، لیکن کیوں؟''

ہم نے جواب دیا۔ ''نہال احمد ڈائریکٹر پروگرامز تھے ایک دن ان کا فون آیا۔ یہاں اس وقت پروموشن کمیٹی کا اجلاس جاری ہے۔ آپ کا پرموشن ہو رہا ہے۔ ڈائریکٹر جنرل صاحب پوچھ رہے ہیں کہ آپ کی پوسٹنگ کہاں کی جائے؟''

یہ پہلا موقع تھا جب کسی سے پوچھا گیا تھا ہم نے جواب دیا تھا اسکردو۔

نہال احمد نے تعجب سے پوچھا تھا۔ ''اسکردو وہ کیوں؟''

''کیوں کہ وہاں ایک سال گزارنے کے بعد اپنی پسند کا اسٹیشن مل جاتا ہے۔''

نہال صاحب نے پھر پوچھا۔ ''کیا واقعی اسکردو جانا چاہتے ہیں؟''

ہم نے کہا۔ ''جی ہاں۔'' اور فون بند ہو گیا۔

ذرا دیر بعد سلیم گیلانی صاحب ڈائریکٹر جنرل لائن پر تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ ''اسکردو کیوں جانا چاہتے ہیں؟''

ہم نے کہا۔ ''وہاں سے ایک سال بعد واپسی ہو جاتی ہے۔''

''اور اگر ایک سال بعد واپسی نہ ہو تو؟'' انہوں نے کہا۔

''یہ آپ کی مرضی ہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

انہوں نے فون بند کر دیا۔

ایک گھنٹے بعد نہال احمد کا فون آیا۔ ''مبارک ہو آپ ڈپٹی کنٹرولر بنا دیئے گئے ہیں اور پوسٹنگ بھی شعبہ مطبوعات میں کی گئی ہے۔''

غلام عباس نے کہا۔ ''آپ کو اسکردو آئے کئی دن ہو گئے ہیں، رات کو برف باری ہوتی ہے لیکن دن میں سورج نکل آتا ہے یہ کئی ہفتوں بعد ہوا ہے ہم سب کا خیال ہے آپ اپنے ساتھ دھوپ لائے ہیں۔ آپ یہیں رہ جائیں۔''

ہم نے کہا۔ ''ایک صاحب آزاد قبائلی علاقے میں گئے انہوں نے سنا تھا وہ لوگ سیدوں کی بڑی قدر و منزلت کرتے ہیں۔ اس لیے نام کے ساتھ سید لگا لیا، ان لوگوں نے بھی سید نہیں دیکھا تھا۔ انہیں دیکھ کر بڑے خوش ہوئے بہت خاطر مدارات کی۔ وہ جب بھی جانے کی اجازت مانگتے وہ لوگ روک لیتے۔ بھلا ایک سید آیا ہے اسے کیسے چھوڑ دیں سنا ہے ان کے مزار پر خاموش رہتا ہے۔''

غلام عباس ہنسنے لگے۔ ''اب ہمیں اتنی بھی دھوپ نہیں چاہیے۔ لوگ بتاتے ہیں آپ ایڈمنسٹریشن میں بہت سخت ہیں اور اسکردو میں اس نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔''

ہم نے کہا۔ پرسوں ہماری روانگی ہے اور ٹکٹ آپ کے پاس ہے۔ کنفرم کرانے کے لیے اور یقین ہے آپ ہمیں جانے دیں گے۔''

غلام عباس ہنسنے لگے اور بولے۔ ''یوں بھی اسکردو میں سب کچھ جما ہوا ہے اس موسم میں تو پرندے بھی کوچ کر جاتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا یہاں آپ کو کیا دکھائیں؟''

ہم نے کہا۔ ''آپ لوگوں کو دیکھا، برف کے بازاروں میں زندگی کی گرمی محسوس کی، وقت نے وفا کی تو موسم گل میں بھی آئیں گے۔''

اسکردو میں کئی دیکھنے کی چیزیں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں، وادیاں، پہاڑ پر قلعہ اور حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سبز میدان۔ آج آپ قلعہ ''کھرپوچو'' ہو آئیں۔ اس قلعے کے نام کا مطلب ہے ''قلعوں کا بادشاہ'' یہ پہاڑی پر ہے جسے علی شیر اچکزئی نے بنایا تھا۔ جیلتستان پر حکومت کرتا تھا یہ حکومت سولہویں صدی کے آخر تک جاری رہی۔ یہ بالکل دریائے سندھ کے نزدیک واقع ہے اس کی ایک تاریخ ہے شاید اتنا راستہ مل جائے کہ آپ گاڑی کے ذریعے وہاں تک پہنچ جائیں۔''

ہم نے نے کہا۔ ''ہر طرف برف نے قلعے بنا رکھے ہیں چلیں اچکزئی کا قلعہ بھی دیکھیں۔''

ریڈیو کی عمارت کے باہر جیپ اور محمد امین دونوں ہمارے منتظر تھے۔

اسکردو میں ہمیں سب سے زیادہ مہم جو محمد امین

لگے۔ ان کا بس چلتا تو ہمیں کسی نہ کسی طرح کوہ پیمائی پر لے جاتے اور ان دنوں وہیں کسی برف کی کھائی میں آرام کر رہے ہوتے لیکن ہم جب ان کے ساتھ نکلتے ہر طرف سے چوکنا رہتے آج انہوں نے قراقرم کی قسم کھائی تھی ہمیں قلعہ کھرپوچو دکھا کر رہیں گے۔ ہمارے مقدر میں بہت سے قلعے ہیں لیکن اجاڑ، ویران، پرانے اور خالی۔ چار چھ صدی پہلے ہمیں کوئی قلعہ دکھاتا تو وہ ہمارا ہوتا وہاں اونچے سے محل میں رہ کر حکم چلاتے آج یہ حال ہے کہ امریکی ڈالر چلاتے ہیں بلکہ یوں کہیں اب یہ قلعے ہم سے ڈالر لینے کے چکر میں رہ گئے ہیں وہاں تک پہنچنے کے لیے یا داخلے کے ٹکٹ کی صورت میں۔

کھرپوچو قلعے کے بارے میں کہا جاتا ہے یہ شیر علی اچنزئی کے دادا نے تعمیر کروایا تھا اور بعد میں انہوں نے اس کی تزئین و آرائش کی تھی لیکن جو محققین مغل دور پر ماہر مانے جاتے ہیں ان کا خیال ہے یہ قلعہ خود شیر علی اچنزئی نے بنوایا ہے۔ ایک زمانے میں وہ لداخ کے حکمران بھی تھے۔ انہیں یقیناً کوہ پیمائی کا شوق ہوگا وہ سولہویں صدی میں تھے اور اس زمانے میں گھوڑے اور یاک کے علاوہ پیدل ہی پہاڑوں پر چڑھنا ہوتا تھا۔ نہ جانے کیوں پاکستان کے صاحبانِ اقتدار نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ لداخ بھی اسکردو کا حصہ ہے۔

ہندوستان کو جہاں اور بہت سے غم ہیں وہاں کشمیر بھی ایک گھاؤ بنا ہوا ہے اور مجاہدین جب موقع ملتا اس پر نمک چھڑک دیتے ہیں۔

قلعہ کھرپوچو اسکردو شہر سے چالیس فٹ اوپر پہاڑ پر ہے جہاں جانے کے لیے ایک سڑک بنی ہے جسے دیکھ کر دوسری سڑکیں شرمندہ ہوتی ہیں بس یوں سمجھیں ایک راستہ اوپر جاتا ہے جس کے ایک طرف صد پارہ ہوٹل اور دوسری طرف بلتن ہوٹل ہے پولو گراؤنڈ اور پھر اس کے ساتھ اوپر جاتا راستہ۔

ہم پہنچے تو اس راستے پر برف ہی برف تھی۔ ذرا سا اوپر چڑھے تو آگے راستہ برف سے بند تھا اوپر قلعے کی دیوار پر انگریزی میں "کھرپوچو" لکھا تھا اس کا مطلب تھا یہی قلعہ تھا۔

محمد امین نے ڈرائیور سے کہا۔ "اوپر چلنے کی کوشش کرو، وہ بے چارہ جیپ سے نیچے اترا تھوڑی دور گیا اور واپس آیا۔ کہنے لگا۔ "صاحب کوشش کریں تو پیدل جا سکتے ہیں جیپ کا جانا مشکل ہے۔"

ہم نے پوچھا۔ "اندر کیا ہے؟"

محمد امین نے بتایا۔ "کچھ کمرے اور ایک پرانی مسجد۔"

ڈرائیور نے کہا۔ "صاحب دروازہ بھی بند ہوگا شاید چوکیدار بھی نہ ہو۔"

"اندر برف بھی ہوگا۔" ہم نے سوال کیا۔

ڈرائیور نے کہا۔ "جی صاحب۔"

ہم نے کہا پھر بھی چھو یہ کوہ پیمائی تو کی جا سکتی ہے۔

ڈرائیور نے گاڑی بند کی۔ کہیں سے ڈھونڈ کر بڑے پتھر لایا پچھلے پہیوں پر لگائے پھر جیپ سے ایک پھاوڑا نکالا۔ وہ سمجھدار آدمی تھا ہم سے آگے چلنے لگا۔ پھاوڑے سے وہ اتنی برف ہٹا دیتا کہ ہم پاؤں رکھتے، آگے بڑھتے جاتے۔ ذرا سا چلے تو سانس پھول گیا محمد امین نے کہا۔

"اسکردو میں اونچائی پر یہی ہوتا ہے ہمیں رک رک کر چلنا چاہیے۔"

اس پر عمل کرتے ہوئے اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے آخر قلعے کے دروازے تک پہنچ گئے اور حیرت یہ ہوئی کہ اس کا ایک دروازہ کھلا تھا اور شاید چوکیدار کسی کام سے گیا ہوا تھا اس وقت ہمیں مرزا غالب یاد آئے کہ وہ جب گھر میں ہوتے تو دروازہ بند کر کے بیٹھتے جب باہر جاتے تو دروازہ کھلا چھوڑ جاتے۔ کسی نے پوچھا مرزا ایسا کیوں کرتے ہو؟ انہوں نے کہا جب میں اندر ہوتا ہوں تو گھر میں سب سے قیمتی میں ہی ہوتا ہوں۔ باہر جاتا ہوں تو دروازہ کھول دیتا ہوں۔ اب گھر میں کیا رہا؟

چوکیدار نے بھی یہی سوچا ہوگا۔

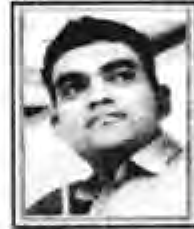
دروازے کے بعد ایک بڑا کاریڈور تھا، راہداری، دوسری جانب ایک شکستہ عمارت جس کے بارے میں بتایا گیا یہ پرانی مسجد ہے۔ صحن میں جا کر کھڑے ہوئے اس فضا میں سانس لیا اور پھر سولہویں صدی سے باہر نکل کر بیسویں صدی میں آ گئے۔

اس دلچسپ سفرنامے کی سنسنی خیز روداد اگلے ماہ کے صفحات پر ملاحظہ فرمائیے۔

شعلہ ساماں تحریریں

محبت اور نفرت کی دھیمی دھیمی آنچ
میں اونگھتی ہوئی شعلہ ساماں تحریریں

انتظار



ایڈیسن ادریس مسیح

ایڈیسن کے قلم کی سچائی، زندگی کے ایندھن میں خود کو رہن رکھنے والوں کا مآل



بھی کوئی اسی، پچاسی برس عمر ہوگی۔ جھریوں سے اٹے چہرے پر گہری تھکن نمایاں تھی۔ سفید داڑھی بے ترتیبی سے بڑھی ہوئی تھی۔ جھکے ہوئے کندھے، شکن زدہ سفید میلا کرتا اور پھٹے ہوئے، دھول میں اٹے سیفٹی بوٹ پہنے ہوئے اس بابے میں بزرگی کا جو ایک خاص وقار ہوتا ہے، نہیں تھا۔ دسمبر کی رات کا پہلا پہر ہو یا آخری، ٹھنڈ تو بہرحال ہوتی ہی ہے، میں خود بھرپور جوان ہونے کے باوجود لیدر کی امپورٹڈ جیکٹ، موٹے دستانے اور اونی ٹوپی جو کھینچ کر کان ڈھانپ لیتے ہیں، پہنے ہوئے تھا پھر بھی کوئی تیز ہوا کا جھونکا کپکپا جاتا تھا۔ بابے کی برداشت پر مجھے حیرت تھی۔ نحیف و نزار بدن پر بس ایک پرانا کرتا.......

"اور ہے؟"...... پھٹی پھٹی سی بلغمی آواز میں وہ مجھ سے سگریٹ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

"sure." میں نے ڈبیا نکال کر بڑھائی۔ بابے نے سگریٹ سلگائی اور بغیر شکریہ ادا کیے سگریٹ اور لائٹر میری طرف بڑھا دیئے۔ میں نے بھی اسی خاموشی سے تھام لیے۔

"کیا کرتے ہو؟"

"پڑھاتا ہوں۔"

"استاد ہو، جلدی سوجایا کرو تا کہ بچوں کو بھی تلقین کرسکو۔ عجیب مزاج ہو گیا ہے شہر کا بھی، آدھی رات تک جاگتے رہنا پھر آدھا دن گزار کر اٹھنا اور کہتے پھرنا کہ وقت نہیں ہے، ٹائم ہی نہیں ملتا۔"

"نہیں، میں جلدی سوتا ہوں اور صبح جلدی ہی اٹھتا ہوں۔ وہ دراصل مجھے انتظار ہے کسی کا۔"

"انتظار......؟ تو تمہیں بھی انتظار ہے کسی کا؟ خدا کرے، تمہارا انتظار جلد ختم ہو جائے۔" بابے کا لہجہ ایک دم بھیگ گیا۔ مجھے خواہ مخواہ ہمدردی ہونے لگی۔

"کیا ہوا بابا، آپ بھی کسی کا انتظار کر رہے ہیں کیا؟"

بابا نے لمبا کش بھرا اور دور خلا میں جیسے میرے سوال کا جواب ڈھونڈا۔

"کون ہے تمہارا؟"

"دوست ہے، پہلی بار گھر آ رہا ہے دراصل۔"

"نیا دوست ہے؟"

"نہیں، تین برس پہلے رات کو اکٹھے چائے پیتے تھے اور تاش کھیلتے تھے۔"

"پھر؟"

''پھر وہ باہر چلا گیا' بہت بڑے بڑے سپنے تھے اس کی آنکھوں میں' خوب خوب روپیہ کمانا چاہتا تھا۔''

''ہا......روٹی کا چکر۔'' بابا آہ بھر کر رہ گئے۔ ''سارا پھڈا اسی پیٹ کا ہے بابو جی چاہتا ہے' خدا سے پوچھوں کہ سب کی روٹیاں اپنے ہاتھ میں کیوں نہیں رکھتا؟ کہتے ہیں' رزق تو بھیجتا ہے تو پھر محنت کش کیوں ہڑتالیں کرتا ہے؟''

میں نے چونک کر دیکھا' بابے کی ذات سمندر تھی' میں جو گہرائیوں سے خوفزدہ ہوں' بس پہلو بدل کر رہ گیا مگر مجھ سے کم ذات کے لیے پہلو تہی ہی تو ناممکن ہے۔

''کیا ہوا تھا بابا؟'' سوال خود بخود ہونٹوں تک چلا آیا تھا۔

............*......*

مہنگائی کی چکی میں پستے کروڑوں عوام میں ایک بہت عام سا چہرہ مختیار احمد کا بھی تھا۔ بچپن سے جوانی جیسے خواب کا عالم تھا پھر حقیقت کی سنگلاخ وادی نے جیسے پیر پکڑ لیے اور وجود دن بدن اَن دیکھی دلدل میں اترتا گیا تھا۔ گیارہ بہن بھائی تھے اور ابا کی تنخواہ بھی گیارہ ہزار ہی تھی۔ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے والا محاورہ بھی کارگر ثابت نہیں ہوسکتا تھا جیسے تیسے کر کے سرکاری اسکول سے آٹھویں پاس کی اور بڑا ہوگیا۔ اتنا بڑا کہ گھر کی گرتی ہوئی چھت کو کندھوں کا سہارا دے کر سنبھالنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اسی کوشش میں ماہ و سال بیتتے چلے گئے۔ دو دو بستر دے کر بہنوں کو وداع کیا۔ باقی تین بھائیوں کو بھی ہمت کے مطابق تعلیم دلوا کر ملازمتیں لگوا دیں' شادیاں کر دیں تو گھر چھوٹا پڑ گیا' سب کے سب الگ جا بسے تو مختیار احمد نے جیسے سکون کا سانس لیا۔ اماں ابا نے آگے پیچھے وفات پائی تھی پھر وہ ماں بھی بنا اور باپ بھی مگر صرف اپنے بہن بھائیوں کا' خود اپنی اولاد عدم تحفظ کا شکار ہوگئی تھی۔

عارفہ جھلا کر کہتی تھی۔ ''ابا کا بس چلے تو جان نچھاور کر دیں اپنے بہن بھائیوں پر۔ آخر یتیم جو ہوئے' دادا جان باپ بنا کر گئے ہیں ناں' کوئی ہم سے تو پوچھو' اصلی یتیم تو ہم ہوئے جو باپ کے ہوتے ہوئے بھی......''

اماں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی تھی اور مختیار احمد کو اپنے بچے ابھی بہت بچے لگتے تھے۔ بہن بھائیوں کی ذمہ داریاں بھگتاتے ہوئے انہیں یہ احساس تک نہ ہوا کہ



عارفہ اب اپنی ماں کے کپڑے پہن سکتی ہے اور رانی' عارفہ کے' وہ تو جیسے کسی خواب سے چونکا تھا جب اچانک رشتہ آ گیا تھا اس کا۔ خدیجہ مائی کہتی تھیں۔ ''لڑکا بڑا دین دار ہے۔ اپنی دکان ہے سائیکل پنکچر کی۔ دال روٹی کو نہ ترسے گی خیر سے بیٹی۔''

مگر عارفہ جو میٹرک کے بعد ٹیوشن پڑھا پڑھا کر اب انٹر کے فائنل ایگزام دینے والی تھی تڑپ ہی تو اٹھی تھی۔

''مجھے نہیں کرنی کوئی شادی وادی ابھی...... کتنا کام باقی ہے میرا۔''

''تو بیٹا! بعد میں کر......''

''نہیں امی! میں بہت سارا پڑھنا چاہتی ہوں۔ خوب ڈھیر سارا پیسہ کمانا ہے مجھے۔ کل کیا ہوگا' کس نے دیکھا ہے؟ مجھے اپنے پیر مضبوط کرنے ہیں۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو بیٹا؟''

''امی...... اچ پوچھو تو ابا تو ساری زندگی بس بھائی ہی بنے رہے' کبھی باپ نہ بن سکے۔ میں دس دس روپے کی چیزوں کے لیے ترسی ہوں۔ مجھ سے چھوٹے پانچ اور کھڑے ہیں میرے جیسی زندگی گزارنے کے لیے۔ وقت بہت بدل چکا ہے امی...... میں نے ساری زندگی ابو ہی کو کوسا ہے' اب میری غیرت کہتی ہے' تم نے کیا کیا' لڑکیاں تو ہوائی جہاز تک اڑا رہی ہیں۔ میں بس اپنی نظروں میں سرخرو ہونا چاہتی ہوں امی...... پلیز......''

مختیار احمد کے تو ہاتھوں کے توتے ہی اڑ گئے۔ اس نہج پر بھلا کب سوچا تھا کہ اس کو بیٹی کے آگے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ تھوڑی سی تنخواہ تھی' ہزاروں خرچے۔ دو دو گھر پالنا مشکل ترین تھا۔ اپنے بچے چھوٹے تھے' بہلائے جا سکتے تھے سو بہلانے کی کوشش کی' یہ کب سوچا تھا کہ چھوٹی چھوٹی خواہشوں کا قتل عام ایک دن انقلاب لائے گا۔ اب احساس ہوا کہ وقت بہت آگے نکل آیا ہے' بچے بڑے ہو چکے ہیں اب۔

ایک عجیب طرح کی تھکن اور بے زاری تھی یا شاید پھر محرومی کے احساس نے ہی سب کو بے کل کیا ہوا تھا؟ کچھ بھی تھا' عارفہ اب اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ فائنل پیپر زدیئے بغیر نتیجے کا انتظار کیے وہ نازک سی محض اٹھارہ برس کی لڑکی اس بڑے شہر کے بڑے صنعتی نظام کا وہ چھوٹا پرزہ بن گئی۔ درحقیقت جس پر پورے نظام کی اساس ہے مگر......

ساڑھے چھ ہزار کی ''خطیر'' رقم جب پہلی مرتبہ اس کے ہاتھ میں آئی تو اس کا بدن ہولے ہولے کانپنے لگا تھا' حلق خشک ہو گیا تھا اور ذہن برس ہا برس پیچھے جا نکلا تھا جب مہینے کے شروع کے دنوں میں سب کو ابا کی تنخواہ کا انتظار رہتا تھا۔ اس نے کبھی اظہار تو نہیں کیا تھا مگر ہر بار اس کا دل چاہتا تھا کہ ابا اس کے لیے کہانیوں والی کتاب لائیں' کوئی نیلی آنکھوں والی گڑیا یا چاکلیٹ' آئس کریم' نیا جوڑا' کچھ بھی مگر کچھ نہ ہوتا' تنخواہ آنے سے پہلے ہی تقسیم ہو چکی ہوتی تھی۔ پیسے پھر بھی کم پڑ جاتے۔ ہر ماہ کسی نہ کسی سے ادھار لینا پڑتا۔ مہنگائی تھی کہ بڑھتی ہی چلی جاتی تھی اور تنخواہیں...... خیر یہ تو الگ بحث ہے' بات تھی ساڑھے چھ ہزار کی' عارفہ سیدھی مارکیٹ گئی تھی اور سب بہن بھائیوں کے لیے چھوٹی موٹی چیزیں خریدیں' اپنے لیے بھی سستے کاٹن کے دو سوٹ لیے۔ فیکٹری میں سب لڑکیاں بہت اچھے کپڑے پہن کر آتی تھیں۔ بار بار کھلونوں کی دکان پر رکھی نیلی' سبز آنکھوں والی گڑیاؤں کی طرف اس کی نظر بھٹک جاتی تھی۔ ہر بار وہ خود کو یقین دلاتی کہ اب وہ بڑی ہو چکی ہے۔ گھر آ کر فخر سے سب کو چیزیں دکھائیں۔ اپنی کمائی کا نشہ ہی کچھ اور تھا۔ امی ناراض ہوئی تھیں۔

''کیا ضرورت تھی فالتو چیزیں اٹھا لانے کی؟ نہ باپ نے کبھی کمائی لا کر میرے ہاتھ پر رکھی' اب تم بھی باپ پر ہی گئی ہو؟'' عارفہ نے مطلق پروا نہ کی۔ مختیار احمد پتہ نہیں کیوں چور سا بنا بیٹھا تھا' اس رات بڑی دیر تک جاگتا رہا۔ صبح بھی جلدی کام پر چلا گیا۔ اس نے رات ہی کو سوچ لیا تھا کہ اب وہ اپنی اولاد کی محرومیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس نے آج ہی دو تین بندوں سے پارٹ ٹائم نوکری کی بات بڑھانے کا کہہ دیا تھا۔

•......•......•......•

جلد ہی مختیار احمد کو ایک اور ملازمت مل گئی' چھوٹی سی فرم تھی' چپراسی کا کام' تنخواہ بھی فرم کی طرح چھوٹی سی ہی تھی مگر وہ بہت خوش تھا۔ دل میں کیا کیا منصوبے نہ بنائے ہوں گے' بس اس نوکری کی تنخواہ تو وہ بیوی کو ہوا بھی نہ لگنے دے گا' جمع کرے گا بہت سارا روپیہ اور عارفہ کا اچھا سا جہیز بنا کر اسے اپنے گھر کی...... نہیں' اسے پڑھنے کا بہت شوق ہے' پڑھاؤں گا' جو بننا چاہے گی' وہ بناؤں

گا۔ میں بھی تو چاہتا تھا کہ انجینئر بن جاؤں گا' میکینک بھی نہ بن سکا۔ خیر' اپنی تو گزر ہی گئی' اب بس اپنے خواب کی تعبیر اپنے بچوں میں دیکھوں گا۔

عارفہ کی ملازمت سے گھر میں کچھ خوشحالی آئی تھی۔ کھلا خرچہ کرنے کی تو عادت ہی نہ تھی۔ ایک جگہ کمیٹی چلا دی۔ اماں کو ہر مہینے لگتا' اب کی بار کمیٹی انہی کی نکلے گی۔ ہر ماہ پرچی نہ نکلنے پر جتنی ناامید ہوتی' اگلے ماہ اس سے بھی زیادہ پرامید۔ بس اسی دھوپ چھاؤں میں زندگی سرک رہی تھی۔

مختیار احمد کا شوگر اب ہائی رہنے لگا تھا' کچھ تو کم عمری کی بے تحاشہ محنت نے تھکا مارا تھا' رہی سہی کسر بیماری نے پوری کردی' بستر سے لگ رہے تھے۔ آنکھیں اور ٹانگیں ہمہ وقت سوجی رہتیں۔ بہن بھائی سب اپنی زندگیوں میں مگن تھے' کبھی کبھار حال چال پوچھ جایا کرتے تھے اور بس' اس سے زیادہ وہ کچھ کر بھی تو نہیں سکتے تھے۔ ان کے اپنے ہی مسائل تھے۔ اب گھر کا سارا معاشی بوجھ بس عارفہ کے کندھے پر تھا۔ اوور ٹائم کر کر کے بھی خرچہ پورا نہ ہوتا تو اس کی راتوں کی نیندیں اڑ گئیں۔ اب اسے اپنے باپ کی مجبوری کا احساس ہوا تھا۔

''ابا......! مجھے معاف کردو' میں نے تمہارے لیے ہمیشہ غلط سوچا' آج جب خود تمہاری جگہ کھڑی ہوں تو احساس ہوا ہے' ہم تو رشتوں میں بندھے ہوتے ہیں۔ زندگیاں ہم پر انحصار کرتی ہیں۔ مجھے فخر ہے تم پر ابا......! اپنے بچوں کو سب کھلاتے پلاتے' خوش رکھتے ہیں۔ تم نے بہن بھائیوں میں فرق نہ سمجھا' بس مجھے بھی یہی کرنا ہے۔ تم بے فکر رہو۔ میں تمہارا کام کروں گی' سب کچھ تمہاری خواہش کے مطابق ہوگا۔''

پتہ نہیں وہ زیادہ رو رہی تھی کہ ابا؟ مگر وہ رات دونوں نے جاگ کر گزاری تھی۔ ابا تھکن سے چور تھے تو اس کو اندر جلتے الاؤ سونے نہیں دیتے تھے پھر اس کے بعد کی کہانی اتنی سی ہی ہے کہ عارفہ نے مختیار احمد کی جگہ لے لی اور زندگی کا تسلسل قائم رکھا۔ ہاں' اس کوشش میں اس کی دو اور بہنوں نے بڑا ساتھ دیا تھا' تینوں بہنیں اکٹھی فیکٹری جایا کرتی تھیں' کل ملا کر اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ گھر کے اخراجات اور مختیار احمد کی دواؤں کے علاوہ بھائی کے تعلیمی اخراجات پورے ہو جاتے تھے۔ احسان (بھائی) خود بھی دو جگہ ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ اچھے رشتے ملنے پر عارفہ نے دونوں بہنوں کی شادی بھی کروادی تھی۔ ابا اب فخر سے کہتے تھے۔ ''عارفہ میری بیٹی نہیں' بیٹا ہے۔''

•......•......•......•

پھر وہ رات آ گئی۔ جو لوگ کہتے تھے کہ نئی صبح کا پیغام لانے والی ہے' ملک میں جشن کا سا سماں تھا' ایک بڑی سیاسی پارٹی کی چیئر پرسن طویل عرصے بعد وطن لوٹی تھیں' عاشقین انڈے چلے آرہے تھے' جگہ جگہ استقبالی جلسے تھے' انقلاب کے نعرے تھے' ترانے تھے' گرما گرم بحثیں تھیں اور بہت کچھ تھا۔

عارفہ کی فیکٹری میں اس دن اوور ٹائم میں کام نہیں کروایا گیا تھا۔ وہ حسب معمول باقی ورکروں کے ساتھ مقررہ وقت پر فیکٹری سے نکل کر فیکٹری ہی کے گیرج میں بیٹھ گئی تھی اس بات سے بے خبر کہ سیاسی لیڈر کا بم دھماکے میں قتل ہو گیا تھا۔ شہر بھر میں آگ بھڑک اٹھی تھی' دکانیں لوٹی جارہی تھیں' گاڑیاں جلائی جارہی تھیں' گولیاں چل رہی تھیں' ڈنڈے برس رہے تھے' اے ٹی ایم اور بینکوں کے تالے توڑے جارہے تھے' لڑکیاں اٹھائی جارہی تھیں' زیور چھینے جارہے تھے' عزتیں لوٹی جارہی تھیں' دختر مشرق کا قتل کوئی معمولی بات تو نہیں تھی ناں؟

فیکٹری کی گاڑی پروسیسنگ زون سے نکل کر روڈ پر آئی ہی تھی کہ کتنے ہی چیختے چنگھاڑتے کالے دیو لپک پڑے تھے۔

''نیچے اترو......ہم آگ لگا دیں گے......'' چیخ و پکار کا وہ طوفان اٹھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ عارفہ کے حواس مختل ہونے لگے' اس نے پوری آنکھیں کھول کر منظر دیکھا۔ بس پر پیٹرول چھڑکا جا چکا تھا' لڑکیوں کی چوڑیاں اتروائی جارہی تھیں' دوپٹے کھینچے جارہے تھے' کپڑے پھاڑے جارہے تھے۔ اس نے پوری قوت سے ابا کو پکارا تھا مگر اس کی پکار محض چیخ بن کر رہ گئی۔ کسی نے پوری قوت سے اسے بھینچ لیا تھا اور نیچے گرا دیا تھا۔ اندھیرے میں ڈوبتی آنکھوں نے آخری منظر دیکھا' اس کے کپڑے......

ایک مشرق کی بیٹی کے قتل کا انتقام شاید اسی صورت ممکن تھا۔

•......•......•

مختیار احمد اب بھی روز اپنی بیٹوں جیسی بیٹی کا انتظام کرتا ہے۔ وہ پاگل نہیں ہے اور شاید...... ہے بھی؟

☆☆☆

اُگروادی



صداقت حسین ساجد

آزادیٔ کشمیر پر قربان ہو جانے والے ایک غیور خاندان کا لہولہو قصۂ اَلم

میں ایک ایسی ماں ہوں...... جس نے کھو کر بھی سب کچھ پا لیا ہے! میں ایک کشمیری ماں ہوں! آج میں آپ کو اپنی کہانی سناتی ہوں۔

ہمارا ایک چھوٹا سا گھرانا تھا...... میرا شوہر، میں، میرا بیٹا اور میری ایک بیٹی۔ اچھی خاصی زندگی گزر رہی تھی...... ہم سری نگر میں رہتے تھے۔ میری بیٹی سری نگر یونی ورسٹی کی طالبہ تھی...... بیٹا ہائی سکول میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ میرے شوہر کی بازار میں ایک دکان تھی۔ اچھا خاصا کاروبار چل رہا تھا۔ ہم جیسے تیسے آزادی کے مجاہدوں کی مدد کرتے تھے...... میری بیٹی تو مسلمان طلبہ میں آزادی کا شعور بے دار کرنے کے لیے بڑی تن دہی سے کام کرتی تھی۔ ہمارے دل کشمیری مجاہدین کے لیے دھڑکتے تھے۔

ہم ابھی تک بھارتی فوج کی ظالمانہ کارروائیوں سے بچے ہوئے تھے...... لیکن کب تک...... آخر ایک دن ہمارا گھرانا بھی لپیٹ میں آ ہی گیا۔ بھارتی فوج نے ہمارے گھر کو گھیرے میں لے لیا۔ اس وقت ہم سب گھر میں موجود تھے...... یہ صبح صبح کا وقت تھا۔ ہم سب کو ایک طرف کھڑا کر کے پورے گھر کی تلاشی لی...... اس دوران سامان بھی توڑا پھوڑا گیا۔ جب کچھ نہ ملا، تو تو ایک افسر آگے بڑھا اور بولا:

"تمھارے رابطے اگروادیوں (مجاہدین) کے ساتھ ہیں۔"

"آپ کو یہ خبر غلط ملی ہے۔" میرے شوہر نے کہا۔

"چپ کر مسلے!"

ایک فوجی نے کہا اور آگے بڑھ کر میرے شوہر کی پٹائی شروع کر دی۔ میرے بیٹے سے یہ سب دیکھا نہ گیا اور وہ اپنے باپ کو بچانے کے لیے اس فوجی سے بھڑ گیا۔ جب باقی فوجیوں نے یہ دیکھا، تو وہ بھی آگے بڑھے اور انھوں نے دونوں باپ بیٹے کو مارنا شروع کر دیا۔ وہ لاتوں، مکوں اور رائفلوں کے بٹوں سے ان کی پٹائی کر رہے تھے۔ ان کی چیخیں ہم ماں بیٹی سے برداشت نہ ہو سکیں اور ہم انھیں چھڑانے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کے حملوں کی زد میں ہم بھی آنے لگے...... کب ہمارے سروں سے ہمارے آنچل کھسکے...... ہمیں اس بات کا کچھ ہوش نہیں تھا۔ اچانک ایک فوجی نے میری بیٹی کو سر کے بالوں سے پکڑا اور اس کا منہ اونچا کیا...... پھر وہ اچانک بول اٹھا۔

"سر! یہ وہی لڑکی ہے، جو سری نگر یونی ورسٹی میں

پڑھتی ہے اور مسلے طلبہ کو ہمارے خلاف بہکاتی ہے۔''
''اچھا! تو آج اس کی زبان ہی بند کر ڈالتے ہیں۔''
''سر! یاد آیا۔'' ایک اور فوجی تیزی سے بولا۔
''کیا یاد آیا ہے...... جلدی بول۔'' افسر نے کہا۔
''سر! یہ وہی لڑکی ہے...... جس نے لال چوک میں بھارتی فوج کے خلاف تقریر کی تھی اور مسلے کشمیریوں کو بغاوت پر آمادہ کیا تھا۔''
''کیا نام ہے تمہارا؟'' افسر نے غصے سے پوچھا۔
''حفصہ!'' میری بیٹی نے کمال جرأت سے جواب دیا۔
''ارے مسلے! اب بتا...... تو تو کہہ رہا تھا کہ ہمارا کسی اگر وادی سے کوئی تعلق نہیں ہے، تو پھر یہ کیا ہے؟'' افسر نے میرے شوہر کو ایک ٹھڈا مارتے ہوئے کہا۔
''اگر اپنا حق حاصل کرنا اور اس کے لیے آواز اٹھانا جائز نہیں ہے، تو پھر ہم اگر وادی ہیں...... ہاں ہم اگر وادی ہیں۔'' میرے بیٹے نے اپنی تکلیف برداشت کرتے ہوئے کہا۔
''بول لو...... جتنا بولنا ہے...... ابھی تمہاری زبانیں خاموش ہو جائیں گی...... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے!!! اگر وادیوں کے بارے میں معلومات تو ہم اس لڑکی سے اگلوا ہی لیں گے۔'' افسر نے کہا۔
''کتنوں کو چپ کراؤ گے...... اب ہر کشمیری اپنا حق حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے...... ان شاء اللہ وہ وقت جلد آنے والا ہے...... جب تم یہاں سے دم دبا کر بھاگ جاؤ گے۔''
میرے شوہر کی اس بات نے ان کو آگ بگولا کر ڈالا۔ افسر چلا اٹھا۔
''بھون ڈالو...... ان باپ بیٹے کو!''
اس کے ساتھ ہی فوجیوں نے اپنی گنوں کے منہ کھول دیے...... میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے اور زور سے چلائی۔
''نہیں۔''



لیکن میرے نہیں کہنے سے کیا بننے والا تھا، جو ہونا تھا...... وہ ہو چکا تھا۔ ہم ماں بیٹی کی دنیا اندھیر ہو چکی تھی...... ہم سے ہمارے سہارے چھینے جا چکے تھے۔

ایک بار تو جی میں آیا کہ دھاڑیں مار مار کر اپنی بے بسی کا اظہار کروں، لیکن پھر خیال آیا کہ ہم سے پہلے بھی تو کتنی خواتین بیوہ ہو چکی ہیں...... کتنی خواتین اپنے بیٹے کھو چکی ہیں...... اپنے بھائی کھو چکی ہیں...... اپنے باپ کھو چکی ہیں۔ یہ دکھ...... یہ صدمہ صرف ہمارا ہی نہیں...... بلکہ سب کا سانجھا ہے...... آزادی کی خاطر تو کیا کچھ قربان کرنا پڑتا ہے...... اپنے خاندان تک قربان کرنا پڑتے ہیں...... ہم سے کوئی نئی قربانی تو نہیں لی گئی...... پھر میں اکیلی یا میری بیٹی رو کر کیا کرے گی۔ میرے شوہر اور بیٹے کو چھلنی کیا جا چکا تھا۔ ان کی خوں چکاں لاشیں کشمیر کی آزادی کے لیے اپنی جانیں قربان کرنے والوں شامل ہو چکی تھیں۔ کشمیر کے لیے جان قربان کرنے والوں میں دو اور شہیدوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔

ابھی میں یہ سوچ رہی تھی کہ جو قربانی ہم سے لی جانا تھی...... وہ لی جا چکی ہے...... مگر یہ میری خام خیالی تھی۔ افسر اپنے فوجیوں کو حکم دے رہا تھا۔

''اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے چلو! جب اس پر تھرڈ ڈگری کا استعمال کیا جائے گا، تو یہ سب کچھ اگل دے گی۔''

یہ سن کر میرے ہوش اڑ گئے...... میں ان ظالموں کی منت سماجت کرنے لگی۔ ان کو ان کے بیوی بچوں کے واسطے دینے لگی۔ ان ظالموں پر خاک اثر ہونا تھا۔ نہتے شہریوں پر ہی وہ ظلم کر سکتے تھے...... جب بھی ان کا مقابلہ برابر کے کسی سے ہوتا، تو یہی فوجی وہاں سے دم دبا کر بھاگ جاتے تھے۔ ایک فوجی میری چیخ و پکار سے تنگ آ کر بولا۔

''سر! کیوں ناں اس بڑھیا کو بھی اس کے شوہر اور بیٹے کے پاس پہنچا دیں۔''

''نہیں...... اب اتنا بھی ظلم نہ کرو کہ ان لاشوں کی آخری رسومات ادا کرنے والا بھی کوئی نہ ہو۔''

''تم مجھے بھی ختم کر دو...... اس زندگی سے تو موت اچھی ہے...... مرنے کے بعد تم لوگوں جیسے کسی ظالم سے تو سامنا نہیں ہو گا۔''

''بڑھیا! تیری یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہو گی...... ابھی تو تجھے اپنی بیٹی کی زندہ لاش بھی دیکھنی ہے...... وہ کتنا زبردست منظر ہو گا اور ہم نہیں چاہتے کہ تم اس منظر کو دیکھنے سے محروم رہ جاؤ۔'' ایک فوجی نے کہا، تو سب قہقہہ لگانے لگے۔

میری سب منتیں بے کار گئیں...... وہ میری بیٹی کو لے کر چلے گئے۔ میں چیختی چلاتی رہ گئی۔ میں روتے روتے کب بے ہوش ہوئی...... اس بات کا مجھے کوئی ہوش نہیں۔ مجھے ہوش تب آیا...... جب میرے منہ پر کسی نے پانی کے چھینٹے مارے۔ میں نے آنکھیں کھولیں، تو دیکھا کہ ایک مجاہد مجھ پر پانی پھینک رہا تھا۔

''مم...... ہم میری بیٹی کہاں ہے؟'' میں ایک دم اٹھ کر چلانے لگی۔

''امی! آپ کی بیٹی بالکل محفوظ ہے۔'' اس نے مجھے جواب دیا۔

''کہاں ہے وہ؟''

''وہ یہیں ہے...... ابھی اس سے آپ مل لیں گی۔''

اب جو میں نے غور سے دیکھا، تو میں کسی پہاڑی وادی میں موجود تھی۔ وہاں سب مجاہد موجود تھے۔ کچھ دیر بعد وہ مجھے میری بیٹی کے پاس لے گئے۔ میں اپنی بیٹی کی حالت دیکھ کر صدمے سے گنگ رہ گئی۔ اس کا جسم شدید زخمی تھا...... میں حیران تھی کہ وہ اتنی شدید زخمی ہونے کے باوجود ابھی تک زندہ کیسے تھی؟ میری بیٹی نے مجھے دیکھا، تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اٹک اٹک کر بولنے لگی۔

''ام...... ام امی! میں...... میں نے ہار...... نہیں مانی...... انھوں نے...... نے بڑی کوشش کی...... کی، لیکن مجھ سے...... سے ایک لفظ تک نہ اگلوا سکے...... سکے...... آپ...... آپ پریشان نہ ہوں...... میری عزت محفوظ ہے...... اللہ...... اللہ کا لاکھ لاکھ شکر...... شکر ہے کہ اس نے مجھے...... کشمیر کی آزادی کے لیے اپنی جان...... جان قربان کرنے کا موقع دیا...... موقع دیا......''

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ،
سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دستر خوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ایک دم اس کی گردن ایک طرف کو لڑھک گئی۔

''بیٹی...... بیٹی...... !میری حفصہ......!''

میں چلا کر اسے جھنجوڑنے لگی...... وہ زندہ ہوتی، تو مجھے جواب دیتی۔ وہ تو اپنے رب کے پاس پہنچ چکی تھی۔ میرا سب کچھ لٹ چکا تھا...... میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ میری چیخیں سن کر کئی مجاہد خیمے میں بھاگ کر آئے۔ حفصہ کو دیکھتے ہی انھیں پتا چل گیا کہ وہ اپنی منزل پا چکی ہے۔ ایک مجاہد نے میری بیٹی کے اوپر چادر پھیلا دی۔

''امی! آپ تو خوش قسمت ہیں کہ اللہ نے آپ کو یہ اعزاز بخشا ہے...... شہیدوں کے لیے روتے نہیں ...... کیوں کہ شہید مرتے نہیں بلکہ ہمیشہ کی زندگی حاصل کر لیتے ہیں۔'' ایک مجاہد نے مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''امی! یہ بھی تو دیکھیں کہ اللہ نے آپ سے اگر آپ کا شوہر، بیٹا اور بیٹی چھینی ہے...... تو اتنے سارے بیٹے بھی تو دے دیے ہیں۔'' ایک اور مجاہد نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس کا اشارہ دیکھ کر سب مجاہد کہنے لگے۔

''ہم بھی تو آپ کے ہی بیٹے ہیں۔''

بس اسی وقت مجھے لگا کہ میں نے کھویا کم ہے، لیکن پایا بہت ہے۔ ان ہی مجاہدوں کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ جب بھارتی فوجی میرے گھرانے پر ظلم کر رہے تھے، تو اس وقت اس علاقے میں ایک مجاہد موجود تھا...... اس نے فون کے ذریعے اپنے باقی ساتھیوں کو اس ظلم کے بارے میں اطلاع دی ...... جب تک وہ وہاں پہنچتے ظلم اور وحشت کا یہ کھیل کھیلا جا چکا تھا۔ انھیں پتا چلا کہ بھارتی فوج میری بیٹی کو اٹھا کر لے گئی ہے، تو انھوں نے فوراً اس فوجی کیمپ پر حملہ کر دیا...... جہاں بھارتی فوجی میری بیٹی کو لے گئے تھے۔ ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس پر ظلم کے پہاڑ توڑے جا چکے تھے، لیکن آفرین ہے میری بیٹی پر! کہ اس نے ایک لفظ تک بھی منہ سے نہیں نکالا تھا۔ مجاہدین نے اس کیمپ پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی......

ایک بھی فوجی کو وہاں سے زندہ بچ نکلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے مجاہدین سے بار بار اصرار کیا کہ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ رکھیں، لیکن وہ نہ مانے اور آخر ایک رات انھوں نے بڑی کامیابی سے مجھے آزاد کشمیر میں مظفر آباد کے علاقے میں پہنچا دیا ...... تب سے اب تک میں وہیں ہوں...... اب جب بھی کسی مجاہد کے شہید ہونے کی خبر ملتی ہے، تو میں حقیقت میں یہی سمجھتی ہوں کہ میں ہی اس مجاہد کی ماں ہوں۔

اب آپ مجھے بتائیں، لیکن آپ مجھے کیسے بتا سکتے ہیں...... کھو کر پانا کیسا ہوتا ہے؟ جانے میری طرح کی کتنی خواتین ہوں گی...... جنھوں نے سب کچھ کھو کر وہ خزانہ حاصل کیا ہے، جو انمول ہے اور قسمت والے کو ہی ملتا ہے۔

☆☆......☆☆......☆☆

غزل

دل آنگن میں خوشیوں کا ہے کال پڑا
غم کا کب سے آنکھوں میں ہے مال پڑا
ماضی کا خورشید تو گہن کی نذر ہوا
تاریکی میں ڈوبا دیکھو حال پڑا
کون سی غلطی باعث ہے بربادی کی
کس آفت کے منہ میں میرا سال پڑا
وہ پردیس میں جا کر خوش ہے پر میرے
ارمانوں میں فرقت سے جنجال پڑا
شہر کی رونق روٹھ گئی ہے کس کارن
شہر میں کس کے جانے سے بھونچال پڑا
دانے کے لالچ میں آ کر مت اترو
چڑیو! تم کو نظر نہ آیا جال پڑا
آنکھوں کے چشمے بھی قمر اب خشک ہوئے
مٹی میں ہے کس مادر کا لال پڑا

شاعر: چوہدری قمر جہاں علی پوری۔ ملتان

پارٹی بازی



سنبل

پارٹی بازی کا شکار ہونے والے ایک نوجوان کا دلخراش قصہ

یہ اس وقت کی بات ہے جب ایک پارٹی دو گروپس میں تقسیم ہوگئی اور دونوں گروپس ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو گئے۔ اس علاقے میں اس پارٹی کے سارے لڑکے آپس میں دوست تھے مگر جب پارٹی دو حصوں میں منقسم ہوگئی تب بھی دوستی تو برقرار مگر وہ سب ایک دوسرے کو مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے کہ نہ جانے ان میں کون مخالف گروپ کا ہے۔

سمیع میرے بڑے بھائی کا دوست تھا۔ اس سے میری ملاقات ایک شادی میں ہوئی تھی اور یاد رہ جانے کی وجہ یہ تھی کہ مجھ سے چھوٹی بہن ہنی کو دورانِ سفر الٹیاں ہوتی تھیں۔ مہندی کی تقریب میں اور شادی کی تقریب میں ہمیں دولہا والوں کی طرف سے ہائر کی گئی بس سے ناظم آباد سے لانڈھی تک جانا تھا۔ شادی میں شرکت کی جلدی کی وجہ سے ہم کوئی کھٹی چیز لے کر بیٹھنا بھول گئے اور دورانِ سفر ہنی کی حالت بگڑنے لگی۔

سمیع نے مجھ سے پوچھا۔ ''یہ اسے کیا ہورہا ہے؟''

میں نے بتایا۔ ''اسے دورانِ سفر گھٹن، ڈیزل اور پٹرول کی بو سے متلی ہوتی ہے۔'' تب اس نے کھڑکی کے پاس جس سیٹ پر وہ بیٹھا تھا وہ ہنی کے لیے خالی کردی اور اسے اپنے ساتھ باتوں میں لگالیا۔ یوں ہنی کی طبیعت بہتر ہوگئی۔ یوں وہ میری اچھی Memories میں Save ہوگیا۔

اس علاقے کی رہائشی ہونے کی وجہ سے ہماری وفاداریاں پارٹی کے پہلے گروپ کے ساتھ تھیں اور سمیع کے بارے میں عام خیال تھا کہ یہ وہ دوسرے گروپ میں شامل ہے۔ بہرحال ان تمام حالات کے باوجود سمیع بھائی کا اچھا دوست تھا۔ ایک دن سب لڑکوں نے مل کر پروگرام بنایا کہ رات میں میچ کھیلیں گے۔ میچ رات گئے مین روڈ پر ہی کھیلا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں سرشام سے ہی کام شروع ہوگیا۔ اسٹریٹ لائٹس کے باوجود ہینگر لگائے گئے اور اس جگہ کو بقعۂ نور بنا دیا گیا۔ ہلکے پھلکے اسنیکس اور ڈرنکس جمع کی گئیں، غرض ہر وہ چیز جس کی ضرورت پڑسکتی تھی وہاں مہیا کی گئی۔

رات کھانے کے بعد بھائی امی ابو کو بتا کر چلے گئے کیونکہ مین روڈ ہماری لین پار کرکے ہی تھا تو رات میں جب تک ہم سو نہیں گئے خوب شور اور ہلے گلے کی



آوازیں آتی رہیں۔ صبح ہم لوگ نماز کے لیے اٹھے تو شور کم تھا۔

ابو کہنے لگے۔ ''لگتا ہے بیٹری لو ہو گئی۔'' میں اور میری بہنیں ہنسنے لگے۔ تب ہی بھائی واپس آ گئے۔ ہم سب نے نماز پڑھی اور دوبارہ لیٹ گئے۔ ہم لوگ تو دوبارہ جلدی اٹھ گئے۔ بھائی رات بھر کے جاگے ہوئے تھے اس لیے انہیں سونے دیا۔

دن میں دو بجے کے قریب سمیع کا خالہ زاد کزن مصطفیٰ جو کہ خود بھی نائٹ میچ میں شامل تھا گھبرایا ہوا آیا اور بھائی کو اٹھانے کو کہا اور بھائی کو مصطفیٰ کی زبانی پتا چلا کہ سمیع Missing ہے۔ بھائی نے لاپروائی سے کہا۔

''اِدھر اُدھر کہیں نکل گیا ہوگا، کوئی بچہ تھوڑی ہے جو کھو جائے گا۔'' اس پر مصطفیٰ نے تشویش سے کہا۔

''تو سمجھ نہیں رہا شہری! وہ تب سے غائب ہے جب سے وہ اس بندے کے ساتھ گیا تھا۔ ہم سب کو شک ہے کہ اسے کڈنیپ کر لیا گیا ہے۔ ویسے بھی اس کا پتا نہیں تھا کہ وہ کس گروپ کے ساتھ، کن لوگوں کے ساتھ اٹھ بیٹھ رہا تھا۔'' تب بھائی کو پہلی بار تشویش ہوئی۔

''یعنی وہ تب سے ہی غائب ہے۔'' بھائی نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

اور تب بھائی سے پتا چلا کہ میچ کے اختتام سے قبل جب ملگجا سا اندھیرا تھا ایک بائیک اِن سے کچھ فاصلے پر آ کر رکی تھی۔ اس بائیک پر جو شخص تھا اس نے ہیلمٹ پہنا ہوا تھا۔ اس نے سمیع کو اشارہ کیا سمیع نے اس بندے سے بات کی مگر اس بندے نے اس دوران بھی ہیلمٹ نہیں اتارا۔ پھر سمیع اس شخص کے

ساتھ پیچھے بائیک پر بیٹھا اور ان لوگوں سے ہاتھ ہلاتا ہوا رخصت ہو گیا۔ ہیلمٹ اور ملگجے اندھیرے کی وجہ سے ان لوگوں سے دور ہونے کی وجہ سے ان میں سے کسی نے سمیع کو لے جانے والے شخص کا چہرہ نہیں دیکھا اور سمیع کے اس شخص سے فرینکلی بات کرنے اور اس کے ساتھ جانے کی وجہ سے کسی نے بائیک کا نمبر بھی نوٹ نہیں کیا۔

بھائی نے امی سے کہا۔ ''امی میں جارہا ہوں سمیع کو ڈھونڈنے۔ دعا کیجیے گا کہ وہ مل جائے۔''

امی نے کہا۔ ''میں دعا کروں گی مگر کھانا تیار ہے کھا کر چلے جاؤ۔''

بھائی نے کہا۔ ''امی! دل ہی نہیں چاہ رہا، بس دعا کریں سمیع مل جائے اسے کچھ نہ ہوا ہو۔''

میں نے کہا۔ ''بھائی! انشاءاللہ وہ مل جائے گا مگر کھانا کھالیں سہارا رہے گا۔''

بھائی نے کہا۔ ''انشاءاللہ مگر ابھی دل نہیں مان رہا کھا بھی لیا تو الٹی ہو جائے گی۔''

پھر میں نے اور امی نے اصرار نہیں کیا اور بھائی چلے گئے۔ وہ پورا دن یہ سارے دوست بھوکے پیاسے سمیع کو ڈھونڈتے رہے مگر سمیع کو نہ ملنا تھا نہ ہی وہ ملا۔

اور پھر تین دن گزر گئے۔ اس دوران سمیع کی بہن جو کہ بیوہ تھیں، وہ ہمارے گھر اکثر آتیں اور اتنی بری طرح سے روتی، بلکتیں کہ بجائے ان کو چپ کرانے کے ہم ماں بیٹیاں بھی ان کے ساتھ روتی تھیں۔ وہ نہ صرف کڈنیپرز کو بلکہ ان تمام لڑکوں کو بھی منہ بھر بھر کر گالیاں دیتی تھیں جو اس رات اس میچ میں موجود تھے۔ ان کو گلہ تھا کہ کوئی تو سمیع کے پیچھے جاتا۔ اس شخص کا چہرہ دیکھتا، کوئی تو بائیک کا نمبر نوٹ کرتا مگر جس قسم کے واقعات ان سب کی زبانی پتا چلے تھے اس میں یہ سب بنتا بھی نہیں تھا۔

☆......☆

اور ایک دن صبح سمیع کا پتا چل گیا۔ ہوا کچھ یوں کہ ایک دوسرے علاقے میں ایک سبزی فروش اپنا ٹھیلا لے کر نکلا تو اس کا ایک پہیہ ایک گٹر کے ڈھکن پر سے چلا تو ڈھکن کھڑا ہو گیا۔ اس نے جھانک کر دیکھا تو اسے کسی کی ٹانگیں نظر آئیں۔ اس نے فوراً پولیس کو اطلاع دی تو وہاں سے لاش نکالی گئی۔

اور یہ لاش سمیع کی تھی......

سمیع کو دیکھنے والی ہر آنکھ اشکبار تھی۔ سمیع کو بے انتہا تشدد کر کے مارا گیا تھا۔ اس کے جسم پر سگریٹ سے داغے جانے، کاٹنے، مارنے، ناخن اتارنے اور ریتیلی زمین پر گھسیٹنے اور کھینچے جانے کے نشانات تھے۔ اس کا جسم تشدد کی وجہ سے نیلا پڑ چکا تھا۔ سمیع کے سارے دوست ایک دوسرے کے گلے مل مل کر دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ پورے علاقے میں ایک کہرام بپا تھا۔

میرے اور بہنی......ہم دونوں کے آنسو کسی طرح سے رک ہی نہیں رہے تھے۔ میں نے اسے دیکھا تھا، اس سے ملے تھے۔ اس سے بات چیت کی تھی۔ وہ ہماری Good memories میں تھا۔ اس نے ہماری مدد کی تھی۔

بھائی اکثر گھر میں اس کی بات کرتے تھے۔ زیادہ بات وہ اس پر ہونے والے تشدد کی ہی کرتے تھے اور ایسے میں، میں اور بہنی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے تھے۔ تب بھائی نے یہ بات کرنی بند کر دی۔

مگر آج ایک لمبا عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ سوالات تشنہ ہیں کہ وہ شخص کون تھا، سمیع اسے کیسے جانتا تھا اور اگر جان پہچان تھی تو اس نے سمیع کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ یا آیا سمیع اس سے ملنے کے بعد کسی اور سے ملا تھا......؟

سمیع کے ساتھ اس رات کیا ہوا؟ کس نے اس کے ساتھ یہ سب کیا اور کیوں کیا۔

یہ سارے تشنہ سوالات سمیع کے ساتھ چلے گئے کبھی نہ حل ہونے کے لیے۔ یہ سوالات آج بھی ہمارے لیے ایک معمہ ہیں۔

☆☆☆

ہوش و خرد سے بیگانہ زمانے کے اُن دیوانوں کی داستانیں؟
جو آج آہنی سلاخوں کے پیچھے خود اپنی ذات کو کھوج رہے ہیں

دل کا چین ڈھونڈ......

سیدہ تبسم زہرہ رضوی

اس نوجوان کی داستان، جس کی ماں نے اُسے پاگل خانے کا راہی بنا دیا، ظلم کی ایک زندہ تصویر



میں ترے سنگ کیسے چلوں ساجنا
تو سمندر ہے میں پاگلوں کی ہوا

یہ الفاظ تھے اس پاگل کے جو سڑک پر جا رہا تھا۔ میں اپنے فلیٹ کی بالکونی میں سوکھے کپڑے اتار رہی تھی اور اس پاگل کو دیکھ رہی تھی۔

''یہ نہیں سنو گی دوسرا سناؤں؟'' یہ کہہ کر میاں تان سین نے نیا نغمہ چھیڑ دیا۔ اس نے کئی نغمے سنائے لیکن پاگل لفظ جوں کا توں بطور قافیہ موجود رہا۔ اچانک کچھ لوگ بھاگتے ہوئے آئے۔ ''پکڑو، پکڑو'' اور پاگل تیزی سے بھاگا لوگوں نے بھاگ کر اسے پکڑ لیا۔ بعد میں سنا کہ پاگل خانے پہنچا دیا۔

میں نے پتہ لگایا تو جو کہانی سامنے آئی اس قدر دل دکھانے والی تھی کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپ بھی دل تھام کر سنیئے۔ دنیا کا سب سے مضبوط رشتہ اس کی حالت کا ذمہ دار تھا۔ یہ رشتہ تو اپنی جان دے کر بھی اپنی اولاد کو بچا لیتا ہے۔ کیا ہو گیا ان ماؤں کو جو اپنے جگر گوشوں کو جیتے جی دیوانگی کی بھینٹ چڑھا کر پاگل خانے آباد کر رہی ہیں افسوس! ادھر پاگل خانے میں درد بھری آواز گونج رہی تھی۔

جب کوئی پیار سے بلائے گا
تم کو ایک شخص یاد آئے گا

جب وہ یہاں تک آتا

زندگی کے درد کو سہو گے تم
دل کا چین ڈھونڈتے رہو گے تم!

تو سخت گیر نگراں بھی موم ہو کر آواز کے سحر میں کھو جاتے۔ کس قدر درد بھری آواز تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ نغمہ کوئی بہت شوق سے سنتا تھا۔ یہ وہ دشمن جاں تھی جو اس کا سب کچھ بن گئی تھی۔

''آخر ہم سب ایک ہوں گے۔'' ایک دن شکوہ اس کے ہونٹوں پر آ ہی گیا اور اس کے لمبے چوڑے وجود پر سناٹا چھا گیا۔ اس کی جان جاں آفرین کے سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ تین بہنیں اور دو بھائی تھے۔

''پہلے بیٹیوں کی کروں گی اور جب بیٹیوں کے رشتے آئے تو اتنی کڑی شرائط رکھ دیتیں کہ لڑکے والے پلٹ کر خبر ہی نہیں لیتے۔ دو چار جگہ بات آگے چلتی یہ اور بھائی ماں کو سمجھاتے۔

''امی سب خوبیاں سب انسانوں میں نہیں ہو

سکتیں۔'' اور امی کا لیکچر شروع ہو جاتا۔

''گورنمنٹ جاب نہیں ہے؟ تو پرائیویٹ تو کتنی اچھی ہے۔ اس کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔''

پتا تو انسان کا بھی نہیں ہوتا، دیکھیں بابا کیسے ہنستے مسکراتے آفس گئے تھے، پہلے ہارٹ اٹیک میں ہی ختم ہو گئے، میت گھر آ گئی تھی۔'' بھائی جان نے ماں کو جتایا۔

''وہ اور بات ہے۔ اپنی طرف سے تو مضبوطی رکھنی چاہیے۔ رنگ بھی کم تھا۔''

''تو کیا ہوا شریف تھا اچھے گھر کا اچھی جاب والا اس سے اچھا داماد آپ کو کہاں ملے گا۔''

''سید بھی نہیں تھا اور ناک پھولی بہت تھی۔''

''اس سے پہلے جو آیا تھا اس کی پچکی بہت تھی۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''اچھا آپ میری کر دیں۔'' بھائی جان کے لہجے میں کڑواہٹ گھل گئی۔

''ہاں بس سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔'' ماحول تلخ ہو چکا تھا۔ سب اٹھ کر اپنی اپنی جگہ چلے گئے۔

''کتنا خوب صورت گھر تھا اپنا؟'' ایک سرد آہ اس کے سینے سے خارج ہو گئی۔ نیچے بڑے بڑے چار کمرے کشادہ لاؤنج، چھوٹا سا لان بھی تھا اوپر کی منزل بھی نیچے کی طرح بنی ہوئی تھی۔ سب بہن بھائی لاؤنج میں جمع ہوتے تو قہقہے سب طرف گونجتے۔ نورین ثمرین باجی بڑی تھیں پھر بھائی جان علیم الزماں اور پھر خود یہ فہیم الزماں اور چھوٹی نتاشا سب کی لاڈلی اب تو وہ بھی بائیس سال کی ہو چکی تھی۔ امی اس کی دو پونی بنواتی تھی۔ ایک دن وہ اوپر سے اتر رہا تھا۔ نتاشا کی دوستیں آئی ہوئی تھیں۔ کھلکھلاتی مسکراتی شی اور نور العین اسے نتاشا کی ہی طرح پیاری تھیں اور وہ جو کچھ کہہ گئی تھیں



الفاظ نہیں تھے سچ کا منہ بولتا خنجر تھے جو اس کے جسم نہیں روح میں اتر گئے تھے۔ نتاشا انہیں دروازے تک چھوڑنے آئی تھی۔

''حقیقت کی دنیا میں تو ہم بائیس سال کی ہیں اب چاہے ہمیں کوئی کتنا بھی ننھا بنائے؟'' انہوں نے نتاشا کی پونیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''اس طرح عمر کم معلوم ہوتی ہے۔'' نور نے نتاشا کی حمایت کی۔

''تو اگر تین پونی بنالیں گے تو عمر اور کم اور اگر چار تو عمر آدھی۔'' نمی شوخی پر اتری ہوئی تھی۔ نتاشا اس سے کافی چھوٹی تھی۔ تقریباً چھ سات سال نورین آپی چالیس سال کی طرف جا رہی تھیں اور امی کا اطمینان قابل دید تھا۔ آپی آہستہ آہستہ نفسیاتی کیس ہوتی جا رہی تھیں۔ ایک دن جب وہ اپنی جاب سے آیا تو پتا چلا کہ آپی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ امی انہیں لے کر اسپتال گئی تھیں۔ اس نے ان سے پوچھا تھا کہ اچھی بھلی صحت ہے انہیں کیا ہو گیا تو امی نے گول مول جواب دیا۔ بعد میں چھوٹی سے پتا چلا کہ انہیں ہسٹریا کا دورہ پڑا تھا اور اس دن اس نے صاف صاف بات کرنے کی ٹھان لی۔ پہلے بھائی جان سے بات کی۔

''آخر کب تک یہ چلے گا۔''

''کیا پتا؟''

''ہم کب تک مصیبت کے چنگل میں گزر بسر کریں گے۔ ہمارے ساتھ کے لڑکے تین تین بچوں کے باپ بن چکے ہیں اور ماں ہماری کھلم کھلا کہتی ہیں کہ جب تک لڑکیوں کی شادی نہیں ہو جاتی میں لڑکوں کی شادی نہیں کروں گی۔''

''نہ لڑکوں کی ہو گی نہ لڑکیوں کی؟'' بھائی جان نے جل کر کہا۔ وہ امی سے نالاں تھے۔ ان کی بات خالہ جان کے ہاں طے تھی، دیر ہونے کی وجہ سے خالہ نے نوشی کی شادی کر دی تھی۔ جب سے ان کا پارہ ہائی رہنے لگا تھا۔ یہ ماں ہیں دوسری خالہ کے بچے بھی بوڑھے ہو رہے تھے لوگ ان کے خاندان کا مذاق اڑاتے تھے۔ ادھر فرحین اس کے ساتھ آفس میں ہوئی تھی۔ خوب صورت اچھے خاندان کا فرد اعلیٰ نسب منیجر بھی اس کے چچا تھے۔ فہیم کی ہر سانس پر اس کا نام لکھا تھا۔ وہ آفس میں آتی تو ہر طرف روشنی پھیل جاتی۔ نظارے گنگنا اٹھتے۔ آتی تو بہاریں ساتھ آتیں جب واپس جاتی تو بہاریں بھی اپنا بوریا بستر سمیٹ کر چلتی بنتیں۔

''تم چپ چاپ شادی کر لو جیسے تم جیسے بہت سے لڑکوں نے کی ہیں جن کی مائیں انہیں بوڑھا کر رہی ہیں۔'' بات دل کو لگی۔ اس نے فرحین سے بات کی۔

''میرے گھر والے نہیں مانیں گے۔''

''فری جانی اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نظر نہیں آتا۔''

''چلیں میں کہہ کر دیکھ لیتی ہوں۔''

''کیا؟'' اس کی ماں چیخ پڑیں۔ ''تمہیں میں اس لیے آفس بھیجتی تھی۔'' یہ خاندانی لوگ تھے اپنا خاندانی وقار انہیں ساری دنیا سے عزیز تھا۔

کل سے تم آفس نہیں جاؤ گی۔ غضب خدا کا چھپ کر شادی۔''

''مما۔'' وہ منمنائی۔

''کیا مما...... آنے دو تمہارے بابا کو بتاؤں گی بٹیا رانی کے کارنامے۔''

☆......☆

فہیم کے لیے وہ صبح قیامت سے کم نہیں تھی۔ جب فرحین آفس نہیں آئی۔ اس کا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔

آہٹ پہ کان، در پہ نظر، دل میں انتظار
دیوانہ کر دیا مجھے تیرے پیار نے

سارا دن گزر گیا۔ اس کی بے چینی قابل دید تھی۔ شام ہوئی وہ بوجھل قدموں سے گھر لوٹ آیا۔ امی اور بہنیں کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ اس کا کسی سے بات کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔

''چھوٹے بھائی چائے لا رہی ہوں پی کر جلدی سے تیار ہو جائیں۔''

''میں کہیں نہیں جا رہا۔'' اس نے بیزار لہجے میں

جواب دیا۔

''ہائیں کہاں جارہے ہو تم......؟''

''ارے چھوٹی آنٹی کے یہاں ان کی موموکی مہندی ہے، بھول گئے؟''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیا ہوا۔''

چھوٹی اسے بہت چاہتی تھی۔ امی بھی آگئیں۔

''کیا بات ہے۔'' انہوں نے پوچھا۔

امی کی ساڑی بہت خوب صورت تھی۔ اس عمر میں بھی وہ بہت اچھی لگتی تھیں۔ جیولری بھی ان کی فیشن اور عمر کے حساب سے تھی۔ امی پچپن اور ساٹھ کے درمیان میں تھیں لیکن دیکھنے میں 45 کی نظر آتی تھیں۔ اپنی صحت کا بہت خیال رکھتی تھیں اپنی دوا اپنی غذا!! وہ باقاعدگی سے جم جاتی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی ان کی اسمارٹنس کی۔ کاش وہ اتنا خیال اپنی اولاد کا بھی رکھ لیتیں۔ یہ نہیں تھا کہ وہ ان کا خیال نہیں رکھتی تھیں، ان کے گھر وقت پر کھانا تیار ہوتا تھا اور مزیدار چائے بھی ٹائم پر ملتی تھی۔ بیشتر امی خود بناتیں یا بہنیں لیکن امی خاصی سوشل اور گھر داری والی خاتون تھیں۔

''تم کیوں نہیں جارہے؟''

اور وہ خیالوں کی دنیا سے باہر آگیا۔

''بس امی میرا دل نہیں چاہ رہا۔ میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔''

''چلیں امی۔'' چھوٹی تیار ہوکر بہت پیاری لگ رہی تھی۔ بڑی دونوں بہنیں بھی آگئی تھیں۔

''ارے بیٹی کچھ اس سے بھی بدتر نہیں تھے کپڑے۔'' بڑی کا موڈ بری طرح آف تھا جب خاندان میں کوئی شادی ہوتی، وہ اسی طرح پیش آتیں۔

''پھر کیا سرخ ساڑی باندھ لوں۔'' انہوں نے چڑچڑے پن سے کہا۔

''میری طرف سے کفن پہن لو۔'' امی کون سی کم تھیں۔ کاش وہ یہ برے کلمے منہ سے نہ نکالتیں۔

سب چلے گئے اور وہ اکیلا رہ گیا اور ایسے میں فرحین کا درد بری طرح تڑپانے لگا۔

دوسری صبح یہ روح فرسا خبر ملی کہ مس فرحین جاب چھوڑ گئیں۔ اپنے موبائل پر فون کرنے سے فرحین نے سختی سے منع کیا ہوا تھا۔ پھر بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے فون کرلیا۔

جواب میں گلوگیر آواز میں اس دشمنِ جاں نے بس اتنا کہ ''سوری فہیم ہمارا تمہارا بس اتنا ہی ساتھ تھا۔ اب مجھے کبھی فون مت کرنا۔'' پھر کسی کے زور سے بولنے کی آواز آئی اور فون خاموش ہوگیا ہمیشہ کے لیے۔ اس کے بعد جب وہ فون کرتا تو جواب ملتا کہ یہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں۔

☆......☆

غم اس کے اندر سرائیت کرچکا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ ابھی تو غم نے ٹریلر دکھایا ہے۔ فلم شروع ہوگئی تو اسے اپنا ہوش ہی نہیں رہے گا اور واقعی دوسری صبح غم اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ کیا طلوع ہوئی، سب کچھ بدل گیا۔ زمین و آسمان اپنے پرائے انسان کے گھر میں پلے، مٹھو تک نے آنکھیں بدل لیں اس کی چیز لانی جو بند ہوگئی تھی۔

صبح معمول کے مطابق اپنی سیٹ پر آفس کا کام کررہا تھا۔ چپراسی نے ایک لفافہ لاکر رکھ دیا۔ اس نے کام روک کر دیکھا تو سر چکرا کر رہ گیا۔ یہ ڈس مس لیٹر تھا۔ اسے بدعنوانی کا الزام لگا کر محکمے سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ جی ایم جو فرحین کے چچا بھی تھے ان کے کمرے میں گیا تو وہ سوا نیزے پر نظر آئے۔

''آپ اسی وقت سیٹ چھوڑ دیں۔'' انہوں نے ناراضی سے کہا۔

''سر ابھی چند دن پہلے تو آپ نے مجھے بہترین کارکردگی پر انعام دیا تھا۔''

''میں آپ کو جاب سے فارغ کررہا ہوں۔ اکاؤنٹنٹ سے اپنا حساب لے لیں۔'' انہوں نے گیٹ آؤٹ کے انداز میں دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

اپنی عزت سمیٹ کر وہ باہر نکل آیا۔

رزق دینے والا خدا ہے۔ اس کے دل سے آواز آئی۔ اس کا دل عجیب طرح سے دھڑک رہا تھا۔

حساب لے کر باہر نکلتے ہوئے اس کی توجہ اسی نکتے پر مرکوز تھی کہ سرو آخر ہوا کیا؟

''ہوں!'' فری کی مما ان کی بھابی تھیں۔ انہوں نے اس کے اور فری کے عشق کے متعلق بتایا ہوگا۔ ایک سرد آہ اس کے سینے سے خارج ہوئی۔

گھر آیا تو آپی کے رشتے کے لیے لوگ دوسرے شہر سے آنے والے تھے۔ گھر میں اہتمام ہو رہا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ آفس کے چپے چپے سے فری کی یادیں جڑی تھیں۔ آج وہ جگہیں بھی چھوٹ گئیں تھیں۔

''جانو میں تمہارے بغیر رہ نہیں سکتا۔ کیوں چلی گئیں مجھے چھوڑ کے۔'' اس کے دل سے عجیب طرح کی آوازیں نکل رہی تھی۔

''فری فری میری فرحین ...... نہیں اس طرح نہیں تم مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔'' خدا جانے کب وہ روتے روتے سو گیا۔

☆......☆

چند ہی دن میں بڑی آپی کا رشتہ طے ہو گیا۔ لڑکا جوان وخوب صورت تھا۔

''شادی جلدی رکھ لیں۔'' بھائی جان نے ماں کو مشورہ دیا۔

''ہوں، اگلے مہینے ٹھیک ہے۔'' گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

تیاریاں عروج پر تھیں۔ جہیز آ رہا ہے، کپڑے جوتوں کی بہار آئی ہوئی تھی۔ پاپا کا چھوڑا ہوا اثاثہ اچھا بھلا تھا۔ امی نے خرچ بھی سنبھال رکھا تھا۔ اس لیے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ بھی سب کے ساتھ شریک تھا لیکن دل مرجھایا ہوا تھا۔ مہندی مایوں میں خاندان کی لڑکیوں نے لائن دینے کی کوشش کی۔ پھر تو وینیسی کا بورڈ دیکھ کر پیچھے ہٹ گئیں۔

مہندی والے دن ایک بات ایسی ہوئی کہ اسے ماں سے نفرت کا احساس ہونے لگا۔ ہوا یوں کہ شہناز آنٹی جو امی کی کولیگ تھیں اور سب سے کلوز فرینڈ بھی تھیں آئی ہوئی تھیں۔ وہ کسی کام سے امی کے کمرے میں جا رہا تھا۔ تو تو کہہ رہی تھی۔

''کہا تھا نہ میں کسی لڑکی کی شادی کروں گی نہ لڑکے کی؟ لڑکے کمانے کے لیے، لڑکیاں پکانے کے لیے خدمت کے لیے۔ اور ہم دونوں مل کر کلب کھولیں گے۔ اب تو شادی رچانے بیٹھ گئی اب یہ نہ کہنا کہ اب اپنی بھی کروں گی۔''

''ارے بھائی بچوں کی طرف سے پریشر بہت تھا۔'' امی کی کھسیانی ہنسی میں اس کے آنسو گھل گئے۔

''بہت سی مائیں یہ کر رہی ہیں۔ اوپر سے اچھی بنی ہوئی ہیں اندر سے مسئلہ یہ ہے بیٹیوں کی کر دیں گی تو خدمت کون کرے گا۔ بیٹوں کی بیویاں آ جائیں گی تو گھر کا سکون تباہ ہوتا ہے۔ لڑکے بیویوں کی زبان بولتے ہیں۔ بڑھیا یا بڈھے کی زندگی برباد ہوتی ہے۔'' شہناز آنٹی کے الفاظ تھے یا بم۔ بات غلط نہیں تھی لیکن اس کے ساتھ یہ ہے کہ بڑے بھی اپنا رول بھی ادا نہیں کرتے اگر انہوں نے اپنے بڑوں کی خدمت نہیں کی تو پھر اپنی اولاد سے اس کی توقع کیوں کرتے ہیں، بھلا یہ کیا ہوا انصاف کہ اپنے بچوں کی زندگیاں اپنے ہاتھوں سے برباد کرو، انہیں آباد کرنا والدین کی ذمہ داری ہے۔

اس کی دونوں بڑی بہنیں گورنمنٹ ٹیچر تھیں۔ اچھی بھلی رقم ماں کے ہاتھ پر رکھتی تھیں۔ بھائی جان بھی اچھی پوسٹ پر تھے۔ لاکھوں کماتے تھے اور خود فہیم کی 75 ہزار تنخواہ تھی۔ اچھا خاصا حساب ملا تھا۔ گھر میں پیسوں کی کمی نہیں تھی۔ لیکن یہ کیا ہوا ایک ماں نے اپنا خرمنی اپنے تو بیلے بچوں سے نوچ ڈالا۔ بہرحال بہت شان وشوکت سے بارات آئی۔ دولہا حسن کا مرقع تھا۔ آپی کی خوشی دیدنی تھی۔ دلہن بن کر قیامت ڈھا رہی تھیں۔ چلو انجن سرکا۔ ان کے کزن سلمان نے ہنس کر کہا۔ اس دن سب بہت خوش تھے اس بات سے بے خبر کہ یہ خوشی کا آخری دن ہے۔ اس نے اور بھائی نے دونوں بازو پکڑ کر رخصت کیا۔ لاکھ ضبط کے باوجود دونوں بھائیوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

رات جب سونے لیٹا تو ایک اطمینان کی سانس سینے سے خارج ہوئی۔ اگلے دن ولیمہ تھا۔ یہ اندرون سندھ کا پر رونق شہر تھا۔ جب تقریب تمام ہوئی تو

دونوں بھائیوں کو مووی بنوانے اندر بلایا گیا۔ سب بہت اچھا لگ رہا تھا لیکن کچھ تھا جو کھٹک رہا تھا۔ وہ لوگ آپی کو لے کر گھر آ گئے۔ رات کو اسے خیال آیا آپی کے چہرے پر خوشی نہیں تھی۔ بظاہر وہ ہنس بول رہی تھیں لیکن جب خاموشی ہوئی ان کے چہرے پر مردنی چھا جاتی پھر کچھ یوں ہوا کہ وہ لوگ انہیں لے کر واپس چلے گئے۔

دو دن کے بعد وہ روح فرسا فون آیا جس نے ان کے گھر کی بنیادیں ہلا دیں۔ آپی کی ساس کا فون تھا۔ ''فوراً آ جائیں۔'' حواس باختہ آواز میں صرف یہ کہا تھا۔

ان کے چھکے چھوٹ گئے تھے۔ بھائی کو فون کر کے یہ ماں بہنوں کو لے کر بائی روڈ گاڑی میں نکل گیا۔

گھر پہنچ کر دیکھا، ان کے گھر کے باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ رش کو چیر کر کسی طرح گھر کے اندر داخل ہوئے۔ ساس بہو کے کمرے کے باہر زمین میں بیٹھی رو رہی تھیں۔

ان سب نے ڈولتے قدموں سے آپی کے کمرے میں قدم رکھا اور غش کھا کر گر پڑے۔ حواس بیدار ہوئے تو پولیس آ گئی تھی۔ آپی کی لاش پنکھے سے لٹک رہی تھی اور پولیس والے سب کو ہٹاتے ہوئے لاش اتار رہے تھے۔

دو دن کے بعد میت ملی۔ پوسٹ مارٹم کے بعد ڈاکٹروں نے رپورٹ میں لکھا تھا کہ موت دم گھٹنے سے ہوئی ہے۔

میت کو غسل دینا قیامت سے کم نہ تھا۔ کوئی غسالہ اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔

مولوی صاحب نے کہا کہ لاش خراب ہو چکی ہے۔ بس تدفین کی جائے۔ سنا تو تھا کہ قیامت آئے گی تو یہ ہوگا وہ ہوگا لیکن دیکھ اب لیا!! یہ لوگ مر کر زندہ ہوئے، زندہ ہو کر مرے پھر جی گئے۔ وقت نے مرنے نہ دیا۔

موت کے تیسرے دن ڈاک سے کاغذ کا پرزہ ملا جس میں لکھا تھا۔ ''امی میں اپنی جان دے رہی ہوں۔ اب مجھ میں جینے کا حوصلہ نہیں ہے۔ نہ لوگوں کے طعنے نہ آپ کی ڈانٹ، نوید کا تعلق تیسری جنس سے ہے۔ اس کی ماں پیشہ ور عورت ہے۔ یہ مجھ سے بھی یہی کروانا چاہتی ہے۔ میں یہ نہیں کر سکتی، میں اپنے آپ کو ختم کر رہی ہوں۔ خدا حافظ۔''

وقت نے ان کے زخم پر مرہم رکھ دیا۔ یہ نوکری کی تلاش میں تھا۔ آپی کی تنخواہ بند ہوئی اس کی بھی ختم ہوئی اور تو اور بھائی جان نے بھی خرچ دینا کم کر دیا تھا خود بھی بہت دیر سے آتے۔ پھر بالکل آنا بند کر دیا کہ کام بہت ہے۔ وہیں سو جاتا ہوں۔ یہ فکر کم نہیں تھی کہ پھر ایک دھماکہ ہو گیا۔

اگلی صبح حناشا جو یونیورسٹی گئی واپس نہیں آئی۔ جب کافی دیر ہوگئی تو اس کا میسج امی کے موبائل پر آیا۔

''سوری امی میں آپ کی موت کے بعد گھر میں نہیں رہ سکتی۔ میں نے دلیر خان سے شادی کر لی ہے کورٹ میرج کی ہے، اس وقت میں پشاور میں ہوں پھر ہم علاقہ غیر چلے جائیں گے، فاٹا میں ان کا دوست رہتا ہے وہیں کاروبار کریں گے۔''

اب نہ رونا آیا نہ ماں کو دلاسہ دیا گیا اور جب بھائی جان نے لپٹایا تو ایسا لگا کہ دماغ کو جھٹکے لگ رہے ہیں۔ اس کی زبان سے صرف یہ الفاظ نکل رہے تھے۔ افسوس ہائے افسوس پھر کچھ ہوش نہ رہا۔

وقت کا دھارا پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ چھوٹی آپی کا رشتہ آیا۔ لڑکا دیکھنے گئے۔

''جی لڑکا کہاں ہے۔'' اس نے بزرگوار سے پوچھا۔

''جی میں ہی ہوں۔''

''لک.....ک.....کیا۔''

ساٹھ سالہ صاحب مسکرا کر بولے۔ ''تین بچے تھے۔ شادیاں کر دی ہیں ایک بیٹی دو بیٹے۔ تینوں امریکہ میں ہیں۔ خدا کا شکر ہے خوش ہیں۔ مجھے گھر والی کی ضرورت ہے۔ پنشن ہو رہی ہے۔ گھر اپنا ہے، میں آپ کے سامنے ہوں۔''

وہ لوگ بوجھل دل لیے لوٹ آئے۔ چھوٹی بھی پینتالیس برس کی ہو رہی تھی۔

سب احوال سن کر نہ جھجکیں نہ شرمائیں۔
''کرویں شادی ہی سے تو مطلب ہے!''
کرب کی ایک لہران کے چہرے پر نمودار ہوئی۔ زہر خند کر کے یہ الفاظ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔
''آپ کی کیا رائے ہے۔'' اس نے ماں سے پوچھا؟
جب کہہ رہی ہے کہ کردو تو کردو یہ کہہ کر اتنا روئیں کہ بے ہوش ہو گئیں۔ بہرحال رشتہ طے ہو گیا۔ اسے بھی کپڑے بنانے تھے۔ ٹوٹے دل سے بازار چلا آیا۔ سر جھکائے اپنی دھن میں مگن۔
اسے اپنی فرحین فاطمہ بھولے نہیں بھولتی تھی۔ ایک صاحب سے ٹکر ہوگئی۔
''سوری سر۔'' اور نگاہ اٹھی تو پتھر کا ہو گیا۔ وہ کوئی اور نہیں اس کے بھائی جان تھے۔
علیم الزماں ایک بچہ گود میں اٹھائے اس کی انگلی پکڑے ایک مناسب صورت خاتون ان کے پیچھے تھیں۔ عنبر یہ فہیم ہے۔ میرا بھیا تمہارا دیور ایک ہی بھائی ہے۔ میرا بھائی جان کے چہرے پر ذرا شرمندگی نہ تھی۔ بھائی جان بمشکل اس کے حلق سے نکلا۔
''ہاں یار! امی تو شادی کرنے والی تھیں۔ پھر خود ہی اپنا بھلا سوچ لیا۔ لاکھوں کماتے تھے۔ شادی کی تو اللہ نے اولاد دی۔ دونوں بیٹے ہیں بوڑھا ہوں گا تو یہ جوان ہو جائیں گے۔ خدا کے بعد بڑھاپے کا سہارا۔ وہ سامنے میرا فلیٹ ہے۔ شہر کے گنجان آباد علاقے میں تمہارے بھائی کی جنت ہے۔'' وہ ہاتھ پکڑ کر اسے گھر لے آئے۔
بچوں کو اس نے لپٹا لیا تھا، پھر پتا نہیں کیا ہوا وہ رو پڑا۔ ''ارے ارے۔'' بھائی جان پانی لے آئے تھے۔
''میرا بھیا۔'' انہوں نے دلاسہ دیا۔
''بھیا یہ لے لیں۔'' بھابی کولڈ ڈرنک اسنیکس لے آئی تھیں۔
''بس بھائی جان میں یہ سوچتا تھا کہ آپ کا سہرا میں خود اپنے ہاتھوں سے باندھوں گا۔ بس اب سب تمہارے سامنے تھا۔ دو راستے تھے یا تو پاگل ہو کر مر جاؤں یا پھر یہ جو میں نے اختیار کیا۔ میں نے عالم دین سے مشورہ لیا تھا یہ مشورہ انہوں نے دیا تھا۔ جب بڑے یہ سوچنے لگیں کہ ہم بچوں کی شادیاں کیوں کریں۔ تب یہ راستہ اختیار کرنا گناہ نہیں ہے۔ بچوں کو آباد کرنا والدین پر فرض ہے۔ اگر وہ اپنے فرض سے غفلت کرتے ہیں تو یہ ان کے لیے سزا ہے۔ گھر کا نظام ایک راجدھانی ہے۔ اس کا لیور گھر والی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ بہو کے آجانے سے اس میں خلل آجاتا ہے لیکن اس پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اس میں مرد کا کردار مضبوط ہوتا ہے۔ اگر سب رشتوں کو اپنی جگہ رکھے تو یہ کبھی نہ ہو۔ یہ مولانا صاحب نے کہا تھا۔ بہرحال یہ تمہارا گھر ہے۔ جب دل چاہے آجایا کرنا۔
اس نے بچوں کو پیار کیا۔ بھابی کے ہاتھ پر سلامی کا ہزار اور بچوں کو ہزار ہزار دے کر واپس لوٹ آیا۔
چند دن میں چھوٹی آپی کی بارات سادگی سے آئی اور وہ خاموشی سے اپنے گھر سدھار گئیں۔ ان کی شادی میں خاندان کی لڑکیاں لڑکے جی بھر کے ہنسے۔ ایسا دولہا کبھی دیکھا نہ سنا۔ ان کا گھر سلیم ولا جس کے اخلاق و مروت کی لوگ مثالیں دیتے تھے اب تماشا بن چکا تھا۔ اس کے دوست کا بھائی لاپتا تھا۔ ایدھی سینٹر سے فون آیا ایک لاش سے کفن ہٹا۔
''ہائے میرے اللہ.....! یہ کوئی اور نہیں اس کی منی کی لاش تھی جس کی نوشی تماشا اس جگہ لاوارث لاشوں کا بورڈ لگا تھا۔ بے ہوش فہیم کو اس کا دوست کسی طرح واپس لے آیا۔ پھر بھائی لے کر لاش لینے گئے۔ ساتھ تفصیلات تھیں۔ یہ لاش پولیس کی طرف سے ایدھی سینٹر میں آئی تھی۔ یہ طوائف تھی اسے کسی نے بہت تشدد کے بعد قتل کیا تھا۔ ایک سینئر طوائف کے یہاں اس کا قیام تھا۔ یہ لاش کلفٹن کے ساحل سے ملی تھی۔ پولیس نے سراغ لگا کر نیپئر روڈ پر چھاپہ مارا جہاں سے اتنا پتا چلا تھا کہ ایک لڑکا اسے وہاں فروخت کر کے گیا تھا۔ گھر سے نکل کر جانے والی لڑکیوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔'' بھائی جان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا۔
اب امی کی حالت بھی خراب تھی۔ کبھی کبھی بالکل

چپ لگ جاتی۔ اس نے دبی زبان سے بھائی کو گھر لانے کی بات کی تھی۔

"خبردار اب اگر اس نے عورت کو ہمارے گھر کا راستہ دکھایا۔" رسی جل گئی تھی بل ابھی باقی تھے۔

وہ لوگوں کو دیکھتا اپنے پوتی پوتا، نواسی نواسے بہلاتے۔ اس کا کلیجہ کٹ کر رہ جاتا۔ گھر میں سناٹا چھایا رہتا۔ کبھی کبھی چھوٹی آپی اپنے میاں کے ساتھ آجاتیں تو کچھ رونق ہو جاتی۔ پانچ میں سے بھائی کے بعد شاید یہی تھیں جو کچھ آباد نظر آتی تھیں۔ دولہا بھائی بہتر انسان ثابت ہوئے تھے۔

جب وہ سونے لیٹتا تو عجیب عجیب خواب نظر آتے۔ بری بری شکلیں پھر وہ اس کے کسی اپنے کی شکل اختیار کر لیتیں۔

جاب ہو گئی تھی لیکن اب اس کا دماغ اس قابل نہیں رہا تھا کہ نوکری کر سکے۔ جہاں کہیں نوکری ہوتی چند دنوں میں جواب مل جاتا، گھر چلنا مشکل ہو گیا تھا۔ ادھار قرض کی نوبت آجاتی تو بھائی جان ناک منہ بنا کر مدد کر دیتے۔ پھر ایک دن وہ ہو گیا جو تابوت میں کیل ثابت ہوا۔

وہ بھائی جان کے گھر گیا تھا۔ پیسوں کی ضرورت تھی وہ گھر پر نہیں تھے۔ بھابی کا رویہ کچھ روکھا تھا۔ گھر میں پیسے مانگنے والوں کو کون پسند کرتا ہے۔ وہ بچوں سے کھیل رہا تھا۔

"آئیے بیٹا آپ کے ٹیوشن کا ٹائم ہو رہا ہے۔" پھر بچوں کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولیں۔ اصل میں انہیں اپنی غیر موجودگی میں کسی کا آنا پسند نہیں، بس اب بس ہو چکی تھی۔ وہ اٹھ گیا۔ قرض خواہوں کو کیا جواب دوں گا۔ اس نے سر جھکا کر سوچا۔ پھر باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ بجلی کاٹنے والے آگئے تھے۔ پڑوسی انکل نے یہ کہہ کر مدد کر دی تھی کہ تمہارے والد میرے دوست تھے۔ ابھی دے رہا ہوں ہفتے کے اندر واپس کر دینا۔ کیا جواب دوں گا۔ اب تو مہینہ ہو رہا ہے۔ سوچوں کا سمندر تھا اور وہ...... ایک آواز اسے باہر لے آئی۔

"اب اسے لے لیں میں تھک گئی، بہت وزنی ہے میرا شہزادہ۔" کہہ کر ایک نوجوان نے بچے کو لے لیا۔ فرحین اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میرا پردہ رکھ لو۔ اس کی پور پور پکار رہی تھی۔

خوب صورت لباس سلیقے سے کیا میک اپ۔ اس کا حسن قیامت ڈھا رہا تھا۔ اس نے دیوار کا سہارا لے لیا تھا۔ وہ لوگ چلے گئے۔ یہ بھی کسی نہ کسی طرح گھر آ ہی گیا لیکن وہ دورہ پڑا کہ اللہ کی پناہ۔ ہاتھ پاؤں اکڑ گئے، منہ سے جھاگ نکل گیا۔ اپنے کمرے میں غش کی حالت میں پڑا تھا۔ اسے لگا کہ انتہائی بدصورت عورت کمرے میں داخل ہوئی۔

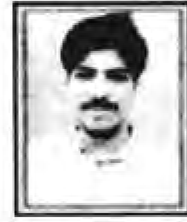
پھر وہ اچانک بڑی ہونا شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ چھت سے جا لگی پھر اس نے ایک رسی نکالی اور اس کے گلے میں ڈال دی اور اسے کمرے سے باہر لے آئی اوپر تیسری منزل پر لے جا کر رسی گھمانی شروع کر دی۔ اس نے دیکھا اس عورت کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں اور وہ اور کوئی نہیں اس کی امی تھیں۔ امی جان نہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ چیخے۔

رسی گھوم رہی تھی اور رسی کے ساتھ اس کا وجود بھی چکر لگا رہا تھا اور پھر وہ ماں ماں کرتا رہا اور ماں نے رسی چھوڑ دی۔ وہ سمندر میں جا گرا۔ جب آنکھ کھلی تو پاگل خانہ تھا اور وہ۔ اپنی کلائی کی رگ کاٹ رہا تھا۔ پڑوسی انکل کہہ رہے تھے۔ ہم بال بچے دار آدمی ہیں۔ کل گھر میں گھس آئے۔ بچوں کو پتھر تو پہلے ہی مارتا تھا۔ اس لیے سب محلے والے مل کر پاگل خانے لائے ہیں۔

کہانی ختم ہو گئی۔ اپنے پیچھے سوال چھوڑ گئی۔ یہ سوال ہے ان ماؤں سے جو اپنے بچوں کی آبادی سے غافل ہیں۔ ان کی عمریں نکل رہی ہیں۔ اماں بے نیاز ہیں۔ کاش یہ مائیں یہ نہ کریں تو پاگل خانہ محفوظ رہے خطرناک پاگلوں سے۔ فہیم کے کمرے سے آوازیں آتی ہیں۔ فہیم الزماں کا مطلب ہے سارے زمانے کا فہم و فراست والا لیکن تمہارا فہیم تو سارے جہاں کا پاگل ہے۔ جبھی تو تم بھی چھوڑ گئیں تم بھی...... تم بھی......!!

☆☆☆

قوسِ قزح



راوی: چوہدری وسیم

تحریر: رانا حبیب الرحمٰن

جیل کی سلاخوں کے پیچھے سے فیوڈل سسٹم کے شکار اُس نوجوان کی سرگزشت

جس کے سینے میں انتقام کا جوالا مکھی بھڑک رہا تھا

پہلا حصہ

شام کا وقت تھا۔ سورج اپنی کرنیں سمیٹ رہا تھا۔ رات اپنے اندھیرے کو ہر طرف پھیلانے کی کامیاب کوشش میں مصروف تھی۔ انسان، حیوان، چرند پرند سب اپنی اپنی پناہ گاہوں کی طرف جا رہے تھے لیکن جنگل کی طرف جانے والے ایک راستے پر میں اندھا دھند بھاگ رہا تھا اور میرے چند ایکڑ پیچھے بھاگتے چوہدری کرم دین کے خوفناک اور آدم خور کتوں کی بھونکنے کی خوفناک آوازیں جنگل کی پراسرار خاموشی کو ہولناک بنا رہی تھیں۔

میرا نام وسیم علی ہے۔ اس وقت میری عمر محض 10 برس کے قریب ہوگی۔ میں بھاگ بھاگ کر اب بہت زیادہ تھک چکا تھا۔ میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے اور میری ٹانگیں اب بالکل جواب دے چکی تھیں لیکن بھاگنے میں ہی میری عافیت تھی کیوں کہ چوہدری کرم دین کے خونخوار کتے میرے پیچھے بھاگ رہے تھے جو کسی وقت بھی مجھے پکڑ کر چیر پھاڑ کر تکہ بوٹی کر کے آپس میں حصے بانٹنے کی بجائے کھانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں بھی دیر نہ کرتے۔ بھاگتے بھاگتے اب جنگل میرے کافی نزدیک آ گیا تھا۔ پھر جنگل شروع ہوا تو میں جائے پناہ کی تلاش میں تھا کہ وقتی طور پر ہی ان کتوں سے بچا جا سکے۔ اس جنگل کے بارے میں صرف میں نے سنا تھا لیکن کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ رات کا اندھیرا بڑھ گیا تھا لیکن میں رک نہیں سکتا تھا۔ بھاگتے بھاگتے میں جنگل کے ایک گھنے حصے میں آ گیا۔ اس جنگل کو مجھے دیکھنے کا شوق نہیں تھا لیکن اب بدقسمتی سے یہی جنگل مجھے چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں ایک جگہ گر گیا۔ مجھ میں اب ہلنے جلنے کی طاقت ختم ہو چکی تھی لیکن مجھے زندہ رہنا تھا تاکہ میں چوہدری کرم دین سے اپنے والدین کے قتل کا بدلہ لے سکوں۔ جہاں میں گرا تھا اس سے کچھ دور ہی جنگل میں ایک جگہ آگ کا الاؤ جل رہا تھا۔ آگ کا وہ روشن الاؤ میں دیکھ چکا تھا لیکن میں وہاں جا نہیں سکتا تھا۔

اسی وقت مجھے اپنے سے تھوڑی دور ہی بھونکتے ہوئے خونخوار کتوں کی آواز سنائی دی۔ اب میں کافی پریشان ہو چکا تھا۔ کیوں کہ آگ کے الاؤ کے پاس پتا نہیں کون تھا۔ وہ دوست بھی ہو سکتے تھے اور دشمن بھی اس لیے میں نے رسک نہ لینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن پیچھے وہ جن کے ڈر سے بھاگ کر میں یہاں تک آ پہنچا تھا۔ وہ اب قریب پہنچنے والے تھے۔ میں کتوں سے اپنی جان بچانے کی خاطر قریب کے ایک درخت

پر چڑھ گیا۔ کتے اب بالکل قریب آچکے تھے۔ کتے درخت پر تو نہیں چڑھ سکتے تھے لیکن پھر بھی ڈر کر میں بہت اونچا جا پہنچا تھا۔ پھر ایک مضبوط سی لیکن پتلی سی شاخ کو تھام کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ کتے اب اس درخت کے نیچے آچکے تھے۔ میں ابھی وہاں بیٹھا ہی تھا کہ کہیں میرے قریب ہی سانپ کی تیز پھنکار سنائی دی۔ وہ پھنکار اتنی تیز تھی کہ میں اور ڈر گیا اسی وقت درخت پر میرے ہاتھ والی شاخ تڑخ کر ٹوٹ گئی اور میں اس شاخ کے ساتھ ہی دھڑام سے نیچے سیدھا ایک کتے پر آگرا جو منہ اٹھائے مجھے دیکھ کر شاید یہ سوچ رہا تھا کہ میں گرا کیوں ہوں۔ میرے گرتے ہوئے منہ سے ایک چیخ خارج ہوئی تھی اسی طرح جس طرح میں جس کتے پر گرا تھا وہ مجھ سے بھی بلند آواز سے چیختے ہوئے ایک جانب بھاگا تھا۔

کتے پر گرنے کی وجہ سے میں کسی بھی خاص نقصان سے بچ گیا تھا۔ لیکن زخم اچھے خاصے آچکے تھے پھر بھی مجھے یقین تھا کہ [illegible]

چیخیں الاؤ کے قریب بیٹھے ہوئے آدمیوں نے ضرور سن لی ہوں گی اگر وہ دشمن بھی ہوتے تو اس حالت میں مجھے بچانے کی کوشش ضرور کرتے۔

میں جس درخت پر چڑھا ہوا تھا بدقسمتی سے اس کے نیچے تھوڑی دیر پہلے سانپوں کی ایک جوڑی اٹھکیلیاں کررہی تھی اور میرے بھاگنے کی آواز سن کر وہ ایک طرف بھاگ گئے تھے۔ بھاگتے ہوئے ان سانپوں کو میں پہلے دیکھ چکا تھا لیکن تیزی میں یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ اسی درخت پر چڑھ گئے ہیں یا یہاں ان کا کوئی دوسرا خاندان رہائش پذیر ہے۔

جب میں کتے پر چیختے ہوئے گرا تو یہ دیکھنے سے پہلے کہ دونوں کتے میرے کتنے حصے کرتے ہیں یہ مقابلے میں کون زیادہ کھاتا ہے اور کون سا کم میں بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس وقت شاید ویسے بھی قدرت کو میری زندگی عزیز تھی اور وہ مجھ سے کوئی نیک کام کروانا چاہتی تھی۔

[illegible] درخت [illegible] دیکھا کہ ایک

ٹہنی پر سانپ لپٹا ہوا تھا۔ میری یہ جرأت اسے بری لگی تھی لیکن اس نے شاید مجھ پر ترس کھا کر صرف پھنکارنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ لیکن میں اس وقت بچہ تھا دوسرا پہلے ہی کافی ڈرا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خطرات کے ساتھ میرا وزن بھی وہ شاخ نہ برداشت کر سکی تھی۔

☆......☆

جب مجھے ہوش آیا تو میں اسی آگ کے الاؤ کے پاس ایک چٹائی پر لیٹا ہوا تھا۔ آسمان پر تارے جگمگا رہے تھے۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر دو اجنبی چہرے فوراً ہی میری طرف متوجہ ہوئے ان کو دیکھ کر میں نے ایک دم گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کی تو ان میں سے ایک نے مجھے اٹھنے سے روکتے ہوئے کہا۔

''بیٹا گھبراؤ نہیں، اب تم بالکل ٹھیک ہو لیکن ابھی لیٹے رہو تم کافی زخمی حالت میں تھے۔ ہم نے دوائی لگا دی ہے۔ اس لیے تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ چند گھنٹوں بعد تم بالکل چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔''

انہوں نے مجھے ایک گاڑھا سا سیال پینے کے لیے دیا جس کا ذائقہ عجیب قسم کا تھا اور پیاس کی وجہ سے میں اسے پی گیا تھا۔ کچھ دیر بعد میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں تو میں سو گیا۔ جب میں دوبارہ ہوش میں آیا تو صبح کا اجالا پھیل رہا تھا۔ وہ بھی درختوں میں سے چھن کر آتی روشنی سے پتا چلتا تھا ورنہ نیچے ابھی تک اندھیرا تھا۔

دونوں اجنبیوں نے مجھے دوبارہ پھر ایک اور سیال پلایا جو پہلے والے سے کچھ میٹھا تھا۔ یہ سیال پینے کے بعد مجھ کو ایک نئی طاقت کا احساس ہوا ورنہ پہلے میں خود کو کافی کمزور محسوس کر رہا تھا۔

درخت کی شاخوں سے رگڑ کھا کر گرنے سے مجھے کافی زخم آئے تھے جن پر مختلف قسم کی لیپ لگی ہوئی تھی جو زخموں پر ٹھنڈک پہنچا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد انہوں نے مجھے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ دونوں آدمی مسافر ہیں لیکن ساتھ ہی وہ سنیاسی حکیم بھی ہیں جو شہر سے اپنی جڑی بوٹیاں تلاش کرنے آئے ہوئے تھے لیکن انہیں رات ہو چکی تھی۔

آبادی وہاں سے کافی دور ہونے کی وجہ سے انہوں نے رات اسی جنگل میں گزارنے کے لیے ایک جگہ کا انتخاب کیا اور جنگلی جانوروں سے بچنے کے لیے یہ آگ کا الاؤ روشن کر لیا تھا۔ اب وہ سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ انہیں ایک انسانی چیخ کے ساتھ ساتھ کتوں کی آوازیں بھی سنائی دیں اور وہ دونوں چوکنے ہو گئے۔ انہوں نے فوراً ہی اپنی اپنی بندوقیں اٹھائیں جو چلتے وقت انہوں نے شکار کے لیے رکھ لی تھیں۔ یہ بندوقیں وہ ہمیشہ اپنے ساتھ لے کر آتے تھے۔ کیوں کہ ان کا کام ہی جنگل میں گھومنے پھرنے کا ہوتا تھا۔ اس لیے یہ بندوقیں شکار کے ساتھ ساتھ جنگلی درندوں سے بھی محفوظ رکھتی تھیں۔

دونوں بہت محتاط روی سے اس طرف بڑھنے لگے جس طرف سے چیخ کی آواز آئی تھی۔ ابھی وہ قریب پہنچے ہی تھے کہ انہیں کچھ آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں محتاط ہو کر ایک جھاڑی نما درخت کے قریب بیٹھ گئے۔ اب ان کی نظر سامنے مجھ پر بھی پڑ چکی تھی۔ وہ حیران رہ گئے جب ایک کتا میرے پاؤں چاٹنے میں مصروف تھا اور دوسرا کتا اپنے منہ اور پنجوں کے ذریعے مجھے جگا رہا تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر تیار بیٹھے تھے۔

انسانی آوازیں اب قریب آ چکی تھیں وہ دو آدمی تھے اور دونوں کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں۔ اپنی ٹارچوں کی روشنی میں وہ اس جگہ آ پہنچے تھے۔ مسافر حکیموں نے ان دونوں کو شکل سے پہچان لیا تھا اور ویسے بھی ان کے متعلق بہت معلومات رکھتے تھے۔ یہ دونوں چوہدری کے بہت ہی زیادہ وفادار اور نمک خوار تھے اور چوہدری کے سر چڑھے ملازم تھے۔ یہ چوہدری کی خوشنودی کے لیے ہر جرم کر جاتے تھے۔ بہت سے لوگ ان کے ظلم و ستم سے اپنی جانوں سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور جو لوگ زندہ تھے وہ بھی وقتاً فوقتاً ان کے تشدد کا شکار ہوتے رہتے تھے۔ قانون بھی اس چوہدری کرم دین کی طرف متوجہ نہ ہوتا تھا۔ اگر کوئی بھولا بسرا سپاہی ادھر آ بھی جاتا تو اس کی مٹھی گرم کر دی جاتی تھی کیونکہ چاند پور

گاؤں میں چوہدری کی حکومت تھی جو چاہتا وہی ہوتا تھا۔ لہٰذا شہر کے قانون نے بھی اسے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ ان کے نام منظور اور ظہور تھے اتفاق سے دونوں سگے بھائی تھے اور ان کے ماں باپ بھی فوت ہو گئے تھے اور یہ بچپن سے ہی چوہدری کے گھر رہے۔ اس کا ہر جائز و ناجائز کام کرتے تھے۔ ان کو زیادہ تر الٹے ناموں سے ہی پکارا جاتا تھا۔ یعنی منظور عرف منظورا، ظہور عرف ظہورا۔

ظہورا اس وقت منظورے سے بولا۔ ''ظہورے یہ مر چکا ہے۔'' لیکن ظہورا گم صم اور حیرت سے کتوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''منظورے یہ کیا ہے؟'' منظورے نے ظہورے کی طرف حیرت سے دیکھا۔

لیکن اس کی سمجھ میں چھوٹے بھائی کی بات نہ آئی تو ظہورا دوبارہ بولا۔ ''ان کتوں کی طرف دیکھو نہ یقین کرنے والی بات ہے۔ یہ کتے بھوکے ہوں تو انسان کو تو منٹوں میں چیر پھاڑ کر کھا پی جاتے ہیں جس کی وجہ سے میں انہیں آدم خور بھی کہتا ہوں لیکن یمی کو یہ کتنے پیار کے ساتھ لیے بیٹھے ہیں۔''

اس پر منظورا بولا۔ ''بھائی اب چوہدری کرم دین کو کیا جواب دیں گے۔ وہ تو یمی کو زندہ دیکھتے ہی ہمیں نہیں چھوڑے گا۔''

دوسرا بولا۔ ''دیکھ نہیں رہے ہو کہ وہ مر چکا ہے کیوں کہ کتوں کو پتا چل جاتا ہے اس لیے اس کے پاس بیٹھے ہیں تاکہ ہم خود دیکھ لیں۔''

ابھی دونوں باتیں کر ہی رہے تھے کہ قریبی جھاڑیوں سے ان دونوں ظہورے اور منظورے پر ایک بڑے چیتے نے چھلانگ لگائی اور دونوں کو ایک ساتھ موقع پر ہی ہلاک کر دیا۔

دونوں کتے ڈر کر بھاگ کھڑے ہوئے اور تھوڑی دور جا کر بھونکنا شروع ہو گئے۔ دونوں مسافر حکیموں نے یہ کارروائی دیکھتے ہی نشانہ باندھ کر فائر کر دیے۔ گولی لگنے سے چیتا وہیں گر گیا اور تھوڑی دیر چنگھاڑنے کے بعد دم توڑ گیا۔

اسی وقت قریب سے ایک درویش کی آواز سنائی دی جو نہ جانے کہاں سے وہاں آ گیا تھا۔ وہ یہ کہتے ہو کہ ''خس کم جہاں پاک قدرت نے غریبوں کی دعائیں سن لیں یعنی اب گاؤں کے لوگوں کو چوہدری کرم دین سے بھی نجات مل جائے گی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ایک جانب چل دیا اور دونوں حکیم دیکھتے رہ گئے۔

ان دونوں نے آگے بڑھ کر مجھے اٹھایا اور دیکھا تو میں صرف بے ہوش تھا جب حکیم میرے قریب آئے تو دونوں کتوں نے بھی واپس آ کر ان پر بھونکنا شروع کر دیا۔ ایک شخص نے کتے کو اپنی بندوق کا دستہ مارا تو وہ کتے کی اگلی ٹانگوں پر لگا جس پر وہ چیختا ہوا دور ہٹ گیا۔ دوسرا کتا یہ دیکھ کر خود ہی پیچھے ہٹ گیا تھا۔

مجھ زخمی کو وہ اٹھا کر اپنے الاؤ کے قریب آ گئے تھے۔ دونوں حکیموں نے اپنے پاس سے ایک لیپ نکالا اور میرے زخموں پر لگا دیا تھا۔ پھر میرے منہ میں ایک جڑی بوٹی کا رس نکال کر منہ میں ٹپکایا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے ہوش آ گیا۔ حکیموں نے میرے منہ میں جڑی بوٹیوں کا ایسا سیال ٹپکایا تھا کہ مجھے نیند آنے لگی تھی تاکہ میں کچھ دیر اور آرام کر لوں۔

اپنے بارے میں بتانے کے بعد وہ بولے۔ ''ویسے بیٹا! ہم تو یہ سمجھ گئے ہیں کہ تم چوہدری کرم دین کے ظلم کا شکار ہوئے ہو اور اب ہمیں اپنا سمجھتے ہوئے سب بتا دو کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا۔ ہمارے نام عظمت علی اور حشمت علی ہیں اور تم چاہو تو ہمیں چچا کہہ کر مخاطب کر سکتے ہو۔''

''چچا جی میرا نام وسیم ہے۔ بچپن سے ہی مجھے یمی کے نام سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ یہ نک نام مجھے بالکل پسند نہ تھا۔ میرے والد گاؤں کے چوہدری کرم دین کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔ ان کا نام وجاہت علی تھا۔ میری والدہ کا نام نعیمہ بی بی تھا۔ ہماری اپنی بھی زمینیں تھیں جو کہ ہمارے دادا پر دادا کے زمانے سے چلی آ رہی تھیں۔ ان پر چوہدری کرم دین کا ہی قبضہ ہے۔ پورے چاند پور گاؤں میں ان کے فیصلے کی کوئی بھی نفی نہیں کر سکتا تھا۔ اسی جائیداد کے ایک سرے پر ہمارا 10 مرلوں پر دو خوب صورت کمروں پر مشتمل گھر

بنا ہوا تھا۔ جس میں مجھ سمیت میرے ماں باپ رہتے تھے۔ میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں۔

ایک دن میں پڑھنے کے لیے اسکول گیا ہوا تھا اس وقت میں پہلی کلاس میں تھا۔ بعد میں میرے ماں باپ دونوں کو قریبی شہر کی رشتہ دار کی فوتگی پر جانا پڑ گیا۔ جاتے ہوئے میری والدہ ہمسائیوں کو میرے متعلق بتا گئی تھیں کہ اس کا خیال رکھنا۔ ہم جلد ہی آجائیں گے لیکن جب وہ واپس آرہے تھے تو راستے میں ان کی گاڑی کی ٹکر کسی ٹرک سے ہوگئی۔ گاڑی میں ڈرائیور سمیت میرے ماں باپ بھی اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوگئے۔

میرے ماں باپ کی ہلاکت پر مجھ سمیت سب گاؤں والے بھی غمگین تھے۔ کفن دفن کے بعد گاؤں میں میری کفالت کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کوئی رشتے دار بھی اس وقت قریب نہ تھا۔ لہٰذا چوہدری کرم دین نے گاؤں والوں کو فیصلہ سنا دیا کہ اب میں وسیم عرف سمی کی کفالت کروں گا۔

چوہدری کرم دین بدفطرت، لالچی اور تکبر سے بھرا ہوا شخص تھا۔ میری کفالت پر اسے جائیداد کے ساتھ ساتھ مفت کا ملازم بھی مل جاتا۔ لہٰذا چوہدری کے اس اعلان پر کسی نے بھی اس کے فیصلے کے خلاف آواز بلند نہ کی۔

چوہدری کرم دین کی کافی زمینیں تھیں پھر بھی اسے لالچ رہتا تھا اس لالچ میں ہی اس نے میرے والدین کو حادثے میں مروادیا تھا۔ اس قتل کا کوئی بھی چشم دید گواہ نہ تھا لیکن قاتل سے ایک غلطی ہوچکی تھی۔

جہاں یہ حادثہ پیش آیا وہاں ایک درویش قسم کا آدمی موجود تھا جس نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

مجھے جائیداد کا علم تھا لیکن اپنے والدین کی موت کے بارے میں لوگوں کی طرح ہی سمجھتا تھا کہ وہ روڈ ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہوئے ہیں۔ اس وقت میری عمر بہت کم تھی۔ لہٰذا جب میں حویلی میں داخل ہوا تو وہاں مجھے اپنے ہم عمر بچے کھیلنے کے لیے مل گئے۔ یہ چوہدری کرم دین کی اولاد تھی جس میں اس کا ایک بڑا بیٹا جس کی عمر پانچ سال ہوگی اور ایک بیٹی جس کی عمر ساڑھے تین سال تھی۔ بیٹے کا نام فرمان تھا اور بیٹی کا نام عاتکہ تھا۔ تھوڑے دنوں میں ہی میری ان بچوں سے اچھی دوستی ہوگئی۔ چوہدری کرم دین کی بیوی ثریا بیگم بھی نہایت نرم دل کی مالک تھی اسے بھی میں بہت پسند آیا تھا۔ وہ مجھ میں اور اپنے بچوں عاتکہ اور فرمان میں کوئی فرق نہ رکھتی تھی لیکن جب چوہدری کرم دین گھر پر ہوتا، میری جان پر بن جاتی۔ ثریا بیگم جسے اب میں ماں جی کہنے لگا تھا چوہدری سے میری جان چھڑاتی پھر وہ مجھے اپنے کمرے میں لے جاتی اور مجھے پیار کرتی اور میں ماں جی کی آغوش میں سب بھول جاتا۔

چوہدری کرم دین بچپن سے ہی ضدی، سرکش قسم کا بدکردار اور لالچی انسان تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا ہونے کی وجہ سے اسے ہر قسم کی آزادی تھی وہ والدین کی ایک بگڑی ہوئی اولاد تھا۔ روزانہ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی مسئلہ صرف اس کی ہی وجہ سے کھڑا ہو جاتا تھا اور اس میں والدین کی سبکی ہوتی لیکن چوہدری کرم دین کو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ والدین کے منع کرنے کے باوجود وہ اور اس کی عادتیں روزانہ زیادہ ہی بگڑتی گئی۔ اب گاؤں میں عورتوں اور جوان لڑکیوں کی عزت بھی محفوظ نہ تھی۔ یہ دیکھ کر چوہدری کے والدین نے اس کی شادی کرنے کے بارے میں غور کیا اور اپنے ہی خاندان میں ایک لڑکی کے بارے میں چوہدری کرم دین سے بات کی تو گھر میں چوہدری نے کہا کہ وہ اپنی پسند کی شادی کرے گا اس لیے کہ وہ ایک دوسرے خاندان کی لڑکی پسند کرچکا ہے۔ اتفاق کی بات یہ تھی کہ لڑکی بھی اسے پسند کرتی تھی۔ یہ لڑکی ثریا خانم ہی تھی۔ ثریا بیگم کا خاندان مذہبی قسم کا خاندان تھا۔ جہاں پردے کے بعد روزہ نماز کی بھی سخت پابندی تھی۔ لہٰذا رسم و رواج کے مطابق دونوں برادریوں میں شادی صرف خاندان کے اندر ہی آپس میں کرتے تھے اپنی لڑکیاں کسی دوسرے خاندان میں نہیں بیاہتے تھے۔ اسی لیے جب کرم دین اور ثریا بیگم نے اپنے اپنے گھروں میں پسند

کی شادی اور برادری سے باہر کرنے پر بات کی تو دونوں طرف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ لہٰذا کرم دین نے کالے جادو کا سہارا لیا۔ اسے دولت کی کمی نہیں تھی۔ باپ دادا کی ساری جائیداد کا اکلوتا وارث تھا۔ اس کالے جادو والے کو بہت کچھ دینا پڑا۔ پھر جا کر ایک دن جادو نے اپنا کام دکھا دیا اور دونوں خاندانوں نے قطع تعلق پر دونوں کی شادی کر دی۔ شادی کے بعد دونوں کا اپنے اپنے خاندانوں سے تعلق ختم ہو چکا تھا۔ جواب تک ختم تھا۔

ثریا کا چچا زاد بھائی محبوب علی شاہ جو اب اللہ کا درویش بن گیا تھا۔ در پردہ اس کا خیال ضرور رکھتا تھا۔ وہ اپنے طور پر چاند پور جاتا رہتا تھا اور گاؤں کی تمام خبریں اس تک پہنچ جاتی تھیں جس سے وہ خدا سے دعا کرتا کہ اس کے بہنوئی کرم دین کو سیدھا راستہ دکھا دے۔

ایک دن درویش محبوب علی شاہ شہر کسی کام سے گئے ہوئے تھے اور اپنی ہی مستی میں اب پیدل آ رہے تھے تو ایک دن انہوں نے راستے میں یہ حادثہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور وہ ٹکر مارنے والے ٹرک ڈرائیورز کو بھی دیکھ چکے تھے۔ وہ چوہدری کرم دین کا ایک وفادار نوکر تھا جو شہر کی غلہ منڈی میں آڑھتی کا کام کرتا تھا لیکن در پردہ دوسرے کام وہ چوہدری کے ہی انجام دیتا تھا۔ درویش مرنے والوں کو بھی پہچان چکا تھا جو ٹکر سے فوراً ہی ہلاک ہو گئے تھے۔

درویش محبوب علی شاہ اس لیے ہی چوہدری کرم دین کو خدا کا خوف یاد دلاتا رہتا تھا۔ چوہدری کے متعلق یہ تمام خبریں مجھے درویش نے ہی ایک دن بتائی تھیں۔

چوہدری کرم دین اپنے دوسرے نوکروں سے بھی زیادہ برا سلوک مجھ سے کرتا تھا۔ جب کبھی کوئی غلطی ہو جاتی تو بدلے میں وہ حد سے زیادہ تشدد کرتا۔ ایسا بہت دفعہ ہو چکا تھا کہ چوہدری کرم دین مجھے پیٹ ڈالتا تھا تو ثریا خانم مجھے اس سے چھڑواتی تھی۔

مجھے شروع سے ہی اپنے نک نام لینے پر دوسرے پر غصہ چڑھ جاتا تھا۔ یہ بات چوہدری کرم دین اور اس کی بیوی ثریا خانم کو بھی معلوم تھی۔ ثریا بیگم تو مجھے وسیم کے نام پر ہی بلاتی تھی لیکن چوہدری مجھے تنگ کرنے کے لیے ہمیشہ ہی یمی کہہ کر بلاتا تھا۔

چوہدری کے بچوں یعنی عاتکہ اور فرمان کے ساتھ ہی میں بھی اسکول جاتا تھا چوہدری کرم دین میرے پڑھنے کے حق میں نہ تھا لیکن ثریا بیگم اسے سمجھاتی کہ اگر اسے اسکول کی تعلیم نہ دی تو لوگ ہزار طرح کی باتیں بنائیں گے کہ خود اپنے بچوں کو پڑھا لکھا لیا ہے لیکن ایک یتیم بچے کو نہیں پڑھا سکا۔ حالانکہ اس کی تمام جائیداد بھی چوہدری کے پاس ہے اس پر چوہدری چپ رہتا۔

چوہدری کے پاس حویلی میں کئی نوکر چاکر تھے جو مختلف کام کرتے تھے اس کے علاوہ گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں بھی حویلی میں مختلف کاموں پر مامور تھیں۔ حویلی میں ہی گائیں اور بھینسوں کے علاوہ بھیڑ بکریاں تھیں۔ اس کے علاوہ حویلی کے ہی ایک طرف گھوڑوں کا اصطبل بنا ہوا تھا۔ یہاں چوہدری کرم دین کے پسندیدہ گھوڑے بھی تھے۔ اُسے گھوڑوں سے بہت انسیت تھی اور وقتاً فوقتاً کسی بھی گھوڑے پر بیٹھ کر اپنی زمینوں کی طرف نکل جایا کرتا تھا۔ گھوڑوں کے اصطبل میں بھی ہر وقت ایک یا دو نوکر موجود رہتے تھے اور اگر حویلی کا کوئی نوکر چوہدری کرم دین کی آنکھوں کا کانٹا بن جاتا تو اس کو سخت سزا دی جاتی تھی۔ اصطبل کے ساتھ ہی ایک بڑا سا پنجرہ پڑا تھا جس میں ایک نہیں پورے چار عدد خونخوار کتے موجود تھے۔ کسی نوکر یا آدمی کو سزائے موت دینا ہوتی تو اسے انہی کتوں کے آگے پھینکا جاتا تھا۔ چوہدری کرم دین کے خلاف کبھی کسی نے اپنی زبان نہ کھولی تھی۔ یہاں بتاتا چلوں کہ کچھ لوگ ابھی بھی یہ کہتے ہیں یا سمجھتے ہیں کہ یہ شاید پرانے زمانے کی باتیں ہیں لیکن یہ پرانے وقتوں کی کہانیاں نہیں اگر غور کریں تو یہ ہمارے موجودہ زمانے میں بھی آپ کو کسی نہ کسی بہروپ میں چوہدری کرم دین جیسا کردار ضرور نظر آئے گا اور شاید یہ رہتی دنیا تک رہیں۔ ان کا ثبوت روزانہ اخبارات اور ٹیلی ویژن پر سرکاری اور غیر سرکاری چینلز پر چلتی خبروں پر ملتا

رہتا ہے۔ پرانے زمانے کے شیر تو شاید گھاٹ پر بکری کے ساتھ مل کر پانی پی لیتے ہوں گے لیکن آج کل کے شیروں نے تو نہ بکری چھوڑی ہے نہ ہرن اور نہ ہی خرگوش ان کے ظلم سے بچا ہے کیونکہ یہ انہی پر تو حکومت کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں کیونکہ حکومت صرف شیر کی ہے۔ باقی آپ خود سمجھدار ہیں۔

میں جب حویلی میں آیا تو انہی دنوں ہی یہ کتے جو ابھی چھوٹے چھوٹے بچے تھے کہیں سے منگوائے گئے تھے۔ میں عاتکہ اور فرمان کے ساتھ کبھی کبھی ادھر آجاتا تھا اور ہم دیر تک ان کو دیکھتے رہتے تھے۔ ایک دن ایک نوکر کو میں نے دیکھا تو وہ کتے کے بچوں کو گوشت کے ٹکڑے کھلا رہا تھا اور وہ بہت ہی شوق سے کھا رہے تھے۔ پھر کیا تھا میں بھی چوری چھپے ان کے پاس آنے لگا حالانکہ اس طرف آنے پر سخت پابندی تھی سوائے نگرانی کرنے والوں کے۔

میں جب بھی ادھر آتا ان بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے لاتا رہتا۔ کبھی دودھ بھی ان کو پلا دیتا تھا جب کوئی جانور مر جاتا تو نوکر اسے باہر پھینک دیتے تو میں چپکے سے چھری سے اس کا گوشت کاٹ کاٹ کر ان کتوں کو کھلا دیتا۔

سب جانتے ہیں انسان سے زیادہ وفا جانوروں میں ہوتی ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی خونخوار کیوں نہ ہو اگر اس جانور سے محبت کی جائے تو جانور ایسے ایسے کام کر جاتا ہے کہ انسانی عقل حیران رہ جاتی ہے لیکن اس وقت مجھے وفا یا بے وفائی کا کوئی پتہ نہ تھا اور نہ ہی آنے والے وقت کا لہٰذا بچہ انسان کا ہو یا کسی جانور کا وہ ہمیشہ خوب صورت ہی ہوتا ہے میں بھی ان کتوں سے پیار کرنے لگا تھا اور وہ بھی مجھ سے مانوس ہو گئے تھے۔ اب یہ کتے بڑے ہو چکے تھے۔

میری عمر بھی آٹھ دس برس کی ہو چکی تھی۔ میں اس وقت پانچویں کلاس میں تھا اب بھی میں چوہدری سے شدید قسم کی نفرت کرتا تھا کیوں کہ درویش نے مجھے حقیقت بتا دی تھی لیکن اس سے ڈرتا بھی تھا میری ڈیوٹی صرف چھوٹے موٹے کام ہی کرنے کی تھی یعنی حقہ تازہ کرنا، مہمانوں کو پانی پلانا اس کی ٹانگیں دبا دینا وغیرہ۔ گرمیوں میں ہاتھ کے پنکھے سے ہوا دیتا تھا۔ ایسے ہی میرے کام تھے۔

چوہدری کرم دین کے بچے عاتکہ اور فرمان اپنی ماں ثریا خانم پر گئے تھے۔ ان کی تمام عادتیں ماں جیسی تھیں۔ عاتکہ تو میری ہم عمر ہی تھی میں عاتکہ کو زیادہ ساتھ رکھتا تھا عاتکہ بھی ماں کی بجائے زیادہ تر میرے پاس رہا کرتی تھی اور فرمان زیادہ تر نوکروں کے ساتھ۔

ایک دن چوہدری کرم دین حویلی میں پریشان سا آیا اور ایک نوکر کو آواز دی وہ قریب آیا تو وہ غصے سے اسے کچھ بتا رہا تھا۔ میں نے جب ان کی باتوں کی طرف توجہ دی تو معلوم ہوا کہ آج زمینوں پر چوہدری کرم دین کو ایک درویش نے عجیب بات کہی تھی جس کا مطلب تھا کہ چوہدری کرم دین میرے ماں باپ یعنی وجاہت اور نعیمہ بی بی کا قاتل ہے اور وہ درویش اس کا چشم دید گواہ ہے۔ اس نے ایک نوکر کو آواز دی جو کھیتوں کو پانی دے رہا تھا اس نے دور ہونے کی وجہ سے نہ سنی تو چوہدری کرم دین اپنے گھوڑے کو لے کر اس نوکر کے پاس جا پہنچا اور کہا کہ اس درویش کو پکڑ کر حویلی لایا جائے لیکن جب چوہدری کرم دین حویلی پہنچا تو بعد میں اطلاع آئی کہ درویش غائب ہو چکا ہے اس پر چوہدری نے جھنجلاتے ہوئے مجھے کہا۔

"جاؤ میرے لیے حقہ تازہ کر کے لے آؤ۔"

میں جب حقہ تازہ کر کے آیا تو چوہدری نے پوچھا۔ "اس کا پانی بھی تبدیل کیا ہے یا نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ بس پھر کیا تھا چوہدری اسی وقت درویش کا غصہ مجھ پر اتارنے لگا۔ اب میں ٹھڈے، لاتیں اور گھونسے کھا رہا تھا۔

اسی دوران فرمان آ گیا اور اپنے باپ سے بولا۔ "بابا یہ کیا کر رہے ہو۔"

اس پر میں بول پڑا۔ "کیا دیکھ نہیں رہے ہو ٹھڈے، لاتیں اور گھونسے کھا رہا ہوں، تمہارے کمینے باپ سے۔ اگر تم بھی کھانا چاہو تو آ جاؤ۔"

چوہدری سانس لینے کی خاطر رک گیا تو فرمان بولا۔

"وسیم بھاگ جاؤ۔" اس پر چوہدری کرم دین فرمان کی طرف غصے سے بڑھا تو مجھے موقع مل گیا۔

میں لہولہان ہو گیا تھا۔ ایسی زیادتی کب تک برداشت کرتا۔ ویسے بھی آپ روزانہ کسی پر ظلم ڈھائیں تو وہ کب تک برداشت کرے گا اور ایک دن ضرور خطرناک ہو جائے گا۔ میں ایک دم اٹھا اور حقے کی آگ سے بھری ہوئی چلم جس میں کوئلے اپنی آب وتاب پر تھے اسے فوراً ہی چوہدری کرم دین پر الٹ دیا۔ چوہدری کو اس طرح کی کارروائی کا بھی خواب بھی نہ آیا ہوگا اسی لیے یہاں وہاں دہکتے ہوئے کوئلے گرے اور چوہدری بری طرح جل گیا تھا۔ زیادہ کوئلے چوہدری کے منہ پر ہی گرے تھے۔ چوہدری کا جسم آبلوں سے بھر گیا تھا۔

چوہدری اس ناگہانی کی وجہ سے ابھی سوچنے سمجھنے کی کیفیت میں نہیں آیا تھا کہ میں ڈر کے مارے وہاں سے بھاگ نکلا اور حویلی کے بڑے گیٹ باہر نکل گیا۔ حویلی کا گیٹ ضرورت کے وقت ہی پورا کھولا جاتا تھا ورنہ ساتھ ایک چھوٹا دروازہ آنے جانے کے لیے استعمال ہوتا تھا لیکن اس وقت ایک ٹرک حویلی میں کچھ سامان لے کر آیا تھا۔ گیہوں، اناج کے گودام بھی حویلی میں ہی تھے۔ اسی وجہ سے حویلی کا بڑا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ وہی میرے کام آ گیا تھا۔ اس گیٹ پر ہمہ وقت ایک چوکیدار موجود رہتا تھا۔ چوکیدار حیران سا مجھے بھاگتا ہوا دیکھتا رہ گیا اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں کیوں بھاگ رہا ہوں کیوں کہ پہلے کبھی میں اتنی تیز نہیں بھاگا تھا۔

چوہدری کی شور مچاتی آواز چوکیدار کو مجھے روکنے کا کہہ رہی تھی لیکن جب تک چوکیدار بات سمجھتا میں اس کی پہنچ سے دور ہو چکا تھا اسی وقت شاید چوہدری نے کتوں کے رکھوالوں منظورے اور ظہورے کو میرے پیچھے کتے چھوڑنے کا کہہ دیا تھا۔ کتوں کو دور سے میں بھاگتا ہوا نظر آ گیا تھا۔ لہٰذا وہ مجھے بھاگتا دیکھ کر خود بھی بھونکتے ہوئے میرے پیچھے بھاگے تھے۔ مجھے بھی پتا چل گیا تھا کہ خونخوار کتے مجھ پر چھوڑے گئے ہیں۔ میں ان کی خونخواری پہلے کئی بار دیکھ چکا تھا کہ وہ آدمی پر جھپٹ کر کیسے اسے منٹوں میں ختم کر دیتے ہیں۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اگر میں ان کے قابو آ گیا تو وہ میرا آخری دن ہوگا۔

میں بھی جان بچانے کے لیے بھاگ رہا تھا۔ دونوں رکھوالے بھی کتوں کے پیچھے تھے اور اب میں یہاں تھا۔ جب میں چپ ہوا تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ اچانک میری نظر ایک جھاڑی پر پڑی دونوں کتے وہاں بیٹھے ہوئے تھے اس پر چچا حشمت اور عظمت نے مجھے بتایا کہ یہ کتے تمہیں بہت چاہتے ہیں یہ رات ہی سے یہاں ہیں اور واپس بھی نہیں گئے۔ میں نے ان سے ایک گوشت کا ٹکڑا لیا اور ڈرتا ہوا ان کے قریب گیا تو دونوں کتے فوراً ہی اپنی دم ہلانے لگے۔ میں نے ان کو گوشت کھلایا تو میں ان کے بہت قریب چلا آیا تھا۔ حویلی میں دن کے وقت یہ پنجرے میں ہوتے تھے۔ اس لیے آج پہلی بار میں ان سے کھلی جگہ ان کے سامنے تھا۔ پھر وہ میرے قدموں میں لوٹنے لگے میرا ڈر ختم ہو چکا تھا میں ان کے جسموں پر آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ پھیرنے لگا اب مجھے دوسرے کتوں کی فکر تھی کہ وہ کہاں ہوں گے لیکن نوکروں نے صرف یہی دونوں کتے چھوڑے تھے باقی دونوں حویلی کے پنجرے میں بند تھے۔

☆......☆

دوسرے دن سہ پہر کے قریب دونوں حکیموں کے ساتھ میں اور میرے دونوں کتے تھے کیوں کہ کتے مجھے چھوڑ کر واپس نہیں گئے تھے اس لیے میں نے بھی انہیں ساتھ رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا جس پر حکیموں کو کوئی اعتراض نہ تھا ان کے ہاں جگہ کی کمی نہ تھی۔

حشمت اور عظمت دونوں آپس میں کزن تھے۔ ان کے گھر بھی ساتھ ساتھ تھے صرف ایک چھوٹی سی دیوار ہی درمیان میں تھی اس میں بھی ایک چھوٹا دروازہ رکھا گیا تھا۔ عظمت کی تین اولادیں تھیں۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ بیٹا سب سے چھوٹا تھا لیکن حشمت کی کوئی اولاد نہ تھی۔ جب میں ان کے ہاں آیا تو میرے لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ میں چاچا حکیم حشمت کے پاس ان کے گھر رہوں۔

ابھی ہم گھر میں داخل ہوئے ہی تھے کہ ایک آدمی باہر سے پیٹ کو پکڑ کے داخل ہوا وہ درد سے دوہرا ہوا جا رہا تھا۔ حکیموں نے فوراً اسے باہر صحن میں بٹھا دیا اور اپنی ادویات والی دکان پر گئے جو گھر کے صحن کے ایک کونے پر بنائی گئی تھی۔ اس کا ایک دروازہ باہر بازار میں بھی کھلتا تھا۔ دکان سے ایک ایک پڑیا لا کر انہوں نے اس آدمی کو دی اور کہا اسے ابھی پانی کے ساتھ کھاؤ۔ جب وہ پانی کے ساتھ پڑیا کھا چکا تو پانچ منٹ میں ہی وہ بھلا چنگا ہو چکا تھا۔ چاچا حشمت نے بتایا کہ یہ ہمارا دوست ہے اس کا نام ناظم علی چانڈیو ہے سب اسے چانڈیو صاحب کہتے ہیں۔ یہ ہمارے علاقے کے ڈپٹی کمشنر بھی ہیں۔ یہ کبھی تمہارے گاؤں چاندپور میں بھی چیف کے عہدے پر ڈیوٹی کر چکے ہیں۔ یہ بہت ہی ایماندار شخص ہے یہ ہمیشہ رشوت سے بھاگتا ہے کوئی بھی اسے خرید نہیں سکتا اور چانڈیو صاحب کی کئی بار چوہدری سے مڈبھیڑ ہو چکی ہے۔ چانڈیو صاحب جانتے ہیں چوہدری کرم دین بہت ہوشیاری سے ناجائز دھندے کرنے والا آدمی ہے اور وہ بہت ہی عیاری سے چانڈیو کے ماتحتوں سے یعنی کالی بھیڑوں سے کام لے لیتا تھا اور ہر بار بچ جاتا ہے۔ کئی بار اس نے چانڈیو صاحب کو شیشے میں اتارنے کے لیے رشوت دینے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا ہر طرح کا لالچ ناکام رہا۔ کچھ عرصے بعد چانڈیو صاحب کا تبادلہ اس علاقے میں ہو گیا جس کو شبیر آباد کا نام دیا گیا تھا۔ گاؤں چاندپور بھی ملتان کا ایک نواحی گاؤں تھا۔''

ان باتوں کے بعد ناظم علی چانڈیو صاحب بولے۔

''حشمت یار! یہ کون لڑکا ہے جسے میرے بارے میں سب کچھ بتا رہے ہو۔''

دونوں حکیم پاس پاس بیٹھے تھے جو چانڈیو صاحب کو بتانے لگے کہ میں کون ہوں اور کیسے چوہدری اکرم دین سے بچ کر نکل آیا ہوں۔

چانڈیو صاحب کہا۔ ''اب کیا ارادہ ہے؟''

حشمت چچا نے کہا۔ ''چانڈیو صاحب میری کوئی اولاد نہیں اس لیے اسے تو میں اپنے گھر ہی رکھوں گا۔''

چانڈیو ایک ہوشیار شخص تھا۔ ویسے بھی پولیس کی نوکری کرتے عرصہ ہو گیا تھا۔ اس لیے وسیع تجربے کا مالک تھا۔ مجھے بھی آدمی اچھا لگا تھا۔ کہنے لگا۔

''حشمت صاحب! پہلی بات تو یہ ہے یہ علاقہ چاندپور سے زیادہ دور نہیں اس لیے اس کا خاص خیال رکھنا ہوگا اور دوسرے نمبر پر اس کا نام تبدیل کر دیجیے گا تاکہ اسے دیکھ کر اور نام سن کر بھی خبر چوہدری تک پہنچ جائے اور میں کل ایک رجسٹر لے کر آؤں گا جس پر اس کا نام مع ولدیت درج کر کے اس کی یہاں کی رہائش اس کی شناخت کی تبدیلی کرنا ہوگی۔ اس کے بعد اگر کوئی مسئلہ پیش آئے تو مجھے اطلاع ضرور دینا۔''

چچا حشمت اور عظمت نے کہا۔ ''ہم اسے اسکول میں داخل کروانا چاہتے ہیں۔''

وہ بولا۔ ''ضرور یہ بھی نیکی ہوگی جو اس پر ہوگی۔''

دوسرے دن میرے چہرے پر ہلکی سی تبدیلی کی گئی اور اس کے ساتھ ہی میرا نام تبدیل کر کے حماد علی رکھ دیا گیا۔ مجھے سختی سے منع کیا گیا تھا کہ میں سب کو اپنا نام وسیم کی بجائے حماد علی بتاؤں۔

چند دن بعد میرا داخلہ اسکول میں ہو گیا تھا کیونکہ اسکول کا ایک ٹیچر چچا حشمت کا مرید تھا۔

حشمت چاچا نے بتایا کہ وہ ٹیچر ایک دفعہ بہت زیادہ بیمار ہو گیا تھا ہر جگہ سے ادویات لے کر کھانے پر بھی اسے آرام نہ آیا تو ایک دن کسی نے ہمارے پاس آنے کا مشورہ دیا تو یہ یہاں آ گیا اور پھر چند دن میں ہماری دوائی کھانے سے ٹھیک ہو گیا تھا اس کے بعد سے یہ ہماری بہت عزت کرتا ہے۔''

حشمت چاچا کی بیوی جسے میں اب چاچی کہنے لگا تھا بہت اچھی عورت تھی۔ اس نے مجھے حماد کی بجائے ہادی کہنا شروع کر دیا۔ ویسے مجھے خود کو ہادی کہنے پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ ویسے بھی جب میں وسیم کی بجائے حماد بن چکا تھا، تبدیلی سے چہرے پر زیادہ فرق تو نہ پڑا تھا لیکن دور سے دیکھنے پر میں پہچانا نہیں جاتا تھا۔

اب میں روزانہ دوسرے چچا عظمت کے بچوں کے ساتھ اسکول جانے لگا اور شام کو کچھ دیر کے لیے

دکان پر بیٹھ کر چچا حشمت اور چچا عظمت کو دوائیاں تیار کرتے اور مریضوں کو دیتے دیکھتا رہتا۔ کبھی کبھی جب وہ کسی جنگل میں جاتے تو مجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ جب کئی بار ہم چاندپور کے قریبی جنگل جہاں میں پہلی بار انہیں ملا تھا جاتے تو میرا دل چاہتا کہ چوری چھپے بھی ایک بار حویلی کا چکر لگا کر عاتکہ اور ثریا بیگم کی خیریت دریافت کروں لیکن وہاں جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس ڈر سے کہ بعد میں کوئی مسئلہ نہ بن جائے چپ رہتا تھا۔

☆......☆

آہستہ آہستہ وقت گزرتا گیا اور میں اسکول سے میٹرک میں اچھے نمبروں سے پاس ہو گیا۔ پاس ہونے کی خوشی میں دونوں حکیموں نے ایک پارٹی کا اہتمام کیا جس میں چانڈیو صاحب کے ساتھ کئی پولیس والے بھی شریک تھے۔

کالج میں داخلہ لینے کے لیے ایک ماہ باقی تھا۔ چچا حشمت اور عظمت کے ساتھ جنگلوں میں شکار کر کے خوب انجوائے کیا۔ اس ایک ماہ میں، میں بھی جنگلوں کے نشیب و فراز کو جان گیا تھا۔ لہٰذا ایک ماہ کے علاوہ بھی گرمیوں کی تین ماہ کی چھٹیوں میں ہم سب خوب انجوائے کرتے رہتے تھے۔ عائشہ، کرن، ان کا بھائی عمر اقبال اور چوتھا ان کے ساتھ میں ہوتا تھا۔

ایک دن میں اپنے ایک ٹیچر اور ناظم علی چانڈیو ڈپٹی کمشنر کے ساتھ کالج گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی میرا داخلہ اسی کالج میں رجسٹرڈ ہو چکا تھا۔ ٹیچر صاحب اور چانڈیو صاحب تو فوراً ہی واپس چلے گئے تھے لیکن میں ابھی کالج کی پرنسپل میڈم روبینہ کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا اور وہ مجھ سے ادب، معاشرت اور میری نجی زندگی کے متعلق پوچھ رہی تھیں۔ میں ان کے جواب دیتا جا رہا تھا ایک طرح سے یہ میرا انٹرویو بھی تھا کیونکہ میرا رزلٹ اچھا تھا اس کے علاوہ میری سفارش بھی بڑی تھی لہٰذا اسی وجہ سے میڈم روبینہ بہت اعتماد کے ساتھ بے تکلف نظر آ رہی تھیں۔ وہ مجھ سے بے حد خوش تھی۔ میرے اسکول کے کئی کلاس فیلوز بھی یہاں داخلہ لے چکے تھے لیکن سب کا شعبہ علیحدہ تھا۔ چچا عظمت کی دونوں بیٹیاں عائشہ اور کرن نے بھی ایک اور شعبہ چنا تھا۔

میں جب کمرے سے باہر نکلا تو مجھے قریبی پلاٹ میں ایک بینچ پر ایک تنہا لڑکی بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ وہ سر جھکائے کسی پریشانی میں مبتلا نظر آ رہی تھی۔ میں لڑکیوں سے زیادہ فری نہیں ہوتا تھا۔ میرے دل میں تو صرف عاتکہ ہی براجمان تھی۔ لہٰذا کچھ سوچ کر میں اس کی مدد کو آگے بڑھا اور قریب جا کر میں نے سلام کیا۔ لڑکی یکدم چونکی اور بولی۔

''جی فرمایئے۔''

میں اسے دیکھتے ہی سب کچھ بھول گیا تھا لڑکی بھی حیرانی سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا وہ لڑکی میری بچپن کی ساتھی اور کلاس فیلو عاتکہ تھی۔ جسے میں نے تقریباً 6 برس پہلے دیکھا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گئی تھی۔

اس پر وہ بولی۔ ''ہیلو مسٹر! اس طرح گھور گھور کر کیا دیکھ رہے ہو۔ کیا کبھی کوئی لڑکی نہیں دیکھی یا میں ان سب لڑکیوں سے زیادہ خوب صورت ہوں جن سے تم پہلے فلرٹ کر چکے ہو۔''

میں اس کی بات سن کر واپس اپنے حواسوں میں آ گیا تھا لیکن کچھ سوچ کر اپنے بارے میں نہ بتانے کا فیصلہ کیا کیوں کہ وہ بھی مجھے نہیں پہچان سکی تھی۔ میں ہوش میں آتے ہی بولا۔

''سوری آئی ایم ویری سوری دراصل میں آپ کو تنہا اور پریشان دیکھ کر ادھر چلا آیا کہ شاید آپ کو میری مدد کی ضرورت ہو اور عاتکہ صاحبہ کیا آپ مجھے اپنی پریشانی بتانا پسند کریں گی؟''

اچانک میرے منہ سے اپنا نام لیے جانے پر وہ یوں اچھلی جیسے کوئی ڈراؤنی شکل دیکھ لی ہو۔

''تمہیں میرا نام کس نے بتایا'' اس نے حیرانی سے کہا۔

میں اس کا نام لے کر غلطی کر چکا تھا۔ میں نے فوراً ہی بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

''جی آپ کی گود میں رکھے ڈاکومنٹ میں آپ کا نام لکھا ہوا نظر آ رہا ہے۔'' حالانکہ ایسی کوئی بات

نہ تھی وہ میرے اس جھوٹ پر کچھ نارمل ہوئی۔
کچھ دیر بعد بولی۔ ''ہاں میں آپ کو کس نام سے مخاطب کروں۔''
میں نے کہا۔ ''جی مس عاتکہ میرا نام حماد علی ہے اور سب مجھے پیار سے ہادی کہتے ہیں اس لیے آپ بھی مجھے پیار سے ہادی کہہ سکتی ہیں۔''
میری بات پر اس نے زیادہ توجہ نہ دی۔ کہنے لگی۔ ''میں اس لیے پریشان ہوں کہ میرا یہاں اس کالج میں کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ میں یہاں سے چند کلو میٹر دور ایک گاؤں چاند پور کی رہنے والی ہوں۔ گاؤں میں ہماری کافی زمینیں ہیں میرا باپ گاؤں کا چوہدری ہے لہٰذا ہمارے گاؤں میں صرف ایک ہائی اسکول ہے زیادہ تر لوگ اپنے بچوں کو اسکول سے ہٹا کر مختلف کاموں پر لگا دیتے ہیں۔''
میرے منہ سے اچانک نکلا۔ ''میں سب جانتا ہوں۔''
اس پر وہ ایک بار پھر اچھلتے ہوئے بولی۔ ''کیا، آپ کیسے جانتے ہیں؟''
میں دوسری مرتبہ بھی انجانے میں غلطی کر چکا تھا۔ فوراً ہی ایک اور جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ ''میں ایسے جانتا ہوں کہ اکثر گاؤں کے لوگ جہالت کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیے جاتے ہیں۔''
عاتکہ نے پوچھا۔ ''کیا مسٹر حماد آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟ میرا مسئلہ اس وقت کالج میں داخلے کا ہے۔ میرے نمبر کچھ کم ہونے کی وجہ سے مجھے پرنسپل صاحبہ نے واپس لوٹا دیا ہے۔''
میں نے کہا۔ ''ہاں دیکھ لیتے ہیں مجھے آپ کی مدد کر کے خوشی ہوگی۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کی میٹرک کی سند والی فائل اور ڈاکومنٹس لیے اور اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے کالج پرنسپل میڈم روبینہ کے دفتر کی طرف چل دیا۔ راستے میں جاتے ہوئے میں تمام کاغذات کو پڑھ چکا تھا۔
پرنسپل روبینہ کے کمرے میں داخل ہوا تو پرنسپل صاحبہ نے ایک نظر اٹھا کر سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بولیں۔
''جی بیٹا حماد کیا بات ہے؟''
میں نے کہا۔ ''میڈم! دراصل میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ یہ میری نئی نئی دوست بنی ہے۔ یہ چاند پور گاؤں سے آئی ہے۔ اس کا باپ ایک بڑا زمیندار ہے۔ اس کی سفارشات بھی کافی ہیں۔ ہر کام وہ منٹوں میں حل کروا لیتا ہے۔ وہ کسی وجہ سے اس کے ساتھ نہیں آ سکا لہٰذا اسے تھوڑا پرابلم ہے یہ تمام ڈاکومنٹس اور میٹرک کی سند ہے اسے آپ پہلے بھی دیکھ چکی ہیں دوبارہ بھی ایک نظر دیکھ لیجیے۔ صرف چند نمبر زکم ہونے کی صورت میں آپ نے داخلہ نہیں دیا۔ پلیز میڈم جی بہت محنتی اور ذہین لڑکی ہے۔ میری خواہش ہے کہ اسے داخلہ ضرور ملے۔''
میڈم روبینہ کو بھی یہ بچی ذہین لگی تھی پھر میرے کہنے پر انہوں نے عاتکہ سے چند سوال کیے جس کے جواب عاتکہ نے فوراً ہی دے دیے تھے۔
میڈم بولیں۔ ''ٹھیک ہے مس عاتکہ صاحبہ آپ پریشان مت ہوں آپ کو مسٹر حماد کی سفارش پر داخلہ دیا جا رہا ہے۔ آپ یہ فارم پُر کر دیں اور داخلہ فیس جمع کروا دیں۔''
میں نے داخلہ فیس اپنی جیب سے نکال کر میڈم روبینہ کے سامنے رکھ دی۔ میڈم اس حرکت پر ہلکا سا مسکرا دی تھیں۔ بولیں۔ ''مس عاتکہ پلیز اب مجھے اور حماد کو شرمندہ نہ ہونا پڑے۔''
عاتکہ کے چہرے پر تشکرانہ آنسو تھے۔
''جی میڈم میں کبھی شکایت کا موقع نہ دوں گی اور آپ کی اور مسٹر حماد کی شکر گزار رہوں گی۔''
میڈم روبینہ نے کہا۔ ''بیٹا حماد اپنی دوست کو کلاس میں لے جاؤ۔ باقی اسٹوڈنٹس بھی پہنچ گئے ہوں گے۔ میں تھوڑی دیر بعد آ کر آپ تمام لوگوں کا آپس میں تعارف کرواؤں گی اور کل سے انشاء اللہ پڑھائی شروع ہو جائے گی۔''
میڈم روبینہ سے میری اچھی خاصی جان پہچان ہو گئی تھی۔ ویسے بھی میں بہت ذہین تھا۔ میرے

انٹرویو سے انہیں اندازہ ہو گیا ہوگا۔ اسی لیے وہ مجھ پر بہت زیادہ مہربان تھیں۔

کلاس روم میں رول نمبر کی ترتیب سے لڑکے لڑکیاں بیٹھے ہوئے تھے میرا اور عاتکہ کا رول نمبر اتفاق سے آگے پیچھے تھا۔ لہٰذا ہم ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔

میں نے جب عاتکہ کو دیکھا تھا تو یہی سوچا تھا کہ میں اپنے بارے میں کچھ نہ بتاؤں گا۔ کہیں یہ واپس گاؤں میں جاکر بتا دے گی تو میرے لیے دوبارہ مشکلات کھڑی ہوسکتی تھیں۔ عاتکہ نے مجھے نہیں پہچانا تھا یہ بھی میرے حق میں بہتر ہی تھا۔

کالج پرنسپل میڈم روبینہ کلاس روم میں آئیں اور ہر ایک سے اپنا اپنا تعارف کروانے کو کہا۔ سب لڑکے اور لڑکیاں اپنا اپنا تعارف کروانے لگے۔

میری باری آئی تو میں اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا۔ ''میرا نام حماد علی ہے لیکن زیادہ تر لوگ مجھے ہادی کہتے ہیں۔ میرے والد وجاہت علی اور والدہ ایک ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ پھر مجھے ایک بہت ہی شریف خاندان جو کہ جدی پشتی حکیم تھے انہوں نے پالا اور ابھی تک میں ان کے ساتھ ہی رہ رہا ہوں۔ وہی اب میرے اپنے ہیں ان کے علاوہ میرا کوئی رشتے دار عزیز و اقارب نہیں ہیں۔ وہی میری تعلیم کے اخراجات اٹھا رہے ہیں کہ میں پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنوں۔''

جب میں اپنی سیٹ پر اپنا تعارف کروا کر بیٹھنے لگا تو میڈم بولیں۔ ''حماد کیا یہ تمہارے سگے ماں باپ نہیں ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں میڈم لیکن میرے لیے تو سگے ہی ہیں اور لوگ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ میں اسی خاندان کا بیٹا ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد تعارف کا سلسلہ بند ہوا تو میں عاتکہ کے ساتھ کلاس روم سے باہر آ گیا۔ عاتکہ اب ایک دفعہ پھر پریشان سی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''عاتکہ اب کیا پریشانی ہے؟''

عاتکہ بولی۔ ''اصل میں میرا ڈرائیور گاڑی لے گیا تھا وہ ابھی تک واپس نہیں آیا۔''

میں نے پوچھا۔ ''تو کیا ڈرائیور روزانہ تمہیں لینے کے لیے آتا جاتا رہے گا؟''

کہنے لگی۔ ''اصل میں یہاں جب تک اپنا رہنے کا انتظام کالج کے ہوسٹل میں نہیں کر لیتی اس وقت تک تو ایسا ہی ہوا کرے گا۔''

میں نے کہا۔ ''عاتکہ اگر تم چاہو تو تمہاری رہائش کے لیے جگہ ہے جو ایک تو کالج کے ہوسٹل کے قریب ہے دوسرا تمہیں اس کا کرایہ بھی نہیں ادا کرنا پڑے گا۔ وہاں دو لڑکیاں اور بھی ہیں۔ ان کی ماں ایک ان کا چھوٹا بھائی ہے اگر چاہو تو ابھی میں ان لڑکیوں سے تمہیں ملوا دیتا ہوں۔''

عائشہ اور کرن دوسرے سمسٹر میں داخلہ لے چکیں تھیں۔ وہ قریب آئیں اور کہنے لگیں۔ ''چلیں دیر ہو رہی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''عائشہ اور کرن پہلے ان سے ملو یہ میری نئی دوست بنی ہے اور عاتکہ یہ عائشہ اور کرن ہیں۔ یہ میرے چچا کی بیٹیاں ہیں اگر چاہو تو تمہاری رہائش کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔''

عاتکہ سے ملنے کے بعد وہ دونوں بہت خوش ہوئیں۔ باتوں باتوں میں ہی وہ ان کی بھی سہیلی بن چکی تھی۔ انہوں نے خود بھی اسے آفر کر دی تھی کہ وہ ان کے ساتھ ان کے گھر رہے گی اور عاتکہ بھی راضی ہو گئی۔

اسی دوران ایک گاڑی ہمارے قریب آ کر رکی۔ اس میں سے ڈرائیور اترا اور سیدھا ہماری طرف آیا۔ میرے دل میں پہچان لیے جانے کا خوف پیدا ہوا تھا لیکن میری شکل اب کافی بدل چکی تھی اس لیے مطمئن تھا ویسے بھی اگر کوئی مسئلہ بنتا تو اب میں کچھ نہ کچھ کر سکتا تھا۔

ڈرائیور نے عاتکہ کو واپس چلنے کے لیے کہا اور وہ مجھے سلام کر کے عائشہ اور کرن کے گلے ملتی ہوئی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے مجھے نہیں پہچانا

تھا یہ میرے حق میں اور بہتر تھا۔

☆......☆

دوسرے دن عاتکہ اپنے کپڑے وغیرہ اور کچھ رقم لے کر آ گئی۔ وہ کالج میں مجھے تلاش کر رہی تھی اسی وقت میں عائشہ اور کرن کے ساتھ کالج میں داخل ہوا تو وہ تیر کی طرح سیدھی ہماری طرف لپکی اور بولی۔ ''میں کافی دیر سے تم لوگوں کو تلاش کر رہی تھی۔''

میں چچا حشمت اور عظمت کو بتا چکا تھا کہ یہ لڑکی عاتکہ ہے۔ میری بچپن کی ساتھی یہ اب یہاں رہے گی لیکن اسے میرے بارے میں نہیں پتا چلنا چاہیے۔

اب میں کالج کے وقت کلاس روم زیادہ تر عاتکہ سے ملتا تھا یا پھر کبھی کبھی میں چچا عظمت کے ساتھ ان کے گھر چلا جاتا تھا حالانکہ بیچ میں صرف دیوار ہی تو تھی لیکن میں اس طرح جانا اچھا نہیں سمجھتا تھا حالانکہ لڑکیاں بھی مجھے بھائی کہتی تھیں اور سمجھتی بھی تھیں۔

دن گزر رہے تھے کہ ایک دن ہم کلاس روم سے باہر آئے تو اچانک ایک لڑکی سے عاتکہ کی ٹکر ہوگئی وہ گرتے گرتے بچی۔ اس کی کتابیں نیچے گر گئیں اور میں کھڑا زور سے ہنسے جا رہا تھا عاتکہ کتابیں اٹھانے لگی تو میں نے بھی اس کی مدد کے لیے جھک کر کتابیں اٹھائیں۔ اسی وقت میری نظر ایک تصویر پر پڑی وہ تصویر عاتکہ کی کتابوں سے گری تھی میں نے وہ تصویر اٹھائی تو عاتکہ نے جھپٹا مار کر وہ تصویر میرے ہاتھ سے لے لی۔ اصل میں وہ تصویر میرے بچپن کی تھی مجھے یاد تھا ایک دن حویلی میں ایک کیمرے والا آیا تھا تو ہم نے اس سے تصویریں اتروائی تھیں اور وہ تصویریں ماں جی یعنی ثریا بیگم کے پاس تھیں اب یہ تصویر عاتکہ کی کتابوں میں دیکھ کر مجھے کوئی حیرت نہ ہوئی تھی لیکن میرے ہنسنے کی وجہ کچھ اور تھی عاتکہ کے پوچھنے پر میں نے بتایا کہ ''میں نے تو سنا تھا لڑکے زیادہ تر لڑکیوں سے ٹکراتے ہیں پھر ان کی کتابیں گرتی ہیں تو اس کی مدد کر کے سوری بھی کہتے ہیں لیکن یہاں تو کام الٹا تھا لڑکی سے لڑکی ٹکرانے والی تھی اور وہ سوری کر کے چلتی بنی اور کتابیں اکٹھی کر کے دینا پڑھ گئیں۔''

میری بات سن کر وہ مسکرادی اور بولی۔ ''اصل میں لڑکا پہلے ٹکرا گیا تھا لیکن کتابیں گرنے کی بجائے میرے ہاتھ میں آ گئی تھیں لیکن یہ لڑکی سے ملنے کی ایک رسم ہوتی ہے جو کہ لڑکا پوری کرتا ہے یہ رسم شاید اس لڑکی نے پوری کر دی ہے۔''

جو لفظ عاتکہ کہہ رہی تھی وہ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا اس لیے میں نے عاتکہ سے کہا۔ ''اچھا یہ بتاؤ یہ تصویر کس کی تھی جو تم نے مجھے دیکھنے ہی نہیں دی۔''

اس پر عاتکہ پہلے میری طرف غور سے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''آؤ۔''

ہم ایک بینچ پر بیٹھ کر عائشہ اور کرن کا انتظار کرنے لگے اس دوران وہ بولی۔ ''مسٹر حماد! تم نے میری مدد کی ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم میرے نجی معاملات پر بھی توجہ دو۔''

میں اس کی اس بات پر حیران رہ گیا اور بولا۔ ''عاتکہ میں تمہیں دوست سمجھتا ہوں اگر آج تک میں نے کوئی حرکت یا کوئی مذاق تم سے کیا ہے تو بتاؤ۔''

کہنے لگی۔ ''اس لیے تو اب تمہارے پاس بیٹھی ہوں ورنہ میں ایسی ویسی لڑکی ہرگز نہیں ہوں اور کسی بھول میں نہیں رہنا۔ یہ بھی بتاتی چلوں کہ یہ تصویر اس لڑکے کی ہے جسے میں بے حد چاہتی ہوں اور چاہتی رہوں گی لیکن تم نہیں سمجھو گے۔'' اس کے ساتھ ہی وہ کہیں کھو گئی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

میں نے پوچھا۔ ''عاتکہ یہ تمہارے گاؤں کا ہوگا اور تم روزانہ اس سے ملتی ہو گی اور تم دونوں خوب انجوائے کرتے ہوں گے۔ سوری میں کچھ زیادہ بول گیا ہوں۔''

وہ یکدم رونے لگی۔ میں پریشان ہو گیا۔ کالج کے کئی لڑکے لڑکیاں ہماری طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا۔

''پلیز عاتکہ رونا بند کرو لوگ کیا سوچیں گے۔''

جب وہ خاموش ہوئی تو میں نے کہا۔
''عاتکہ میں نہیں جانتا تھا کہ تم اس لڑکے سے اتنی محبت کرتی ہو اگر میری کوئی بات بری لگی ہے تو پلیز مجھے معاف کردو۔ میں بالکل نہیں چاہتا تھا کہ تمہاری دل آزاری کروں۔''
عاتکہ بولی۔ ''ایسا تمہاری وجہ سے ہی ہوا ہے۔''
میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے میں تمہارے کسی کام آسکا تو ضرور آؤں گا۔''
وہ چپ رہی پھر بولی۔ ''اصل میں یہ بات نہیں ہے یہ تصویر اس عمر کی ہے جس عمر میں ہم ایک ساتھ حویلی میں رہتے تھے۔ ایک دن بابا کی وجہ سے وہ غائب ہوگیا اور کہیں جنگل کی طرف بھاگ گیا۔ رات ہوگئی تھی۔ اب پتا نہیں وہ زندہ بھی ہے یا نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور زندہ ہوگا صرف میرے لیے اور میں اسے تلاش کرتی رہوں گی۔ اب تک اسے سات آٹھ سال گزر چکے ہیں۔ حالانکہ اس کا تمہاری طرح کوئی بھی نہ تھا۔''
وہ رکی تو میں نے پوچھا۔ ''جب نسیم بھاگ گیا تھا تو کیا تمہارے والد نے اسے تلاش نہیں کروایا؟''
کہنے لگی۔ ''کروایا تھا لیکن وہ ملا نہیں اگر مل بھی جاتا تب بھی مارا جاتا لیکن تم یہ بتاؤ تمہیں کیسے پتا چلا کہ اس کا نام وسیم تھا۔''
میں یہ تیسری غلطی بھی کر چکا تھا لہٰذا اب پھر جھوٹ کا سہارا لیا اور بولا۔ ''مجھے اس لیے پتا چلا کہ مس عاتکہ آپ نے اس کا نام لیا ہے۔ ورنہ میں کون سا درویش ہوں۔''
پھر وہ حیرت سے بولی۔ ''تم اس درویش کو کیسے جانتے ہو۔''
میں نے کہا۔ ''کون سے درویش کو؟''
کہنے لگی۔ ''جس کا نام لے رہے ہو۔''
میں نے کہا۔ ''میں نے تو کسی درویش کا نام نہیں لیا۔ صرف درویش کہا ہے یعنی پہلے سے باتیں جاننے والا درویش وہ کوئی بھی ہوسکتا ہے۔''
وہ بے یقینی کی کیفیت میں بولی۔ ''حماد پتا نہیں

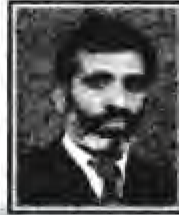
کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم سب کچھ جانتے ہو لیکن مجھے بتاتے نہیں۔ کبھی کبھی لگتا ہے کہ تم ہی وسیم ہو میرے وسیم جو مجھ سے آٹھ سال پہلے بچھڑے تھے۔''
میں اس کی بات پر چونکا ضرور تھا۔ پھر بولا۔ ''تمہیں شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''
کہنے لگی۔ ''جب پہلے دن تم مجھ سے ملے تھے تو مجھے تمہارا چہرہ وسیم سے ملتا جلتا لگا تھا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے سامنے وسیم ہی حماد بن کر آگیا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے تمہاری دوستی اور تمام احسان لے لیے تھے ورنہ میں کسی کا احسان نہیں لیتی۔ آخر بڑے باپ کی بیٹی ہوں جو ہر کام کروانا جانتا ہے۔''
میں نے کہا۔ ''عاتکہ اب تم جذبات میں بول رہی ہو پتا نہیں کیا کہے جا رہی ہو اس سے بہتر ہے یہاں سے چلتے ہیں۔''
عائشہ اور کرن ابھی تک کلاس سے باہر نہیں آئی تھیں۔ عاتکہ بولی۔ ''ابھی بیٹھو ایسی کوئی بات نہیں وہ دونوں آتی ہیں تو ساتھ میں چلیں گے۔''
کچھ دیر خاموشی کے بعد عاتکہ بولی۔ ''وسیم کو بابا نے بہت تلاش کروایا۔ صبح ہوتے ہی پورا جنگل چھان مارا لیکن وسیم تو نہ ملا مگر ایک جگہ ہمارے دونوں نوکروں کی ادھ کھائی ہوئی لاشیں جو کسی جانور نے کھائی تھیں ان کے ساتھ ہی ایک چیتے کی باقیات بھی پڑی ہوئی تھیں ملی تھیں۔ اس پر بابا نے سوچا کہ وسیم بھی کسی جانور کی خوراک بن گیا ہوگا۔ کچھ دور ایک درویش جو کہ بابا کو پہلے بھی مل چکا تھا دیکھا تو اس نے بابا کو کہا جس کی حفاظت کا ذمہ خدا کے سر ہو اس کا تو بال بھی بیکا نہیں کرسکتا اور جس کی موت لکھی گئی ہو اسے کوئی بچا نہیں سکتا اس لیے آخرت کے لیے تیاری کرلو۔ جاؤ چلے جاؤ جسے تلاش کر رہے ہو وہ یہاں سے جا چکا ہے اس لیے اس کو تلاش کرنے کی بجائے روز آخرت کے لیے کچھ جمع کرلو اور توبہ کرلو شاید کہ تم پر آنے والا عذاب ٹل جائے جاؤ چلے جاؤ۔''
جاری ہے

توشہ خاص، خوان جنت رنگ حکایتیں

مختصر مختصر، خوش بیاں، فرحت ساماں، زہر کار، عبرت اثر حکایتیں

داتا کی نگری سے پہلی حکایت

جنت کی چڑیا



عبدالعزیز جی آ

میکے کی اُن چڑیوں کی دکھ بیتی، جس سے اکثر بابل کی چڑیاں گزرتی ہیں

پچھلے ویک اینڈ پر گھر گیا تو والدہ کی قبر پر دعا کرنے قبرستان چلا گیا قبرستان کی حدود پر پہنچ کر میں نے موٹر سائیکل سائیڈ پر کھڑی کی اور ایک طائرانہ نگاہ اس خاموش چپ چاپ ویران بستی پر ڈالی تو دل پر ایک عجیب سی بے جان جسموں والے شہر جیسی اداسی چھا گئی۔

حدیث مبارک ہے کہ جب تم قبرستان میں داخل ہونے لگو تو کہو السلام علیکم یا اھل القبور'' ترجمہ'' اے قبروں میں رہنے والوں تم پر سلامتی ہو۔ وہ جواب دیتے ہیں۔ جن کو سننے سے تمہارے کان قاصر ہیں ایک اور جگہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا'' والدین کی قبروں پر ان کی اولاد کا جانا حج جتنا ثواب ہے۔'' میں خودرو جنگلی بوٹیوں اور جھاڑیوں سے دامن بچاتا والدہ کی قبر کی طرف بڑھا۔ تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ چھ ماہ میں والدہ کی قبر کے ساتھ اچھی خاصی تازہ قبروں کا اضافہ ہو گیا تھا اور مجھے اپنی والدہ کی قبر ڈھونڈنا پڑی۔ مجھے خیال آیا کہ والدہ کی قبر کے دائیں جانب ایک بہت بڑا جھاڑ تھا اب تو وہ میرے قد سے بھی اونچا نکل گیا تھا۔

اس اجڑی ہوئی بستی خودرو جنگلی بوٹیوں اور جھاڑیوں، ٹوٹی پھوٹی خستہ حال قبروں جن میں حالیہ بارشوں سے بڑے بڑے شگاف پڑ گئے تھے، میں حشرات الارض، کیڑے مکوڑوں سانپ اور بچھو اور کتے کے بچوں کی آماجگاہوں کو دیکھ کر بھی خیال نہیں آتا کہ ہم قبرستانوں کی مناسب دیکھ بھال اور معقول انتظامات کی طرف توجہ دیں۔

والدہ کی قبر پر کافی گھاس اگ آئی تھی میں بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے گھاس توڑنے لگا اور یادوں کے کنویں سے غم کے بوکے کھینچنے لگا۔

ماں جی کل میں اپنے گاؤں چلا گیا تھا۔ مدتوں بعد اپنے آبائی گھر کی یاد آئی تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ ماں جی جب میں اپنے گھر کے صحن میں پہنچا تو صحن میں لگا ہوا ''کواں'' کا درخت یوں لگا جیسے مجھے دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھا ہو اور مجھے اپنی ٹھنڈی چھاؤں کی آغوش میں بھر لیا بے خودی کے عالم میں، میں نے درخت کے تنے کی بوڑھی کھال پر بوسا دیا۔ تو میرے آنکھوں کے سوتے پھوٹ پڑے۔ دائیں طرف نظر اٹھی تو آپ کٹھیالی میں بیٹھی ہم بہن بھائیوں کو ناشتا بنا کے دے رہی تھیں۔ مٹی کے چولھے میں اپلے اور سوریاں جل رہی ہیں۔ جو آپ

گائے اور بھینسوں کا گوبر اکٹھا کر کے گول گول تھاپتی تھیں اور جب وہ خشک ہو جاتے تو انہیں مٹی کے چولھے کے قریب اوپر تلے ایک ترتیب کے ساتھ لگا دیتی تھیں۔ ماں جی کواں کے درخت کے مڈھ میں بیتل بکری کا کلا تھا جس کے ساتھ آپ اسے باندھتی تھیں۔ وہ بہت دودھ دیتی تھی یاد ہے آپ نے اس کا نام حیا تو مسلن رکھا ہوا تھا۔ جب بھی آپ اسے بلاتی تھیں وہ آگے سے بولتی تھی وہ اپنا نام پہچانتی تھی۔ اور اس بکری کے بچے ''بکرو ٹے'' جن کا نام والد صاحب نے ''موتے سان'' رکھا ہوا تھا۔ گوری آنکھوں والے کتنے پیارے تھے۔ ماں جی اب میں مویشیوں کے کوٹھے کی جگہ کھڑا ہوں۔ کوٹھے کی جگہ اب کھولا ہے کوٹھے کے ساتھ تندور ہوا کرتا تھا۔ آپ جب سرشام اس پر روٹیاں لگا رہی ہوتیں تو میری گوگی ساتھ ضرور لگاتیں۔ وہ گوگی (جسے میں گوگا کہتا تھا) پک جاتی تو آپ سرکنڈے پر لگا کر مجھے پکڑا دیتیں۔

ماں جی آپ کی بے لوث محبت پیار اور خلوص جس کا اثر آج بھی میں اپنے دل و دماغ میں محسوس کرتا ہوں۔ سب کچھ خالص اور سچا تھا ایک تعلق ابدی تھا۔ ماں جی اب میں اس طرف بڑھ رہا ہوں جہاں رہائشی کمرے تھے۔ بڑا کمرہ (محل) آپ نے کس قدر محنت اور لگن سے سجا رکھا تھا۔ ہم بچوں کو اندر جانے سونے بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی وہ اکثر بند رہتا۔ دور دراز کے پنڈ سے جب کوئی مہمان آ جاتا تو اس میں ٹھہرایا جاتا۔ بڑے کمرے کے ساتھ اگلی کوٹھی تھی جس میں ہر قسم کا اناج سے ڈولے چٹورے بھرے ہوتے اور گلھوٹے گندم سے اگلی کوٹھی سے اندرونی دروازہ رسوئی میں کھلتا تھا جس میں ہم رہتے تھے۔ ماں جی آپ کا دور بڑا حسین دور تھا نہ کوئی جھوٹ فریب تھا نہ دھوکے بازی۔ مکان کچے تھے مگر لوگ سچے تھے ایک دوسرے پر جان دیتے تھے خیال رکھتے تھے۔ ماں جی اب میں پھر صحن میں آ گیا ہوں۔

بنا دروازے کے گھر کے ویہڑے میں، میں نے پاؤں پاؤں چلنا سیکھا تھا۔ میرا بچپن میرے ارد گرد ہی کہیں ہمک رہا ہے۔ اور ماں جی آپ کی یادیں میرے دائیں بائیں گھوم رہی ہیں، لیکن آپ نہیں ہیں، میں آپ کو کہاں ڈھونڈوں ماں........ ماں جی اب صرف آپ کی یادوں کی خوشبو ہے۔ باقی سب کچھ بے روح ہے اب نہ وہ گھر ہے نہ در ہے ایک بغیر چھت کے ویران کھولا ہے گھاس ہے کائی ہے سر ہے اور حشرات الارض کا گھر ہے۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک مجھے اپنی پیٹھ پیچھے جھاڑ کی دوسری جانب کسی خاتون کے رونے کی آواز آئی۔ رونے کرلانے اور بین کرنے کی آواز جب تیز ہوئی۔ تو میں نے اٹھ کر جھاڑ کے دائیں جانب سے

جھانک کر دیکھا۔ ایک بیس بائیس سال کی نوجوان لڑکی تازہ قبر پر گلاب کی تازہ پتیاں ڈالتے ہوئے زاروقطار روئے جارہی تھی ۔ مجھے یوں لگا جیسے پوری کائنات اس حوا کی بیٹی کی آہ وفغاں میں ڈوب گئی ہو۔ اس کی دلدوز چیخیں سن کر مجھے اپنا سینہ شق ہوتا محسوس ہوا۔ میں پہلے ہی والدہ کے غم میں دل گرفتہ تھا اس لڑکی کی آہ و بکا نے مزید دکھی کردیا۔

وہ اپنے باپ کی قبر پر آنسوؤں کے نذرانے پیش کرتے ہوئے بین کررہی تھی۔

''ہائے ربا جب مجھے پتا چلا میرے ابو فوت ہو گئے ہیں تو یہ خبر مجھ پر بجلی بن کر گری۔ اس اطلاع نے مجھے توڑ پھوڑ کے رکھ دیا۔ ہائے مجھے یوں لگا ابو جی جیسے مجھ پر آسمان گر گیا ہو۔ میرا جگر پاش پاش ہو گیا میں ریزوں میں بٹ گئی ابو جی۔''

وہ دھاڑیں مار کے رو رہی تھی۔

''پیارے ابو جی اٹھیں ناں...... دیکھیں آپ کی بیٹی آئی ہے۔ آپ تو مجھے جنت کی چڑیا کہتے تھے۔ آپ نے مجھ سے کیوں منہ موڑ لیا۔ اپنے اوپر منوں مٹی کو اوڑھ لیا۔ تو ہی بتا میرے ربا کہاں ڈھونڈوں اپنے ابو کو...... ابو جی آج ارشد نے مجھ کو تھپڑ مارا ہے۔''

وہ شکایت بھرے لہجے میں مٹی کی ڈھیری پر ہاتھ مارتے ہوئے کرلائی۔

''کہتا ہے مرنا ایک دن سب کو ہے تیرا باپ کوئی انوکھا اور دنیا سے وکھرا نہیں مرگیا۔ اب رونا دھونا بند کر۔ ابو جی آپ ہوتے تو ایسے کرنے دیتے۔ امی کو بھی جانے کی بہت جلدی تھی۔ آج آپ بھی چلے گئے۔ بتائیں ابو مجھے کس کے حوالے کر گئے۔ ارشد میرا بالکل خیال نہیں رکھتا۔ آپ تو جانتے تھے وہ ماں کی مانتا ہے اگر اس نے مجھے گھر سے نکال دیا تو میں کہاں جاؤں گی ابو...... میکہ تو والدین کے دم کے ساتھ ہوتا ہے۔ بھائی تو اپنی بیویوں کا دم بھرتے ہیں۔''

وہ روئے جارہی تھی اور ساتھ ساتھ اپنے سسرالی رشتوں کی شکایتیں بھی کررہی تھی۔ میں جھاڑ کے پیچھے کھڑا خاموش آنسو بہائے جارہا تھا۔ میرا اپنی بیٹیوں کی طرف خیال چلا گیا۔ بیٹیوں کی پیدائش سے کوئی نہیں ڈرتا ان کے نصیبوں سے ہر ماں اور ہر باپ ڈرتا ہے۔

میں نے اکثر گھرانے دیکھے ہیں جہاں بیٹیوں کی قدر نہیں کی جاتی پرایا دھن سمجھا جاتا ہے۔ اور جس گھر میں پیدا نہ ہوں وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔

بیٹیاں سسرال میں بھلے ہی خوشحال کیوں نہ ہوں۔ انہیں میکے گھر کی دہلیز پر بیتے ہر لمحے کی یاد ستاتی ہے۔ ماں باپ کی انمول محبت اور شفقت گزشتہ زندگی بچپن کے گڑیاں پٹولے لڑکپن کے کھیل اور جوانی کی حسین یادیں حتیٰ کہ میکے گھر کی دال ساگ چٹنی کو بھی نہیں بھولتی ہیں، ہمیشہ یاد رکھتی ہیں۔

اچانک کچھ فاصلے پر موٹر سائیکل رکنے اور ہارن کی آواز پر میں چونکا اور ذرا پیچھے سرک کر جھاڑ کی اوٹ میں ہو گیا۔ وہاں سے آنے والے کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ آنے والا دور سے ہی دہاڑا۔

''عالیہ کتنی دیر ہوگئی تجھے قبرستان آئے ہوئے، گھر مہمان آئے ہوئے ہیں۔ تجھے کوئی فکر نہیں۔ تیرے باپ کا مرنا کوئی دنیا سے وکھرا تو نہیں ہوا۔ چل اٹھ جلدی کر۔''

الفاظ تھے یا زہر آلود سنگریزے جو سماعتوں کو چیرتے ہوئے جگر میں پیوست ہو گئے۔ ڈر کے مارے عالیہ بے چاری کا رنگ فق ہو گیا۔ زبان خشک اور لب خاموش۔ اس نے کانپتے ہاتھوں باپ کی قبر سے تھوڑی سی مٹی اٹھا کر اپنے دوپٹے کے پلو میں باندھی، کچی مٹی کی اس ڈھیری پر الوداعی بوسہ دیا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بڑی مشکل سے اٹھی۔ جیسے برسوں کی مریضہ ہو۔ لڑکھڑاتے قدموں اس موٹر سائیکل سوار (جو یقیناً اس کا شوہر ارشد ہی تھا) کے پیچھے جا بیٹھی۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور پھر آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئی۔ میں جھاڑ کی اوٹ سے نکلا۔ میں نے دیکھا ایک آدم نما اپنے پیچھے موٹر سائیکل پر ایک زندہ لاش کو بٹھائے تیزی سے گاؤں کی طرف جارہا تھا۔ نجانے گھر جا کر اس دکھی اور مظلوم لڑکی کے ساتھ وہ ظالم جاہل اور گنوار کیا حشر کرے گا۔ یہ خیال مجھے مزید دکھی کر گیا۔ میں نے جیب سے رومال نکالا اپنے آنسو پونچھے والدہ کی قبر کو الوداعی بوسہ دیا اور گھر کی راہ لی۔ وہ جنت کی چڑیا اپنی روح اپنے ابو کی ڈھیری پر ڈھیر کرتی شوہر کے ساتھ اُڑ گئی تھی۔

☆☆☆

رکھوالا



محمد شاہد رانا

اُن لوگوں کے لیے بطورِ خاص' جو ایمان کو جان سے زیادہ عزیز جانتے ہیں

''بھائی صاحب یہ بکس بیڈ کے ساتھ رکھ دیجیے۔ یہاں سے کہیں نہیں جائے گا۔'' ڈاکٹر صاحب نے جب دوسری بار قدرے زور دے کر کہا کہ تو خادم حسین نے بکس کو بیڈ کے ساتھ رکھ دیا۔ ڈاکٹر، نرسیں حیران تھے کہ خادم حسین نے اس بکس کو اپنے ساتھ کیوں چمٹایا ہوا ہے۔ حالانکہ اس کمرے میں ڈاکٹر اور اس کے اسٹاف کے علاوہ کوئی بھی بغیر اجازت نہیں آسکتا تھا مگر شاید اسپتال کا عملہ یہ نہیں جانتا تھا کہ خادم حسین کے لیے وہ بکس کتنا قیمتی تھا۔

خادم حسین راولپنڈی کے ایک نزدیکی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ کام دھندے کے لیے کراچی آیا تو یہاں اسے معقول تنخواہ کی ملازمت مل گئی۔ ایک بیکری والے نے اسے اپنا مددگار رکھ لیا۔ چھ ماہ تک کام کرنے کے بعد جب اسے گاؤں کی یاد آئی مالک سے چھٹی کی اجازت مانگی تو اس نے خادم حسین سے کہا۔ ''ٹھیک ہے تم پندرہ بیس دن کی چھٹی لے لو مگر میرا ابھی ایک کام کر دینا۔ تم تو جانتے ہو

میرا ایک بھائی راولپنڈی میں ہے۔ ایک ہفتے بعد اس کی بیٹی کی شادی ہے۔ وہ اتنا مالدار نہیں ہے کہ اپنی بیٹی کی اچھے طریقے سے رخصتی کر سکتے۔ میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں لیکن میں بیکری کو بند کر کے بھی نہیں جا سکتا اور کسی پر اعتبار بھی نہیں ہے۔ تم پر مجھے اپنے سے زیادہ اعتماد ہے۔ اس لیے میں تمہیں کچھ چیزیں اور پیسے دے رہا ہوں۔ انہیں حفاظت سے میرے بھائی گل محمد تک پہنچا دینا۔"

"میں انشاء آپ کے اعتماد پر پورا اتروں گا اور ہر چیز حفاظت سے آپ کے بھائی تک پہنچا دوں گا۔" خادم حسین نے اپنے مالک طفیل محمد سے کہا اور مقررہ دن وہ امانت جو ایک بکس تھا، لے کر راولپنڈی کے لیے روانہ ہو گیا۔

راولپنڈی ریلوے اسٹیشن پر اترنے کے بعد وہ رکشے پر بیٹھا اور رکشے والے کو مطلوبہ ایڈریس پر پہنچنے کے لیے کہا۔ رکشے والا اچانک ایک سڑک سے دوسری پر جانے کے لیے مڑا تو پیچھے سے تیز رفتار کار کی پچھلی سائیڈ رکشے کو لگی۔ خادم حسین اور رکشے والا دونوں دور جا گرے۔ لوگوں نے اٹھایا۔ اسپتال پہنچایا۔ خادم حسین کے سر اور ٹانگوں میں شدید چوٹیں آئیں۔ سر سے خون رس رہا تھا۔ خادم حسین کے سر پر تین ٹانکے لگے اور ڈاکٹرز نے اسے چیک کرنے کے بعد ایک کمرے میں شفٹ کر دیا اور مکمل آرام کا مشورہ دیا۔ خادم حسین کے سڑک سے اسپتال پہنچنے کے دوران اور بعد میں ایک ہی رٹ تھی کہ میرا بکس کہاں ہے۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر اسے ایک گھڑی دی، تو وہ چلایا۔ نہیں بھائی اس کے ساتھ ایک بکس بھی تھا۔ پھر کمرے کی ایک سائیڈ پر رکھا اسے بکس دیا گیا تو اسے کچھ سکون ہوا۔ اس دوران ایک نرس کو غصہ آ گیا۔ "تم عجیب شخص ہو، اپنی جان سے زیادہ اس بکس کو اہمیت دے رہے ہو۔ اس میں ہیرے جواہرات ہیں کیا؟"

"اس میں ہیرے جواہرات سے بھی بڑھ کر کچھ ہے۔ بس تم نہیں جان سکتے۔" خادم حسین نے کہا اور اس بکس کو اپنے بیڈ کے ساتھ ہی رکھ لیا۔ دو دن گزر گئے لیکن خادم حسین کی ٹانگوں میں اتنی جان نہ تھی کہ وہ تھوڑی دور تک آرام سے چل سکتا وہ فکر مند ہو رہا تھا کیونکہ مالک طفیل محمد نے تاکید کی تھی کہ ایک ہفتے بعد اس کے بھائی گل محمد کی بیٹی کی شادی ہے اور یہ سامان اور پیسے اس کی شادی کے لیے ہیں۔ اگر میں ٹھیک نہ ہوا تو یہ امانت گل محمد تک کیسے پہنچے گی...... وہ یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہا تھا۔ تیسرے دن اس نے بیڈ سے اٹھ کر چلنے کی کوشش کی مگر لڑکھڑا گیا۔ کمرے میں اس وقت کوئی نہ تھا۔ اس نے ہمت کی اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اس دوران اس نے کمرے کے تین چکر لگائے تو اس کی جان میں جان آئی۔ اچانک کمرے میں نرس داخل ہوئی تو اس نے غصے سے کہا۔ "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ ایکسیڈنٹ کے بعد آپ کی ٹانگوں سے کافی خون ضائع ہوا تھا اس لیے ابھی آپ اس قابل نہیں ہیں کہ چل پھر سکیں۔"

"بی بی صاحبہ! مجھے جلدی ٹھیک کرو۔ مجھے کل ہر صورت ایک کام سے جانا ہے۔ یہاں پر یہ جگہ کہاں ہے؟" خادم حسین نے ایک پرچی نرس کے آگے کر دی۔

"یہ جگہ یہاں سے تقریباً آدھے گھنٹے کی مسافت پر ہے اور وہ بھی رکشے پر۔" "مگر تمہارا جانا ضروری کیوں ہے؟" نرس نے پوچھا تو خادم حسین بولا۔ "بی بی جی! اصل میں کراچی جہاں پر میں کام کرتا تھا میرے مالک نے ایک امانت یہ بکس اور کچھ پیسے دیے تھے یہ ایڈریس ان کے بھائی کا ہے۔ میں یہ امانت وہاں پہنچانا چاہتا ہوں۔ تین دن بعد ان کی بیٹی کی شادی ہے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں کسی وارڈ بوائے سے کہوں گی تو وہ مطلوبہ ایڈریس تک یہ چیزیں پہنچا دے گا۔" نرس نے تیزی سے کہا اور انجکشن بھرنے لگی۔ "میں یہ کام خود کروں گا۔ مجھے اس وقت تک تسلی نہیں ہو گی جب تک میں خود اپنے ہاتھوں سے یہ امانت، مطلوبہ جگہ تک نہیں پہنچا دیتا۔" خادم حسین نے بکس پر ہاتھ رکھ کر کہا اور نرس اسے انجکشن لگانے لگی۔

"مگر فی الحال تم تین سے چار دنوں تک کہیں آنے جانے کے قابل نہیں ہو۔" انجکشن کے بعد خادم حسین پر غنودگی چھا گئی۔

☆......☆

رات کے کسی پہر اس کی آنکھ کھلی تو اس کے کان میں نرس کا آخری جملہ گونج رہا تھا "فی الحال تم تین سے چار دن تک چل پھر نہیں سکتے۔" اس کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔

"اگر میں یہ امانت وقت پر نہ پہنچا سکا تو گل محمد کی بیٹی کی شادی......" اس کے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔ "میں ہر حالت میں یہ امانت پہنچاؤں گا۔" اس نے ایک پختہ عزم کے ساتھ اپنے آپ سے کہا۔ رات بھر وہ یہ سوچتا رہا کہ دن میں اسے جانے کون دے گا۔ ڈاکٹر اور نرسیں بھی وقتاً فوقتاً آتی رہیں گی۔ اسے صبح صبح فجر کے فوراً بعد یہ کام کرنا چاہیے۔ یہ سوچتے ہوئے اسے نیند نہ آئی اور وہ بکس کے حوالے سے پریشان ہی رہا۔ مختلف وسوسے اسے تنگ کرتے رہے کہ اگر میں یہ امانت گل محمد

تک وقت پر نہ پہنچ سکا تو یہ ہو جائے گا، وہ ہو جائے گا۔ ابھی وہ انہی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ فجر کی اذان کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو اس نے اللہ سے دعا کی کہ اسے اس مقصد میں کامیاب کرے۔ وہ آہستہ آہستہ بیڈ سے اترا اور بکس کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ پھر وہ دھیرے سے دروازے سے نکلا۔ اسپتال کے استقبالیہ کے عملے نے فوری طور پر اس پر دھیان نہ دیا تھا۔ وہ خاموشی سے سڑک پر آ گیا۔ آسمان پر بادلوں کی گھن گرج سے اس کا سامنا ہوا۔ "اس وقت تو رکشا ملنا بھی مشکل ہے۔" اس نے سوچا اور آہستہ آہستہ ایک سمت کو چلنے لگا۔ ابھی وہ صرف دس منٹ ہی چلا تھا کہ اس کی ٹانگوں پر بوجھ بڑھ گیا لیکن امانت کو بروقت پہنچانے اور گل محمد کی بیٹی کی شادی کے احساس نے اس کے اندر ایک ان دیکھا جذبہ پیدا کر دیا۔ وہ اپنے زخم کی پروا کیے بغیر ایک سمت کو چلتا رہا۔ اب وہ مین شاہراہ پر آ گیا تھا۔ اس دوران ایک رکشے والا جلدی سے اس کے قریب آ گیا۔ شاید اسے بھی سواری کی تلاش تھی اور خادم حسین کی دعا بھی اللہ نے سن لی تھی۔ "بھائی مجھے بکرا منڈی جانا ہے۔"

"بیٹھ جائیں۔" رکشے والے نے خادم حسین کی تکلیف محسوس کر لی تھی اس نے اتر کر بکس پکڑنا چاہا تو خادم حسین ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ رکشے والے نے دروازہ کھول دیا۔ خادم حسین ہمت کر کے رکشے میں بیٹھ گیا اور رکشہ بکرا منڈی کی طرف روانہ ہو گیا۔ "بھائی صاحب! ایک بات پوچھوں...... اگر برا نہ مانیں؟" رکشے والے نے تھوڑی سی مسافت طے ہونے کے بعد خادم حسین کو متوجہ کیا۔

"جی...... جی پوچھیں۔"

"اس بکس میں کوئی قیمتی چیز لگتی ہے؟" رکشے والے نے کہا۔ "جی بھائی صاحب! میری جان سے زیادہ قیمتی حالانکہ مجھے نہیں پتا کہ اس بکس میں کیا ہے؟" رکشے والا خادم حسین کی بات پر بہت حیران ہوا۔

"جب آپ کو پتا نہیں کہ اس بکس میں کیا ہے پھر یہ...... جان سے زیادہ قیمتی کیسے ہو گیا۔"

"دراصل یہ کسی کی امانت ہے اور امانت کے بارے میں ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جس کا مفہوم ہے۔ "اس شخص کا کوئی دین نہیں جس میں امانت نہیں۔" اسی طرح آپ نے منافق کی تین نشانیوں میں سے ایک یہ بتائی ہے کہ جب اس کے پاس امانت رکھی جاتی ہے تو اس میں خیانت کرتا ہے۔ اب بتاؤ کیا اس سے قیمتی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔" رکشے والا خادم حسین کی سوچ پر رشک کر رہا تھا کہ ایسے خوب صورت ذہن کے لوگ بھی ابھی اس دنیا میں موجود ہیں ورنہ تو......" چند منٹ خاموشی میں گزرے رکشے والے نے ایک جگہ جا کر بریک لگا دی۔

"جی بھائی صاحب بکرا منڈی تو آ گئی۔ آپ نے جانا کہاں ہے۔" خادم حسین نے فوراً جیب سے پرچی نکال کر ایڈریس رکشے والے کو دکھایا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ شہر بھر کی گلیوں محلوں سے واقف ہوتے ہیں کیونکہ ان کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ رکشے والے نے ایڈریس سمجھ کر اسے لمحوں میں اس گھر کے سامنے اتار دیا۔ رکشے والے نے خادم حسین کی مشکل آسان کر دی۔ خادم حسین نے اسے کرایہ ادا کیا اور شکریہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ رکشے والا دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ شاید وہ اس کی سوچ کو سلام پیش کر رہا تھا۔

بارش تقریباً تھم چکی تھی۔ اب خادم حسین ابوبکر بلاک کی گلی نمبر 4 کے آخری مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے نیم پلیٹ دیکھی تو اس کی تمام مشکلیں ختم ہو گئیں۔ "گل محمد......" نیم پلیٹ پر درج تھا اس نے دروازے پر دستک دی۔ ایک لمبا تڑنگا اور کسرتی جسم سرخ و سفید رنگت کا شخص باہر نکلا۔ "گل محمد صاحب آپ ہی ہیں؟" اسے یقین تھا کہ وہی ہوں گے۔ "جی...... جی میں ہی ہوں۔"

"یہ آپ کی امانت......! یہ بکس مجھے کراچی میں آپ کے بھائی طفیل محمد صاحب نے دیا تھا اور یہ پیسے بھی...... میں انہی کے ہاں کام کرتا ہوں بکس لاتے ہوئے میرا راستے میں ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اس لیے کچھ دیر ہو گئی۔ اس کی معذرت۔ یہ آپ کی امانت۔" خادم حسین نے بکس دیا اور پیسے آگے بڑھا دیے۔ گل محمد نے بکس اور پیسے لیے اور بولا۔ "اندر آ جائیے۔"

"نہیں مجھے ذرا جلدی ہے۔ میں نے اسپتال جانا ہے۔ ڈاکٹرز نے ایک ہفتہ مکمل آرام کا کہا تھا۔ لیکن یہ کام آرام سے بھی ضروری تھا۔ مجھے اجازت دیں۔" گل محمد نے بہت اصرار کیا کہ آپ تھوڑی دیر کے لیے آرام کر لیں لیکن خادم حسین نے اس کی ایک نہیں سنی۔ اسے اسپتال جانے کی جلدی تھی اسے ڈاکٹرز اور نرسوں سے بھی معذرت کرنا تھی کیونکہ وہ ان کی اجازت کے بغیر چلا آیا تھا لیکن...... لیکن وہ پر سکون تھا کیونکہ اس کے ذہن و دل سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا اس نے امانت حقدار تک پہنچا دی تھی۔

شہر لاہور سے ہی تیسری حکایت

کورٹ مارشل



شیخ معظم الٰہی

اُس کالی بھیڑ کا قصہ، جس نے ہوسِ زر میں ایک یتیم کی زندگی برباد کر ڈالی

(اس کالی بھیڑ کا قصہ جس نے ہوس زر میں ایک یتیم کی زندگی برباد کر ڈالی۔)

ریما کی پیدائش اس کی نانی کے ہاں ہوئی تھی کیونکہ اس کے والد نے اس کی والدہ کو ریما کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے طلاق دے دی تھی۔ ریما کی والدہ نے اس کی خود پرورش کی طلاق لینے کے بعد ریما کی والدہ نے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کر لی جو اب تک جاری ہے۔

ریما جب پانچ سال کی ہوئی تو اسے ایک اعلیٰ اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ اسے لے جانے اور لانے کی ڈیوٹی اس کا ماموں نبھانے لگا۔

ریما نے میٹرک اور ایف۔ ایس۔ سی میں نہایت اعلیٰ نمبر حاصل کیے۔ اسی بناء پر ریما نے پنجاب یونیورسٹی کا امتحان بھی اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا۔ اس کے بعد ریما نے تھوڑے عرصے کے لیے ایک دوا بنانے والی کمپنی میں کام کیا اور پھر یہ ملازمت چھوڑ دی۔ کیونکہ وہاں سے اسے رات گئے تک گھر واپس آنا پڑتا تھا اس کی والدہ نے اس کی شادی کی تیاری شروع کر دی تھی مگر ریما نے اپنی والدہ سے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ میں شادی اپنی مرضی سے کرنا چاہوں گی۔ آپ کو اس کے بارے میں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کی والدہ نے جب یہ سنا تو دنگ رہ گئیں۔ انہوں نے حیرت سے کہا۔

''ریما! تم نے کوئی لڑکا پسند کر لیا اور مجھے ابھی تک نہیں بتایا؟ وہ کون ہے؟ کیا کام کرتا ہے؟ اور کس خاندان سے ہے؟''

ریما نے جواب دیا۔'' وہ لڑکا الطاف ہے جو ایک آرمی آفیسر ہے اور وہ ہمارے خاندان سے نہیں ہے وہ سیالکوٹ کا رہنے والا ہے۔ میں اور الطاف ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ الطاف یونیورسٹی میں میرے ساتھ پڑھتا تھا اسی دوران وہ آرمی میں چلا گیا۔ ہم ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔'' ریما کی والدہ نے یہ سن کر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے مجھ سے پوچھے بغیر اپنی مرضی کا ہم سفر کیوں چنا ہے؟ وہ بھی خاندان سے باہر کا اور سیالکوٹ کا رہنے والا۔ نہ میں اسے جانتی ہوں اور نہ اس کے خاندان کو۔ تمہاری شادی ہوگی تو خاندان میں ورنہ کہیں نہیں ہوگی۔''

یہ سن کر ریما نے جواب دیا۔

''امی جان! اگر آپ میری شادی الطاف سے نہیں کروائیں گی تو ہم دونوں کورٹ میں جا کر شادی کر لیں گے۔''

ریما کا جواب سن کر اس کی والدہ دنگ رہ گئی

تھیں۔ انہیں کبھی اس بات کی توقع نہیں تھی کہ ریما ان کے آگے یوں زبان چلائے گی اور اپنی مرضی کے لیے اس قدر خود سر بن جائے گی۔ چنانچہ ریما کی والدہ نے خاندان کے دوسرے افراد کو ریما کی پسند کے بارے میں بتایا۔ ان لوگوں نے ریما کو بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر بے سود، آخر انہوں نے ریما کی والدہ سے کہا کہ ریما جہاں چاہتی ہے اس کی شادی کردو۔



اس بنا پر ریما کی والدہ، چند رشتہ داروں کو لے کر لڑکے کو دیکھنے کے لیے اس کے گھر سیالکوٹ چلی گئیں اور الطاف کے گھر والوں سے ملیں۔ وہ گھر دیکھا جہاں الطاف رہائش پذیر تھا۔

الطاف کا گھر ایک درمیانے درجے کا تھا۔ جہاں جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر تھے، مکھیاں اڑ رہی تھیں۔ گھر کا باورچی خانہ اور غسل خانہ بہت گندے تھے۔ گھر کے مکین بھی کچھ اسی طرح کے تھے۔ ان سب کا رویہ بھی عجیب قسم کا تھا مگر پھر بھی ریما کی والدہ نے مجبوراً رشتہ طے کر کے شادی کی تاریخ رکھ دی۔ حالانکہ ریما کے خاندان والوں کو لڑکا اور اس کے گھر والے بالکل پسند نہیں آئے تھے۔

☆......☆

مقررہ تاریخ کو ریما کی شادی الطاف سے کردی گئی۔ ریما کی والدہ نے جہیز میں ضرورت کی ہر چیز دی گویا کسی بھی چیز کی کمی نہ ہونے دی اور کافی دل کھول کر روپیہ خرچ کیا۔ شادی کے روز مہنگے ترین شادی ہال میں کھانا دیا گیا۔ ماں کی خواہش تھی کہ بیٹی کو یہ احساس نہ ہو کہ ماں کی مرضی کے بغیر شادی کررہی ہے تو ماں نے کوئی کام دل سے نہیں کیا۔ بلکہ شاید ...

ان دنوں الطاف کی پوسٹنگ کوئٹہ میں تھی۔ چنانچہ ریما بھی اس کے ساتھ کوئٹہ چلی گئی۔ وہاں دونوں نے تقریباً ایک ماہ گزارا۔ اس کے بعد وہ دونوں کراچی میں ڈیڑھ سال تک رہے۔ اس کے بعد مری میں تین سال رہے اسی دوران ریما کے ہاں دو لڑکے پیدا ہوئے۔ اکثر اوقات الطاف اور اس کے خاندان والوں نے ریما کو مختلف طریقوں سے تنگ کرنا شروع کردیا۔ وہ آئے دن کوئی نہ کوئی فرمائش کرتے جسے ریما کی والدہ کو پورا کرنا پڑتا۔ خاص طور پر الطاف کسی نہ کسی بہانے ریما کی والدہ سے بڑی بڑی رقمیں بہانے بہانے سے بٹورتا رہتا تھا۔ حالانکہ ریما کی والدہ نے الطاف کے آرمی کے جتنے بھی کورس ہوئے سب کا خرچہ برداشت کیا۔ یہاں تک کہ الطاف کو امریکہ میں ایک کورس کرنے کے لیے بھیجا گیا تو بھی اس کا بھی سارا خرچہ ... برداشت کیا۔ کیونکہ

الطاف کو اس کے خاندان والوں نے کہا تھا کہ یہ کورس الطاف کے کیریئر کے لیے انتہائی ضروری ہے مگر اس کورس کو کروانے کے لیے ہمارے پاس رقم نہیں ہے۔ بیٹی کا مستقبل بھی داماد کے کیریئر سے جڑا ہوا تھا چنانچہ ریما کی والدہ نے کسی نہ کسی طرح سے رقم فراہم کر دی۔ امریکہ میں الطاف نے چھ ماہ کا عرصہ گزارا۔

چھ ماہ کے بعد الطاف جب واپس آیا تو اس کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔ اس نے آتے ہی ریما اور اس کی والدہ کو بے حد تنگ کرنا شروع کر دیا۔ شادی کو چھ سال ہو چکے تھے اور الطاف ترقی کرتا ہوا ایک بڑا آفیسر بن گیا تھا مگر اس کے اور اس کے خاندان والوں کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ آئے دن کسی نہ کسی بہانے سے ریما کی والدہ سے رقم کا مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ اب الطاف اور ریما کے درمیان اکثر لڑائی جھگڑا ہونا شروع ہو گیا۔ ریما کے دونوں بیٹے ایک تین سال کا دوسرا ایک سال کا تھا۔ وہ دونوں اپنے والدین کو لڑتے جھگڑتے دیکھتے۔ وہ دونوں حیران ہوتے کہ ہمارے ماں باپ کو کیا ہو گیا ہے؟ دونوں کے درمیان جب لڑائی جھگڑے حد سے بڑھ گئے تو آخر کار ایک روز ان کی لڑائی کا خاتمہ طلاق پر ہوا۔ ہوا یوں کہ الطاف راولپنڈی سے ریما اور اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر اپنے سسرال آیا اور وہاں دس دن تک ٹھہرا۔ اس دوران اس نے اپنے گھر والوں کے دباؤ میں آ کر ریما کو طلاق دینے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اپنے سسرال میں نارمل طریقے سے رہا تاکہ کسی کو شک وغیرہ نہ ہو۔ پھر دسویں دن ریما اپنی والدہ کے ہمراہ بازار کچھ چیزیں وغیرہ خریدنے کے لیے گئی۔ ان کے جاتے ہی الطاف نے اپنا سامان باندھا اور اپنے بیٹوں کو ریما کے ماموں کے سپرد کر کے کہا کہ میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں اپنے ایک دوست کو ملنے کے لیے جا رہا ہوں۔ اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور گھر سے نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب ریما اپنی والدہ کے ساتھ گھر واپس آئی تو اس نے اپنے ماموں سے الطاف کے بارے میں پوچھا۔ ماموں نے جواب دیا کہ وہ اپنے ایک دوست کے پاس کسی کام سے گیا ہے۔

جب الطاف کو گئے کافی دیر ہو گئی تو ریما کو فکر لاحق ہو گئی کہ الطاف نے اتنی دیر کہاں لگا دی۔ وہ اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اتنے میں اس کے موبائل پر پیغام کی ٹون بجی۔ ریما نے فوراً ہی موبائل پر پیغام پڑھا تو اس میں الطاف نے لکھا تھا کہ تم اپنی گاڑی کے ڈیش بورڈ میں ایک خاکی رنگ کا لفافہ اٹھا کر پڑھ لو۔

ریما نے فوراً گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈیش بورڈ سے خاکی رنگ کا لفافہ نکالا تو اس میں سے ایک تہہ شدہ اشٹام برآمد ہوا جس پر طلاق نامہ درج تھا، الطاف نے اس میں تینوں طلاقیں اکٹھی ہی دے دی تھیں جسے پڑھ کر ریما اور اس کی والدہ کو بہت صدمہ پہنچا۔

ریما کو یہ سمجھ ہی نہ آسکی کہ الطاف اصل میں چاہتا کیا تھا؟ وہ اور اس کی والدہ چھ سال تک اس کے جائز اور ناجائز مطالبات پورے کرتی رہیں مگر وہ کبھی بھی ان سے راضی نہ ہوا۔

آج کل ان دونوں کا مقدمہ عدالت میں زیر سماعت ہے۔

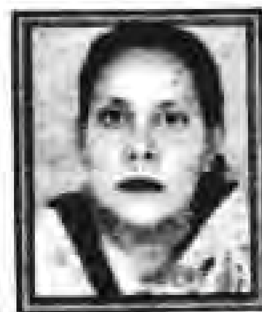
کچھ دنوں کے بعد سننے میں آیا کہ الطاف نے جب آرمی جوائن کی تو اسے آرمی کے کورس کرنے کے لیے ایک بڑی رقم کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے اور اس کے گھر والوں نے ایک اسکیم تیار کی کہ کسی ایسی لڑکی سے الطاف کی شادی کی جائے جو کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی ہو۔ الطاف نے آخر ریما کو اپنے دام میں پھنسایا اور وقتی طور پر اس سے شادی کر لی۔ دراصل اس کے گھر والوں نے لڑکی پہلے ہی دیکھ رکھی تھی جب الطاف کے تمام ضروری کورس مکمل ہو گئے تو اس نے ریما کو طلاق دے دی اور اس لڑکی سے دوسری شادی کر لی جو اس کے گھر والوں نے پسند کی تھی اب وہ اپنی دوسری بیوی ساتھ زندگی گزار رہا ہے اسے اپنے دونوں بیٹوں کا کوئی فکر و غم نہیں ہے کیا ایسے بھی باپ ہوتے ہیں؟ البتہ ریما نے ابھی تک کوئی شادی نہیں کی۔

یہ کہانی اپنے پیچھے بہت سے سوال چھوڑے جا رہی ہے۔ آرمی ہماری شان ہماری آن ہے اور اس آرمی کے اندر الطاف جیسی کالی بھیڑیں آرمی کا نام خراب کر رہی ہیں۔ اگر آج الطاف کو کوئی سزا نہ ہوئی تو کوئی بات نہیں۔ اللہ کے ہاں اس کے کورٹ مارشل کا مقدمہ تیار ہے اس دنیا میں کسی بھی وقت اس کا خدائی کورٹ مارشل ہو سکتا ہے، ہم اسی انتظار میں ہیں۔

☆☆☆

شہرِ عروس البلاد سے چوتھی حکایت

امتحان



الماس فاطمہ ارمان

کھوئی ہوئی محبت پالینے والوں کے لیے بطورِ خاص ایک حکایت



"پتا نہیں عورت کا خمیر کیوں محبت سے گندھا ہوتا ہے، وہ اندر سے ہی بے بس ہوتی ہے کہ مرد چاہے اس کے ساتھ جتنی بھی بے وفائی کرلے وہ سراپا وفا بنی رہتی ہے۔ وہ اس کی پکار پر سب کچھ بھلا دیتی ہے یا سینے کے نہاں خانوں میں چھپا دیتی ہے کیونکہ سب کچھ بھلانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔" سونو ما غصے سے پاگل ہو رہی تھی اور بڑی بہن روما کو

باتیں سنا رہی تھی۔
''آپی آپ حسن کے پاس دوبارہ جانا چاہتی ہیں...... بڑے شرم کی بات ہے۔ جس شخص نے آپ کو اپنی زندگی سے الگ کر دیا پھر آپ اس کی زندگی میں دوبارہ جانا چاہتی ہیں، جو آپ پر سوکن لے آیا۔ اس کو اپنے دل کی رانی بنا کر بیٹھا ہوا ہے۔ اسے بچیوں کے لیے آپ کا خیال آ گیا۔ کیوں کیا بچیاں صرف آپ کی ہیں، اس کی نہیں۔ وہ دوسری مہارانی سے بولے ان کا خیال کرے۔'' روما خاموشی سے بہن کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ کیا بولتی۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی ٹھیک تھا مگر وہ بھی ممتا سے مجبور ہو گئی۔ اس نے ایک سال سے اپنی بچیوں کو نہیں دیکھا تھا۔ چھوٹی بیٹی عرشیہ بہت بیمار تھی، بڑی بیٹی علیشبہ کا فون آیا تھا۔

''مما عرشیہ ہر وقت آپ کو یاد کرتی ہے۔ وہ بہت ضدی ہو گئی ہے۔ آیا اماں کو بھی بہت تنگ کرتی ہے۔''

وہ تھوڑی دیر کے لیے گزرے ہوئے ماضی میں کھو گئی وہ اور حسن ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ بی اے کا آخری سال تھا۔ وہ تمام دوستوں کے ساتھ کینٹین میں بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ جب ہی چند لڑکے کینٹین میں زور زور سے قہقہے لگاتے ہوئے داخل ہوئے۔ انہوں نے بھی کافی کا آرڈر دیا۔ وہ لڑکیوں پر آوازیں کسنے لگے۔ روما کو غصہ آ گیا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور جا کر ان لڑکوں کو اچھی خاصی باتیں سنا دیں۔ حسن بھی دوسری ٹیبل پر بیٹھا تھا اس نے بھی روما کا بھرپور ساتھ دیا۔ بات ہاتھا پائی تک جا پہنچی مگر وقت پر کینٹین والے انکل نے صلح صفائی کرا دی۔ اس طرح حسن اور روما ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور بات محبت تک جا پہنچی......

جب کہ روما کو تایا نے اپنے بیٹے کے لیے مانگا تھا مگر روما کو اسد پسند نہیں تھا۔ وہ اپنی دنیا میں مگن رہنے والا لڑکا تھا جب کہ روما کو شوخ و چنچل لڑکے پسند تھے۔ بڑی جدوجہد کے بعد روما کے والد اس رشتے کے لیے مانے اور ان کی شادی ہو گئی۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ روما دو بچیوں کی ماں بن چکی تھی۔ حسن اور روما اپنی زندگی سے مطمئن تھے۔ حسن اچھی پوسٹ پر تھا۔ اسے بزنس کا بہت شوق تھا۔ اس نے اپنے والد صاحب سے کچھ رقم لے کر بزنس شروع کیا۔ نوکری کے ساتھ ساتھ بزنس نے اتنی ترقی کی کہ وہ ایک اچھا بزنس مین بن گیا۔

حسن کے آفس میں بہت سی لڑکیاں کام کرتی تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی شمائلہ تھی، جو ہر وقت حسن کو اپنی اداؤں سے رجھاتی رہتی اکثر لوگ روما کو کہتے تم حسن کو قابو میں رکھو مگر وہ ہنس کر ٹال دیتی۔

''وہ بچہ تھوڑی ہے۔ دو بچیوں کا باپ ہے۔''

پھر ایک دن اس کی دنیا لٹ گئی۔ وہ دل پکڑ کر رہ گئی جب اسے پتا چلا کہ حسن نے شمائلہ سے نکاح کر لیا ہے۔ اس نے پہلی دفعہ حسن سے اونچی آواز میں بات کی۔

''مجھے بتاؤ مجھ میں کیا کمی تھی۔ تم نے تو مرتے دم تک ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے تمہاری خاطر اپنے والد تک سے ناراضگی مول لی تھی۔ ہر وقت تمہارا خیال رکھا۔ بیٹا یا بیٹی تو خدا کے ہاتھ میں ہے، جس خدا نے بیٹیاں عطا کی ہیں، وہی بیٹا بھی دے دیتا۔''

''نہیں روما بیٹی یا بیٹا اس کی وجہ نہیں، بس وہ میرے دل کو بھا گئی۔ تم کو بھی میں پورا حق دوں گا۔''

''نہیں چاہیے مجھے خیرات میں تمہارا حق۔ نہیں چاہیے بھیک میں تمہارا پیار۔ میں جا رہی ہوں تمہاری زندگی سے۔ تم نئی نویلی دلہن کے ساتھ عیش کرو۔ میری بچیاں مجھے دے دو۔ میں ان کو بہتر طریقے سے پال سکتی ہوں۔''

حسن نے ان تمام باتوں کا یہ جواب دیا۔

''تم جا سکتی ہو بچیاں میں تمہیں نہیں دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' روما روتی ہوئی سینے پر ممتا کا بوجھ لے کر گھر واپس آ گئی۔ وہ بچیوں کے لیے تڑپتی رہتی۔

اس کے والد نے کہا کہ تم حسن سے طلاق لے لو میں تمہاری دوسری شادی کر سکتا ہوں۔ مگر روما ایسا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنی ممتا سے مجبور تھی۔ حسن کی طرف سے اس کے والدین بہت بار آئے کہ روما گھر واپس آ جائے۔ بچیاں بہت روتی ہیں۔ کوئی ماں کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اس طرح دو سال گزر گئے۔ شمائلہ سے اس کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تھی۔ شمائلہ چاہتی ہی نہیں تھی کہ وہ ماں بنے۔ حسن اپنے کیے پر پشیمان تھا۔ پھر چھوٹی بیٹی عرشیہ سخت بیمار ہو گئی۔ اس کے دماغ پر بخار چڑھ گیا۔ وہ جب بھی آنکھ کھولتی یہی جملہ کہتی۔ ''مما کو بلا دو۔'' آخر کار روما کی ساس نے آ کر روما سے کہا۔

''تم حسن کا منہ مت دیکھو۔ تمہاری بچی کی زندگی خطرے میں ہے۔ تم کیسی ماں ہو۔''

روما ممتا سے مجبور ہو کر فوری اسپتال پہنچ گئی۔ عرشیہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



ماں کو دیکھ کر خوش تھی۔ جلد ہی وہ صحت مند ہو گئی۔ روما کی ساس نے کہا کہ تم گھر چلو۔ تمہارا خرچا میں اٹھاؤں گی۔ تم بچیوں کے ساتھ رہنا۔" اور یوں روما گھر چلی گئی۔

اس نے بچیوں پر توجہ دینا شروع کر دی اس کا مقصد اس کی بچیاں تھیں۔ وہ حسن کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہوئے وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن چکے تھے۔

پھر اچانک حسن کی زندگی میں ایک اور طوفان آیا۔ دوسری بیوی شمائلہ نے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ روما کو طلاق دے۔ حسن نے اس کو لاکھ سمجھایا کہ وہ اس کے بچوں کی ماں ہے۔ وہ تم سے کس چیز کا مطالبہ کر رہی ہے۔ وہ تو میری طرف بھی نہیں دیکھتی۔ وہ میری پہلی محبت اور بیوی ہے۔ ٹھیک ہے اگر تم نہیں رہنا چاہتی ہو، تو میں تم کو طلاق دیتا ہوں۔

حسن نے شمائلہ کو طلاق دے دی۔ حسن نے وقتاً فوقتاً یہ کوشش کی کہ روما دوبارہ اس کی زندگی میں آ جائے مگر روما کا دل پتھر ہو چکا تھا۔ وہ حسن کو اپنے دل میں دوبارہ جگہ نہیں دے پا رہی تھی۔ اسی کشمکش میں کافی وقت گزر گیا۔ روما کی ساس نندوں وغیرہ نے بھی بہت صلح صفائی کی کوشش کی مگر روما کا یہی کہنا تھا کہ میں حسن سے کسی قیمت پر سمجھوتا نہیں کرنا چاہتی۔ میں اگر یہاں ہوں تو صرف اپنی بچیوں کی وجہ سے۔" حسن بہت غمگین رہنے لگا تھا۔ اس نے ایک اچھی بیوی کے ساتھ ساتھ اپنی بچیاں بھی کھو دی تھیں۔ بچیاں ہر وقت ماں کے ساتھ لگی رہتیں۔

☆......☆

گرمیاں عروج پر تھیں۔ ہر طرف سناٹا تھا لوگ اپنے کمروں میں اے سی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حسن کی طبیعت صبح سے بے چین تھی۔ اس کے الٹے ہاتھ میں سخت درد تھا۔ گھبراہٹ بھی ہو رہی تھی وہ باہر لان میں پنکھا چلا کر بیٹھ گیا۔ اچانک اسے شدید درد دل میں محسوس ہوا۔ وہ تیزی سے کرسی سے اٹھا ابھی وہ کمرے کی طرف جانا چاہتا تھا کہ اسے چکر آ گئے اور اسے شدید درد اٹھا۔ وہ وہیں پر گر گیا۔ روما کچن میں کسی کام سے جا رہی تھیں چیخ کی آواز سن کر وہ لان کی طرف لپکی۔ اس نے دیکھا حسن بے ہوش پڑا ہے۔ اس نے جلدی سے اس کو سیدھا کیا۔ چوکیدار کی مدد سے گاڑی میں لٹایا اور فوری اسپتال جا پہنچی ڈاکٹروں نے ایمرجنسی میں چیک اپ کیا تو پتا چلا اسے دل کا اٹیک ہوا ہے۔ اگر فوری طور پر اس کو آئی سی یو میں نہیں رکھا گیا تو فالج کا اٹیک بھی ہو سکتا ہے۔"

روما ڈاکٹر سے بس یہی کہتی جا رہی تھی۔ "ڈاکٹر میرے حسن کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔"

حسن کی والدہ بہنیں بھی فوری آ گئیں۔ روما رو رو کر سب کو بتا رہی تھی کہ حسن کو کیا ہوا اور سب سے یہی کہہ رہی تھی حسن کو ہوش آ جائے آپ سب مل کر دعا کریں۔ گھر والے اس کی شکل دیکھ رہے تھے۔ یہ وہی روما ہے جو حسن کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ چند گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد حسن کو ہوش آ گیا۔ نرس نے آ کر بتایا تو وہ فوراً کمرے کی طرف دوڑی اور حسن کے پاس جا پہنچی۔

"حسن تم ٹھیک ہو۔ تم کیسا محسوس کر رہے ہو۔" حسن روما کی طرف حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ ایک دم وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ روما نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"حسن مت روئیں پلیز۔"

"روما تم نے مجھے معاف کر دیا۔"

"ہاں حسن میں نے تمہیں معاف کر دیا۔"

"تم اب مجھ سے کبھی مت روٹھنا۔ ورنہ میں دنیا چھوڑ دوں گا۔"

"ایسا مت بولو، میری اور میری بچیوں کی دنیا تم سے آباد ہے۔ تم ہمارے سر پر سلامت رہنا یہی میری تمنا ہے۔ ایک طوفان تھا جو آیا اور آ کر چلا گیا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو، میری زندگی بھی تم سب سے ہی ہے۔ میں اپنی غلطی پر شرمندہ ہوں۔ تم میری بیوی نہیں بلکہ ایک انمول ہیرا ہو جس کی پہچان میں نہ کر سکا۔ گھر والے جہاں غمگین تھے وہاں خوش بھی۔ وہ ایک ہو گئے تھے۔ حسن نے روما کو کھو کر دوبارہ پا لیا۔ ان کے گھر میں پھر سے بہار آ گئی وہ خوش تھے۔ ڈاکٹروں نے بھی روما سے یہی کہا کہ یہ ایک معمولی سا جھٹکا تھا۔ آپ ان کو خوش رکھنے کی کوشش کیجئے گا۔"

"ڈاکٹر صاحب آپ فکر نہ کیجیے۔ اب ان کی لگام میرے ہاتھ میں ہے۔" حسن روما کی طرف دیکھ کر زور سے ہنسا تھا۔

اور یوں زندگی اپنی پرانی ڈگر پر آ گئی تھی۔ جس میں حسن اور روما کے سوا کوئی تیسرا قطعاً نہ آ سکتا تھا۔

☆☆☆

یادیں



رئیسہ خالد

عمرِ رفتہ کی یادیں لیے ایک حکایتِ خاص

وہ سردیوں کی ایک اندھیری رات تھی، یہی کوئی دسمبر کا آخری ہفتہ تھا۔ بوجھل ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ اور ماحول میں ویران سناٹوں کی گونج محسوس ہوتی وہ اپنے بستر پر رضائی میں دبکی پڑی تھی لیکن اس سردی میں یہ رضائی بوڑھے جسم کو شدید سردی سے بچانے کے لیے ناکافی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کے کمرے کا ہیٹر بند کیا گیا تھا۔ اسے اپنا آپ سردیوں کی اس یخ بستہ رات کی طرح لگ رہا تھا جو اندھیری تھی، بوجھل ہواؤں کے جھکڑ اسے اپنے اندر محسوس ہو رہے تھے۔ وہ کتنی اکیلی تھی۔ اس نے رضائی میں چھپا سر باہر نکالا۔ ہوا کے دباؤ سے کھڑکی بار بار بج رہی تھی اس کے برابر کا بستر خالی تھا۔

یہ اس کے شوہر کا بستر تھا جس کے ساتھ اس نے زندگی کے 45 سال گزارے تھے جس کی زندگی میں اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس کا دل یوں خالی کر جائے گا۔ اس نے حسرت سے خالی پلنگ کو دیکھا کبھی اس پلنگ سے کتنی یادیں وابستہ تھیں۔ اس نے نادانستہ طور پر رضائی سے ہاتھ باہر نکالا اور خالی بستر پر یوں ہاتھ پھیرنے لگی جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو۔ اس بستر پر یادوں کے انبار تھے۔ یہ بستر پینتالیس سال سے اس کے ساتھ تھا۔ اکثر گھر بدلے تھے کمرا بدلا تھا۔ ترتیب بھی بدلی تھی لیکن یہ بستر اس کے ساتھ ساتھ ہی رہا تھا۔ یہ بستر اس کی چھوٹی سی دنیا تھی وہ دنیا جو بہت خوبصورت سے آباد تھی۔ بوڑھی آنکھوں میں اس دنیا کا تصور آج بھی جوان اور خوبصورت تھا۔ جب وہ بیاہ کر اس دنیا میں آئی تھی اپنے آپ کو دنیا کا خوبصورت، خوش قسمت ترین انسان جانا تھا۔ وہ اس کی زندگی میں بہار بن کر داخل ہوا تھا۔ وہ چند دنوں کے لیے میکے جاتی تو خود کو خالی خالی محسوس کرتی۔ وہ تھا بھی تو کتنا اچھا، کتنا پر خلوص اور محبت کرنے والا اس کی چھوٹی بڑی غلطیوں کو نظر انداز کرنے والا۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ اس نے سوچا اس وقت کی زندگی اب کی خالی زندگی سے کتنی مختلف تھی۔ اس خالی پن میں ملن کی آس ہوتی تھی اور اس خالی پن میں کرب کے سوا کچھ نہیں۔ آنکھیں بند کیے وہ کچھ دیر چپ لیٹی رہی اور لمبی لمبی سانس لیتی رہی بجلی فیوز کر گئی تھی۔ تاریکی اور تنہائی سے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اس نے موم بتی روشن کی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ فضا بہت پرہول لگ رہی تھی۔

آج اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ جھکڑوں کے شور اپنے اندر محسوس ہو رہے تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے اس نے اپنے اندر اکیلے پن کا احساس اتنی شدت سے محسوس نہیں کیا تھا۔ اچانک وہ بہت آہستگی سے اٹھ گئی اسے محسوس ہو رہا

تھا کہ اس کی روح بہت زخمی ہے۔ بہت زخمی اور سکون اور شانتی کی خاطر بھٹک رہی ہے۔ اس کے لب ساکت ہیں۔ مگر دل کا کرب ذہن اور دماغ میں گشت پیدا کر رہا ہے۔

شوہر کے آخری چند سال بستر پر گزرے۔ ان دنوں وہ گم سم سے رہتے۔ تکلیف کا اظہار وہ بہت کم کرتے لیکن بیمار ہونے کے باوجود بھی اس کے وجود کا اپنا مقام تھا۔ تنہائی کا دکھ اور اکیلے پن کا احساس اس کے ہوتے ہوئے کبھی نہ جھیلا تھا۔

اس کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ سبھی اس کے پاس تھے۔ سب ہی دل گیر تھے۔ بیٹی کو اپنے پاپا سے بہت ہی پیار تھا۔ وہ تڑپ تڑپ کر باپ کے لیئے روتی تھی۔ آج بھی روتی ہے۔ بچے دادا اور نانا کی شفقتیں یاد کرتے تھے۔ سب اس کے دکھ میں شریک تھے، سب کا غم مشترک تھا۔ وہ سوچتی کہ سب کچھ ہوتے ہوئے سے اکیلے پن کا احساس اتنی شدت سے کیوں ہوتا ہے۔ اس کے بچے اسے یوں بہلاتے جیسے وہ چھوٹی سی بچی ہو۔ کبھی اس کا بیٹا کبھی بیٹی اس کے کمرے میں سوتے رہے، پھر بھی اکیلے پن کا احساس اسے شدت سے ہوتا۔ وہ دونوں اس سے باتیں کرتے تاکہ اس کا دل بہلا رہے۔ اسے یک گونہ سکون مل رہا تھا کہ اس کے بچے اس کے غم میں برابر کے شریک ہیں اس غم کو برداشت کرنے اور سہنے میں وہ اکیلی نہیں ہے اس کے بچے بھی اس کا غم بانٹ رہے ہیں۔ یوں یہ غم کتنا ہلکا ہو گیا تھا۔

اس کے بچے اسے ہر وقت خوش دیکھنا چاہتے، دل بہلانے کا سامان کرتے لیکن اس کا دل تھا کہ بہلنے کا نام



ہی نہیں لیتا تھا۔ اس کا داماد جو اس کی نند کا بیٹا تھا بہت ہی سلجھا ہوا اور نیک انسان تھا۔ اب شوہر کے بعد وہ اپنی بیٹی کے ساتھ رہتی تھی۔ بیٹا ملک سے باہر تھا۔ سال میں ایک بار آتا اور لے جانے کی ضد بھی کرتا تھا۔ لیکن اسے یہیں رہنا پسند تھا کیونکہ یہاں اس کے شوہر کی یادیں تھیں۔ انہیں چھوڑ کر وہ کہیں جانے کو راضی نہیں تھی۔

اللہ کا کرم ہمیشہ اس کے ساتھ رہا۔ وہ اپنی تمام ذمہ داریوں سے احسن طریقے سے عہدہ برآ ہوئے۔ اس کے بچے بہت پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ ہر والدین کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جہاں وہ اپنی زندگی کا اختتام کر رہے ہوں، ان کے بچے وہیں سے اپنی زندگی کا آغاز کریں۔ ان دونوں کی بھی یہ خواہش بھی اللہ نے پوری کردی ان دونوں کے بچے اللہ کے فضل سے بہت بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔

اب وہ بڑھاپے کی دہلیز پر تھیں، بڑھاپا کسی خاص شے کا نام نہیں صرف انداز فکر ہے۔ بعض لوگ تیس سال میں بوڑھے ہو جاتے ہیں جبکہ کچھ لوگ 70 سال میں بھی خود کو بوڑھا نہیں سمجھتے۔ بوڑھے لوگوں کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔ وہ دیکھتا ہے اس کے سارے ساتھی ایک ایک کر کے رخصت ہو رہیں۔ اب اس کا وقت بھی آیا ہی چاہتا ہے۔ اس کا مشغلہ پرانی یادیں پرانی تصویریں ہوتی ہیں جنہیں دیکھ کر وہ پرانی یادوں میں کھو جاتا ہے۔ ان دنوں کو یاد کرتا ہے جو گزر گئے۔ خوش نصیب ہے وہ بوڑھا یا بوڑھی جو حسرت اور ندامت سے آزاد ہو۔ جو مطمئن اور پرسکون ہو۔

موسم گزر جاتے ہیں مگر یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔ وہ کبھی نہیں بھولتیں۔ اس کے ساتھ بھی اس کی یادیں رواں دواں تھیں۔

انسان جب بڑھاپے میں داخل ہوتا ہے جب اس کی پرانی یادیں نئی یادوں کے ساتھ چلتی رہتی ہیں، گئے لمحے لوٹ کر نہیں آتے مگر اپنے نقش پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ یادیں خوشگوار بھی ہوتی ہے اور تلخ بھی۔ اپنے رفیق حیات کے دنیا سے چلے جانے کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا کہ لق ودق صحرا میں تنہا رہ گئی ہوں۔ لاکھوں دل کی باتیں ہیں کس سے کہوں کوئی ہمدم و ہم ساز نہیں۔ ہمارا ہمسفر جا چکا ہے لیکن میرا سفر ابھی باقی ہے۔ ملک کے جو حالات میں ان سے خوفزدہ رہتی ہوں اور اللہ سے اپنے بچوں کی سلامتی اور خوشیوں کے لئے دعائیں مانگتی رہتی ہوں کہ اللہ انہیں کوئی غم نہ دکھائے، ''آمین''۔

☆☆☆

مسیحا کون؟



ملک عاشق حسین ساجد

اب کس سے ہم کریں شناسائی' کون ہے مسیحا اب' آج کی زندہ حکایت

آج سے کئی برس پہلے کی بات ہے۔ میری ممانی کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تو انہیں نزدیکی تحصیل ہیڈکوارٹرز اسپتال لے جایا گیا۔ ان کی بیماری کے پیش نظر انہیں اسپتال میں باقاعدہ داخلہ دے دیا گیا۔ میں ان کی عیادت کے لیے جمال آباد اسپتال گیا۔ ممانی سے ان کا حال احوال پوچھ رہا تھا کہ اسی دوران ایک

ویگن اسپتال کے اندر داخل ہوئی۔ ویگن سے نکلنے والے شخص کے چہرے پر اڑنے والی ہوائیاں معاملے کی نزاکت بیان کر رہی تھیں۔ انسانی تجسس اور ہمدردی کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں ویگن کی طرف بڑھا۔ ویگن کے اندر سیٹیں ہٹا کر ایک چارپائی رکھی ہوئی تھی جس پر خون میں لت پت چودہ پندرہ سال کا ایک خوبرو لڑکا پڑا ہوا تھا۔ لڑکا شدید زخمی اور خون زیادہ مقدار میں بہہ جانے کی وجہ سے بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ شکل سے لڑکے کی ماں لگنے والی خاتون کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کرتے گر رہے تھے۔ جب کہ ویگن سے اترنے والا شخص دوڑتا ہوا میڈیکل آفیسر کے پاس گیا۔

ویگن سے اترنے والے ایک فرد نے بتایا کہ اس کا نام حسن ہے اور وہ لڑکے کا ماموں ہے۔ زخمی لڑکے کا نام علی ہے۔ اسکول سے واپسی پر گھر آ رہا تھا کہ بارات میں مقابلہ بازی کرتی ایک کار کی زد میں آ گیا۔ جس نے علی کو اس حالت میں پہنچا دیا۔ ایکسیڈنٹ سے کار کو بھی نقصان پہنچا کیونکہ کار کرائے کی تھی اور ڈرائیور بچے کے زخمی ہونے سے زیادہ اس بات پر پریشان تھا کہ اس کا گاڑی مالک اس سے کیا سلوک کرے گا۔ موقع پر موجود لڑکے کے ماموں نے کار والے کا اتا پتا نوٹ کر کے اسے جانے دیا جونہی علی کے محنت کش والد کو اطلاع ملی وہ فوراً جائے حادثے پر پہنچا۔ کرائے پر ویگن کی اور بچے کو اسپتال لے آئے۔ ابھی لڑکے کا ماموں صورت حال بتا رہا تھا کہ اس کا والد تقریباً دوڑتا ہوا واپس آیا اور بولا۔

''حسن! علی کو باہر نکالو۔ ڈاکٹر صاحب میٹنگ میں ہیں۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے علی کو تین چار لوگوں کے سہارے سے باہر نکالا اور ایمر جنسی روم کی طرف لے چلے۔ میں ان کے ساتھ بطور مددگار شامل ہو گیا۔ بچے کی والدہ بار بار آسمان کی طرف دیکھتی اور اپنے بیٹے کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ ماں کی حالت کسی سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

ہم نے بچے کو ایمر جنسی روم میں لٹایا اور میں بچے کے والد کے ہمراہ میڈیکل آفیسر کے کمرے کی طرف تقریباً دوڑتا ہوا گیا۔ خدشہ تھا کہ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے بچہ جان سے نہ چلا جائے۔ ہم ڈاکٹر صاحب کے کمرے کے باہر پہنچے تو کمرے کے باہر موجود چپڑاسی نے اندر جانے سے روک دیا کہ صاحب میٹنگ میں ہیں۔ مجھ سے رہا نہ گیا کہ یہ کیسی میٹنگ ہے نصف گھنٹے سے زائد گزر چکا تھا۔ بچہ ایمر جنسی میں ہے۔ وقت کا گزرتا ہر لمحہ اسے زندگی سے دور کر رہا ہے مگر ڈاکٹر صاحب کی میٹنگ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔

میں نے چپڑاسی کو ایک طرف دھکیلا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ سلام کے بعد عرض کیا۔ ''ڈاکٹر صاحب! چودہ پندرہ سال کا لڑکا شدید زخمی حالت میں موت سے پنجہ آزمائی کر رہا ہے پلیز جلدی چلیں۔''

ڈاکٹر نے قہر آلود نظروں سے مجھے گھورا میں نے اس کے قریب بیٹھے افراد پر نظر ڈالی تو ایک جانا پہچانا چہرہ بھی نظر آیا جس کا تعلق ایک سیاستدان سے تھا۔ ڈاکٹر شاید ان کی خاطر تواضع میں لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر ''آتا ہوں'' کا رسمی فقرہ کہہ کر توجہ مہمانوں کی طرف کر لی لیکن مجھ سے رہا نہ گیا۔

''خدارا ڈاکٹر صاحب! بچے کی زندگی کا معاملہ ہے۔ یہ میٹنگ بعد میں بھی ہو سکتی ہے مگر خدانخواستہ بچے کو کچھ ہو گیا تو اس کے ساتھ والدین پر کیا قیامت ٹوٹے گی آپ نے اس کا تصور بھی کیا ہے؟''

یہ سنتے ہی ڈاکٹر نے ناگواری سے میری طرف دیکھا اور مضحکہ خیز انداز میں بولا۔

''اے میاں! لگتا ہے پہلی بار اسپتال آئے ہو۔ یہاں تو چوبیس گھنٹے ایسی ایمر جنسی برپا رہتی ہے اگر ہم بھی تمہاری طرح جذباتی ہو جائیں تو پھر گزر گئی۔''

''باتوں کا وقت نہیں ہے پلیز آپ چلیں بچے کو دیکھیں۔'' میں نے التجائیہ انداز میں کہا تو ڈاکٹر نے بپھرتے ہوئے کہا۔

''ایک دفعہ کا کہنا کافی نہیں ہے کہ آ رہا ہوں...... بس پانچ منٹ......'' ڈاکٹر کا بے حسی پر مشتمل رویہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔

''لڑکے کی زندگی کے لیے پل پل بھاری ہے

اور آپ گزشتہ نصف گھنٹے سے بھی زائد پانچ منٹ میں آیا کی تکرار کیے جارہے ہیں۔ آپ گورنمنٹ ملازم ہیں اور اپنی ڈیوٹی کی تنخواہ لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب! دوسرے لفظوں میں آپ مسیحا ہیں۔'' میری بات کاٹتے ہوئے غصے کی کیفیت میں بولا۔

''اے جنٹلمین! اتنی زیادہ ہمدردی ہے تو بچے کو کسی پرائیویٹ اسپتال میں لے جاؤ، آجاتے ہیں ہمدرد بن کے......''

ڈاکٹر کے اس جواب نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ حد تو یہ کہ میٹنگ میں موجود کسی فرد کے چہرے پر تردد، فکر کی پرچھائیں تک نظر نہیں آرہی تھیں۔ ڈاکٹر اور ان کے مہمان بے حس تھے یا میں زیادہ حساس ہو رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے کہ اسی دوران ڈاکٹر کے ساتھ سفید پوش شخص بڑبڑایا۔

''لگتا ہے میاں جی پہلی بار اسپتال آئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب! آپ جائیں مریض کو دیکھیں ہم شام کو چکر لگالیں گے۔'' گویا یہ میٹنگ نہیں چکر تھا جانے اس چکر میں کتنے مریضوں کے سر چکرا جاتے ہوں گے۔

اسی دوران لڑکے کا باپ بھی اندر آگیا۔ ڈاکٹر کے منہ سے نکلا۔ ''لو جی یک نہ شد دو شد۔''

''ڈاکٹر صاحب! علی کے جسم کو جھٹکے لگ رہے ہیں۔ پلیز آپ چلیں۔ خدا کے لیے ہم پر ترس کھائیں۔'' یہ کہتے ہی اس نے ڈاکٹر کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

ڈاکٹر اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ باہر سے بین نما آوازیں آنے لگیں۔ علی کے والد نے ہونقوں کی طرح پہلے ڈاکٹر کو دیکھا پھر دیوانا وار باہر کی طرف بھاگا۔ ہاں علی مرچکا تھا اس کا جسم زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ ماں دیوانہ وار اپنے علی کی لاش سے چمٹی جارہی تھی۔ ڈاکٹر کے لیے یہ غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ آرام سے چلتا ہوا اس چارپائی کی طرف آیا جہاں عورتوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ زخمی بچے کی نبض چیک کی اور نفی میں سر ہلا کر واپس اپنے آفس کی طرف گھوم گیا۔ جی تو چاہا کہ اسے روک کر اس سے پوچھوں کہ اس جیسے کتنے قتل روزانہ کرتے ہو مسیحائی کے لبادے میں قصاب چھپے بیٹھے ہو لیکن یہ سوچ کر خاموش ہو رہا کہ جھنجوڑا تو انہیں جاتا ہے جس کے اندر ضمیر نام کی کوئی چیز باقی رہ گئی ہو جس شخص کے دل میں انسانی زندگی کی اہمیت ہو۔ ذہن پر مادیت پرستی کا خمار چھایا ہو وہاں الفاظ اپنی اہمیت اور وقار کھو بیٹھتے ہیں۔

علی کے والدین علی کو واپس اسی ویگن میں گھر لے گئے جس میں اسے اسپتال لے کر آئے تھے۔ اس واقعے کو کچھ برس بیت گئے۔

ایک روز میں چھٹی کے بعد فارغ ہو کر گھر واپس آرہا تھا۔ شام کا ملگجا اندھیرا چھانے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ نہر کنارے پر کچھ لوگ جمع تھے۔ وجہ جاننے کے لیے مجمع کے قریب گیا تو معلوم ہوا کہ اسکول سے چھٹی کے بعد موٹر سائیکل رکشہ بچوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونسے واپسی منزل کی طرف رواں دواں تھا کہ ٹریکٹر ٹرالی کی کراسنگ کے دوران توازن قائم نہ رکھ سکا اور نہر میں جا گرا۔ نہر میں پانی کم تھا اور سست رفتاری سے بہہ رہا تھا لیکن پانی اتنا بھی کم نہ تھا کہ نقصان نہ ہوتا۔ بچوں کو ڈوبنے کے لیے کافی تھا۔ بچوں کی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ سامنے سڑک پر ایک گدھا گاڑی والا سامان لادے گزر رہا تھا۔ اس نے بچوں کی چیخ و پکار سنی تو گدھا گاڑی وہیں سڑک پر کھڑی کر کے نہر میں چھلانگ لگادی اور جلدی جلدی باری باری سب بچوں کو نہر سے نکالنے لگا۔ رکشہ ڈرائیور خود بری طرح سے زخمی تھا اور چوٹوں کی وجہ سے کراہ رہا تھا۔ بچوں کو نہر سے نکالنے کے بعد گدھا گاڑی والے نے رکشا ڈرائیور اور دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر رکشے کو باہر نکالا۔ یہ تمام عمل نصف گھنٹے کی جدوجہد میں انجام کو پہنچ گیا۔

اگر خدانخواستہ گدھا گاڑی والا بروقت مدد نہ کرتا تو بہت سی معصوم کلیاں پھول بننے سے قبل ہی مرجھا جاتیں کئی زندگی کے چراغ گل ہو جاتے اور ان کے بہت سے خاندانوں پر غم واندوہ کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے۔

اس واقعے کی یاد نے برسوں پہلے دلخراش واقعہ کی یاد دلا دی۔ میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اسپتال کے ڈاکٹر اور گدھا گاڑی بان میں سے اصلی مسیحا کون ہے؟

☆☆☆

گھر اور عزت

حسین خواجہ

ایک حکایتِ پُرسوز، شکوہ کناں جہانِ دِگر......

کہا جاتا ہے جو انسان حقیقت پسند ہو اس کو بھی سچائی سے دکھ یا تکلیف نہیں پہنچتی لیکن میرے ساتھ کچھ معاملہ الٹا ہوا۔ آج سے تقریباً چار سال قبل میں ایاز کی زندگی میں صدیوں کی مسافت طے کر کے آئی تھی۔ میری شادی قدرے دیر سے ہوئی تھی لہٰذا صدیوں کی مسافت کہنا غلط نہ ہوگا اگرچہ ایاز میرے لیے کوئی غیر نہ تھا بلکہ میرا خالہ زاد تھا اور ہم دونوں نے ہنستے کھیلتے پتا نہیں کب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ دیا تھا اور کبھی اس بات کا خیال نہ رکھا کہ اب ہم دونوں کو اس قدر دوستانہ رویے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ شاید اس رویے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم اندر ہی اندر ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ بہرحال وہ وقت جیسا بھی تھا پر اب کی نسبت اچھا تھا کیونکہ ایاز کی فطرت کے جو پہلو مجھ پر شادی کے بعد کھلے تھے پہلے میں ان سے واقف نہ تھی۔

شادی سے پہلے تو ایاز بہت خوش مزاج اور ملنسار شخص تھا لیکن گزرتے وقت کے ساتھ یوں بدل جائے گا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ وہ اپنے جن کا تصور پیش کیا جاتا ہے دراصل وہ تو غیروں سے بھی بدتر ہوتے ہیں ایاز مجھے پسند کرتا تھا اس کے باوجود مجھے ایاز کی زندگی میں آنے کے لیے صدیوں کی مسافت طے کرنا پڑی،

ایسا کیوں ہوا یہ تو میں نہیں جانتی بس اتنا جانتی ہوں کہ خالہ نے کبھی مجھے اپنے بیٹے کے لائق ہی نہیں سمجھا تھا۔ پہلے تو غیروں میں رشتہ تلاش کرتی رہی اور جب بات بنتی نظر نہ آئی تو مجھ پر دستِ شفقت رکھ دیا۔ حقیقت پسند تو میں شروع سے ہی تھی، میں نے کبھی ایسے خواب آنکھوں میں سجائے ہی نہیں تھے جن کے نہ پورا ہونے پر بعد میں آنکھوں میں چبھن ہو۔ خواب دیکھنا انسانی فطرت میں شامل ہے اور اس امر سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ میرے خواب حقیقت کے قدرے نزدیک ہوتے تھے جو میں نے ایاز کے تصور میں بسائے تھے۔ ایک قدیم مثال ہے کہ عورت کی تعریف کرنے کی بجائے اس کی عزت کرنی چاہیے اور ویسے بھی ایک عورت مرد سے صرف اور صرف عزت کی ہی توقع کرتی ہے۔ جو مرد عورت کو یہ احساس نہیں دے سکتا کہ وہ اس کی ملکہ ہے لیکن کم از کم عورت کو یہ احساس تو دے کہ وہ اس کے برابر کی ہے اور جو مرد عورت کو عزت بھی نہیں دے سکتا اس سے اور کیا امیدیں رکھنا۔

☆......☆

آج مجھے ایاز کے ساتھ تقریباً پورے چار سال بیت گئے ہیں اور مجھے پل پل اس بات کا احساس دلایا جاتا

ہے کہ میں کم تر، نا سمجھ اور احمق ہوں اگر میں ایاز کے ساتھ اس کے مطلب کی بات کروں تو بھی میں غلط ہوں کیونکہ وہ مجھ سے بہتر خود کے لیے سوچ سکتا ہے۔ ایاز ایک تعلیم یافتہ شخص ہے اس لیے میری تذلیل قدرے مہذب طریقے سے کرتا ہے۔ ایاز میری دنیا ہے اور پوری دنیا کا خانہ خراب ہے، ایاز مجھے ہر بات پر ٹوکتا ہے اب تو اگر میں کچھ صحیح کام بھی کر رہی ہوں تو مجھے شک ہونے لگتا ہے، غلط کر رہی ہوں۔ میری اور ایاز کی لڑائی جب بھی ہوئی ہے ہمیشہ غیر ارادی طور پر ہوئی ہے اب تو لگتا ہے وہ میرے ساتھ زندگی نہیں گزار رہا بلکہ مجھے برداشت کر رہا ہے۔ میں کبھی جو ایاز کے ساتھ محو گفتگو ہونے کی کوشش بھی کروں تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں لڑائی نہ ہو جائے۔

میں زندگی کی گہری سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ ایاز کام سے واپس آ گئے۔ معمول کے مطابق ایاز کے لیے کھانا لگایا اور اس کے سامنے بیٹھ گئی اور محو گفتگو ہوتے ہوئے کہا۔

"ایاز وہ...... میں یہ سوچ رہی تھی کہ......" ابھی میری بات مکمل نہ ہوئی تھی کہ ایاز نے طنزاً لہجے میں کہا۔

"واہ جی واہ جی تو اب آپ سوچتی بھی ہیں یہ جان کر اچھا لگا۔" انسان جب حق پر ہو تو خود بخود اندر ایک طاقت آ جاتی ہے اور ایاز کے اس ناحق طنز پر میں آگ بگولا ہو گئی اور بڑے غصے میں بولی۔

"کیوں میں نہیں سوچ سکتی کیا، میں پاگل ہوں یا مجھ میں دماغ نہیں ہے، فہم، فراست سے بے نیاز ہوں۔" پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا نہ جانے ایک لمحے میں میرے منہ سے کیا کیا نکل گیا تھا۔

ثانیہ کو دیکھ کر مجھے اور بھی رونا آ گیا وہ دونوں بہن بھائی سو رہے تھے۔ میں ان کے پاس گئی اور ممتا بھری آنکھوں سے دونوں کو دیکھنے لگی اور فوراً میرے دماغ میں خیال آیا جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا وہ یہ کہ ان بچوں کا کیا مستقبل ہوگا اور جب یہ بڑے ہوں گے تو گھر میں کیا ماحول پائیں گے اور اپنے والدین کے بارے میں کیا گمان کریں گے۔

ابھی ان ہی سوچوں میں گم تھی کہ میرے پیچھے ایاز بھی بیڈروم میں آ گیا اور بڑے نرم لہجے میں کہنے لگا۔



''ناراض ہو گیا؟''

میں کچھ نہ بولی اور اپنی جگہ پر خاموش ساکت کھڑی رہی۔ ایاز نے میرے قریب آ کر میرے کان میں دوبارہ سرگوشی کی۔ ''ناراض ہو گیا؟''

میں خاموشی سے بیڈ پر آ کر اپنی سائیڈ پر لیٹ گئی ایاز وہیں کھڑا ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔

''اب اگر میں نے مذاق سے کہہ ہی دیا کہ اب تم بھی سوچتی ہو تو اتنی سی بات پر کون سی قیامت ٹوٹ پڑی۔ تمہارا تو موڈ ہی نہیں ٹھیک ہو رہا۔'' اب میرا غصہ قدرے پہلے سے کم ہو چکا تھا لہٰذا میں بڑے اطمنان سے بولی۔

''ایاز ممکن ہے آپ کے نزدیک یہ ایک چھوٹی سی بات ہو گی لیکن آپ کی اس چھوٹی سی بات سے مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ پتا نہیں وہ دن کب آئے گا جس دن آپ کے نزدیک میری کوئی قدر ہو گی اور آپ کو میرے جذبات کا احساس ہو گا۔ پتا نہیں امی نے آپ میں کیا دیکھا تھا جو مجھے آپ کے حوالے کر دیا۔'' ابھی میں بول ہی رہی تھی کہ ایاز نے طنزاً لہجے میں کہا۔

''اتنا تمہاری امی نے مجھے پسند نہیں کیا تھا جتنا تم نے خود کیا تھا۔ میں تو جیسا پہلے تھا آج بھی ویسا ہی ہوں۔ اگر اب تمہیں مجھ میں عیب نظر آتے ہیں تو مجھے چھوڑ دو۔''

ایاز تو اتنی بات کہہ کر سو گیا اور میں ساری رات روتی رہی اور روتے روتے پتا نہیں کب سو گئی۔

صبح معمول کے مطابق اٹھی ایاز کی رات والی باتیں ابھی تک دماغ میں گھوم رہی تھیں۔ خیر۔ ایک نئی صبح تھی تو سوچا کیوں نہ رات والی بات کو بھول جاؤں اور صبح کا آغاز نئے معاملات کے ساتھ کیا جائے اور پھر میں ایاز کے لیے ناشتا بنانے میں مصروف ہو گئی۔ اتنے میں ایاز بھی فریش ہو کر ڈائننگ ٹیبل پر آ گیا۔ میں نے ایاز کو گڈ مارننگ کہتے ہوئے ناشتا پیش کیا۔ ناشتا شروع کرتے ہوئے ایاز نے کہا۔

''آج تم بھی میرے ساتھ ناشتا کر لو چلو اس بہانے تمہارے ساتھ کچھ وقت گزارنے کو مل جائے گا۔ ویسے بھی جب سے نیا باس آیا ہے کام کی مصروفیت کچھ بڑھ سی گئی ہے۔ کافی دن ہو گئے ہیں میں تمہیں اور بچوں کو ٹائم نہیں دے سکا۔'' میں جو کہ کچن کے دروازے میں کھڑی تھی فوراً ایاز کے پاس ٹیبل پر آ گئی اور ہم دونوں ناشتا کرنے لگے۔ اس دوران مجھے خیال آیا کہ ایاز اتنا بھی نہیں بدلا۔ نہ اپنے فرائض سے غافل ہوا۔ ایاز کے اس رویے پر مجھے ٹوٹ کر پیار آ رہا تھا کہ ایاز نے میرے خیالات کا تسلسل توڑتے ہوئے کہا۔

''اچھا چلو اب بتاؤ کہ کل تم کیا سوچ رہی تھیں؟''

''چھوڑو یار دفعہ کرو رات گئی بات گئی۔''

''او اچھا تو یعنی کہ کل کا غصہ ابھی باقی ہے۔''

''نہیں ایاز ایسی کوئی بات نہیں۔''

''اگر ایسی کوئی بات نہیں تو پھر بتا دو۔''

''ایاز وہ میں سوچ رہی تھی کہ اگر میں بیوٹی پارلر کھول لوں تو کیسا رہے گا۔ آخر دو سال لگائے ہیں اس کا کچھ تو حاصل ہو۔'' ایاز نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''مجھے پسند نہیں۔''

''لیکن ایاز! باجی زاہدہ تو اپنا سیلون چلا رہی ہے اور خوب پیسے کما رہی ہیں۔''

''دیکھو باجی اپنے گھر کی ہیں اب میرا باجی پر کوئی حق نہیں میرا حق صرف تم پر ہے پلیز اب فضول بحث مت کرو۔''

اور پھر ایاز تو ناشتا کر کے دفتر کے لیے نکل گئے اور میں سارا دن ایک ہی بات سوچتی رہ گئی کہ کیا ایاز کو مجھ پر اس قدر حق حاصل ہے کہ وہ میری خواہشات سلب کر لے۔ کیا میری خواہشات کا میرے وجود پر کوئی حق نہیں؟ ایک لڑکی کی خواہشات باقی رہ جاتی ہیں تو وہ سوچتی ہے کہ پیا دیس جا کر پوری کروں گی اور اگر وہ خواہشات پیا دیس جا کر بھی پوری نہ ہوئی ہوں تو عورت اندر سے مر جاتی ہے۔ کیا گھر کی تمام ذمہ داری عورت کے ہی سر پر ہے مرد کا کوئی فرض نہیں ہے؟ میں اگر ایاز کی بے پروائیوں کا گلہ کروں تو بھی غلط اور وہ جیسے مرضی کرے۔ آخر وہ مرد ہے اسے مجھ پر برتری حاصل ہے نہ جانے کیوں وہ اپنے حق کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے...... میرا کیا ہے میں تو اس کے پہلو میں خوش ہوں اور اگر نہ بھی خوش ہوں تو کیا کر سکتی ہوں۔ زندگی کا دوسرا نام عزت ہے اور بس عزت کے لیے عورت جی رہی ہے، جیتی چلی جا رہی ہے۔ میری طرح بالکل میری طرح، آپ کا کیا خیال ہے ساتھیو!!

☆☆☆

دنیا میں کس جگہ
سچی کہانیاں
کے چرچے نہیں

آپ سچی کہانیاں کے خریدار بن کر ملک کو
زرِ مبادلہ بھیجیے

اندرون ملک =/890 روپے

ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

زرِ سالانہ

ملک	زرِ سالانہ	ملک	زرِ سالانہ
کویت	55 امریکی ڈالرز	ایران	55 امریکی ڈالرز
سعودی عرب	55 امریکی ڈالرز	سری لنکا	55 امریکی ڈالرز
یو اے ای	55 امریکی ڈالرز	جاپان	55 امریکی ڈالرز
مصر	55 امریکی ڈالرز	لیبیا	55 امریکی ڈالرز
یونان	55 امریکی ڈالرز	ڈنمارک	55 امریکی ڈالرز
فرانس	55 امریکی ڈالرز	جرمنی	55 امریکی ڈالرز
برطانیہ	55 امریکی ڈالرز	ہالینڈ	55 امریکی ڈالرز
ناروے	55 امریکی ڈالرز	پولینڈ	55 امریکی ڈالرز
امریکہ	65 امریکی ڈالرز	کینیڈا	65 امریکی ڈالرز
افریقہ	65 امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	65 امریکی ڈالرز

آج ہی رابطہ کیجیے
C-88 II ۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
فون نمبر: 021-35893121 - 35893122

ناول
کاشی چوہان

زہرِ عشق

خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور، عشق کی ایک ایسی ناقابلِ یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

آخری قسط

آصف یہ سن کر جیسے غش کھا کے گرا اور درشہوار کی چیخ حلق کی سرحدوں کو توڑ کر خارج ہوگئی۔ چیخ سن کر سلمان باہر کی طرف لپکا تو صنوبر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سلمان کی آنکھوں میں بہت سے سوالات نے ہلچل مچا دی کہ ماں کی چیخ سن کر بھی صنوبر اس کے ساتھ کمرے سے باہر آنے کے بجائے الٹا اسے بھی ہاتھ سے پکڑ کر روک رہی تھی۔

''ابھی تم نے وعدہ کیا بھی نہیں۔ سلمان میرے بھائی اور امتحان کا پہلا پرچا تمہارے روبرو ہے۔ مجھے میرے سوال کا جواب دیے بغیر کمرے سے گئے تو میں سمجھوں گی تم مجھ سے وعدہ کر کے کبھی نبھاؤ گے نہیں۔ اگر ایسا ہے تو میں تمہارا ہاتھ چھوڑتی ہوں اور شادی کے نام پر کسی بھی جہنم میں کود جانے کو تیار ہوں'' سلمان کے تن بدن میں ایک جھرجھری سی آگئی وہ جیسے اپنے سارے وجود سے کانپ کے رہ گیا۔ یا اللہ مجھے حوصلہ دے۔ میری مدد کر میرے مولا میں کیا کروں! کیا جواب دوں اپنی اس پگلی بہن کو'' سلمان کے دل سے ایک آہ نکلی اور وہ خود کو ایک ایسے شکنجے میں جکڑا ہوا محسوس کرنے لگا۔ جس سے نکلنے کی اس کے اعضاء صلاحیت کھو چکے تھے۔

''ٹھیک ہے میں تمہیں کل تک کی مہلت دیتی ہوں۔ تم مجھے سوچ کر جواب دے دینا'' صنوبر نے جب اپنے بھائی کو مخمصے میں دیکھا تو وہ سمجھ گئی کی دنیا کی شاید ہی کسی بہن نے اپنے بھائی کو ایسی مشکل میں ڈالا ہوگا۔ جب دنیا میں کسی بات کی کوئی دلیل اور مثال موجود نہ ہو تو اس پر پہلا قدم رکھنے والا انسان دنیا کا پہلا جرأت مند انسان ہوتا ہے جو سلمان ظاہر ہے نہیں تھا۔ ایک پل میں جوش آجائے اور انسان کچھ بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہو جائے۔ اور اس لمحے میں کسی کا قتل بھی کر دے تو جوش و ولولے کے دباؤ میں یہ ممکن ہے۔ ایسی حالت میں کوئی بھی حد درجے کا بزدل آدمی بھی بہادر بن سکتا ہے لیکن یہ صرف ایک لمحہ ہی ہوتا ہے جو بعض اوقات انسانوں کی پوری زندگی پر پھیل کر ان کی ساری تاریخ بدل کے رکھ دیتا ہے۔ ایسا ہو سکتا تھا سلمان بہن کی محبت کے جوش میں اس وقت اس کی مرضی پر راضی ہو سکتا تھا۔ صنوبر کو اپنا گوہر مقصود مل سکتا تھا مگر اس قسم کے وعدوں اور عہد و پیمان کے بارے میں سنا گیا ہے کہ اکثر لوگ ان پر قائم نہیں رہتے اور بعد میں کہہ دیتے ہیں کہ وہ میرا جذباتی فیصلہ تھا مجھے سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

صنوبر نے جس وقت سلمان کا ہاتھ چھوڑا تو اس کے ذہن میں اسی بات نے کروٹ لی تھی اور وہ سلمان کے بعد خود

بھی دھیرے دھیرے چلتی ہوئی باہر لاونج میں آئی تو اس نے دیکھا سلمان اس کے پاپا آصف کو پانی پلا رہا تھا اور وہ اب بھی فرش پر ٹانگیں پسارے بیٹھے ہوئے تھے بلکہ انھیں درشہوار نے سہارا دیا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر درشہوار کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرا کر معدوم ہوگئی۔

''کیا ہوا پاپا آپ اس طرح...؟'' صنوبر اپنے پاپا کے قریب پہنچ کر فرش پر بیٹھتے ہی بولی۔ جواب میں آصف سے کچھ نہیں کہا وہ ایک ایسی گہری نگاہوں سے اس کی طرف ٹکر ٹکر دیکھتا رہا کہ صنوبر نے ان کی طرف توجہ ہٹا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا اور ان کا ہاتھ پکڑ کے دباتے ہوئے بولی۔

''بیٹیوں کے دکھ کتنے ظالم ہوتے ہیں ایسے ماں باپ کو ایک جگہ اکٹھا کر دیتے ہیں جو پتا نہیں کب سے ایک دوسرے کے لمس کی حرارت کو بھی بھول چکے ہوتے ہیں سکتے۔''

''کیوں کر رہی ہو ایسا؟'' درشہوار سے رہا نہیں گیا اور وہ اس حالت میں بھی پوچھ بیٹھی۔ ابھی صنوبر کوئی جواب دیتی کہ درشہوار پھر بولی۔ ''دیکھو تمہارا باپ تم سے کتنی محبت کرتا ہے تمہارے اس احمقانہ مطالبے کا سن کر اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہو سکا اور زمیں بوس ہو گیا۔

''میرے تو دونوں طرف ہی کھائی ہے پاپا۔'' اس نے اپنا سر اپنے باپ کے گھٹنے سے لگا دیا ویران آنکھیں جیسے سکتے کی سی حالت میں ہوں۔ نہیں تو اس وقت وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی۔ آصف نے درشہوار کے ہاتھوں سے نرمی سے اپنا ہاتھ نکالا اور بولا۔

''میری بنی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دیکھنا سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''پتا نہیں پاپا سب ٹھیک ہوگا بھی یا نہیں۔ پر میں اتنا ضرور جان گئی ہوں کہ ماں باپ کے لیے بیٹیوں کا پالنا اور ان کی جھولی میں ان کی پسند کی خوشیاں ڈالنا کتنا مشکل ہے۔ آپ دونوں کی طرف دیکھتی ہوں تو دل میں خیال سر اٹھاتا ہے کہ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ ماں باپ جن کے گھر میں بیٹی کا جنم نہیں ہوتا۔''

''مت کرو ایسی فضول اور مایوسی والی باتیں۔ تمہارے پاپا کہہ رہے ہیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا نا'' درشہوار نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سلمان اس منظر کو اجنبیت سے دیکھنے لگا۔ کتنا ہولناک وقت تھا دکھوں نے ہلا مچایا ہوا تھا اور سب صنوبر کی زندگی کی الجھنوں میں الجھ چکے تھے پھر بھی یہ منظر سلمان کو اتنا زیادہ اچھا اور دل کو چھوتا ہوا محسوس ہوا کہ اس کا دل چاہنے لگا کہ کاش یہ منظر اس کے گھر سے کبھی رخصت نہ ہو۔ مگر خواہشوں کا کیا ہے وہ تو بنا سوچے سمجھے در آتی ہیں کبھی دل میں کبھی دماغ میں۔ اس سے زیادہ وہ نہیں سوچ سکا کہ کیا کہے۔ صنوبر نے اسے کل تک کا سوچنے کا وقت دیا تھا اس کا مطلب تھا کہ رحمان انکل آ کر جو بھی کہیں گے انھیں ہر حال میں کل تک حتمی جواب دینے کو کہا جائے گا۔ ابھی چاروں میں خاموشی کی ایک چادر سی تنی ہوئی تھی کہ ملازم نے آ کر اطلاع دی کہ رحمٰن صاحب تشریف لا چکے ہیں اور انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا ہے۔ آصف نے امید بھری ایک نظر صنوبر پر ڈالی اس کے بعد درشہوار کو دیکھا تو درشہوار بولی۔

''اٹھو آصف آج تمہیں خود کو یہ یقین دلانے کی ضرورت پڑے گی کہ تم ایک جوان بنی کے باپ ہو۔ بیٹی کا باپ ہونا کتنا مشکل ہوتا ہے یہ آج ہمیشہ سے زیادہ جان لو گے۔''

درشہوار کی بات ختم ہوئی تو آصف اٹھا اور ڈرائنگ روم کی طرف جانے لگا۔ اسے پیچھے سے پھر درشہوار کی آواز سنائی دی وہ کہہ رہی تھی۔ ''رحمٰن سے جو بھی بات ہوگی ہم تینوں بھی وہاں موجود رہنا چاہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے تم منع نہیں کرو گے۔''

درشہوار کی بات سن کر آصف نے 'ٹھیک ہے' کہا اور وہ تینوں بھی اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔ رحمٰن توقع کر رہا تھا کہ اسے آصف سے اکیلے میں بات کرنے کا موقع ملے گا اور وہ آصف کو وہ ذلت آمیز بات بھی بتا سکے گا کہ کیسے اس کے بیٹے نے اس کے منہ پر طمانچہ رسید کیا ہے۔ لیکن اس کی توقع کے خلاف آصف تو اپنی بیوی کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کو بھی گفتگو میں شریک کرنے کا فیصلہ کر کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ رحمٰن کو

یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ اس وقت اس گھر کا نقشہ کیا ہے سب ایک نہج پر ہیں اور صنوبر کی زندگی کا فیصلہ کرنے کا اختیار اسے اس انداز میں دیا گیا ہے کہ اس کے اپنے اسے ہر حال میں سپورٹ کریں گے۔ اس پر کسی بھی قسم کا دباؤ نہیں ڈالا جائے گا۔ رحمن نے آصف کو سلام کیا ہاتھ نہیں ملایا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑتے ہوئے بولا۔

''کچھ بھی کہنے سے پہلے میری پوری بات سن لو اس کے بعد تم جو بھی کہو گے مجھے منظور ہوگا۔ تم اپنی عزت اور کاروبار کی شہرت کو نقصان پہنچانے کا ہرجانہ بھی مانگو گے تو میں وہ بھی دینے کو تیار ہوں گا۔'' رحمن کی بات جاری تھی کہ آصف بولا۔

''مجھے میری بیٹی سے زیادہ عزیز کچھ بھی نہیں ہے مجھے کسی ہرجانے کا کوئی حق چاہیے نا مطالبہ ہے۔ بس جاننا چاہتا ہوں کہ شادی سے دو دن پہلے ایسا کیا ہوا جو تم نے اتنا بڑا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے میری بیٹی کی عزت اور خوشی سے زیادہ کچھ بھی عزیز نہیں ہے اور یہی مجھے درکار بھی ہے۔ اب تم اپنی بات پوری کرو''

آصف نے رحمن کو غور سے دیکھتے ہوئے اپنی بات ختم کر دی۔ رحمن نے ایک نظر ان تینوں کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔ ''کیا تم بچوں کو بھی اس گفتگو میں شریک رکھنا چاہتے ہو؟''

''ہاں اس وقت میرے بچے ہی میری سب سے بڑی دولت ہیں اور میں انھیں ایسے ہر معاملے میں شریک رکھنا چاہتا ہوں جس کا تعلق ان کی زندگیوں سے ہے۔''

''اچھا..........!'' ایک طویل اور گہرے سانسوں کے بیچ میں بولی اچھا کے بعد کمرے میں سناٹا برسنے لگا اور پھر طویل وقفے کے بعد رحمن نے بات شروع کی اور فارس کے تھپڑ مارنے والی ذلت آمیز بات بھی ہمت کر کے کہہ ڈالی۔ تھپڑ والی بات نے آصف سمیت صنوبر، درشہوار اور سلمان سب کو چونکنے اور ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''وہ بدتمیز ہے، ایسا نہیں ہے کہ میں اسے صنوبر کے لائق سمجھتا تھا لیکن جب اس نے صنوبر کی خواہش کا اظہار کیا تو مجھے پہلی بار شدت سے یہ احساس ہوا کہ صنوبر وہ لڑکی جو اسے بہتر انسان بنا سکتی ہے۔ اس لیے میں نے ہمت کر کے تم سے یہ رشتہ مانگا تھا اور اس وقت میں بہت حیران ہوا تھا جب اس رشتے کے لیے صنوبر بیٹی نے خود اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تھا۔ میری تو حیرت کی انتہا نہیں رہی تھی کہ صنوبر جیسی کھرّ اور بہت نفیس خیالات کی مالک ایک آرٹسٹک لڑکی میرے بیٹے کو اپنے لیے قبول کر سکتی ہے۔ لیکن اب جو پرسوں اس نے یہ حرکت کی ہے تو مجھے یقین آ گیا ہے کہ میرا نالائق جنگلی اور بدتمیز اور بدتہذیب بیٹا اس کے لائق ہی نہیں ہے۔ انتہائی قدم بھی میں نے اس لیے اٹھایا تا کہ اس رشتے کی بحالی کی کوئی ہلکی سی بھی امید باقی نہ رہے۔'' اتنا کہہ کر رحمن صاحب خاموش ہو گئے اور کمرے میں موجود ہر نفس یہ سوچنے لگا کہ اب کیا کہا جائے گا۔ یہ تو معاملہ بالکل ہی مختلف نکل آیا ہے۔ اب تو سلمان کو ایک دن میں صنوبر کے سوال کا جواب دینے کی بھی ضرورت نہیں رہی تھی اب تو مہلت ہی مہلت تھی کیونکہ رحمن صاحب نالائق فارس کے لیے رشتے کی بحالی کے لیے نہیں بلکہ صرف یہ بتانے آئے تھے کہ انھوں نے ایسا انتہائی قدم کیوں اٹھایا ہے۔ کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔

دیر تک رہنے والے سکوت کو رحمن نے ہی یہ کہہ کر توڑ دیا کہ ''اب تم جو بھی فیصلہ کرو مجھے منظور ہوگا۔ تم اگر یہ کہو گے میں اپنا فیصلہ بدل کر اس شادی کو ہو جانے دوں تو مجھے یہ بھی منظور ہوگا حالانکہ اتنا سب ہو جانے کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ یہ رشتہ مناسب ہوگا۔ جو تم کہو گے مجھے سب منظور ہوگا، تم کہو گے کہ میں چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں اور پھر بھی اس طرف کا رخ بھی نہ کروں تو مجھے یہ بھی منظور ہوگا، میرے بیٹے نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ میں تم سے معافی مانگنے کے علاوہ اور کہہ بھی کیا سکتا ہوں۔'' اتنا کہنے کے بعد رحمن اٹھ جانے کو کھڑا ہو گیا۔ معاملہ اتنا سنگین تھا کہ کسی کو رحمن کو چائے تک کا پوچھنے کا خیال نہیں آیا اور رحمن اٹھ کر چلا گیا تب بھی وہ چاروں اپنی جگہ پر ساکت صامت بیٹھے رہے۔ صنوبر اٹھی اور خاموشی سے اس کمرے سے جانے لگی تو درشہوار نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

''صنوبر! ایسے مت جاؤ کچھ تو کہو کیا فیصلہ کرنا چاہیے اور تم کیا چاہتی ہو؟ کچھ تو۔'' درشہوار نے اس کے عقب سے جا کے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پھر سے بٹھانے کی کوشش کی۔

''میں خود سمجھ نہیں پا رہی کہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے میرے مقدر میں صرف اور صرف اکیلا رہنا لکھ دیا گیا ہے'' صنوبر کی اس بات کو سن کر درشہوار چپ نہیں رہ سکی وہ سمجھ گئی کہ صنوبر کی اس بات کا کیا مطلب ہے وہ اپنے بھائی سے کچھ منوانے کی کوشش کر رہی تھی اسی راستے پر چلنے کا اس نے ارادہ کر لیا ہے۔

''ایسا تو مت کہو۔ کوئی ایک واقعہ پوری زندگی نہیں ہوتا بیٹے۔ اس وقت تم پریشان ہو میں تم سے کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتی بس اتنا جاننا چاہتی تھی کہ تم رحمن کی بات سننے کے بعد کیا سوچ رہی ہو؟''

''کیا سوچوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں بہت دنوں تک لوگوں کا دوستوں کا سامنا نہیں کر سکوں گی کیونکہ میری شادی ایسے عجیب و غریب انداز میں ختم ہوئی ہے کہ کسی کو کچھ بتا کر مطمئن نہیں کیا جا سکتا بس لوگوں کی نظروں میں جمے ہوئے سوالوں کا سامنا کرتے ہوئے ایسے خاموش رہنا ہوگا جیسے ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے اور جن کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا وہ لوگوں کی نظروں میں اس کے باوجود مجرم ہوتے ہیں کہ انھوں نے کوئی جرم کیا ہوتا نہ گناہ۔ ایسا ہی کچھ اب مجھے بھی جھیلنا ہوگا۔ میں خود کو ان سب پوچھے گئے سوالوں کی بوچھاڑ کے نتیجے میں پہنچنے والے زخموں کو ابھی سے محسوس کر رہی ہوں اور مجھے خود کو اس کے لیے تیار کرنا ہوگا۔'' صنوبر نے اتنا ہی نہیں کہا۔ اس کے اس درد اور اس حقیقت کو سب نے دل کی گہرائی سے محسوس کیا۔ وہ مزید بولی۔'' میں چاہتی ہوں کچھ دن کوئی کچھ بھی کہے آپ لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔ میں تو اس سب کو اپنا نصیب مان چکی ہوں۔ اس لیے شاید مجھے اتنی اذیت، اتنا درد نہیں ہوگا۔'' یہ کہہ کر صنوبر چپ ہوگئی اس کی آنکھوں میں بڑھتی ہوئی ویرانی کو محسوس کر کے درشہوار اور آصف کے دل چھلنی چھلنی ہو گئے۔

''میری بات مانو تو کچھ عرصے کے لیے یہاں سے دور چلی جاؤ۔ کہیں بہت دور تا کہ جب اس واقعات کی گرد بیٹھ جائے تو واپس آ جانا اس وقت شاید لوگ بھول جائیں نہ بھی بھولیں تو کم سے کم ان کی کڑوی کسیلی باتوں میں وہ شدت باقی نہیں رہے گی جو دل تو دل روح کو بھی زخمی کر دیتی ہے۔'' آصف کی تجویز بہت اچھی تھی درشہوار کو تو یہی اس مسئلے کا حل معلوم ہوا وہ کہنے ہی والی تھی کہ آصف جلد سے جلد اٹلی اور یورپ کے کچھ اور ملکوں میں بھیجنے کا بندوبست کر دے کہ اچانک صنوبر نے درشہوار کے ارادوں کو درمیان سے جا لیا۔

''نہیں پاپا میں ضرور چلی جاتی۔ لیکن میں آپ کو بتاؤں میں یہ سب فیس کرنا چاہتی ہوں۔ میں خود کو اتنا مضبوط بنانا چاہتی ہوں کہ زندگی میں آنے والے اور ایسے اور شاید اس سے بھی زیادہ ہولناک واقعات کے لیے خود کو تیار کر سکوں۔ مجھے اب یہ نازکی چھوڑ کر لوہے کا انسان بن کر جینا ہوگا۔ اور میں آپ کو یقین دلاتی ہوں میں ایسا کر سکتی ہوں'' صنوبر کی بات سن کر درشہوار نے پھر بیٹی کی مخالفت کرنا چاہی تو آصف نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا کہ صنوبر سے اور کوئی بحث نہ کی جائے۔ صنوبر ان سب سے اجازت لے کر چلی گئی اور یہ تینوں اب اس ڈرائنگ روم میں اکیلے تھے۔

☆☆☆

رحمن صاحب جب گھر میں داخل ہوئے تو ان کی بیٹی اور بیوی ان سے ایسے چمٹیں جیسے پتا نہیں انھیں کیا مل گیا ہے یا جیسے کوئی کئی سال سے بچھڑے ہوئے انسان ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔

''آپ کہاں چلے گئے تھے۔ ہم لوگوں کتنے پریشان ہو گئے تھے آپ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے'' ان کی بیوی ساجدہ نے کہا۔

''میں سارے اندازے لگا سکتا ہوں'' اس وقت وہ تفصیل سے کچھ بھی نہیں کہنا چاہتے تھے بہت تھک چکے تھے اور صرف یہ جاننے میں انھیں دلچسپی تھی کہ وہ نالائق گھر میں موجود ہے یا گھر سے باہر گیا ہوا ہے۔ ان کی اولاد تھی اتنا تو وہ بھی جانتے تھے کہ ان کا نالائق بیٹا ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ کر جانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور نہ ہی اس میں اتنی غیرت ہے۔ اس لیے انھیں معلوم تھا کہ فارس گھر ہی میں موجود ہے۔

"مجھے پانی پلاؤ" انھوں نے کہا تو ان کی بیٹی فرح ناز نے جلدی سے انھیں پانی لا کر دیا۔ انھوں نے پانی پیا اور پھر کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد وہ بولے۔

"میں آصف کی طرف گیا تھا رشتا باضابطہ طور پر ختم کر آیا ہوں۔ انھوں نے خاموشی اور افسوس کے ساتھ میری ساری مجبوری کو سنا اور کوئی جواب دیا نہ ہی مجھے برا بھلا کہا جیسا کہ میں توقع کر رہا تھا۔ بہت ہی شریف لوگ ہیں اور ہمارا بیٹا ایسے شریف لوگوں کا داماد بننے کے لائق نہیں ہے ساجدہ" یہ سب ساجدہ نے بہت دکھ سے سنا اور بولیں۔

"میں آپ کے ہر فیصلے کے ساتھ ہوں رحمن مجھے معلوم ہے آپ بیٹے کی شادی صنوبر سے کرانے کے لیے کتنے خوش اور پر امید تھے۔" انھوں نے بیوی کو اور بیٹی کو سینے سے چمٹا لیا اور پتا نہیں کب سے رکے ہوئے آنسو پھوٹ کر بہہ نکلے۔ اور آنسوؤں کے بیچ میں سے ہی بولے۔

"یہ سب مجھے خدا نے سرفراز کے بیٹے شرجیل کا حق چھیننے کی سزا دی ہے میں جانتا تھا شرجیل صنوبر سے محبت کرتا ہے لیکن جب مجھے پتا چلا کہ میرا بیٹا بھی صنوبر کا طلب گار ہے تو میں نے انتہائی خود غرضی اور بے حسی سے سرفراز کو یہ باور کرا دیا تھا کہ اگر اس نے میرے بیٹے کی خوشیوں کے سامنے آنے کی کوشش کی تو میں اسے سڑک پر لا کر کھڑا کر دوں گا۔ ایسا کہتے ہوئے میں بھول گیا تھا کہ وہ اوپر والا جو مجبوروں کا بھی ہے وہ چاہے تو زور آوروں کو زمین چٹا دے اور اس نے مجھے میری اوقات یاد کرا دی ہے میرے اسی بیٹے کے ہاتھوں بے عزتی کرا کے جس کے لیے میں ایک مجبور انسان کے بیٹے کی خوشیاں چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔" وہ رکے اور پھر بولے۔ دونوں ماں بیٹیاں رحمن کی صورت کی طرف ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے انھوں نے پہلی بار اس انسان کو دیکھا ہو۔ "پتا نہیں کہیں اس شریف انسان نے میرے ڈر سے ہی اپنے بیٹے کو کہیں دور بھیج دیا ہو اور وہ چاہتا ہو کہ جس وقت فارس کی صنوبر سے شادی ہو تو وہ یہاں موجود نہ ہو اور یہ مشہور کرا دیا ہے کہ اس کا بیٹا کہیں چلا گیا ہے۔ ممکن ہے وہ ٹھیک کہتا ہو مگر یہ بھی اسی وجہ سے ہوا ہے کہ شرجیل دلبرداشتہ ہو کہیں چلا گیا ہو۔ کتنے پریشان ہوں گے اس کے ماں باپ۔ جانتی ہو وہ جو شرجیل ہوسپٹل میں داخل تھا وہ بھی مجھے اپنے بیٹے فارس کا ہی کارنامہ لگتا ہے۔ جب سے اس نے میرے منہ پر طمانچہ مارا ہے مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اس ساری کہانی میں جو کچھ بھی خرابی ہوئی ہے اس سب کا ذمے دار فارس ہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئے۔ اور کمرے میں گہری خاموشی طاری ہو گئی۔

"کہاں ہے وہ؟" کچھ توقف کے بعد وہ بولے۔

"کل صبح سے اپنے کمرے میں بند ہے بس کھانے کے لیے نکلتا ہے اور اتنا زیادہ کھانا کھاتا ہے اگر آپ اسے کھاتے ہوئے دیکھ لیں تو حیران رہ جائیں پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ ایسا لگتا ہی نہیں ہے کہ وہ ہمارا وہ ہی فارس ہے چپ رہتا ہے کچھ پوچھو تب بھی جواب نہیں دیتا۔ سارا وقت بس سوتا رہتا ہے۔ میں نے بہت چاہا کہ اس سے پوچھوں کہ اسے ہوا کیا ہے مگر آپ کی وجہ سے میری ہمت نہیں پڑی ویسے بھی آج کا سارا دن آپ کی پریشانی میں نکل گیا۔"

ساجدہ نے بتایا وہ چپ ہوئی تو کمرے میں موجود سلمان کے ہونٹوں پر ہنسی کھیل گئی۔ اس نے سب کچھ سن لیا تھا یعنی اس کا کام ہو چکا تھا۔ اور اب اس کے اور صنوبر کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ تو کیا اب اسے فارس کے جسم کو چھوڑ کر چلے جانا چاہیے۔ یہ سوچ اسے بے چین کر رہی تھی، ایک طرف وہ صنوبر سے ملنے کو بے چین ہو رہا تھا تو دوسری طرف اسے اپنے ماں باپ اور کنعان کا خیال رہ رہ کر پریشان کر رہا تھا کہ پتا نہیں ان پر کیا گزر رہی ہے وہ تو پلٹ کے واپس گیا ہی نہیں اور اپنے قبیلے سے دوران سب کے لیے یہ پہلا موقع تھا جب وہ وقت گزار رہے تھے۔ آس پاس جنات کی کوئی بستی نہیں تھی اس ویرانے میں جہاں سلمان انھیں چھوڑ آیا تھا کچھ ہی فاصلے سے انسانوں کی آبادی شروع ہو جاتی تھی اور سلمان کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اگر اس کے والدین اور کنعان کا کسی انسان سے سامنا ہو گیا تو کہیں کوئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔ بس اس کی ماں تھی جس پر اسے یقین تھا کہ کیسے ہی حالات ہوں اس کی ماں اپنے بے مثال صبر اور ذہانت سے ان حالات کو بگڑنے سے بچانے کی صلاحیت رکھتی ہے اس کے پریشان خیال باپ ابراہیم کو بھی اس کی ماں ہی چین سے ایک جگہ رکنے کا ہنر جانتی ہے ورنہ دو دن ہو چکے تھے وہ لوٹ کر واپس نہیں گیا

تھا۔ اس کا باپ نہ صرف ناراض ہو رہا ہوگا۔ بہت بے چینی سے یہ سوچ رہا ہوگا کہ یہ سلمان ہمیں ہمارے قبیلے سے نکال کر یہاں چھوڑ کر خود پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے۔ اور سلمان پر جو کچھ بھی گزر رہی تھی وہ کیسے کسی کو بتا سکتا تھا خاص طور سے اپنے والد کو کہ وہ ایک مرے ہوئے انسان کا بہروپ بھر کے ایک انسان لڑکی سے نہ صرف محبت کر رہا ہے بلکہ اس سے شادی بھی کرنا چاہتا ہے۔ اس سے بھی بڑا عذاب یہ ہے کہ اسے فوری طور پر شرجیل کے ماں باپ کے گھر پہنچ کر انھیں بھی یہ بتانا ہوگا کہ وہ زندہ ہے اور واپس آچکا ہے۔ صنوبر تو اس طرح بنا بتائے جانے پر اتنی ناراض ہوگی کہ اسے منانا شاید اتنا آسان نہ ہوگا۔ یہ سوچ سوچ کر بھی اس کا ذہن شل ہو چکا تھا۔ کہ اتنے دن اور اس طرح بغیر کسی کو بھی بتائے وہ کہاں گیا تھا اور کیوں گیا تھا۔ ان دونوں سوالوں کے جواب اسے پہروں سوچنے کے بعد بھی نہیں مل رہے تھے کیونکہ یہ انسان ہیں اور ان کے سوچنے کا انداز اس سے بہت مختلف ہے یہ اس طرح کی باتوں کو کبھی معاف نہیں کرتے بلکہ باقاعدہ سزا دیتے ہیں اور جب تک قصوروار خود کی صفائی میں ایسا کچھ نہ کہہ دے جس سے سننے والوں کو مطمئن کیا جا سکتا ہو اس وقت تک وہ پوچھ پوچھ کے بھیجا فرائی کر دیتے ہیں۔ اور اس کے پاس ایسے کسی بھی سوال کا کوئی جواب سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ تھوڑا اس نے فارس کو راستے سے ہٹا دیا تب بھی وہ اپنی منزل سے ابھی بہت دور تھا۔ اس نے فوری طور پر فارس کا جسم چھوڑ کے جانے کا فیصلہ ترک کر دیا اور یہ سوچنے لگا کہ اس طرح فارس کا جسم چھوڑنے سے ایک تو خود فارس مصیبت بن سکتا ہے دوسرے ان لوگوں کو شک بھی ہو سکتا ہے کہ شرجیل کی واپسی ایسے وقت میں اور عین انھی حالات میں کیوں ہوئی ہے کہیں اس سب کا تعلق تلاش کرنے کی کوشش کی گئی تو لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں۔ یہ ساری سوچیں اسے مسلسل آ رہی تھیں۔ پھر بھی وہ خوش تھا اس نے اپنی صنوبر کے سامنے سے وہ دیوار گرا دی تھی جو اسے اور صنوبر کو ملنے سے روک رہی تھی۔

رات کو وہ فارس کو لے کر یہ سوچ کر نکلا کہ پہلے صنوبر کو فون کر کے اسے بتا دیتا ہوں کہ میں آ رہا ہوں۔ مگر پھر اسے کچھ ہی دیر میں یہ خیال آ گیا کہ اسے کسی طرح یہ پتا چل گیا کہ میں اسے یہیں اسی شہر سے فون کر رہا ہوں تو اس بگڑی ہوئی پچویشن کو سنبھالنا ممکن نہیں ہوگا۔

''تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' اس نے خود سے پوچھا۔ لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا اور اسے یہ لگنے لگا کہ کہیں میں صنوبر کو پا کے بھی کھو تو نہیں دوں گا۔ سوچوں کی آندھیاں چلتی رہیں۔ پھر ایک بجلی کی سی تیزی سے اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا اور اس نے صنوبر کو فون کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے صنوبر سے یہ کہنا تھا۔ اُسے یہ راستا مل گیا تھا۔ اس نے خود کو شاباش دی کہ اسے ایک ایسی بات سوجھ گئی تھی جسے سن کر کم سے کم شرجیل کے گھر والے اور صنوبر کو تو مطمئن کیا جا سکتا ہے۔

''وہ فارس کو لے کر کمرے سے نکلا تو سامنے ہی کوریڈور میں اس کا باپ رحمٰن ٹہل رہا تھا۔ ابھی رات کے کھانے میں کچھ وقت باقی تھا۔ اور رحمٰن اسے توجہ سے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ یہ اس وقت کہاں جا رہا ہے۔ اور کیوں جا رہا ہے۔ ابھی تو کھانے میں بھی کافی وقت ہے۔ یہ سوچ کر رحمٰن نے ارادہ کیا کہ اسے فارس سے پوچھنا چاہیے کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس نے خود کو تسلی دی کہ وہ فارس کا باپ ہے اور سب سے بڑھ کر وہ ابھی اس کے گھر میں رہ رہا ہے اور یہاں اس کا حکم چلتا ہے۔ زیادہ بدمعاشی کی تو اسے اس گھر میں رہنے کی سہولت نہیں رہنے دوں گا۔ فارس قریب آیا تو رحمٰن نے ہمت کر کے پوچھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' پہلے تو سلمان نے اسے گھور کے دیکھا پھر بولا۔

''کیوں ایک تھپڑ سے دل نہیں بھرا تیرا جو پھر میرے راستے میں آتا ہے'' فارس کی بدتمیزی نے رحمٰن کے تن بدن میں آگ لگا دی اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک زور کا تھپڑ مارنے کو اٹھایا مگر اسے کیا معلوم تھا کہ فارس کے جسم کو تو سلمان نے قابو کیا ہوا ہے۔ سلمان کوئی انسان تو تھا نہیں ویسے بھی رحمٰن کو فارس سے متنفر رکھنے کے لیے اس قسم کی حرکتیں کرتے رہنا ضروری تھیں۔ اس نے رحمٰن کا ہاتھ فضا میں ہی روک لیا اور اسے ایک زور کا دھکا دے کر فرش پر گراتے ہوئے بولا۔ ''آئندہ میرے راستے میں آیا تو لحاظ نہیں کروں گا۔ یہ ہاتھ توڑ کے رکھ دوں گا جو میرے سامنے اٹھے گا۔''

سلمان تو یہ کہہ کر چلا گیا مگر اس منظر کو فارس کی ماں ساجدہ نے دیکھ لیا وہ دوڑ کر اپنے زمین پر گرے ہوئے شوہر کو اٹھانے لیے لپکی اور اسے سہارا دیتے ہوئے بولی۔

''آپ کیوں اس کمینے کے منہ لگتے ہیں۔ رہنے دیں اسے اس کے حال پر'' پتا نہیں رحمن نے یہ بات سنی یا نہیں کیونکہ اس کا ذہن مسلسل اس ہاتھ کی طاقت میں الجھ گیا تھا۔ جس نے اسے پکڑ کر زمین پر پھینکا تھا۔ اسے یاد آنے لگا کہ پہلے والا تھپڑ بھی ایسا ہی تھا غیر معمولی تھا۔ جس جگہ پر پڑا تھا وہ جگہ دیر تک جلتی رہی تھی۔ فارس کے تو کیا یہ تو کسی انسان کے ہاتھ بھی نہیں معلوم ہو رہے تھے۔ کچھ دیر تک ساجدہ اس کے قریب بیٹھ کر جانے کیا کیا کہتی رہی مگر رحمن کو اس کی کوئی ایک بات بھی سنائی دی نہ ہی اس نے اس پر غور کیا۔ پھر وہ یہ کہہ کر چلی گئی کہ میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔

☆☆☆

سلمان فارس کے بہروپ میں گھر سے باہر نکلا اور اس نے ایک پبلک بوتھ تلاش کر کے صنوبر کو فون لگایا۔ بات کرنے سے پہلے وہ یہ بھی طے کر چکا تھا کہ اسے صنوبر سے کیا کہنا ہے اور اس نے دکاندار کا بھی بندوبست کر لیا تھا کہ وہ اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ بھی نہ سن سکے۔ دوسری طرف سے فون صنوبر نے ہی اٹھایا کیونکہ فون اس کے موبائل پر کیا گیا تھا۔ صنوبر پہلے تو دیر تک اس نامعلوم نمبر کو نظر انداز کرتی رہی لیکن جب بہت مرتبہ کال کی گئی تو اس نے فون اٹھا ہی لیا اس وقت وہ اپنے کمرے میں تھی اور اپنی ماں سے باتیں کر رہی تھی۔

''ہیلو......!'' سلمان نے شرجیل کی گھبرائی ہوئی آواز میں ہیلو کہا۔

''کون.............؟'' صنوبر نے پوچھا۔

''میں شرجیل....'' اس نے پھر سانسوں کے ردھم کو ایسا بنا کے رکھا جیسے وہ بہت جلدی میں ہے اور بڑی مشکل سے فون کر رہا ہے۔ لیکن اس کے توقع قطعی خلاف اس کا نام سنتے ہی صنوبر نے فون کاٹ دیا۔ درشہوار نے فون سن کر صنوبر کے غیر معمولی ردعمل کو نوٹ کر لیا اور وہ صنوبر سے پوچھنے لگی۔

''کون تھا صنوبر......؟'' صنوبر نے خوفزدہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا اور چپ رہی۔

''میں پوچھ رہی ہوں صنوبر فون پر کون تھا؟'' درشہوار نے اس بار زیادہ اصرار سے پوچھا۔

صنوبر کو ماں کی توجہ اس فون سے ہٹانے لیے کہنا پڑا۔

''کوئی نہیں رانگ نمبر تھا۔'' صنوبر کے چہرے پر جو تغیرات رونما ہو چکے تھے شرجیل کا نام سننے کے بعد انھیں درشہوار بہت اچھی طرح پہچانتی تھی ویسے بھی جب سے صنوبر ان مصیبتوں سے گزر رہی تھی درشہوار اس کی ایک ایک حرکت پر نہ صرف نظر رکھتی تھی بلکہ وہ اس کے ایک ایک ردعمل سے واقف ہو چکی تھی اسی لیے درشہوار نے کہا۔

''ماما سے جھوٹ بول رہی ہو تو ضرور کسی ایسے انسان کو فون تھا جس سے تم بات تک کرنا نہیں چاہتیں۔ ورنہ میں اچھی طرح جانتی ہوں میری بیٹی ایک موقع تو صفائی پیش کرنے کا سب کو دیتی ہے لیکن اس فون پر تو تم نے صرف اس کا نام سن کر فون کاٹ دیا۔

صنوبر کو ماں کی بات سن کر ایسا لگا کہ جیسے اس کی ماں خطرناک حد تک اس کے بارے میں جان چکی ہے۔ ابھی ان دونوں میں کوئی اور بات ہوتی یا صنوبر یہ سوچنا شروع کرتی کہ اس نے شرجیل کا فون کاٹ کر ٹھیک کیا ہے یا غلط کیا ہے۔ کہ فون پھر سے بجا اور اس بار بھی وہی نمبر تھا۔

''صنوبر پلیز فون مت رکھنا، میری بات تو سن لو' صنوبر بولی کچھ نہیں مگر اس نے اس بار فون نہیں کاٹا وہ فون کان سے لگا کر اپنی ماں کی طرف دیکھنے لگی جو اسی کی طرف کافی توجہ سے دیکھ رہی تھی۔

شرجیل بولا...'' میں بڑی مشکل سے تمہیں یہ فون کر رہا ہوں۔ صنوبر مجھے فارس نے کرائے کے غنڈوں سے اغوا کرا لیا ہے اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ میں کہاں ہوں۔ یہ فون آج کسی طرح میرے ہاتھ لگ گیا تو میں نے سب سے پہلے تمہیں......کوئی آرہا ہے میں فون رکھتا ہوں'' شرجیل نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا۔

صنوبر کے تو جیسے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ کچھ دیر تک تو وہ ایک بے سدھ بیٹھی رہی اور خود کو یقین دلاتی رہی کہ جو

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

کچھ اس نے ابھی سنا ہے وہ حقیقت ہے۔ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہی اور سوچوں کے گرداب سے وہ باہر نکلی تو اس نے دیکھا اس کی ماں اسے جھنجوڑ جھنجوڑ کر پوچھ رہی ہے۔

''صنوبر کون تھا فون پر۔ صنوبر میری بچی ہوش میں آؤ....'' یہ جملہ درشہوار بار بار بول رہی تھی اس نے اتنی بار کہا کہ اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ پر کام کرتا ہوا سلمان بھی اس کے کمرے میں چلا آیا اور حیرت سے اس منظر کو دیکھنے لگا کہ کس طرح اس کی ماں اس کی بہن کو جھنجوڑ رہی ہے۔

''فارس نے شرجیل کو کڈنیپ کرالیا ہے۔ وہ اس کی قید میں ہے۔'' صنوبر نے ہوش میں آتے ہی ایک ہی سانس میں یہ جملہ بولا۔

''کیا........؟؟'' سلمان اور درشہوار دونوں کے منہ سے نکلا۔

''ہاں وہ یہی کہہ رہا تھا۔ شرجیل کا ہی فون تھا!'' صنوبر جیسے پوری طرح ہوش میں آچکی تھی۔

''یہ اس نے کہا کہ اسے فارس نے اغوا کرایا ہے؟'' سلمان نے پوچھا۔

''ہاں اس نے کہا ہے فارس نے کرائے کے آدمیوں کے ذریعے اغوا کرایا ہے اور اسے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔ اس نے کہا کوئی آرہا ہے اور پھر فون کاٹ دیا۔'' صنوبر نے ساری بات ان دونوں نے سامنے گوش گزار کردی۔

''مجھے فارس سے ایسی ہی گھٹیا حرکت کی امید تھی!'' سلمان نے غصے سے کہا۔ ''پتا نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے''

''کہیں وہ جو پہلے حملہ ہوا تھا وہ بھی تو فارس نے ہی نہیں کرایا تھا؟'' درشہوار سوچتے ہوئے بولی۔

''ہمیں شرجیل کی مدد کرنی چاہیے؟'' صنوبر جلدی سے بولی ''وہ بہت مشکل میں لگ رہا ہے۔''

''لیکن ہم اس کی مدد کریں گے کیسے ایک گمنام نمبر سے آنے والی کال سے یہ کیسے پتا چلایا جاسکتا ہے کہ وہ کہاں سے کس علاقے سے کی گئی کال ہے۔ پھر میں نے تو یہ بھی سنا ہے اغوا کرنے والے بھی ایک ٹھکانے پر نہیں رکتے وہ اپنے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں'' سلمان نے تفصیل سے کہا۔

''تو کیا شرجیل کی کوئی مدد نہیں ہوسکتی۔ کہیں وہ اسے کوئی نقصان...نہ پہنچا دیں؟'' صنوبر کے لہجے میں گہری تشویش در آئی تھی۔

''نہیں میری بہن ایسا نہیں ہے انھوں نے شرجیل کو کوئی نقصان پہنچانے کے لیے نہیں بلکہ تمہاری شادی سے دور رکھنے کے لیے کڈنیپ کیا ہے اگر انھیں نقصان پہنچانا ہوتا تو اتنے دن سے وہ ان کی قید میں ہے اب تک پہنچا چکے ہوتے۔'' سلمان نے صنوبر کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

''لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی کہ اگر شرجیل کو شادی سے دور رکھنے کے لیے اغوا کیا گیا ہے تو پھر فارس نے ایسی بدتمیزی والی حرکت کیوں کی۔ اس طرح تو اس کی شادی کھٹائی میں پڑ چکی ہے؟'' درشہوار کا سوال صنوبر اور سلمان دونوں کا سر گھمانے کے لیے کافی تھا۔

ساجدہ کمرے سے جاچکی تھی اور رحمن مسلسل یہ سوچے جارہا تھا کہ یہ ہاتھ کسی انسان کا تو نہیں ہے۔ پھر جب ساجدہ چائے لے کر آئی تو وہ ایسے بولا جیسے اس کی سوچ کسی نتیجے پر پہنچ چکی ہو۔

''ساجدہ تم بتا رہی تھیں کہ وہ کھانا بہت زیادہ کھاتا ہے۔ اتنا کہ اتنا کھانا کبھی فارس نے نہیں کھایا اور شاید ایک انسان اتنا کھانا کھا بھی نہیں سکتا۔؟'' رحمن نے لہجے میں شدت اور اشتیاق تھا مگر ساجدہ نے معمول کی طرح ہی جواب دیا اور بولی۔

''ہاں ایسا ہی ہے لیکن اس نے بارے میں مت سوچیے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیجیے۔ خدا کے لیے اس سے مت الجھیے نہیں تو پھر کوئی ایسی ویسی حرکت وہ کرے گا اور آپ اس کو برداشت نہیں کرسکیں گے۔'' ساجدہ کی بات انھوں نے پوری طرح نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے یقین ہے وہ فارس نہیں ہے؟''

''کون فارس نہیں ہے؟'' ساجدہ کو لگا کہ رحمن کو ان کے بیٹے نے جو دھچکا دیا تھا اس کی وجہ سے اس کے

ذہن پر اثر ہو گیا ہے۔

''رحمٰن پلیز آپ میری بات مانیں اور یہ چائے پی کر لیٹ جائیں تھوڑی دیر آرام کر لیں۔ خدا کے لیے خود کو اتنا مت تھکائیں۔'' ساجدہ کی بات سن کر رحمٰن کو احساس ہوا کہ اس کی بیوی کو اس کی بات دیوانے کی بڑ سے لگ رہی ہے۔

''تم ہی نے تو کہا تھا کہ وہ انسانوں کی طرح کھانا نہیں کھاتا۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ کوئی انسان اتنا کھانا نہیں کھا سکتا۔ کہا تھا یا نہیں؟''

ساجدہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دے۔ ''ہاں کہا تھا لیکن اس بات کو آپ بھول جائیں رحمٰن پلیز۔''

''یہ بھولنے والی نہیں یاد رکھنے والی بات ہے۔ وہ فارس نہیں ہے وہ فارس کے روپ میں کوئی اور ہے!'' رحمٰن نے یہ کہہ تو دیا لیکن سننے کے بعد ساجدہ کی تو جیسے گھگھی بندھ گئی۔

''کیا..... ک..... کیا..... کہنے کی کوشش کر رہے ہیں آپ...؟'' وہ خوف سے لرزنے لگی۔

''جب اس نے پہلا تھپڑ مارا تھا تب بھی میرے گال پر بہت دیر تک جلن ہوتی رہی تھی اور مجھے غصے میں یہ خیال ہی نہیں آیا کہ کسی انسان کا اور خاص طور سے فارس کا ہاتھ اتنا بھاری اور اتنی طاقت والا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اب جب اس نے مجھے اٹھا کر دور پھینکا تو میں نے محسوس کیا یہ کوئی انسانی ہاتھ نہیں تھا اور فارس کے ہاتھ میں تو اتنی طاقت ہو بھی نہیں سکتی'' رحمٰن جوں جوں سوچ رہا تھا اس کا شک یقین میں بدل رہا تھا۔

''یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں رحمٰن... اگر وہ فارس نہیں ہے تو پھر کون ہے؟'' ساجدہ کا ڈر اب بھی اس کے وجود کو اپنی گرفت لیے ہوئے تھا۔

''یہی ہمیں پتا چلانا ہوگا کہ وہ کون ہے؟'' رحمٰن کو اپنی بات کا مفہوم جان کر ایک قسم کا ڈر سا لگا انھوں نے ہمت اور حوصلے لیے بیوی کی طرف دیکھا تو وہ پہلے ہی خوف سے زرد پڑ چکی تھی۔

☆☆☆

''یہ بات تو ہے اگر شرجیل کو شادی سے دور رکھنے کے لیے اغوا کیا گیا ہے تو پھر فارس نے ایسی حرکت کیوں کی جس سے شادی اس سے دور چلی جائے۔ شادی ہی کیا وہ تو اپنے باپ کی وراثت سے بھی محروم ہو چکا ہے۔'' سلمان نے کہا۔

''ہمیں آصف کو بتانا چاہیے'' درشہوار نے کہا۔

''جو بھی ہے۔ ہمیں سب سے پہلے شرجیل کی مدد کرنے کا سوچنا چاہیے۔ اسے دشمنوں سے نجات دلانا چاہیے'' صنوبر تو بس شرجیل سے زیادہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتی تھی یا اس کی محبت اسے سوچنے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔

''لیکن صنوبر کیسے..... ہم کیسے شرجیل کی مدد کر سکتے ہیں۔ جس نمبر سے تمھیں کال آئی تھی اسے ٹریس کرانے کے لیے ہمیں پولیس کو بتانا ہوگا۔'' سلمان نے جذباتی ہو کر کہا۔

''ہاں تو کیا ہوا ہمیں پولیس کو بتانا چاہیے کہ شرجیل کو اغوا کیا گیا ہے اور وہ فارس کی قید میں ہے!'' صنوبر کے لیے اس وقت شرجیل کو بچانا اتنا ضروری ہو چکا تھا کہ وہ معاملات کی نزاکت اور احتیاط کے بارے میں سوچ ہی نہیں رہی تھی۔ سلمان اس کے قریب آیا اسے کاندھوں سے پکڑ کے بولا'' جانتی ہو اس کے بعد کیا ہوگا۔''

''کیا.........؟؟؟'' صنوبر نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

''شاید تم نہیں جانتیں کہ جن لوگوں کو اغوا کر لیا جاتا ہے اغوا کاروں کا ان سے سب سے بڑا مطالبہ کیا ہوتا ہے۔ یہی کہ اگر پولیس کو خبر کرنے کی کوشش کی گئی تو مغوی کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ پولیس کو بتانے کا مطلب ہے شرجیل کو زندگی کو خطرے میں ڈالنا۔'' سلمان کی بات سن کر لمحے بھر کو صنوبر کو اپنی دنیا پھر سے اندھیرے کے پیچھے چھپتی ہوئی محسوس ہوئی اور اس کے اندر جو امید کا دیا روشن ہوا تھا وہ پھر سے ٹمٹمانے لگا۔ وہ خاموش ہو گئی اس کے چہرے کو سوچ کی لکیروں نے گھیر لیا۔ پھر ان ہی لکیروں میں اسے ایک اور راستہ نظر آیا اور وہ بولی۔

''مگر شرجیل نے تو سب سے چھپ کر فون کیا تھا اس لیے اغوا کرنے والوں کو کیسے پتا چلے گا کہ ہم نے پولیس کو بتا دیا ہے!''

لیکن اس راستے پر بھی سلمان کی سوچوں نے پھر سے بڑے بڑے کنٹینر کھڑے کر کے راستا مسدود بنا دیا۔

اب وہ پھر سے بے چین ہو گئی۔ اس کا شرجیل مشکل میں تھا اور وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ اس لیے اس کا پریشان ہونا فطری تھا۔ صنوبر کو اس قدر پریشان دیکھ کر درشہوار اس کے قریب آئی اور بولی۔

''تم تو اس سے بدلہ لینا چاہتی تھیں۔ تم تو اس سے بدلہ لینے کی وجہ سے فارس پر مان گئی تھیں پھر اب جب اس کا فون آیا تو ایک دم سے اتنی پریشان کیوں ہو میری بیٹی؟'' اس نے درشہوار کی طرف ایک ایسی حسرت اور ندامت سے دیکھا کہ ماں کا دل پاش پاش ہو گیا۔ جیسے اس کے پاس اپنی بے وقوفی کو سپورٹ کرنے کے لیے کوئی ایک سہارا نہیں بچا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ندامت اور پشیمانی کے آنسو ڈھلکنے لگے۔ درشہوار نے اسے گلے سے لگایا اور بولی۔

''خدا کا شکر ہے کہ تمہاری شادی فارس سے ہو نہیں گئی۔ اگر یہ شادی ہو جاتی اور بعد میں تمہیں پتا چلتا کہ فارس نے تمہارے شرجیل کو اغوا کر کے کہیں قید کیا ہوا تھا تو تم خود کو بھی معاف نہیں کر پاتیں۔ اللہ کے کاموں کو سمجھنے کی صلاحیت انسانوں میں نہیں ہوتی۔ اس لیے انسان کو کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے خدا کی مدد مانگنا چاہیے۔'' درشہوار اسے تسلی دیتی رہی۔ سلمان نے اس سے پوچھا۔

''کیا شرجیل نے اور کچھ کہا تھا جس سے ہمیں کوئی مدد مل سکتی ہو اور ہم اس کی کوئی مدد کر سکتے ہوں۔ پھر سے یاد کر کے بتاؤ صنوبر؟'' سلمان کی بات سن کر جیسے ایک بار پھر وہ بھول گئی کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ اس کے دل میں شرجیل کی باتیں پھر سے گونجنے لگیں اور وہ سوچوں اور یادوں کی پگڈنڈی پر تیز تیز دوڑنے لگی۔

''وہ کہہ رہا تھا کہ جلد دوبارہ فون کرے گا'' بہت یاد کرنے پر صنوبر کو بس اتنا ہی یاد آ سکا۔

''تب تو ہمیں اس کے فون کا انتظار کرنا ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ اس بار کوئی ایسی معلومات یا سراغ دے سکے جس سے ہم اس کی مدد کرنے کا کوئی راستا تلاش کر لیں۔'' یہ کہہ کر سلمان اس کمرے سے چلا گیا۔ ''میں پاپا کو فون ملاتا ہوں انھیں بتاتا ہوں ساری بات''

درشہوار نے صنوبر کو بٹھایا اور اس کے سرہانے لگے انٹر کام سے کمرے میں چائے لانے کو کہا۔ وہ بھی مسلسل اسی بارے میں سوچ رہی تھی۔ اور صنوبر اس کی سوچیں تو جیسے کسی اور کے بارے میں سوچنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ محبت اندھی ہوتی ہے اور اس اندھے پن میں بعض اوقات اتنا بھی دکھائی نہیں دیتا جتنا کسی کمزور بینائی والے کو دکھائی دیتا ہے۔ صنوبر بھی شرجیل سے محبت کرتی تھی اور اب جب اسے معلوم ہوا کہ شرجیل فارس کی قید میں ہے تو اس نے خود کو لعنت ملامت کرنا شروع کر دیا کہ وہ کتنی غلط تھی جو شرجیل کو سبق سکھانے کے لیے اسی کے دشمن کی شریک حیات بننے پر راضی ہو گئی تھی۔ محبت کا فیصلہ اس وقت بھی۔ غلط تھا اور اس وقت بھی صنوبر کا دل و دماغ اس نکتے پر سوچنے کو ذرا سا بھی آمادہ نہیں ہوا کہ اگر شرجیل کو فارس نے اغوا کر کے قید کیا ہوا تھا تو اس نے ایسی حرکت کیوں کی جس کے نتیجے میں اس کی شادی کھٹائی میں پڑ گئی۔ صنوبر نہ بھی سوچتی مگر سلمان کا ذہن تو جیسے سب سے زیادہ یہی ایک بات سوچ رہا تھا اس نے اپنے باپ کو بھی یہ بات جتا کر بتائی۔

''کیا رحمن انکل جھوٹ اور غلط بیانی کر کے گئے ہیں انھوں نے شادی کسی اور وجہ سے منسوخ کی ہے اور کہانی وہ سنائی ہے جس پر کوئی بھی یقین کر سکتا ہے۔ تو ایسی کیا وجہ ہو سکتی ہے جو رحمن کو ایک پہلے سے طے شدہ شادی کو منسوخ کرنے کی ضرورت پڑی۔'' دونوں باپ بیٹوں نے فون پر طویل گفتگو کی مگر وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ عقل جس میں الجھ کے رہ جائے ایسے ہی حالات کا سامنا تھا انھیں۔

''جو بھی ہے یہ تو پتا چل گیا ہے کہ شرجیل کہاں ہے۔ مجھے میری بیٹی کی خوشی سب سے زیادہ عزیز ہے اب ہمیں شرجیل کے سلامت واپس آنے کی دعا کرنی چاہیے تا کہ صنوبر کی اس کے ساتھ شادی ہو سکے باقی ہر بات، ہر معاملہ بعد میں دیکھا جا سکتا ہے۔'' اپنے پاپا کی بات اسے ٹھیک معلوم ہوئی کہ کیا ہوا ہے، اور کیوں کیسے ہوا ہے اس سے سب سے

زیادہ اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ شرجیل زندہ سلامت واپس آجائے اور اس کی صنوبر سے شادی کر دی جائے۔ سلمان کو خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ اس کی بہن کی برباد ہوتی ہوئی زندگی میں پھر سے بہار آ گئی تھی۔ اسے وہ امید مل گئی تھی جو اس کی زندگی اور خوشی دونوں کی ضامن تھی۔

☆☆☆

''مت کریں ایسی باتیں۔ کون مانے گا ان باتوں کو۔ بس آپ آرام کریں میں جاتی ہوں۔ آپ ذہن سے سب کچھ نکال کے سونے کی کوشش کریں'' ساجدہ کی بات سن کر پہلی بار رحمٰن کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی بیوی اسے دیوانہ یا پھر پاگل سمجھ رہی ہے۔ جب میری بیوی، میرے اپنے گھر کے لوگ ہی میری بات پر یقین نہیں کریں گے تو میں کسی باہر والے کو کیسے یقین دلا سکتا ہوں۔ اب رحمٰن کے سامنے سب سے پہلی مشکل یہ تھی کہ اسے اس یقین کو دوسروں کا یقین بنانا تھا۔ لیکن کیسے...... خالی یہ کہنے سے کہ فارس کے جسم میں جو طاقت ہے وہ کسی فارس جیسے لڑکے یا کسی اس عمر کے انسان کی طاقت نہیں ہے۔ اور یہ فارس بہت زیادہ کھانا کھانے لگا ہے یہ دونوں باتیں سن کے کوئی بھی اس بات پر کیسے یقین کر سکتا تھا کہ وہ فارس نہیں کوئی اور ہے۔

''کوئی اور........!!!'' یہ ایک بات سوچ کر رحمٰن کو بھی جیسے پسینے آ گئے۔ کوئی اور کون۔ کون ہو سکتا ہے کوئی جن یا کوئی بدروح کون ہو سکتا ہے اس کے علاوہ کیا سوچا جا سکتا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے انگریزی فلموں کی طرح اس کا بیٹا کسی اور مخلوق کے قالب میں ڈھل رہا ہے اور یہ اس کا کنورٹ ہونے والا وقت ہے۔ اس نئی سوچ نے رحمٰن کو مزید مشکل میں ڈال دیا۔ کون سی مخلوق میں وہ کیا بننے والا ہے۔ اس کا ذہن واضح طور پر کوئی بھی جواب نہیں دے سکا۔ لیکن اس کی فطرت جو جاننا چاہتی تھی اسے اب کسی بھی طرح سے نچلا بٹھانے یا اس بارے میں کوئی قدم نہ اٹھانے پر مجبور کرنا مشکل ہو چکا تھا۔ وہ مسلسل سوچ رہا تھا کہ وہ کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔ جس سے وہ فارس کے بارے میں اصل حقیقت جان سکے۔ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد وہ اپنی نشست سے اٹھا اور کمرے کے دروازے سے نکل کر فارس کے کمرے کی طرف جاتا نظر آیا۔ اس کے پیروں میں ایک قسم کی لرزش تھی ڈر اور خوف سے اس کے اندر عجیب عجیب ہیولے بن اور بگڑ رہے تھے مگر بیٹے کی زندگی اور اپنے فطری تجسس کو وہ کسی بھی طرح دبانے سے قاصر رہا۔ جاننا جیسے موت اور زندگی کی طرح ضرور ہو چکا تھا کہ آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے۔ اسے اب یہ بھی یقین ہونے لگا کہ اس کے منہ پر تھپڑ بھی اس کے بیٹے فارس نے نہیں بلکہ اسی نے مارا ہے جو اس وقت فارس کو قابو کر چکا ہے یا کر چکی ہے۔ اس کے پاس اندازے لگانے کے علاوہ اور کچھ بھی تو نہیں تھا۔ اگر یہ سچ ہوا جیسے کہ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ سچ ہے تو اس نے اپنے بیٹے کو خوامخواہ سزا دی۔ اسے اپنی ولدیت اور جائیداد سے عاق کرنے کا فیصلہ درست نہیں تھا۔ اس کے بیٹا تو خود کسی مشکل میں تھا۔ اب اسے اس بات کا بھی کامل یقین آ چکا تھا کہ اس کا بیٹا ضرور کسی مصیبت میں ہے ورنہ وہ کتنا بھی ناسمجھ سہی کم سے کم ایک موقعے پر ایسی حرکت نہیں کر سکتا جب اس کی شادی میں بس دو دن باقی رہ گئے ہوں۔ جب کہ صنوبر سے شادی کرنے کے لیے تو وہ مرا جا رہا تھا۔ اور اس شادی کی خاطر اپنے باپ کی ہر شرط، ہر ایک بات ماننے کو تیار ہو چکا تھا جو کسی اور صورت میں منوانا ناممکن تھا۔ اس نے شراب، سگریٹ اور آوارہ دوستوں کی محفلوں میں جانے یا ایسی محفلیں خود آراستہ کرنے سے توبہ کر لی تھی اور اپنے باپ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ زندگی بھر ایسا کوئی کام نہیں کرے گا جس سے اس کے والد کا سر نیچے ہو سکتا ہو، اس نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ ساری زندگی صنوبر کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائے گا۔ جو انسان اتنی مشکل شرائط ماننے پر تیار ہو چکا تھا وہ اپنی شادی سے عین دو دن پہلے ایسی حرکت کیوں کرے گا۔ یہ سب سوچتے ہوئے وہ فارس کے کمرے کے دروازے پر پہنچے اور انھوں نے ہولے سے دروازے کو دستک دی تو انھیں اندازہ ہوا کہ دروازہ تو اندر سے کھلا ہوا تھا لیکن کمرے میں ملگجا سا اندھیرا تھا۔ رحمٰن نے پہلے ہلکے سے پھر زور زور سے آوازیں دیں... فارس... فارس... اور جب بہت مرتبہ پکارنے پر بھی فارس نے کوئی جواب نہیں دیا تو انھوں نے ڈرتے ڈرتے کمرے کے سوئچ بورڈ کے قریب جا کر لائٹ جلائی لیکن یہ کیا۔ فارس تو کمرے میں موجود ہی نہیں تھا۔

''کہاں چلا گیا؟'' اس کے ذہن میں ابھرنے والا پہلا سوال یہی تھا ابھی وہ اور کچھ سوچتا کہ دروازے سے فارس

داخل ہوا۔ اس نے جو اپنے باپ کو اپنے کمرے میں موجود پایا اس کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا۔ رحمٰن پر کپکپی سوار ہوگئی اور وہ اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ یہاں اپنے بیٹے کے کمرے میں آیا کیوں ہے۔ فارس کچھ دیر تک اسے خونخوار نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے نہایت نرمی اور سعادت مندانہ انداز سے کہا۔

''پاپا آپ کو مجھ سے کوئی کام تھا تو آپ مجھے بلاتے؟'' رحمٰن اس کے لہجے اور اس میں موجود نرمی اور فرمانبرداری کو محسوس کر کے ایک لمحے کو جیسے سکتے میں چلے گئے ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ وہ ہی انسان ہے جس نے ابھی تھوڑی پہلے اسے دھکا دیا تھا اور انتہائی بدتمیزی سے بات بھی کی تھی۔

''آ.....پ...ک.... ہاں گئے تھے؟'' رحمٰن نے ڈرتے ڈرتے بدقت تمام اس سے پوچھا۔ وہ اسی نرمی اور خلوص کی مٹھاس سے بولا۔

''میں نے کہاں جانا تھا بس ذرا یونہی ٹیرس تک گیا تھا، تازہ ہوا لینے۔ لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ آپ نے اب تک یہ بھی نہیں بتایا آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟'' رحمٰن پر جیسے اس کی فرمانبرداری اور سعادت مندی نے سحر سا طاری کر دیا تھا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس سے کہے کہ تم چھت پر نہیں بلکہ کہیں اور سے آ رہے ہو تم نے مجھے دھکا دیا مجھ سے بدلحاظی سے بات کی اور اب تم ایسے بن رہے ہو جیسے تم سے زیادہ فرمانبردار اور تابعدار تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا تمہیں میرا اتنا خیال ہے کہ مجھے کوئی کام تھا تو میں تمہیں بلوا لیتا خود چل کر نہ آتا۔ لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کہہ سکا اس کے الفاظ اس کے اندر غدر مچاتے رہے مگر اس کے ہونٹوں تک نہیں آ سکے۔ اسے چپ دیکھ کر فارس پھر بولا۔

''آپ اس طرح خاموش کھڑے رہ کر مجھے دیکھے کیوں جا رہے ہیں۔ کچھ کہہ کیوں نہیں رہے آپ کو مجھ سے کیا کام تھا بتائیں نا پاپا؟'' فارس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ اسے اپنے بیٹے کے ہی معلوم ہوئے مگر ان میں جو نرمی اور جو حلاوٹ تھی وہ اس کی نہیں تھی۔ آوارہ قسم کے دوستوں اور محفلوں میں رہ رہ کر اس کا بیٹا کافی کھردرا ہو چکا تھا۔ اس لیے تمیز اور خلوص کی وہ نرمی جو اس وقت اس کے لہجے میں موجود تھی یہ کب کی رخصت ہو چکی تھی۔

''نہیں مجھے کوئی کام نہیں ہے۔ میں بس ایسے ہی تمہاری خیریت دریافت کرنے آیا تھا۔'' یہ بات رحمٰن کو لگا اس کے حلق سے ایسے نکلی کہ اس نے چاہا نہیں پھر بھی خود بخود پھسلتی چلی گئی۔

''آپ صنوبر کے گھر گئے تھے۔ کیا کہا انھوں نے؟'' یہ سن کر تو جیسے رحمٰن کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں وہ کچھ دیر تک وحشت بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر ایک دم سے فارس کے کمرے سے ایسے بھاگا جیسے اس نے کوئی ایسی چیز دیکھ لی ہو جس سے اسے اپنی جان کا خطرہ ہو۔ اس کے پیچھے فارس کا ایک قہقہہ تھا جو بلند ہوا مگر اسے فارس کے علاوہ کوئی بھی نہیں سن سکا۔ رحمٰن نے اپنے کمرے میں جا کر پناہ لی۔ اس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اسے سردی سی محسوس ہونے لگی اور اس نے جلدی سے اپنی الماری سے ایک چادر نکال کر اوڑھ لی۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ جیسے صوفے میں دھنس چکا ہو۔ لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب کیا کرے اس کا ذہن جیسے ماؤف ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی بیوی آئی اور بولی۔

''رحمٰن کھانا لگ چکا ہے آ جائیں کھانا کھا لیں'' اس نے ایسے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

☆☆☆

آصف گھر پہنچا تو اس نے اپنی بیٹی صنوبر کو گلے سے لگا کر مبارک باد دی کہ اس کا شرجیل نہ صرف زندہ ہے بلکہ وہ اس کے ساتھ بے وفائی بھی نہیں کر کے گیا بلکہ وہ ایک مشکل میں پھنسا ہوا ہے۔ دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ بھی تردد کی گہری گہری لکیروں سے بھرتا چلا گیا۔ وہ زیادہ دیر وہاں نہیں رکا اور سلمان کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں آ گیا اس نے درشہوار کو تاکید کی وہ صنوبر کے پاس ہی ٹھہرے۔ اپنے کمرے میں پہنچنے کے بعد اس نے سب سے پہلے ایک گلاس پانی پیا اور پھر اپنے بیٹے سلمان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''تم پیو گے پانی؟'' سلمان انکار کرنا چاہتا تھا لیکن پانی کی طرف دیکھ کر اسے بھی پیاس کا احساس ہونے لگا اور اس نے جی کہہ کر باپ کی طرف پانی کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ پانی پینے کے بعد۔ آصف نے بات شروع کی۔

''میں بھی بہت دیر تک تمہاری اس بات کے بارے میں سوچتا رہا ہوں کہ اگر فارس نے شرجیل کو اس ارادے سے اغوا کیا ہے کہ وہ اس شادی سے دور رہے بلکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر شرجیل کو اس طرح غائب کر دیا جائے تو صنوبر اس کی بات مان جائے گا اس سے شادی کے لیے ہاں کہہ دے گی۔ اپنے مقصد میں تو واقعی وہ اسی وجہ سے کامیاب ہوا تھا کہ شرجیل کا اس طرح چلے جانا صنوبر کے لیے شدید بے عزتی اور بے وفائی کے مترادف تھا اسی لیے اس نے غصے اور رد عمل میں فارس سے شادی کے لیے ہامی بھری تھی۔ وہ ذرا بھی جانتی کہ شرجیل پر کیا گزری ہے تو وہ اس شادی کے لیے کبھی نہ مانتی۔ لیکن اس کا دوسرا مقصد کہ شرجیل کو شادی سے دور رکھے اس مقصد کو پورا ہونے سے تو اس نے خود ہی روک دیا ہے۔ رحمٰن کی بات میں اگر ذرا سا بھی سچ ہے جیسا کہ مجھے لگتا ہے رحمٰن جھوٹ نہیں بول رہا کیونکہ کوئی ایسی وجہ نہیں ہو سکتی کہ وہ اس شادی کو منسوخ کرنے کے لیے اس قسم کا گیم کھیلے۔ اگر کسی بہت بڑی ڈیل کی وجہ سے اس نے ایسا کیا ہے اور یہ کوئی کاروباری گیم ہوا ہے تو اس بارے میں میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''لیکن میں کہہ سکتا ہوں!'' سلمان جو اپنے باپ کی باتیں محویت سے سن رہا تھا ایک دم ہی درمیان میں بول پڑا۔

''کیا... کیا کہہ سکتے ہو تم؟'' آصف نے تجسس اور تردد کے ملے جلے جذبات سے پوچھا۔

''فارس صنوبر کو چھوڑ کر اپنے باپ کی کسی بھی کاروباری ڈیل کو مان جائے اس بات کا یقین ایسا کوئی بھی انسان نہیں کر سکتا۔ جو ذرا سا بھی فارس کو جانتا ہو۔'' سلمان نے پریقین لہجے میں کہا۔

''تب تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ کوئی کاروباری ڈیل ہے اور نہ ہی کوئی سازش۔ رحمٰن نے جو کچھ بھی کہا وہ سچ ہے!''

''جی لگتا تو ایسا ہی ہے'' سلمان نے اپنی نشست پر پہلو بدلا۔

''کس قدر الجھا ہوا معمہ ہے۔ اگر رحمٰن سچ کہہ رہا ہے تو یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ فارس ایسا کیوں کرے گا جب کہ وہ صنوبر سے شادی کرنے کے لیے مرا جا رہا تھا۔ اور یہ مانا جائے کہ فارس نے ایسا کیا ہے تو پھر اسے یہ سب کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس کی انتہائی منت سماجت کے بعد تو ہم نے یہ رشتا قبول کیا تھا اور آخر وقت تک ہم یہ چاہتے تھے کہ صنوبر اس رشتے سے انکار کر دے لیکن اس نے شرجیل کو بے وفا جان کر ایسا کیا۔ اور اب پتا چلتا ہے کہ شرجیل بے وفا نہیں ہے بلکہ وہ تو فارس کی قید میں ہے۔ فارس کو جب شادی ہی نہیں کرنی تھی تو اس نے شرجیل کو اغوا کیوں کیا؟ یہ سب اس قدر الجھا ہوا ہے کہ ہم کتنی بھی کوشش کر لیں اس گتھی کو سلجھا نہیں سکیں گے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہمیں ان ساری باتوں کو اپنے ذہن سے جھٹک کر صرف اور صرف اس ایک بات کے بارے میں سوچنا چاہیے کہ ہم شرجیل کو اس قید سے کیسے نجات دلائیں۔''

''صنوبر نے بتایا تھا کہ شرجیل نے دوبارہ فون کرنے کو بھی کہا تھا۔'' سلمان نے بتایا۔

''اس کا مطلب ہے ہمیں اس کے اگلے فون کال کا انتظار کرنا ہوگا۔'' بات ابھی ٹھیک سے پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ آصف کے فون کی بیل بجنے لگی۔ اس نے فون نکالا اور فون کی طرف دیکھ کر ایک گہری نظر اپنے بیٹے سلمان پر ڈالی اور بولا۔

''رحمٰن ہے'' فون کان سے لگانے کے بعد اس نے جیسے ہی ہیلو بولا۔ دوسری طرف سے رحمٰن نے نہایت عجلت میں کہا۔

''آصف میں رحمٰن بول رہا ہوں۔ میں تمہیں ایک بہت ضروری بات بتانا چاہتا ہوں۔ بلکہ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں جتنی جلدی ہو سکے۔''

''تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔ کیا بات ہے سب خیریت تو ہے؟'' آصف نے کہا۔

''نہیں خیریت نہیں ہے۔ فارس جو یہاں ہمارے گھر میں ہے وہ فارس نہیں ہے!'' رحمٰن کی بات ختم ہوتے ہی

آصف کو جیسے کوئی کرنٹ لگا ہو۔ وہ اپنی نشست سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا.........!!" اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا یا کچھ اور کہتا دوسری طرف سے لائن کٹ گئی۔

"کیا بات ہے پاپا۔ کیا کہا رحمٰن انکل نے؟" سلمان نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ اس کا باپ بری طرح اچھلا تھا اور اس کے بعد اس کے چہرے کو ایسی اجنبی لکیروں نے گھیر لیا تھا کہ کوئی بھی ہوتا وہ جان جاتا کہ فون پر کوئی بہت ہی پریشان کن اور حیرت ناک بات کہی گئی ہے۔ سلمان کے دوسری بار پوچھنے پر آصف نے دھیمے سے کہا۔

"رحمٰن کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے وہ شاید پاگل ہو چکا ہے۔"

"انھوں نے کہا کیا پاپا؟" سلمان کی بے چینی بدستور برقرار رہی۔

"کہتا ہے اس کے گھر میں جو فارس ہے وہ فارس نہیں ہے۔"

"فارس نہیں ہے تو پھر کون ہے؟"

"یہ وہ بتا نہیں سکا۔ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اور عجلت میں بھی لگ رہا تھا۔ ملنا چاہتا تھا جلد سے جلد، اس سے زیادہ وہ کچھ بھی کہہ نہیں سکا۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے وہ اپنی بات کیوں پوری نہیں کر سکا۔" آصف کی تشویش میں اضافہ ہو گیا۔ اب سلمان کی بھی کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اور کیا بات کرے کیا پوچھے۔ وہ بس اتنا بولا تھا۔

"تو کیا آپ ان سے ملنے جائیں گے؟" سوال سن کر آصف نے بہت ہی عجیب اور بڑی بڑی آنکھوں سے بیٹے کی طرف دیکھا اور صرف اتنا کہا۔

"کہاں جاؤں؟" سلمان سمجھ گیا کہ اس کے پاپا کی خود یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ وہ کہاں جائیں اور کس طرح رحمٰن انکل سے ملاقات کریں اور اگر واقعی ان کا دماغ الٹ چکا ہے تو یہ ایک بڑا رسک ہوگا جو اس کے پاپا کو نہیں لینا چاہیے۔ دونوں باپ بیٹے ایسے خاموش تھے جیسے کسی جنازے میں آئے ہوئے ہوں۔ اسی اثنا میں درشہوار کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے آتے ہی خود سے کہا۔

"وہ اکیلے رہنا چاہتی ہے۔ اس نے مجھے جانے کو تو نہیں کہا مگر میں خود سے ہی چلی آئی۔" اپنی بات ختم کر کے درشہوار نے پہلے آصف اور پھر اپنے بیٹے سلمان کی طرف دیکھا دونوں نے اس کی بات سن کر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ دونوں اس طرح سکوت میں تھے کہ انھیں اس کے آنے کی بھی خبر نہیں ہوئی تھی، لمحے میں وہ سمجھ گئی کہ یہاں کوئی اور قیامت ٹوٹ چکی ہے۔ اس کے ذہن نے سب سے پہلی چھلانگ اس بات پر لگائی کہ کہیں شرجیل کو مار تو نہیں دیا گیا۔ اس نے سلمان کو پکڑ کے ہلایا اور بولی۔

"سلمان کیا بات ہے کیا ہوا ہے؟" سلمان نے سکتے سے واپس آتے ہوئے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور پھر اسی میکانیکی انداز میں اپنے پاپا کی طرف دیکھا جو چپ ضرور تھے مگر ان دونوں کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ درشہوار سمجھ گئی کہ جو بھی بات ہوئی ہے اس کے بارے میں آصف کو زیادہ بہتر معلومات ہیں۔ وہ فوراً سے پیشتر آصف کے قریب پہنچی اور وہی سوال دہرایا جو اس نے ابھی کچھ دیر پہلے سلمان سے کیا تھا۔

"صنوبر کیسی ہے؟" آصف نے جواب دینے کے بجائے الٹا اس سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے اکیلے رہنا چاہتی تھی اس لیے مجھے آنا پڑا۔" درشہوار نے پھر سے اپنا سوال دہرایا جس کے جواب میں آصف نے اسے پوری بات بتا دی مگر درشہوار بھی ایک دم سے کسی ایسی سوچ میں چلی گئی جس کا کھوج کوئی نہیں لگا سکتا تھا تاوقت کہ خود درشہوار ہی نہ بتائے۔

"کیا ہوا تم کیا سوچنے لگیں؟" آصف نے پوچھا۔

"رحمٰن نے پہلے جو بات بتائی تھی وہ بھی یقین نہ کرنے والی تھی کیونکہ ہم سب جانتے ہیں فارس کتنا بھی برا اور بدمعاش ہے مگر اس موقع پر وہ ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ اور اب ان کا یہ کہنا کہ فارس... فارس نہیں ہے.. دوسری عجیب و غریب بات ہے۔" وہ بولتے بولتے آصف کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''فارس... اگر فارس نہیں ہے تو پھر کون ہے؟''
آصف نے اور سلمان نے بھی خوف سے پھیلتی ہوئی آنکھوں سے درشہوار کی طرف دیکھا۔ لیکن کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔
''کہیں اس سب کا تعلق ہماری صنوبر کے ان دوروں سے تو نہیں ہے جو اس پر پڑتے ہیں اور پھر اسے کچھ یاد نہیں رہتا، ہوش میں آنے کے بعد وہ بالکل نارمل ہو جاتی ہے'' درشہوار جیسے بنا سوچے سمجھے بول رہی تھی۔ اسی لیے اسے فوراً آصف نے ٹوکا۔
''کچھ بھی بول دیتی ہو۔ ہماری بچی کا فارس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ بات تم پھر کبھی بھولے سے بھی زبان پر مت لانا۔ اگر رحمٰن کے گھر میں واقعی کوئی پریشانی ہے تو اس کی پریشانی کو اپنے گھر دعوت دینا کوئی عقل مندی نہیں ہے۔ ہماری بچی کا اس کے بیٹے سے یا ایسی کسی بات سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔''
''پاپا ٹھیک کہہ رہے ہیں ماما!'' سلمان نے باپ کی تائید کی۔ درشہوار شرمندہ سی نظریں نیچی کر کے جیسے کچھ دیر کو چپ ہو گئی۔
''مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے ٹھیک کہتے ہو آپ۔ لیکن یہ بات اگر سچ ہوئی کہ فارس... فارس نہیں ہے تو؟'' درشہوار نے اس بار اپنے ذہن کے وسوسوں کو کسی اور انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی۔
''تو کیا... ہمیں ان کے مسئلوں سے کیا سروکار۔ فارس... فارس ہے یا نہیں ایسی لایعنی بات پر کون یقین کر سکتا ہے ضرور رحمٰن کا دماغ الٹ چکا ہے۔ اس نے فارس کی حرکت کو دل پر لے لیا ہے اسے یہ حرکت اپنی ساری زندگی کی کمائی ہوئی عزت کو مٹی میں ملاتی ہوئی محسوس ہوئی ہے اور اس صدمے سے اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے بس اس سے زیادہ نہ کچھ ہے اور نہ ہی ہمیں سوچنے کی ضرورت ہے'' آصف نے حتمی طور پر کہا۔
سلمان اور درشہوار نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن بولے کچھ نہیں۔ درشہوار کو بھی اسی بات میں عافیت نظر آئی۔
''دیکھو اگر کوئی اور بات ذہن میں آتی بھی ہے تو اسے جھٹک دو۔ ہمیں بس اسی پر یقین کرنا ہے کہ فارس کی نازیبا حرکت کی وجہ سے رحمٰن کا دماغ الٹ چکا ہے۔''
سلمان اور درشہوار دونوں نے آصف کے قریب جا کر اس کے ہاتھوں کو پکڑ کے کہا۔
''آپ فکر مت کرو ہم سے کوئی بھی اس سے زیادہ نہ تو سوچے گا اور نہ ہی ایسی کوئی بات منہ سے نکالے گا جو ہمارے گھر اور ہمارے مفاد میں نہ ہو۔'' آصف نے دونوں کو سینے سے لگا لیا۔ اور مختصراً بولا۔
''اسی میں ہماری بقا اور سلامتی چھپی ہوئی ہے۔ مجھے میرے بچوں کی زندگی اور مستقبل سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے بس''
''آپ دونوں فریش ہو لو میں کھانا لگواتی ہوں'' یہ کہہ کر درشہوار نیچے چلی گئی اس کے ساتھ سلمان بھی چلا گیا۔ اور ان کے جاتے ہی آصف کا فون پھر سے بجنے لگا دوسری طرف رحمٰن ہی تھا۔ اب آصف اس مخمصے میں پھنس چکا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے فون سننا چاہیے یا نہیں... دیر تک فون بجتا رہا اور وہ بس یہی سوچتا رہا کہ کیا کرنا چاہیے فون اٹھانا چاہیے یا نہیں۔ اور بالآخر اس نے فون نہیں اٹھایا۔

☆☆☆

کھانے کے دوران سب خاموش تھے۔ صرف صنوبر نے اتنا کہا کہ ''شرجیل کا فون ابھی تک نہیں آیا۔''
اس کے ماں باپ نے اس کا حوصلہ بڑھایا اور اسے بہت مجبور کیا کہ وہ کھانا تو ٹھیک سے کھائے مگر صنوبر کی تو جیسے بھوک ہی مر چکی تھی۔ بس اس کے کان فون کی بیل سننے کو بے چین تھے۔ اسی لیے اسے آس پاس کی آوازیں بھی ٹھیک سے سنائی نہیں دے رہی تھیں۔
''کیا خیال ہے ہمیں شرجیل کے گھر فون کر کے ان کی خیریت پوچھنی چاہیے یا نہیں؟'' درشہوار نے کھانے کے

دوران جیسے بات کرنے کے لیے کہا تھا لیکن آصف نے اس کی بات سن کر کہا۔
''اوہ یہ تو بہت ہی ضروری ہے ابھی کے ابھی شرجیل کو فون لگاؤ۔ ہمیں ان کے گھر کی خیریت ضرور پوچھ لینی چاہیے۔ا'' ایک ہلکی سی ممنونیت سے صنوبر نے اپنے پاپا کی طرف دیکھا اور در شہوار نے جواب میں کہا۔
''کھانا ختم کر لیجے پھر لگاتی ہوں فون''
''کیا ہمیں شرجیل کے گھر والوں کو یہ بات بتانا چاہیے کہ صنوبر کے پاس شرجیل کا فون آیا تھا اور اس وقت وہ کہاں ہے؟'' سلمان کی بات سن کر سب نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
''پتا نہیں یہ بات ان کے اطمینان کا باعث بنے گی یا ان کی پہلے سے موجود پریشانی میں اور اضافہ کرے گی۔ کہنا مشکل ہے، کیونکہ شرجیل کہاں ہے یہ سن کر وہ خوش ہونے کے بجائے زیادہ بڑی تشویش میں پڑ سکتے ہیں ابھی تو ان کے ذہن میں جو بھی ہے اس میں وہ اپنے آپ کو یہ یقین دلا چکے ہوں گے کہ ان کا بیٹا جہاں بھی ہے خیریت سے ہے۔''
''ماما بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں ہمیں انھیں اس فون کال کے بارے میں بالکل نہیں بتانا چاہیے'' در شہوار کی بات کے جواب میں صنوبر نے کہا۔
''اچھا تو پھر فون تو لگاؤ..'' آصف نے کھانا ختم کر کے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا اور عین اسی وقت کھانے کی میز سے کچھ ہی فاصلے پر نہایت بری اور تباہ حال حالت میں شرجیل آ کے گرا اور یہ کہتے ہوئے بے ہوش ہو گیا۔
''صنوبر........'' اس کے منہ سے اپنا نام سن کر صنوبر چونکی اور اٹھ کر اس کی طرف لپکی تب تک وہ زمیں بوس ہو چکا تھا۔
آصف اور سلمان نے اسے اٹھا کر پاس والے کمرے میں لے جا کر لٹا دیا۔ صنوبر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اور اس کے ہاتھ پاؤں سہلاتے ہوئے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔ اسی اثنا میں سلمان پانی لے آیا اور صنوبر اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر اس کے چہرے پر چھینٹیں مارنے لگی جواب میں شرجیل نے ایک آہ کھینچی اور صنوبر کے چہرے پر پھول کھلنے لگے کہ اس کا شرجیل ٹھیک تھا بس کچھ تھکن اور کچھ غنودگی تھی جو اسے بے ہوشی کی طرف لے جا رہی تھی لیکن وہ بے ہوش نہیں تھا۔
''پتا نہیں کہاں سے بھاگ کر آرہا ہے؟'' در شہوار نے کہا۔
''کیا گزری ہے اس پر، کن مشکلوں سے نکل کر فرار ہوا ہے۔ اس کی حالت تو یہی بتا رہی ہے کہ بہت دیر سے پیدل بھاگتا رہا ہے۔'' سلمان نے کہا۔
''چلو در شہوار اس کے گھر والوں کو فون لگاؤ۔ فوراً'' آصف کی بات سن کر جیسے در شہوار کو کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔
اور پھر شرجیل کے گھر والوں کو فون لگایا گیا۔ قریب آدھے گھنٹے میں اس کے سارے گھر والے صنوبر کے گھر پہنچ گئے۔ ان کے حلیوں سے صاف پتا چل رہا تھا کہ جو جیسا تھا ویسے ہی اٹھ کر بھاگ کر آ گیا ہے۔
شرجیل کی ماں لیٹے ہوئے شرجیل سے ایسے چمٹ کے روئی کہ وہاں موجود ہر آنکھ اشک بار ہو گئی۔ شرجیل کے والد اور بہن کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔
صنوبر، در شہوار، آصف اور سلمان کی آنکھیں بھی آبدیدہ ہو گئیں۔ کچھ قرار آیا تو سرفراز نے آصف سے پوچھا۔
''کب آیا؟''
''یہی کوئی دو گھنٹے پہلے۔ آدھے گھنٹے تک تو ہمیں ہوش ہی نہیں رہا کہ آپ کو اطلاع کرتے۔ کیونکہ جو کچھ ہوا وہ بہت اچانک تھا ہمارے اپنے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔'' پھر آصف نے شرجیل کے والد کو پوری روداد سنا دی کہ کیسے وہ آیا اور کتنا وہ ہانپ رہا تھا اور اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ کیا گزری ہے اس کے بارے میں آصف نے کہا۔
''یہ تو وہ خود ہی بتا سکے گا''
آصف نے مصلحتاً سرفراز کو یہ نہیں بتایا کہ شرجیل فارس کی قید میں تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا اس بات کا کوئی بھی فائدہ

نہیں ہے۔ اسے رحمٰن کی حالت یاد آئی اور اس کے دل نے کہا وہ تو خود بہت مشکل اور مصیبت میں لگتا ہے اس لیے۔ اس وقت ایسی کوئی نزاعی بات کرنا مناسب تھا۔

دیر تک شرجیل کے ہوش میں آنے کا انتظار کیا جاتا رہا۔ اور پھر وہ ہوش میں آ گیا۔ اس نے آنکھیں کھولتے ہی سب سے پہلے صنوبر کو نام لیا۔ صنوبر اس کے قریب ہی کھڑی ہوئی تھی وہ فوراً اس کے نزدیک پہنچی تو اس نے لیٹے لیٹے صنوبر کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔

''تمہیں اور مجھے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ ہماری محبت اٹوٹ ہے اور یہ ہمیشہ رہے گی۔'' شرجیل کی محبت سے لبریز باتیں دیر تک جاری رہیں اتنی دیر تک کہ خود صنوبر کو شرم آنے لگی اس نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اسے چپ کرایا اور اس کے والدین کی موجودگی کا احساس کرایا۔ جس کے بعد شرجیل نے اپنے ماں باپ سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بات کی۔ اور جب اس کی ماں نے پوچھا کہ وہ کہاں تھا تو اس نے یہ سوال سنتے ہی آصف کی طرف دیکھا جیسے اس سے کہنا چاہتا ہو کہ آپ نے ٹھیک کیا کہ انھیں نہیں بتایا کہ میں فارس کی قید میں تھا کیونکہ یہ بات تو صرف صنوبر کا غصہ ٹھنڈا کرنے اور اسے مطمئن کرنے لیے کہی تھی میں نے ورنہ تو میں فارس کی نہیں فارس میری قید میں تھا۔ اس نے ممنونیت سے آصف کی طرف دیکھا اور آصف اس کے دیکھنے کو بالکل بھی نہیں سمجھ سکا کہ وہ اس کی طرف ایسے کیوں دیکھ رہا ہے۔........

اب بے چارے آصف کو کیا معلوم کہ مجھے......جی مجھے وہ ساری بات معلوم ہے جو انھوں نے سرفراز سے کہی ہے جو اس وقت میرا باپ ہے۔

آپ مجھے کے صیغے سے چونکیں تو ضرور ہوں گے۔ جی ہاں میں جانتا ہوں ایسا ہے لیکن اب اس کے آگے کی ساری کہانی میں آپ کو سنانے والا ہوں۔

فارس کے جسم میں نے چھوڑ تو دیا مگر میرے اثرات سے نکلنے میں اسے اتنا وقت لگا کہ تب تک میری صنوبر سے شادی ہو گئی۔ اور جب فارس پوری طرح ٹھیک ہوا تو اسے پوری بات معلوم ہوئی لیکن اب وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا بس اس کے دل میں میرے لیے کینہ تو ہے اور اس کے بغض کینے سے مجھے فرق کیا پڑتا ہے۔ یہ وہ نہیں جانتا کہ اگر اب اس نے مجھ پر حملہ کیا تو وہ مجھے شرجیل کی طرح نہیں مار سکے گا اس کا سامنا جن سلمان ابراہیم سے ہو گا جو شرجیل کا جسم اوڑھ کر رہتا ہے۔ لیکن فارس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ رحمٰن کی سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ وہ سب کیا تھا؟ فارس کو ہوا کیا تھا اس نے خود کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ شاید کوئی بیماری تھی۔ چونکہ اس کا فارس اب ٹھیک ہو چکا تھا تو اسے اور کیا چاہیے تھا۔ صنوبر میرے ساتھ بہت خوش ہے اور ہم دونوں ایک الگ گھر میں رہتے ہیں۔ ایسے ہی ایک گھر کے بیسمنٹ میں میں نے کنعان اس کی ماں اور اپنے ماں باپ کے رہنے کا انتظام کر دیا ہے۔ میں اکثر ان سے ملنے جاتا ہوں اور ایسا اکثر ہوتا ہے میں لمحے میں منظر سے غائب ہو جاتا ہوں۔ صنوبر غریب الجھ کے رہ جاتی ہے مگر میں اسے پتا نہیں چلنے دیتا اور کچھ بھی بول کر اسے مطمئن کر دیتا ہوں۔

شرجیل کے قاتل صابو کو میں نے اس لائق نہیں چھوڑا کہ وہ اب ذرا سی بھی بدمعاشی کر سکے اس کے دونوں ہاتھ توڑ دیے ہیں۔ اور وہ اب بہت مشکل زندگی گزار رہا ہے۔ سوچتا ہوں شرجیل کو قتل تو فارس کے کہنے پر کرایا گیا تو کیوں نا فارس کے بھی ہاتھ پاؤں توڑ ہی ڈالوں۔۔۔۔

آپ کا کیا خیال ہے............؟؟؟؟

ساتھیو! زہرِ عشق تو اپنے اختتام کو پہنچا۔ آپ کی محبتوں کا مقروض ہوں۔ اگلے ماہ سے آپ کے لیے ایک نئے ناول کے ساتھ ان ہی صفحات پر ملاقات ہو گی۔

یاد رہے! یہ ناول بھی بطور خاص اپنے پیاروں کے لیے لکھا گیا ہے۔ نئے سال 2017ء میں یہ ناول آپ [illegible]

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اِس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کُجا منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

عزیزو!
اللہ میرے تمام بچوں کو اپنی امان میں رکھے۔ نماز کی پابندی بہت ضروری ہے۔ اپنے اعمال نیک رکھو کہ یہی ساتھ جائیں گے۔ نماز مت ترک کرنا چاہے کیسے ہی حالات ہوں اور دوسرا صبر اور درگزر کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہنا۔ قبر بہت تاریک گھر ہے جہاں سب کو جانا ہے۔ بس ہمارے اچھے اعمال ہی اس میں روشنی کر سکتے ہیں۔ دن کی شروعات اس نیت سے کرو کہ کوئی نہ کوئی نیکی ضرور کرو گے اور جس دن کوئی اچھا کام نہ کر سکو اس دن پر ضرور رو دیا کرو۔ قرآن کو سمجھ کر پڑھو اور اس پر عمل کرو۔ زندگی کا سورج بہت جلد ڈوبنے والا ہے۔ زادِ راہ تیار رکھو۔ اللہ ہم سب پر اپنا کرم فرمائے آمین۔

□ شبانہ بی بی۔ کوہاٹ

o بابا! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں نے آپ کو پہلے بھی خط لکھا تھا۔ اللہ کا شکر ہے آپ نے جو وظائف دیے تھے اُن سے میرا مسئلہ حل ہو گیا۔ میں آج آپ کے پاس اپنا ایک اور مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ میرا اٹھارہ سال کا بیٹا ہے۔ کچھ دن پہلے رات کے بارہ بجے پولیس گھر سے اُسے اٹھا کر لے گئی۔ پولیس نے یہ الزام لگایا ہے کہ اس نے ہم پر گولیاں چلائی ہیں اور یہ کئی ڈکیتیوں میں ملوث ہے۔ حالانکہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ بے گناہ ہے کسی نے ہم سے دشمنی نکالی ہے۔ اب اس کی ضمانت نہیں ہو رہی۔ ہم نے بہت بھاگ دوڑ کی ہے لیکن کوئی حل نہیں نکل رہا۔ آپ پلیز کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرے بیٹے کی ضمانت جلد ہو جائے۔ وہ خود بھی روتا رہتا ہے۔ اس کا کوئی قصور نہیں۔ یہ کسی نے سازش کی ہے۔ میرے خاوند باہر ہوتے ہیں۔ ان کو ابھی تک اس بات کا پتا نہیں چلا۔ پلیز مجھے جلد جواب دیجیے گا گھر میں بہت زیادہ پریشانی ہے آپ کا احسان ہوگا۔ اللہ آپ کو اجر دے آمین۔

☆ بیٹی شبانہ! تمہارا خط ملتے ہی میں نے بچے کی محفوظ واپسی کے لیے دعا کروادی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک تمہیں یہ جواب ملے گا معاملات کافی حد تک سلجھ چکے ہوں گے۔ جس قدر جلد ممکن ہو مجھ سے حفاظت کا تعویذ منگوالو۔ بیٹے پر صبح و شام آیت الکرسی پڑھ کر دم کرتی رہا کرو، اللہ سب خیر کرے گا۔

□ حمیرا۔ کراچی

☆ بیٹی حمیرا۔ اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ تمہاری سوچ بہت اچھی ہے، جو بچے اپنے بڑوں کا احترام کرتے ہیں اور اپنی خواہشات کے غلام نہیں بنتے وہ بہت کامیاب زندگی گزارتے ہیں کیوں کہ والدین کی دعائیں ان کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اللہ سے مدد کی طلب گار رہو، نماز فجر اور عشا کے بعد سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 11 ننانوے ننانوے بار اوّل و آخر درود شریف پڑھو، مدت 41 دن ہے۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلومات حاصل کرلو۔

□ رفعت خان۔ فیصل آباد

o بابا جی! میرے دماغ پر بوجھ بڑھنے لگتا ہے جب کوئی مجھے سکون سے نہیں رہنے دیتا۔ بہت مشکل سے انٹر پاس کیا ہے۔ اب بڑے بھائی اور ابو منصوبے بناتے ہیں کہ اس کو یونیورسٹی میں داخل کرائیں، چار سال میں ایم ایس

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: 88-C II ۔ فرسٹ فلور ۔ خیابان جامی کمرشل ۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی ۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے ۔ 35893122 - 35893121 - 021

کرلے گا تو چچا کے پاس جرمنی بھیج دیں گے یا پھر ہمیں یونیورسٹی میں جاب دلوادیں گے۔ بڑے بھائی یونیورسٹی میں ہی پڑھاتے ہیں۔ میں ابھی سکون چاہتا ہوں، ایک سال آرام کرنے کے بعد کچھ سوچوں گا کہ کیا کرنا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ میں کچھ کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے ابو سے کہا ہے میں بھائی سے زیادہ پڑھوں گا اور آپ جرمنی بھیجنے کی بات کرتے ہیں، میرا ارادہ امریکہ یا فرانس جانے کا ہے۔ کینیڈا بھی اچھا ہے۔ آپ دیکھیے گا میں کتنا کامیاب رہوں گا لیکن فی الحال آپ لوگ مجھے کچھ دن آزادی کے گزارنے دیں۔ یہ بات ان لوگوں کو گراں گزرتی ہے۔ بابا جی! پلیز کوئی ایسا عمل بتائیں کہ میری بات ابو لوگوں کی سمجھ میں آجائے اور مجھے دماغی سکون مل جائے۔

☆ بیٹے رفعت۔ تم فی الحال اپنی ذمہ داریوں سے فرار حاصل کر رہے ہو۔ بڑے بڑے ارادے ظاہر کرکے اور بڑی بڑی باتیں کرکے خود کو فریب بھی دے رہے ہو۔ اس میں بھی ایک طرح کا عارضی اطمینان ہے۔ خود کو احساس دلا رہے ہو کہ بہت کام کیا ہے، بس ذرا آرام کرنا ہے جیسے کہ اچھا وقت ہمیشہ منتظر رہے گا اور بھائی تمہارے بارے میں ہی سوچتے رہیں گے۔ دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ تم حالات میں تبدیلی سے خوف زدہ ہو۔ اس لیے آزادی کے دنوں کی بات کر رہے ہو، یہ آزادی وقت کی بربادی بھی بن سکتی ہے۔ اس لیے اپنے بڑوں کی بات مانو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ نماز کی پابندی کرو اور ہر نماز کے بعد ایک بار "یا قہار" کی تسبیح کو معمول بنالو۔ دیکھ لینا کس طرح تمہارا دل و دماغ پُرسکون ہوکر مضبوط فیصلہ کرے گا۔

□ سعیدہ۔ جہلم

○ پیارے بابا جی! السلام علیکم۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے اور آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رہے، آمین۔ بابا جی! میں نے آپ کو اس سے پہلے ایک خط لکھا تھا اور آپ نے چالیس دن کا وظیفہ دیا تھا۔ بابا جی! میں نے وظیفہ مکمل کرلیا ہے اور آپ نے چالیس دن بعد دوبارہ خط لکھنے کو کہا تھا۔ بابا جی! اب بتائیں وظیفہ جاری رکھوں یا چھوڑ دوں۔ میں نے وظیفہ کاروبار میں برکت کے لیے لیا تھا، اللہ کا شکر ہے کاروبار ٹھیک چل رہا ہے۔ بابا جی! میرا ایک اور مسئلہ بھی ہے وہ یہ ہے کہ میرے سر کے بال پہلے ہی بہت کم ہیں اور اب تو بال گر رہے ہیں۔ پلیز بابا جی! آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس سے میرے سر کے بال لمبے اور گھنے ہو جائیں، برائے کرم میرے مسائل کا حل بتا دیں۔ آپ کی بہت بہت مہربانی ہوگی۔ میں ساری زندگی آپ کی شکر گزار رہوں گی۔

بیٹی سعیدہ! بس اب وظیفہ ترک کردو۔ صرف نماز کی پابندی رکھو۔ زندگی میں خوش رہنا چاہتی ہو تو نیک کام کرو۔ والدین کی فرمانبرداری، اللہ کی اطاعت اور چھوٹوں سے شفقت، یہ رویے تمہیں بہت خوشیاں عطا کریں گے۔ نماز پابندی سے ادا کرتی رہو، بالوں کے سلسلے میں تیل تجویز کیا جا رہا ہے۔ تم اس سے استفادہ کرسکتی ہو، آفس فون کرکے تیل منگوالو۔

□ فائزہ۔ پاکپتن

○ محترم بابا جی! السلام علیکم۔ آپ کا کالم پڑھا اور یہ جان کر ازحد خوشی ہوئی کہ اس مادی دور میں ایسا شخص بھی موجود ہے جو دکھی انسانیت کی خدمت بلا معاوضہ کر رہا ہے۔ اس کا اجر اللہ عزوجل آپ کو آخرت میں ضرور دے گا، انشاء اللہ۔ محترم بابا جی! جو مسئلہ میں آپ سے بیان کرنے جا رہی ہوں یہ صرف میرا مسئلہ نہیں بلکہ اس شخص سے جڑے ہر فرد کا مسئلہ ہے جو خواہ وہ کسی بھی رشتے کی صورت میں ہو، میرے ماموں زاد بھائی شاہد حسن کو جہاد کا بے حد شوق تھا اپنی دادی کی زبانی کشمیر پر ہونے والے مظالم کی داستان سن کر یہ جذبہ اور بھی بڑھ جاتا...... آخر کار گھر والوں سے چوری اپنا نام مجاہدین کی ایک تنظیم میں بطور مجاہد لکھوا دیا۔ کچھ عرصہ تو پتا ہی نہ چلا لیکن ماموں جان کو ایک روز خبر ہوگئی۔ انہوں نے ان سے باز پرس کی تو انہوں نے تسلیم کرلیا۔ گھر والوں نے انہیں بہت سمجھایا کہ یہ تنظیم ٹھیک نہیں ہمیں شبہ ہے کہ یہ معصوم لوگوں کی جان لیتے ہیں مگر وہ نہیں مانے ان کے ذہن پر بس ایک ہی دھن تھی کہ وہ کشمیر کے لیے اپنی جان بھی قربان کردیں گے۔ وہ ٹریننگ کے لیے جاتے رہے اس دوران گھر بھی چکر لگا لیتے، مگر ایک روز اچانک یہ سلسلہ بند ہوگیا...... ہم نے بہت تلاش کیا مگر کوئی اتا پتا نہ ملا، آخر 2006ء میں دو آدمی ان کی شہادت کی خبر لے آئے۔ ان کے پاس ایک ناقابل فہم خط بھی تھا جس کی

ابتدائی لکھائی شاید بھائی کی تھی لیکن باقی سطریں ان کی لکھی ہوئی نہیں لگ رہی تھیں۔ پورا خاندان شدتِ غم سے نڈھال تھا۔ اس وقت کسی نے بھی اس بات کی طرف توجہ نہیں دی۔ آج انہیں ہم سے بچھڑے دس برس بیت چکے ہیں لیکن ہمیں کل کی بات لگتی ہے۔ ہمیں کسی طور چین نہیں آتا اور نہ ہی یقین آتا ہے۔ ہمیں اُس وقت یقین آجاتا اگر وہ ہمیں ان کی میت دیتے۔ ہم سب کا خیال یہی ہے کہ وہ دہشت گردوں کے ہاتھ لگ چکے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ وہ زندہ ہوں۔ بس امید کا دامن تھام کر آپ سے ''استخارہ'' کی گزارش کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ملیں گے کہ نہیں۔

☆ بیٹی فائزہ! اللہ تمہیں اور دیگر خاندان کے افراد کو صبر عطا فرمائے۔ جس قدر ممکن ہو قرآن پڑھ کر بھائی کو بخشا کرو۔ اور خیرات کا سلسلہ بھی جاری رکھو۔

□ ذکیہ بی بی۔ کوہاٹ

☆ بیٹی ذکیہ! اللہ تمہارے شوہر کو عقل سلیم عطا فرمائے۔ دوسری شادی کرنا گناہ نہیں مگر مساوات رکھنے کا سختی سے حکم ہے۔ پردے کی پابند خاتون کو خرچ کے لیے اور دیگر ضروریات کے لیے تنگ کرنا نہایت قبیح عمل ہے۔ بیٹی میں تمہیں صبر کی نصیحت کروں گا اللہ تمہیں تمہاری اولاد کی بے شمار خوشیاں دکھائے گا۔ بیٹی بکثرت درود شریف پڑھو۔ نماز کی پابند ہو، بہت خوش نصیب ہو۔ فجر اور عشاء کے بعد ایک ایک بار سورۃ واقعہ پڑھو اللہ کرم فرمائے گا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ شمع۔ چیچہ وطنی

○ محترم بابا جی! السلام علیکم۔ بابا جی! میں گزشتہ دو سال سے آپ کو خط لکھ رہی ہوں اور آپ کا ہم پر یہ احسان ہے کہ آپ ہمارے خط کا جواب وقت پر دے دیتے ہیں۔ بابا جی! میں نے جس مسئلے کے لیے بھی وظیفہ منگوایا، خدا کے کرم اور آپ کی دعاؤں سے وہ مسئلہ حل ہوگیا، لیکن میرا ایک اہم مسئلہ جس کے لیے میں نے آپ سے وظیفے منگوائے اور وہ سب نماز کی پابندی کے ساتھ ادا بھی کیے، لیکن مسئلہ پھر بھی حل نہیں ہورہا۔ بابا جی! پلیز خدا کے بعد آپ کو واحد سہارا جان کر یہ خط لکھ رہی ہوں، برائے کرم میری مدد کریں اور مجھے ایک بیٹی ہونے کے ناتے دعا دیں کہ مجھے میرا سچا پیار مل جائے۔ بابا جی! آپ مجھے کوئی ایسا جلالی ورد بتادیں جس کے کرنے سے میرا رشتہ غیر برادری میں، جہاں میں چاہتی ہوں جلدی سے طے ہوجائے اور خدا ہم دونوں کو جلدی سے ایک کردے۔ بابا جی! مجھے یہ بھی بتائیں کہ جو ورد آپ مجھے بتائیں گے کیا وہ ورد لڑکا جس سے میں شادی کرنا چاہتی ہوں، کرسکتا ہے۔ بابا جی! میرے خط کا جواب جلدی دیجیے گا اور مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆ بیٹی شمع۔ اب جو حالات ہیں اس میں مناسب ہوگا کہ تم مجھ سے تعویذ لے لو۔ ایک تعویذ تم رکھو دوسرا وہ لڑکا رکھے۔ آئندہ خط مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ لکھنا تاکہ تمہیں تفصیل ارسال کی جاسکے۔

□ ناہید۔ پشاور

☆ بیٹی ناہید۔ خود اعتمادی کے لیے تمہیں خود بے انتہا کوشش کرنی ہوگی۔ اس کا سب سے آسان حل یہ ہے کہ لوگوں سے گھبراتی ہو تو لوگوں ہی میں گھری رہا کرو۔ گھر والوں سے ہر معاملے میں بات کیا کرو۔ عزیز و اقارب سے قریبی تعلق رکھو۔ گھر میں اور کمرے میں بند مت رہا کرو، نماز کی پابندی رکھو اور سورۃ فاتحہ بکثرت پڑھا کرو، ابھی کم عمر ہو تھوڑی سی ہمت کروگی تو اس مسئلے پر قابو پالوگی۔ یہ مت سوچا کرو کہ لوگ تمہارے بارے میں کیا سوچیں گے بلکہ کوشش کیا کرو کہ تم ان کے بارے میں اچھا سوچو۔ گھر آئے مہمانوں کی خاطر کیا کرو، خیریت دریافت کیا کرو، انسان سب کچھ اپنے گھر سے ہی سیکھتا ہے۔ کوشش کرو ضرور کامیابی ہوگی۔

□ شہناز۔ ملتان

○ محترم بابا جی! السلام وعلیکم۔ میرا نام شہناز ہے اور میری بچی کا نام مہناز ہے، مسئلہ یہ ہے کہ میری بچی کا دماغ پڑھنے میں بہت کمزور ہے اور وہ شرارتیں بھی بہت ہی زیادہ کرتی ہے، چھوٹے بڑے کسی کا لحاظ نہیں کرتی اور نہ ہی میرا کہنا مانتی ہے، اتنا تنگ کرتی ہے کہ میں اکثر رو پڑتی ہوں، اس کی عمر اب آٹھ سال ہونے کو ہے۔ اسکول، مدرسے جہاں بھی جاتی ہوں مجھے اس کی شکایتیں سننے کو ملتی ہیں اور اس کی نظر بھی بہت کمزور ہے، دور سے کسی چیز کو دیکھتی ہے تو آنکھیں بہت کھینچتی ہے اور دھوپ میں اس کی آنکھیں بند ہوجاتی ہیں۔ میں اپنی بیٹی کے

بارے میں بہت فکر مند ہوں۔ برائے کرم مجھے اس مسئلے کا حل بتائیں۔ آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا۔

☆ بیٹی شہناز! بچوں کو اگر بات بات پر مارا اور جھڑکا جائے تو وہ ڈھیٹ ہوجاتے ہیں۔ بچوں کی بھی عزتِ نفس ہوتی ہے اور اس کو مجروح کرنے کا والدین کو بھی حق نہیں۔ بہر حال بچی کو نرمی اور محبت سے سمجھاؤ۔ تم اپنے اندر برداشت پیدا کرو۔ ہر بچہ ایک سا نہیں ہوتا پھر اولاد کو اچھی طرح پالنے کے لیے بہت توجہ اور محنت کی ضرورت ہے۔ تم نمازِ عصر کے بعد 11 بار سورۂ ناس پڑھ کر بچی پر دم کرو اور اللہ سے دعا کرو کہ اللہ اس کو فرمانبردار بنادے۔ حسبِ استطاعت صدقہ ضرور نکالا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ انیسہ۔ شکر گڑھ

o السلام وعلیکم بابا جی! میرا نام انیسہ ہے اور میری عمر 25 سال ہے۔ میں تقریباً چھ، سات سال سے کافی بیمار رہتی ہوں۔ سب سے پہلے مجھے نیند نہ آنے کی شکایت ہوئی اور تھوڑے وقت میں میرے سر سے بال گرنا شروع ہوگئے جس سے سر کے سامنے کی طرف گنج پن ہوگیا اور وہ آج تک میرے بال صحیح نہیں ہوئے جب کہ میں نے ڈاکٹروں سے علاج کروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی نہ بالوں کے لیے نہ بیماری کے لیے مگر کوئی فرق نہیں ہورہا۔ کچھ وقت پہلے سے میرے کپڑوں پر خون کے نشان اور جسم پر بھی عجیب سے نشانات آجاتے ہیں، جیسے کچھ لکھا گیا ہو یا ناخن اور انگلیوں کے نشانات۔ میرا کوئی کام نہیں ہوپاتا۔ میں نے 2009 میں میٹرک کیا، آگے پڑھنا چاہتی ہوں، کالج میں بھی داخلہ لیا اور پرائیویٹ بھی کرنا چاہا مگر میرا انٹر بھی نہیں ہو پارہا۔ Job کرنا چاہتی ہوں مگر اتنی کوششوں کے باوجود بھی صرف ناکامی ہی ہوتی ہے، عمر 25 سال ہے مگر رشتہ بھی نہیں ہوتا۔ میں ان تمام ناکامیوں اور بیماری سے بہت عاجز آچکی ہوں۔ اس مہینے میں میری طبیعت بہت زیادہ خراب رہی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دل پر کوئی بہت بھاری پتھر رکھ دیا ہو یا جیسے کوئی سانس روکنے کی کوشش کررہا ہو۔ ہم 10 سالوں سے جس گھر میں رہ رہے ہیں اب ہم وہ گھر چھوڑنا چاہتے ہیں۔ ہمارا گھر کرائے کا ہے، مگر کبھی ابو تو کبھی بھائی رضامند نہیں ہوتے اور جب ہوجائیں تو کسی نہ کسی وجہ سے ہم اس گھر سے جا نہیں پارہے۔ ابو اور بھائی کا کام ہوتے ہوئے بھی گھر میں برکت نہیں ہوتی اور اکثر و بیشتر تو حالات بہت ہی زیادہ بُرے ہوجاتے ہیں۔ ہم چار افراد ہیں گھر میں مگر ہمارے گھر میں کوئی نہ کوئی بیمار ہی رہتا ہے خاص کر میں اور میرے والد صاحب۔ 3 سال پہلے میری والدہ ہاسپٹلائز ہوئی تھیں تب سے اُن کی بھی طبیعت نرم گرم رہتی ہے۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا، آپ کی دعاؤں کی طلب گار۔

☆ بیٹی انیسہ! تمہارا ساتھ معاملہ سفلی عملیات کا ہے مزید تاخیر کیے بنا مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو تاکہ تفصیل سے جواب دیا جاسکے۔ فوری طور پر نماز فجر اور عشا کے بعد ایک ایک بار سورۂ توبہ پڑھو۔ میں تعویذ تیار کردیتا ہوں تم سچی کہانیاں کے دفتر فون کرکے فوراً معلومات حاصل کرکے تعویذ منگوالو۔

□ نور زمان۔ دبئی

o بابا صاحب! میری عمر 38 سال ہے۔ عرصہ بارہ سال سے میں یہاں مقیم ہوں میں ایک بہت مشکل کا شکار ہوں۔ مجھے گلے میں شدید تکلیف رہتی ہے۔ ذرا سا کچھ بازار کا کھالوں، گلا خراب ہوجاتا ہے۔ آپ مجھے اپنی تیار کردہ دوا ارسال کردیجیے۔ میں بہت ممنون ہوں گا۔

☆ بیٹے نور! اللہ تمہیں شفا دے۔ نماز کی پابندی رکھو۔ دوا تیار کردوں گا۔ مگر اکثر دوائیں مطلوبہ پتے پر مل نہیں پاتیں۔ اس لیے تم کسی سے بھی آفس سے دستی منگواسکتے ہو۔

□ احمد مغل۔ جرمنی

o بابا جی! میں پچھلے 18 سال سے جرمنی میں ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ زندگی آرام سے گزر رہی ہے۔ میرے دو بچے ہیں۔ بیٹی بڑی ہے میں اس کی پاکستان میں شادی کرنا چاہتا ہوں مگر میری بیوی بالکل تیار نہیں اصل میں وہ انگریز ہے مگر شادی سے قبل اس نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ اس کے دماغ میں پتا نہیں کیسے یہ بات آگئی ہے کہ پاکستانی لڑکے بیویوں کو مارتے پیٹتے ہیں۔ بس اسی بات کو لے کر وہ بہت خوف زدہ ہے۔ میں چاہتا ہوں یہ مفروضہ اس کے دماغ سے نکل جائے اور وہ خوشی سے پاکستان آنے پر تیار ہوجائے۔ میں بدمزگی کے بغیر

یہ معاملہ طے کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے آپ سے اس مسئلے کے حل کے لیے تعویذ چاہیے۔ پلیز میری مدد کریں۔ جو بھی ہدیہ ہو میں دینے کو تیار ہوں۔

☆ بیٹے احمد! اللہ تمہیں درست فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ کیا تمہارا اپنا رویہ بیوی سے اچھا نہیں رہا جو وہ ایسا سوچ رہی ہے؟ بہرحال اپنے رویے سے ثابت کرو کہ اس کی سوچ غلط ہے۔ نماز پڑھو اور دعا کرو نماز عشاء کے بعد ایک بار سورۂ یونس پڑھو اور دعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر میں فون کر کے معلومات لے لو۔

☐ شاہ بی بی۔ میرپور خاص

○ السلام علیکم! بابا جی عرض یہ ہے کہ میں آپ کے پاس ایک واقعہ جو ہمارے گھر پیش آیا اس کو لے کر حاضر ہوئی ہوں وہ یہ ہے کہ میرا بھتیجا نام مصطفیٰ کی رات کو ڈھائی بجے اپنی مورگھی جس میں بچے کو سلاتے ہیں سو رہا تھا۔ سوا مہینہ پہلے کی بات ہے بارشوں کے دن تھے گرمی کا فل سیزن تھا۔ جس بھی تھا پتا نہیں بند کمرے میں کیسے سانپ آیا اور سانس پی گیا بچہ فوت ہو گیا۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ موت تو برحق ہے اسے جہاں جیسے آنا ہو گا آ کر رہے گی۔ مگر آج کل جو شر انگیز دور چل رہا ہے اس میں یہ یقین کرنا چاہتے ہیں کہ کیا یہ موت امرِ الٰہی تھی یا کسی دشمن کا وار تھا۔ مہربانی فرما کر آپ ہماری رہنمائی کریں۔ یہ بچہ سولہ سال بعد بھائی کو بڑی دعاؤں سے عنایت ہوا تھا۔ بچہ 4 ماہ 4 دن زندہ رہا۔

☆ بیٹی شاہ بی بی! تمہارا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ یقیناً والدین کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ کی امانت تھی اُس نے واپس لے لی۔ میں نصیحت کروں گا کہ اس بار حمل ٹھہرتے ہی مجھ سے حفاظت کا تعویذ منگوا لینا۔ انشاءاللہ سب خیر ہو گی۔

☐ زرقا۔ صادق آباد

○ محترم بابا جی! السلام علیکم۔ خدا آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔ میرے ایک جاننے والے نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا اور آپ کا پتا بتایا کہ آپ بہت سے پیچیدہ مسائل کا حل بہت آسانی سے نکال لیتے ہیں۔ وظائف اور تعویذ بھی دیتے ہیں۔ خدارا میرے مسئلے کا بھی کوئی حل نکالیے کہ میں بہت پریشان اور اکیلی ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ میرے شوہر کو فوت ہوئے تقریباً 4 سال ہو چکے ہیں، میرے 4 بچے ہیں۔ میرے سارے بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ، شکل و صورت کے اچھے، قد کاٹھ والے اور برسرِروزگار ہیں۔ جب سے میرے شوہر فوت ہوئے ہیں میرا کوئی بھی کام آسانی سے پورا نہیں ہوتا۔ ہر کام میں نجانے کیوں اتنی رکاوٹیں اور پریشانیاں آ جاتی ہیں کہ وہ پورا نہیں ہو پاتا، بہت منتوں مرادوں کے بعد میری دو بیٹیوں کی شادی ہوئی ہے جب کہ سارے بچے شادی کے قابل ہیں۔ جہاں کہیں رشتے کی بات شروع ہوتی ہے، بہت پُرامید طریقے سے ہوتی ہے مگر کچھ عرصے میں ختم ہو جاتی ہے۔ یہ صرف رشتوں میں ہی نہیں بلکہ ہر کام میں ہوتا ہے۔ مجھے آپ سے تعویذ درکار ہے تاکہ اللہ مشکلات آسان فرمائے۔

☆ بیٹی زرقا! اللہ تمہاری مشکل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد ایک تسبیح سورہ الناس کی پڑھو۔ اول و آخر درود شریف 7-7 بار پھر حاجت بیان کرو مدت 2 ماہ ہے۔ مجھ سے فون پر ضرور رابطہ کرنا بیٹی۔ تعویذ حاصل کرنے کا طریقہ سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلوم کر لو۔

☐ ناز۔ نامعلوم

○ محترم بابا جی! السلام وعلیکم! میں ایک ایسے مسئلے میں گرفتار ہو گئی ہوں کہ جس کے بارے میں، میں کسی سے تو کیا خود سے بھی کوئی بات کرتے ڈرتی ہوں، میں نے اپنا نام اور شہر فرضی لکھا ہے۔ بابا جی میں فائنل بی ایس سی کی اسٹوڈنٹ ہوں اور اگلے ہی سال ڈاکٹر بننے والی ہوں، مگر مجھے لگتا ہے کہ اب یہ سب کچھ خواب ثابت ہو گا۔ بابا جی! اندرونِ سندھ سے آنے والا میرا ایک کلاس فیلو جو کہ بے حد وجیہہ و شکیل تھا۔ میں دوسری لڑکیوں کی طرح اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی اور بابا جی ایک سال دھواں دھار عشق کے بعد ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں۔ بابا جی! میں اُسے کسی بھی طرح، کسی بھی قیمت پر حاصل کر لینا چاہتی تھی۔ عشق کا بھوت اُس وقت اُترا جب اچانک محبت کی اس اندھی کو بند کمرے کے مناظر کسی دوسرے لڑکے نے موبائل کے ذریعے دکھا کر استعمال کیا۔ اللہ کے واسطے بابا جی میں تنگ آ گئی ہوں

اپنی زندگی ہے۔ یہ فیلڈ اتنی بھی بری نہیں مگر ہم محبت میں اندھی ہو جانے والیاں...... آپ کا کالم مسئلہ یہ ہے میں بچپن سے پڑھتی آ رہی ہوں کیوں کہ میرے گھر سچی کہانیاں آتا تھا۔ میری امی پر کسی نے کالا جادو کروایا تھا تو آپ ہی کے پاس مسئلہ لکھ کر بھیجا تھا۔ خدا کا کرم ہوا اور آپ وسیلہ بن گئے۔ بابا جی! اب میرا مسئلہ یہ ہے کہ کچھ ایسا کر دیں کہ از خود اُس ظالم کا دل موم ہو جائے اور یہ میری زندگی کا کالا باب بند کرانے کے لیے وہ خود ایسا کرے کہ میں جس طرح کھلونا بن چکی ہوں، ایک نارمل لائف جینے لگوں۔

☆ بیٹی ناز! تم نے جو مسئلہ بتایا ہے وہ از خود تمہارا پیدا کردہ ہے، تمہارا حساب لگایا گیا ہے۔ تم بہت بڑی آزمائش میں گھر چکی ہو۔ سب سے پہلے تو ہر وقت باوضو رہو، نماز کی پابندی کرو۔ اور تمہارے دوست نما دشمن کے لیے بھی، بہت اہم تعویذات تیار کرا لیے گئے ہیں۔ تم فوری طور پر سچی کہانیاں کے آفس فون کر کے طریقہ استعمال معلوم کرو۔ باقی کچھ چیزیں تمہارے جوابی لفافے میں ڈالی جا رہی ہیں۔ امید ہے اس آزمائش سے تم جلد سرخرو ہو جاؤ گی۔ باقی ہو سکے تو روزانہ سونے سے پہلے تین بار سورۃ یٰسین کی تلاوت کو باقاعدہ بناؤ۔ اور اکتالیس دن تک روزانہ صبح فجر کے بعد سورۃ مریم کی تلاوت کرو۔ اس وقت تمہیں ہمت سے کام لینا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ ہر چیز کو اُس کی جگہ پر اتنا ہی اہمیت دو مگر شدت ہر چیز کی ہی بری ہوتی ہے، مجھ سے رابطے میں رہنا۔ خدا رحم کرے گا۔

☐ فوزیہ۔ میر پور خاص

☆ بیٹی فوزیہ! میں تمہارے لیے دعا کا اہتمام کروا رہا ہوں۔ انشاء اللہ جلد کرم ہو گا۔ تم نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 3-3 تسبیح پہلے کلمے کی پڑھو اور دعا کرو۔ مدت 21 دن ہے۔

☐ فرح۔ کراچی

o بابا! میں نے بہت شوق سے یونیورسٹی میں داخلہ لیا، پہلے ہی سمسٹر میں دو پرچوں میں نمبر کم آئے۔ مجھے کبھی فیل ہونے کا تجربہ نہ تھا۔ میرے ساتھ دوسری طالبات نے بھی ٹینشن نہیں لی مگر میرا تو سکون ختم ہو گیا۔ اس قدر صدمہ ہوا کہ مجھے اپنی ذات، اپنا ذہن، اپنی شکل سب کچھ برا لگنے لگا۔ مزاج بھی چڑچڑا ہو گیا۔ بہت مشکل سے یونیورسٹی جانا شروع کیا۔ دل چاہتا ہے پڑھنا چھوڑ دوں، تاکہ یہ بھول جاؤں کہ کبھی فیل بھی ہوئی تھی۔ مگر والدین مجھے مستقل سمجھا رہے ہیں کہ کوئی بات نہیں ہے تم پڑھو...... مگر...... بابا جی! کوئی ایسا وظیفہ دے دیں کہ میرا ٹوٹا ہوا دل جڑ جائے۔

☆ بیٹی فرح! اگر پڑھنا چھوڑ دو گی تو یہ کبھی بھول نہ پاؤ گی کہ فیل ہوئی تھیں بلکہ جب بھی تعلیم کے حوالے سے ذہن میں کوئی بات آئے گی تو فیل ہونے کا ناگوار احساس بھی ہو گا۔ یقیناً تم پاس ہو سکتی ہو جن پرچوں میں نمبر کم ہیں دوبارہ محنت کر کے امتحان دو، پاس ہونے کے لیے اس بار زیادہ توجہ اور یکسوئی سے مطالعہ کر کے دیکھو، تجربہ اچھا رہے گا۔ اس کے علاوہ ہر طرح کی صورتحال میں مزاج کو پُرسکون رکھنا ضروری ہے۔ بدمزاجی اہل خانہ کو ناگوار گزرتی ہے۔ اس طرح تعلقات بھی خراب ہوتے ہیں، اس وقت کوئی حوصلہ بھی نہیں دیتا۔ فیل ہونے پر افسوس ہونا چاہیے تاکہ دوبارہ امتحان کی پہلے سے زیادہ اچھی طرح تیاری کی جائے لیکن اتنا صدمہ نہ ہو کہ اپنی ذات بری لگنے لگے۔ یہ ڈپریشن کی علامت ہے لہٰذا اس کیفیت سے ہر ممکن بچو۔ اور نماز کی پابندی کو یقینی بناؤ اور اول و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف کے بعد ہر نماز کے بعد "یا علیم" کی تسبیح ایک بار ضرور پڑھو۔ خدا کے حکم سے ہر مسئلہ حل ہو جائے گا۔

☐ ایمن۔ لاہور

o محترم بابا جی! السلام علیکم۔ آپ بہت سے لوگوں کے مسائل حل کرتے ہیں۔ میں بھی اپنا ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ میری شادی کو سات سال ہو گئے ہیں اور میں اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔ بچوں کی تعلیم وغیرہ بھی صحیح جا رہی تھی۔ لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ میری ساس اور نند دونوں نے مل کر میرے شوہر کو گاؤں لوٹ جانے پر مجبور کیا ہے۔ میری ساس بھی گاؤں میں رہتی ہیں۔ میرے شوہر فتح جنگ ہی میں سرکاری ملازمت کرتے ہیں۔ میں نے جب انکار کیا تو میرے سسرال والوں نے مجھے

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کردینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آئیے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

زبردستی گاؤں جانے پر مجبور کیا۔ جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ میں گاؤں میں نہیں رہنا چاہتی کیوں کہ میری ساس اور نند بہت سخت ہیں اور ہر وقت جھگڑتی رہتی ہیں۔ میں اس قسم کا ماحول پسند نہیں کرتی۔ لہٰذا آپ میرے لیے ایسا وظیفہ بتائیں جس سے میں اس مصیبت سے بچ سکوں۔

☆ بیٹی ایمن! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ تمہیں اس معاملے میں بہت تحمل اور سکون سے اپنے شوہر سے بات کرنی چاہیے، بہرحال شہر میں گاؤں کے مقابلے میں پڑھنے لکھنے کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔ نماز فجر کے بعد ایک بارہ سورۂ آل عمران پڑھو پھر اپنے اوپر دم کرلو۔ اس کے بعد مناسب موقعہ دیکھ کر شوہر سے بات کرو انشاء اللہ ضرور بات بن جائے گی۔

□ ارمان جہاں۔ کہروڑ پکا

○ باباجی! السلام علیکم۔ میں عرصے سے آپ سے رابطے میں ہوں مگر آج ایک نئے مسئلے کے ساتھ حاضر ہوں۔ میری شادی میری پسند سے ہوئی تھی میرے شوہر نے بھی اپنے گھر والوں کی مخالفت مول لے کر مجھ سے شادی کی مگر اب جب کہ میرے دو بچے بھی ہیں ان کا رویہ بہت خراب ہوگیا ہے۔ انتہائی سرد انداز ہے۔ لگتا ہے جیسے مجھے دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ باباجی! ان کے اس رویے سے مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں چھوڑتی پھر بھی وہ مجھ سے خوش نہیں بتائیے میں کیا کروں؟

☆ بیٹی ارمان! غیر فطری انداز زندگی بہت دیر تک نہیں چلتا۔ تمہارے شوہر تم سے بدظن نہیں بلکہ اس کو اس کا ضمیر کچوکے لگا رہا ہے۔ والدین کو ناراض کر کے کون خوش رہا ہے۔ تم اگر کامیاب زندگی چاہتی ہوں تو اپنے والدین اور شوہر کے والدین سے تعلقات بحال رکھو۔ یہ تمہارے لیے بھی اچھا ہے اور بچوں کے لیے بہت بہترین ہے۔ بیٹی! رشتے ناطے سنبھال کر ساتھ لے کر چلائے جاتے ہیں توڑے نہیں جاتے۔ شروع میں تمہیں مشکل ہوگی لیکن اگر چاہتی ہو کہ تمہاری اولاد سدا تمہاری فرمانبردار رہے تو بڑوں سے تم دونوں معافی مانگو بہت

سکون ملے گا۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد "یا حفیظ" کا ورد کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

□ راحیل بیگ۔ سرگودھا

○ باباجی! میرا بیٹا ایک طلاق یافتہ عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے، وہ اس کے ساتھ جاب کرتی ہے۔ بیٹے کی عمر 30 سال کے قریب ہے۔ ایک روز میں نے دونوں کو سڑک پر گزرتے دیکھا۔ عورت کم عمر ہے، دیکھنے میں لڑکی معلوم ہوتی ہے لیکن میری رائے اس کے بارے میں بالکل اچھی نہیں کیوں کہ اس نے میرے لائق بیٹے کو بہکایا ہے۔ میرے رشتے داروں کو پتا چلے گا تو سب ہی مجھ پر ہنسیں گے۔ بات بہت بڑھ گئی ہے۔ لڑکے نے صاف کہہ دیا ہے کہ اگر ہم لوگ راضی نہ ہوئے تو وہ الگ گھر لے کر رہے گا اور ہمیں چھوڑ دے گا۔ میری بیوی کا بھی رو رو کر برا حال ہے۔ پلیز کوئی ایسا تعویذ دیں کہ میرا بیٹا اُس لڑکی سے تائب ہو جائے۔

☆ بیٹا راحیل! تم نے جو مسئلہ بتایا ہے۔ اگر تم خاندان والوں سے ڈرتے ہو تو بات اور ہے مگر دیکھ لو والدین کو بھی تھوڑا تحمل سے کام لینا چاہیے باقی سب سے پہلے تو تم سب نماز کی پابندی کرو اور آفس فون کر کے تعویذ منگوالو اور اُسے بیٹے کے کمرے میں رکھ دو۔ خدا بہتری کرے گا۔

□ رضیہ بانو۔ سکھر

○ باباجی! گھر کے لڑائی جھگڑوں سے پریشان ہو کر میں اپنے دونوں بچوں کے ساتھ علیحدہ رہنے لگی ہوں۔ بیٹا کالج میں پڑھتا ہے اور بیٹی اسکول میں، بڑے بیٹے کی شادی کر دی ہے، اس کی بیوی ٹیچر ہے۔ وہ اپنی بچی کو ہمارے پاس چھوڑ کر جاتی تھی۔ مسئلہ یہ ہے کہ علیحدہ ہونے کے بعد میرے شوہر نے میرا ساتھ نہ دیا بلکہ بڑے بیٹے کے ساتھ ہی رہنے لگے۔ ان کی محبت سے محروم ہو کر چھوٹے بیٹے نے نشہ کرنا شروع کر دیا۔ وہ کہتا ہے کہ میں نشہ چھوڑ چکا ہوں لیکن مختلف طرح کے اخراجات کا ذکر کر کے کافی رقم لے لیتا ہے۔ اب یا تو میں اس پر اعتماد کروں یا پھر ڈرتی رہوں کیوں کہ میں گھر سے باہر تو اس کے ساتھ نہیں ہوتی۔ کچھ ایسا کر دیں کہ میرا بیٹا سدھر جائے۔

☆بیٹی! تم نے گھر چھوڑ کر سب سے بڑی غلطی کی اور دیکھ لو تم دونوں میاں بیوی بھی الگ ہو گئے۔ اور آگے جو پریشانیاں آئیں گی تمہارے سامنے ہے۔ خیر اب تم نماز کی پابندی کرو اور ہر نماز کے بعد ''یا مانع'' کی 3-3 بار تسبیح پڑھو اور ہاں ہر پیر اور جمعرات کے دن صدقہ خیرات لازمی دیا کرو۔ آفس میں رابطہ کرو اور ان حالات کی بہتری کے لیے تعویذ منگوالو۔

□ صائمہ۔ کراچی

o بابا جی! خدا آپ کو سلامت رکھے۔ بابا جی میرا سب سے بڑا مسئلہ میرا موٹاپا ہے، اللہ کے واسطے اس مسئلے کا حل بتائیں۔ کوئی دوا تجویز کردیں میں بہت پریشان ہوں۔ میری عمر 35 سال ہے۔ قد نارمل ہے۔

☆بیٹی صائمہ! موٹاپے کا سب سے پہلا علاج چہل قدمی ہے۔ اگر گھر میں زینہ ہے تو ہر کھانے کے بعد پانچ مرتبہ ایک منزل کو چڑھا اترا کرو۔ اس کے علاوہ چکنائی زہر قاتل ہے۔ موٹاپے کے لیے دوا تیار ہے ''سچی کہانیاں'' کے آفس سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

□ فاطمہ۔ راولپنڈی۔

o محترم بابا جی! ہمارے مالک مکان نفسیاتی مریض معلوم ہوتے ہیں۔ ذرا پانی گرنے کی آواز آتی ہے تو فوراً کہتے ہیں، پانی نہ پھینکو۔ حالاں کہ ہم جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتے۔ غلطی سے کبھی نل کھلا رہ جاتا ہے۔ اس طرح دیوار پر کیل ٹھونکتے ہیں تو وہ پریشان ہو کر منع کرتے ہیں۔ کبھی تو کہتے ہیں دیوار توڑ رہے ہو، اس کے ساتھ ساتھ کانپنے لگتے ہیں۔ میں نے ان کی بیوی سے بات کی انہوں نے بتایا کہ وہ نفسیاتی مریض ہیں۔ بابا جی! ہم تو اس کِل کِل سے تنگ آگئے ہیں۔ کرایہ پورا دیتے ہیں اور پھر بھی فقیروں کی طرح ان کے آگے جھکے رہتے ہیں۔ کچھ ایسا عمل بتائیں کہ وہ بے جا بولنا چھوڑ دیں۔

☆بیٹی فاطمہ! تمہارا مسئلہ ایسا پیچیدہ نہیں ہے۔ جس نے گھر بنایا ہوتا ہے وہ ایک کیل کے ٹھونکنے پر اعتراض کرتا ہوا بھی حق بجانب ہے۔ بس برداشت سے کام لو۔ نماز کی پابندی کرو اور ہر نماز کے بعد 7-7 بار ''یا رحیم اور یا سمیع'' کی تسبیح پڑھو۔

☆☆☆

ہائیڈ پارک

نفیس خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

بات کے پکے

آفتاب ولایت جس وقت نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ غلام محمد ملک غلام مہر گورنر جنرل پاکستان کی نوعمری اور طالب علمی کا زمانہ تھا۔ شہرت سن کر، دوارث پر حاضر ہوئے اور خادم کے ذریعے اندر کہلوایا کہ آپ کا غلام آیا ہے اور باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔ حضرت نے جواب عطا فرمایا کہ ”ہمارا غلام تو بادشاہ ہوتا ہے اسے کہہ دو کہ چلا جائے۔“

آپ کی زبانِ حق سے نکلے ہوئے الفاظ مقبول بارگاہ الٰہی ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ جو کہہ دیا سو ہو گیا۔

یہ طالب گورنر جنرل پاکستان بنا۔

حسن انتخاب: ایم حسن نظامی، قبولہ شریف

طیارہ 661

اللہ اکبر اللہ اکبر سے گونجتا ہوا طیارہ
دلوں پر کرو ے جو سب کے ہیبت ناری
لرزتے لبوں پر ایک ہی صدا تھی اللہ اکبر اللہ اکبر
آہ کتنی جانوں نے دیا نذرانہ
کتنے خاندان ہوئے بے آسرا
سن کر ہوا دل آبدیدہ بہت
مرتے لبوں نے کی ہوگی رب سے سرگوشی
معافی بھی ہوگی توبہ بھی ہوگی
اپنے ہر گناہ پر ندامت بھی ہوگی
ہوگا کرم رب کا ہر ایک مسلمان پر
دل سے نکلی ہے فرح کے آج اک دعا
رب کی رحمت ہو ان شہیدوں پر
کر گئے قربان جو اپنی جانوں کو

شاعرہ: فرح انیس، کراچی

مہکتی باتیں

☆ آنسو مسکراہٹ سے زیادہ اسپیشل ہوتے ہیں، پتا ہے کیوں؟ کیونکہ مسکراہٹ تو سب کے لیے ہوتی ہے مگر آنسو صرف ان کے لیے ہوتے ہیں جنہیں ہم کھونا نہیں چاہتے۔

☆ میں اچھے وقت سے زیادہ اچھے دوست کی قدر کرتا ہوں، کیونکہ اچھا دوست اچھا وقت پیدا کر سکتا ہے مگر اچھا وقت اچھا دوست پیدا نہیں کر سکتا۔

مرسلہ: راشد لطیف۔ صبرے والا

افسانچہ

مت پوچھو کیسے وقت گزارہ تم بن...... پل پل جیے...... پل پل مرے...... اف کس قدر ظالم ہو تم...... اب آ بھی چکو، تمہاری راہ تکتے صدیاں بیتیں مگر تم سنگ دل آتی ہی نہیں۔ تم سنگ گزرا ایک ایک لمحہ یاد آتا تھا۔ وہ لحافوں میں بیٹھے دیر تک مونگ پھلیاں کھانا۔ وہ گرم گرم کافی سے اٹھتا دھواں...... اُف...... وہ برفیلی راتوں میں دیر تک ہیٹر کو گھورنا کہ شاید ”گیس“ آجائے۔ ہائے......! گرم ابلے انڈوں پر نمک چھڑک چھڑک کھانا۔ بہت یاد آتا ہے قسم سے...... کتنا ستاؤ گی...... کب

تک تڑپاؤ گی...... جانے کب آؤ گی۔ سردی جی اب تو دسمبر آ گیا ہے۔ آبھی جاؤ۔
عظمیٰ شکور۔ اسلام آباد

حالات

آج میں اسے کافی دنوں کے بعد ملا تھا۔ خوشی کے ساتھ ساتھ کچھ حیرت بھی ہوئی۔ آج اس کی شخصیت میں کافی نمایاں تبدیلیاں تھیں۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ اب وہ کامیابی کی طرف گامزن ہے۔ اس نے مجھے بھی کافی مخلص مشورے دیے لیکن افسوس اپنے حالات کے پیشِ نظر میں ان سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔
مرسلہ: خواجہ حسین جاوید۔ مخن آباد

آج کا دور

آج کے اس دور میں انسان کا حساس ہونا بھی جرم ہے۔ انسانیت کے جذبے روند دیے جاتے ہیں۔ پاگل ہیں وہ لوگ جو خواب سجاتے ہیں۔ محبت لفظ افسانوں کے لیے بنا ہے۔ جرم الفت کی سزا موت ہے۔ ڈر لگتا ہے ہر ایک آہٹ پر کہ کہیں ضمیر جاگ نہ جائے۔ کچھ تو انسان میں ہوتا ہے جو اسے مرنے نہیں دیتا لیکن بظاہر کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہوتا ہے جو انسان کو جینے بھی نہیں دیتا۔
مرسلہ: خواجہ اولیس۔ مخن آباد

تیرے بعد

ویران زندگی میری پل بھر میں کر گیا
اپنا مکاں بنا لیا جائے خلد میں
نہ جانے کس کی نظر لگی نہ جانے کس نے دی بددعا
یہ نصیب ہی کی بات تھی جو نصیب نے دعا دی
ہیں دربدر کی ٹھوکریں میرے نصیب میں
دنیا نے تیرے بعد تو پتھر سمجھ لیا
شاعرہ: نفیسہ فضل۔ کراچی

گل دوستی

دنیا میں ہزار ہا قسم کے پھول ہیں مگر لازوال مہک رکھنے والا دوستی کا پھول ہے جس سے نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ دل مسرور ہوتا ہے، یہ "پھول" اس زمانے میں کامیاب ہے اس پھول کو نرم و گداز اور حساس زمین پر کاشت کر کے خونِ جگر سے سینچا جاتا ہے اس کی نشوونما کے لیے، اعتماد، اعتبار اور خلوص بہترین کھاد ہے۔ مہر، محبت، وفا، ایثار و ہمدردی، انکساری کی نرم اور لطیف آب و ہوا میں یہ خوب پھلتا پھولتا ہے۔ اسے شکوک و شبہات اور بدگمانیوں کی بادِ مسموم سے محفوظ رکھیے، ورنہ حسد، بغض اور کینہ جیسے امراض اسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ دلکش پتیاں سوکھ کر گر جاتی ہیں اور بے جان ٹہنیاں تلخ یادوں کی مانند رہ جاتی ہیں۔
مرسلہ: فہد غفار، کراچی

اخلاق اور مفکرین

☆ تم میں مجھے وہ زیادہ عزیز ہے جس کا اخلاق اچھا ہو۔ (حدیث نبویؐ)
☆ اخلاق کا اچھا ہونا محبتِ الٰہی کی نشانی ہے۔ (حدیث نبویؐ)
☆ چھوٹے با اخلاق اعمال زندگی کو میٹھا اور بڑے با اخلاق اعمال اسے بامعنی بنا دیتے ہیں۔ (بودھ)
☆ کائنات کا عظیم ترین محل یا کوئی گوہر نایاب بھی اس قدر قیمتی نہیں ہوتا جتنا کسی انسان کا اخلاق۔ (رینالڈ)
☆ بہت زیادہ با اخلاق نہ بنو ورنہ تمہیں دھوکا ہوگا۔ (تھورو)
☆ جس کو ماں باپ اخلاق نہیں سکھاتے اسے زمانہ سکھا دیتا ہے۔ (اسپنسر)
☆ اگر تم چاہتے ہو کہ دنیا کو اس کی ناک پکڑ کر گھما سکو تو اپنے اخلاق بلند رکھو۔ (نطشے)
مرسلہ: مسز نگہت غفار۔ کراچی

زندگی کا انشورنس

ایک اجنبی کسی گاؤں میں داخل ہوا۔ ایک جگہ کافی لوگ جمع تھے۔ یہ دیکھ کر اس نے وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ ایک بڑھیا کی سالگرہ ہے اور آج وہ پورے سو برس کی ہو چکی ہے۔ بڑھیا کے بازو میں ایک بوڑھا کھڑا تھا جو بے حد پریشان نظر آ رہا تھا اسے دیکھ کر اجنبی نے پوچھا۔

پلکیں اس نے جھکائیں نظر میں نے بھی جھکائی
محبت کا ایک نیا دیا اس نے مجھے پیغام یقین رضا
اپنی زندگی میں نہ آئے گی پھر ایسی شام میں
شاعر: ملک علی رضا۔ فیصل آباد

ڈرتے کیوں ہو!!

کرتے ہو جو ہم سے محبت تو دنیا سے ڈرتے کیوں ہو
چھپ کر دنیا سے اظہارِ محبت کرتے کیوں ہو
روز کرتے ہو وعدۂ ملاقات بھول بھی جاتے ہو
اس طرح میرے جذبات سے کھلواڑ کرتے کیوں ہو
آتا ہے بڑا لطف تمہیں جو ستاتے ہو اس قدر
خفا جو رکھتے ہو تو پھر ہمیں مناتے کیوں ہو
کہہ دو نا ایک بار سرِ عام ہمیں تم اپنا
بنتے ہو انجان ہم سے سرِ محفل کتراتے کیوں ہو
عجیب زمانے کا ڈر حائل رکھتے ہو درمیاں
خود کو بے نام بندشوں میں باندھتے کیوں ہو
مرنہ جائے کہیں نینا اس کی بات یاد رکھنا
نا سیکھ سکو تو داستانِ عشق کو پڑھتے کیوں ہو!
شاعرہ: نینا خان۔ کراچی

ڈائری کا ایک ورق

میرے محسن میرے ابو دنیا کے عظیم ترین انسان ہیں۔ ہر پریشانی میں وہ میرے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ انہوں نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ میرے ابو انتہائی شفیق انسان ہیں، ویسے تو دنیا کا ہر باپ ہی اپنی اولاد کے لیے محنت کرتا ہے لیکن میرے ابو نے میرے لیے دن رات محنت کی ہے۔ میرے ابو کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ لفظوں میں نہیں سما سکتے۔
حسن زورِ قلم: سنی سانگی۔ رحیم یار خان

محبت

میرا دل چاہتا ہے
پھول گلاب کے سجا دوں تمہارے بالوں میں
لا کر چاند رکھ دوں تمہاری بندیا میں
ریشم کا لباس ہو تمہارا
شاعر: حسین خواجہ۔ مخن آباد

''یہ کون ہے اتنا پریشان کیوں ہے؟'' اس پر جواب ملا۔
''وہ بڑھیا کا داماد ہے جو پچھلے پچاس برس سے اس کی زندگی کی انشورنس کی قسط بھر رہا ہے۔''
مرسلہ: جواد انور۔ اسلام آباد

موت کا کھیل

ایک دوست نے دوسرے دوست سے کہا۔
''میرے آباؤ اجداد سب موت سے کھیلتے ہیں۔''
دوست نے پوچھا۔
''وہ سپاہی تھے؟''
''نہیں۔''
''کیا وہ ڈاکٹر تھے؟''
''نہیں وہ مردوں کی تجہیز و تکفین کرتے تھے۔''
دوست نے جواب دیا۔
مرسلہ: مہوش یوسف۔ ڈسکہ، سیالکوٹ

میری امی

میری امی دنیا کی بہترین خاتون ہیں وہ بھی اس کے باوجود کہ انہوں نے آج تک میرے لیے کچھ نہیں کیا کیونکہ یہ شرط لازم نہیں کہ جو والدین اپنی اولاد کے لیے کچھ کریں وہی عظیم ہوتا ہے۔ کبھی کبھی انسان کسی کامیابی کے پیچھے صرف اور صرف والدین کی دعائیں ہی ہوتی ہیں۔ میری اماں نے میرے لیے دن رات مالک کے حضور رو رو کر دعائیں مانگی ہیں۔ میری ماں میری جنت!
مرسلہ: ثناء اللہ۔ رحیم یار خان، بٹی

حسین شام!

شام تو ہر روز ہی آتی ہے زندگی میں مگر
جو گزری ہے کل کی شام
کیا دوں میں اسے نام
اک شوخ حسین لڑکی سے جو ملی نگاہ
اس نگاہ مست میں جانے کیا تھا اثر
کیا اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سلام
کچھ وہ بھی شرما گئی کچھ گھبرایا میں بھی



قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمایئے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں
نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

صلاح الدین......ٹنڈو آدم

ضرور ہے کوئی پیغام پیڑ کا اس میں
یہ پھول شاخ سے یوں ہی نہیں گرا مجھ پر
یہ کس کی سانس مجھے گدگدا رہی ہے کبیر
یہ کون میرے سرہانے جھکا ہوا مجھے پر

کوثر سعید......لاہور

اب سہاروں کی بات مت کرنا
اب دلاسوں سے بھر گیا ہے دل

عزیز سعید انصاری......کراچی

آج پھر پریشان ہوا ہے دل
جانے کس حال میں ہو گا مجھے چھوڑنے والا

خضر حیات......روڈہ تھل، خوشاب

میری آنکھوں سے بہا کرتی ہے ان کی خوشبو
رفتگاں خواب میں آتے ہیں چلے جاتے ہیں
شادیٔ مرگ کا ماحول بنا رہتا ہے
آپ آتے ہیں رُلاتے ہیں، چلے جاتے ہیں

ریاض حسین تبسم چوہان......فیصل آباد

جاگنے کا عذاب سہہ سہہ کر
اپنے اندر ہی سو گئی آنکھیں

نور العین......اسلام آباد

خدا جانے یہ کیسے مرد ہیں جو یہ سمجھتے ہیں
کہ سب مردانگی عورت کو تھپڑ مارنے میں ہے

محمد قاسم خان بلوچ......ٹوبہ ٹیک سنگھ

جا جا کے اس کے سینے میں جا کے دھڑک اے دل
اس کے بغیر بھی جی رہا ہوں تیرے بغیر بھی جی لوں گا

ڈاکٹر شہباز......حیدر آباد

عنوان زندگی پر بس اتنا ہی لکھ پایا
بہت کمزور رشتے ہیں بہت مضبوط لوگوں سے

زاہد کولاچی......نواب شاہ

رقص کرتی ہوئی لو سر پہ اٹھا لائی ہے
سر قلم کر کے چراغوں کے ہوا لائی ہے
مری اوقات ہی کیا تھی کہ سراہا جاتا
مجھ کو مسند پہ بزرگوں کی دعا لائی ہے

محمد ارشد......بورے والا

نہ ظاہر ہوئی ان سے نہ بیان ہوئی ہم سے
بس سلجھی ہوئی آنکھوں میں الجھی رہی محبت

سعادت علی خان......لیہ

خواب آنکھوں میں سجائے ہوئے معصوم سے لوگ
زندہ رہنے کی تمناؤں میں مر جاتے ہیں

محمد رمیز......ٹنڈو آدم

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں اُن کی تقدیریں

محمد وسیم چدھڑ......روڈہ تھل خوشاب

رنگوں کے پیچ و تاب میں تصویر الگ ہوئی
آنکھوں سے خواب، خواب سے تعبیر الگ ہوئی
رستے پہ حادثہ مجھے پیش آیا عشق میں
نقصان الگ ہوا مرا تاخیر الگ ہوئی

عالیہ کاظمی......رحیم یار خان

عکس ابھرتا ہی نہیں ذہن پہ میرے کوئی
تیری یاد نے ہر سو دھند مچا رکھی ہے

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایڈ فری لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First. All Done

Liked | Message | •••
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow

معین رزاق......کراچی

اپنی نیندوں سے جاگ کر بھول نہ جانا ہمیں
ہماری ہر صبح منتظر رہتی ہے آپ کی دعاؤں کی

محمد فیاض محمود......کراچی

ترے آنسو نہیں اچھے تری مسکراہٹ پیاری ہے
تری یہ جو ایک جان ہے یہ میری دنیا ساری ہے
کبھی ناراض مت ہونا، کبھی جدا مت ہونا دوست
بہت خوش نصیب ہوں میں جو میرے ساتھ دوستی تمہاری ہے

ایم افضل آزاد......ساہیوال

ہے عکس میسر ترا جس سمت بھی دیکھوں
گیا ہر کوئی تم سا ہے یا سارا جہاں تم ہو

افضال عمرانی......سجاول

شرم، وحشت، جھجک، پریشانی
ناز سے کام کیوں نہیں لیتیں؟
آپ، وہ، جی مگر یہ سب کیا ہے؟
تم مرا نام کیوں نہیں لیتیں

علی رضا عمرانی......ٹھٹھہ

کوئی فیصلہ تو ہو کہ کدھر جانا چاہیے
پانی کو اب تو سر سے گزر جانا چاہیے

تنویر فاطمہ......کراچی

اس کو نہ پا سکے تھے جب دل کا عجیب حال تھا
اب جو پلٹ کے دیکھئے بات ہی کچھ محال تھی
میری طلب تھا ایک شخص وہ جو نہیں ملا تو پھر
ہاتھ دعا سے یوں گرے بھول گیا سوال بھی

افضال حسین بابر......کراچی

یہ کب کہتی ہوں تم میرے گلے کا ہاتھ ہو جاؤ
وہیں سے لوٹ جانا تم جہاں سے بے زار ہو جاؤ

حبیب شفیق......اسلام آباد

یہ غربتیں مری آنکھوں میں کیسی اتری ہیں
کہ خواب بھی مرے رخصت ہیں، رتجگا بھی گیا

یاسمین عمران......وزیر آباد

جلنے کا حوصلہ نہیں رکنا محال کردیا
عشق کے اس سفر نے تو مجھ کو نڈھال کردیا

رضوانہ کوثر......لاہور

مرے گلے پہ جے ہاتھ میرے اپنے ہیں
جو لڑ رہے ہیں میرے ساتھ میرے اپنے ہیں

اسامہ بلال اعوان......لاہور

بچھڑا جو ایک بار تو ملتے نہیں دیکھا
اس زخم کو ہم نے کبھی سلتے نہیں دیکھا
اک بار جسے چاٹ گئی دھوپ کی خواہش
پھر شاخ پہ اس پھول کو کھلتے نہیں دیکھا

بشریٰ......لاہور

دل عجب شہر کہ جس پر بھی کھلا در اُس کا
وہ مسافر اسے ہر سمت سے برباد کرے

محمد بلال فیاض......ملتان

شام بھی ہو گئی دھندلا گئیں آنکھیں بھی مری
بھولنے والے میں کب تک ترا رستہ دیکھوں

فرح عالم......اسلام آباد

تعلقات کے برزخ میں ہی رکھا مجھ کو
وہ میرے حق میں نہ تھا اور خلاف بھی نہ ہوا

آصف احمد......میلسی

بھولا نہیں دل ہجر کے لمحات کڑے
راتیں تو بڑی تھیں ہی، دن بھی بڑے

کوپن برائے

تیر نیم کش

فروری 2017ء

میرا یہ پسندیدہ شعر "سچی کہانیاں" کی نذر ہے

نام:

پتا: